

ماہنامہ سگر گزشتہ

جولائی 2012

علاج حب الشباب

پاک سوسائٹی

ڈاکٹر گلام

جون 2012

مجلہ

کیتھرین دے ویس کی ملک جو جلال خیرت کردار کی ماں گدھی

یاد رہے کہ یہ سب چیزیں انسانی حیات کے نام سے یورپ آج بھی تھرتا ہے

www.Paksociety.com

اصول سیرت

ادارہ

سرگزشت

ایک صفحے میں مکمل ایک
نا در روزگار کا تعارف خاص

گفت و شنید

آپ کی باتیں آپ کے
مشورے اور آپ کے سوال

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

عظیم

ڈاکٹر ساجد امجد

واقعات عالم

وہ عالم ترین افراد تھے جن کے
خوف سے ایک جہاں لرزنا لگتا تھا

لرزیہ یورپ

مریم کے خان

قاتل بہرو

مختار آزاد

جرم کھانی

وہ اس شہر کے پولیس کے سہارنے
کے لیے آیا تھا اور کیا پلاننگ کیا

عقل مند

سید احتشام

جوان ہمت

طارق عزیز خان

معلومات

مل پاس کے بیک کورس ہونی لڑکی
نے ایک ملکہ کا لاج پہن کر رون کیا

کیستھرین

ابن کبیر

فلمی انفلیلہ

علی سفیان افغانی

زندگی نامہ

اس دنیا میں کسی کے عجیب و غریب
قوتوں کے حامل لوگ پائے جاتے ہیں

پراسرار بندے

عائشہ جونجو

شہر یوں کا شہر

ایس جی یزدانی

چشم کشا

ایک معمولی بندے کے جذبات
پس ملکہ میں انقلاب لا دیا تھا

ڈنک

جاذب احتشام

بھنو بھال

محمد ایاز رابی

شخصیت

روح کی بلیدگی نہیں دل کی بڑگی
کے لیے ایک فروش کی دھو دھیا

تحقیق

ہا یک بڑی شخصیت تھی مگر لے
دی گئی سزا بھی اسی بھیانک تھی

عزم و حوصلہ

عزم و حوصلے سے نکل کر تیری
موت کو وہ پیچھے چھوڑ چکا تھا

فلم و صحافت

فلم و صحافت کی کمی ان کی
باتیں بھولی بسری یادیں

سفر کھانی

اس ملکہ کا سفر جہاں تاقی کا اہل ہے
جہاں کا جہاں حکومت چکا کرتی ہے

واقعات

ماضی قریب سے ایک عورت کے
حوصلے کا قصہ ایک دلچسپ واقعہ

معاشرت

بے مثل دلوں سے گندمی تہلکہ
خیز داستان، لہو لہو کرے نوالی تحریر

سراب

کاشف زہید

شعر و ادب

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

بیت بازی

قارئین

علمی آزمائش

ادارہ

پہلی سچ بیانی

محبت کرنے والے قربانیوں
کی مثال قائم کرتے ہیں

کہانی محبت کی

اشعر علی

تجربہ

فیصل اختر

تیسری سچ بیانی

اسے شط لگانے کی عادت تھی کبھی
کبھی کر پھوٹا کبھی بڑھاتا ہے

آخری شرط

بدرالدین

وعلے بد

ڈاکٹر فرحان احمد

پانچویں سچ بیانی

وہ نقاب سے چھانکتی دو
آنکھوں کا ایسے چمکا تھا

آئینہ

منظر امام

جھانسا

ڈاکٹر نوہا احمد

ساتویں سچ بیانی

وہ لہٹاؤ، دھبے کو مائل
رہنے کے لیے ہاتھ لگا دیا تھا

جنس

آرکشی

منزل

عبدالرحیم

اٹھویں سچ بیانی

لیاں سے لیاں
لیاں سے لیاں

آپس کے جگنو

فراز علی

پاپے

قارئین / ادارہ

انعامی مقابلہ

ذہن قارئین سے ذوق جستجو
تکسین کے انفر، انعامی سالانہ

دوسری سچ بیانی

میرا ہی کی محبت میں ایک تیرے
کو بھی شامل کرنے کا انوکھا تجربہ

چوتھی سچ بیانی

اس نے یہاں کا دل دکھایا تھا اس لیے
اس کی زندگی کھوں کی تصویب ہو گئی

پہلی سچ بیانی

ایک مل سازگرہ کی نمل
ساز کا قصہ بیداری کا فسانہ

آٹھویں سچ بیانی

اس نے گاؤں سے جاتے
جاتے ایک غلطی کر دی تھی

سو فالت

دنیا بھر سے مختلف موضوعات
پر معلومات انگشٹافانی پاپے

ماہنامہ کی سندس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
معاشرے کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
اہم درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے
کی کاپی یا طبع کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

اصول پرست

سرگزشت

15 اگست 1913ء کو سیالکوٹ کے قصبہ بدوہلی میں ایک زمیندار ہوا کرتے تھے۔ نام ان کا چوہدری غلام حیدر تھا۔ ان کا شمار پنجاب کے چند بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے حقیقی غم خوار تھے اور صحیح معنوں میں ان کے مسائل حل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے زوال نے انہیں بے حد افسردہ کر دیا تھا لیکن سرسید کی تحریک ان کے لیے تقویت کا باعث تھی۔ دیگر زمینداروں کے برعکس وہ مسلمانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ اس ادارے میں بچوں کو داخلہ دلوانے کے لیے انہوں نے باضابطہ تحریک چلائی تھی۔ اپنے بیٹے کو وہ چاہتے تو دیگر بڑے زمینداروں کی طرح معروف پرائیویٹ اسکول میں بھیج سکتے تھے لیکن انہوں نے اسے بھی اپنے ہی اسکول میں مزاحموں کے بچوں کے ساتھ بٹھایا۔ اس تعلیمی ادارے میں کسی کو کسی پر فوقیت دینے کی پابندی تھی۔ صرف قابلیت کو ترجیح دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹے کو بھرپور محنت کرنا پڑتی تھی۔ اسی اسکول سے ان کے بیٹے نے میٹرک پاس کیا پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا جہاں سے اس نے گریجویشن کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی لا کالج سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی اور وکالت کے پیشے میں آ گیا۔ وکالت کے لیے آبائی شہر سیالکوٹ کو پسند کیا۔ خدمتِ خلق خون میں شامل تھی اس لیے عوام سے زیادہ قریب تھے۔ آہستہ آہستہ سیاست کی جانب مائل ہونے لگے۔ سیاست کا آغاز کیا انڈین نیشنل کانگریس سے۔ 1939ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ کے رکن منتخب ہوئے لیکن جب مسلم لیگ نے سالانہ کنونشن میں قرارداد لاہور منظور کی تو اسے ساتھیوں کے ساتھ وہ مسلم لیگ میں آ گئے۔ 1944ء میں پنجاب مسلم لیگ کنونشن میں قائد اعظم کو شرکت کی دعوت دینے وہ خود بھی گئے اور وہیں ان کی ملاقات نواب بہادر یار جنگ سے ہوئی۔ انہوں نے انہیں بھی کنونشن میں شرکت کی دعوت دی۔ کنونشن ہوا اور اتنا کامیاب ہوا کہ فطریات ٹوانہ کی حکومت مل گئی۔ قیام پاکستان کے حق میں انہوں نے پورے پنجاب میں کنونشن، کانفرنس اور جلسے کرائے مگر ان جلسوں پر خرچ ہوئی رقم ان کی ذاتی تھی۔ وہ اپنی جائداد بیچ کر کارکنوں کی فوج تیار کرتے رہے، اسی فوج نے فطریات ٹوانہ کی حکومت کو گرا کے مسلم لیگ کو پنجاب میں محکمہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان تک ان کی آدمی سے لائد جائداد بک چکی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد انہیں وزیر تعلیم کا کم و ان ملا تو انہوں نے پہلا حکم نامہ جاری کیا کہ انجمن کالج کی سرکاری گرانٹ بندی جائے۔ کیونکہ یہ کالج امرائے پنجاب کے ہے اس لیے اہل جاہ امرائے پنجاب کے اسکول اور کالجوں میں طبقاتی فرق مٹانے کے لیے ایک پورنامہ کا اعلان کیا۔ امرائے پنجاب نے بھی ملے دوڑوں اور دوستوں کی مدارات پر خرچ خود کرتے۔ سرکاری رقوم کو عوام کی کمائی کے لیے اس کے دہاں کو مرام قرار دیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ جن دنوں روز ویلٹ جنرل اسپتال کی صدر تھیں، ہمارے مہمان نے مادام کے احوال میں استقبال دینے کی لابی شروع کی۔ انہوں نے بھی پاکستان کی جانب سے لابینگ شروع کر دی۔ ہم کامیاب قرار پائی۔ اس استقبال میں اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک نے شرکت کی اور یہ ایک کامیاب ترین سیاسی تحریک قرار پائی۔ اس دعوت کے تمام اخراجات انہوں نے اپنی جیب سے ادا کیے۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اخراجات حکومت پاکستان سے لے لیں تو انہوں نے جواب دیا ”یہ دعوت میں نے صرف ملک کا وقار بلند کرنے کے لیے اپنے طور پر دی تھی پھر میں مام کے گارمے پسینے کی کمائی پر ڈاک کیوں ڈالوں؟“ وطن کا یہ تپا خدمت گزار، اعلیٰ سیاست داں، ایک درمند دل رکھنے والا 1991ء میں اچانک دل کے دورے سے بدوہلی میں اپنی حویلی کی دہلیز پر گرا اور روح عرش بریں کی جانب پرواز کر گئی۔ اس اصول پرست سیاست داں کا پورا نام چوہدری نصیر احمد عرف لارڈ بدوہلی تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!
السلام علیکم!

مہنگائی، بے روزگاری، خون ریزی..... ارباب اختیار کی بے حسی، قانون کی ناقدری، سیاست کی بازیگری ان سب پر تو اتر سے لکھا جا رہا ہے لیکن اب اکتاہٹ ہونے لگی ہے اس لیے کہ مسائل در مسائل کا ایک دریا سا بہنے لگا ہے۔ جہاں شکر کی قیمت میں ایک چونی (چار آنے) بڑھنے پر حکومت ڈمگائی تھی اسی ملک میں اب ہر روز ہر چیز کی قیمت میں مسلسل اضافہ ہوتا ہی چلا جا رہا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ارباب اختیار تو عوامی مسائل سے ”ناواقف“ ہیں ہی خود ساختہ قومی رہنما یا حسب اختلاف بھی اس بارے میں زبان کھولنے سے گریزاں ہیں۔ ہاں تقریب میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے مہنگائی کی دہائی دے دی جاتی ہے لیکن اس سلسلے میں زیادہ غور کرنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ سیاسی پارٹیاں الزام تراشی اور انا پرستی جیسے خود ساختہ اہم مسائل سے نمٹنے میں ہی سارا زور لگا رہی ہیں تو پھر مہنگائی اور دیگر عوامی مسائل کے لیے وقت کہاں سے نکالیں کیونکہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے گرکوششیں کی جائیں گی تو اس میں صاحبانِ قضا و قدر کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اسی لیے ہم مصحفی کے اس شعر پر اکتفا کر لیتے ہیں

رہنے دو میرے سینے میں پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہر خدا تاوک جاناں کو نہ چھیڑو

معراج رسو

جلد 22 • شمارہ 08 • جون 2012ء

ماہنامہ
نگار

مدیر: اعلیٰ : عذرارسل
مصور: شاہ حسین

شعبہ اشتہارات

نیو شہزادہ نمبر 2256789-0333
نایب مدیر محمد رمضان نمبر 2168391-0333
ڈائریکٹر محمد جمیل نمبر 2895528-0323
نایب ڈائریکٹر انور علی نمبر 4214400-0300

♦♦♦

قیمت فی پرچہ 90 روپے • زر سالانہ 600 روپے

پبلشر پروپرائٹر: عذرارسل

مقام اشاعت: C-63، فیز 11 ایکس ٹینشن
ڈسٹریکٹ کٹرل اربائیں کونگڑا
کلمہ 75500

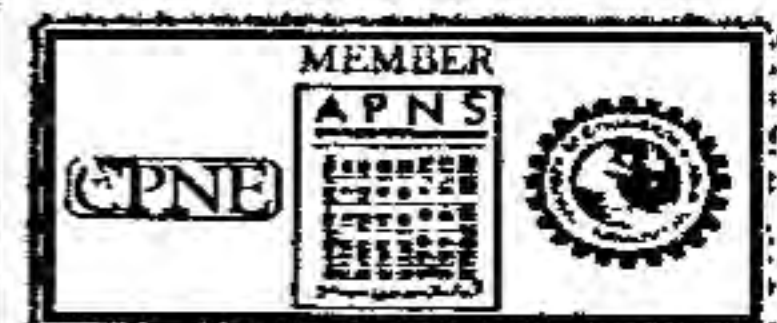
پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ایم سن پرنٹنگ پریس

ہائی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdggroup@hotmail.com





ایم اے خالق بھٹی کا مکتوب خلوص، اللہ آباد، رحیم یار خان سے "ادارہ میں لوڈ شیڈنگ کا ذکر تھا۔ اب تو لوڈ شیڈنگ ہماری زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ مختصر سرگزشت میں مشہور زمانہ قلم کار محمد عمر المعروف شوکت تھانوی کے حالات زندگی سے واقفیت ہوئی۔ بلاشبہ وہ مزاح لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سودیشی ریل جیسی مزاح سے بھرپور کہانی کا جواب آج تک کوئی لکھ نہیں پایا۔ کرشن چندر کی ایک گدھے کی سرگزشت اور سودیشی ریل یہ دو طویل کہانیاں طنز کی دنیا کا اثاثہ ہیں۔ ساجد امجد کی پیش گوئی بھی بنی اسرائیل کے حضرت دانیال علیہ السلام کا ذکر بڑے خوبصورت ہیرائے میں پڑھنے کو ملا ہے۔ انہی کبیر کی استنبول کا عاشق پڑھ کر احساس ہوا کہ مسلمان ادیب کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مسلمانوں میں پہلے ادیب ہیں جن کو طویل پرائز ملا۔ سلیم فاروقی کی جنون آزادی پڑھی۔ سلیم فاروقی صاحب سرگزشت میں آپ کی مزید تحریریں پڑھنے کا انتظار رہے گا۔ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے، اس کا ادراک صرف انہیں ہے جو غلام ہیں۔ ہم بھی آزاد ہیں اس لیے آزادی کی قدر نہیں کر رہے۔ کس طرح آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی یہ قابل تعریف ہے۔ باربی ڈول کی دوسری ذخری قسط محمد اختر کے قلم سے انتہائی پڑیر ہوئی۔ انکل علی سفیان آفاقی بھی صحت یاب ہو گئے ہیں ان کی درازی عمر اور صحت کاملہ کے لیے دعا گو ہوں۔ تنویر ریاض کے قلم سے شو بزنس کے معروف رائٹر جاوید اختر کی کتنا مقدور کی بات کے نام سے پڑھی ہے، اچھا لکھا ہے محمد امجد نے سائن ٹولو جی کے نام سے ایک نئے مذہب سے متعارف کرایا ہے۔ شہید مرتے نہیں، زین مہدی کا نیک مستیوں کے بارے میں پڑھا۔ راجا ثاقب نواز ثاقب کرسی صدارت پر جھگڑ کر تے نظر آئے۔ سرکار کو ششیں جاری رکھیں۔ سز سدرہ بانو ناگوری اب آپ بھی خواتین کو چاندنی بی والا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ اعجاز حسین سخار، آپ کے تبصرے نے دو ماہ کی کٹر پوری کر دی۔ سعید احمد چاند، ملک ثاقب شاد تنولی، مونا گل، مجاہد مصطفیٰ کوریہ، رانا شاہد، محمد ایاز راسی، افتخار احمد کسمن، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، معراج الدین، منظر علی خان، رانا حبیب الرحمن کے اچھے تبصرے اور معلوماتی تھے۔ رانا محمد ساجد بڑا ہی طویل تبصرہ لکھا ہے جی۔ سسٹر طاہرہ گلزار، کوئی کسی کو نہیں بچاتا، بس ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ اب دیکھیے ہمارے ملک کی ستر فیصد آبادی ناخواندہ ہے، ان کو بھی تعلیم یافتہ افراد کے برابر ووٹ کا حق حاصل ہے۔ میرے خیال میں ان ناخواندہ افراد کے ووٹوں کی سزا سب سمجھتے چلے آ رہے ہیں۔ سہیل احمد عباسی، جوانی میں لسان کی بیماری لگ چکی ہے!"

✍ خال کبیر کا مکتوب، لاہور سے "کچھ عرصہ سے فنی مصروفیات کے باعث بیرون ملک تھا، واپسی پر سرگزشت پڑھا۔ میں شہر خیال کے افراد کا مشکور اور ممنون ہوں جنہوں نے میرے سالانہ تجزیہ کو سراہا اور جنہوں نے خامیوں کی طرف نشاندہی کی۔ آئندہ ان خامیوں کو دور کروں گا۔ اس دفعہ کا ادارہ پڑھا جس میں شہر کراچی کی خصوصی اور پاکستان کی عمومی صورت حال کے بارے میں پڑھا۔ آپ نے درست لکھا کہ بے روزگاری نے نوجوان نسل کو جرائم کی طرف ڈال دیا ہے۔ لوڈ شیڈنگ، مہنگائی اور امن وامان کی صورت حال نے پاکستان کے لوگوں کو نفسیاتی سریش بنا دیا۔ ہر کوئی شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ بے یقینی ہر طرف پھیل رہی ہے، کچھ معلوم نہیں کہ آئندہ آنے والا وقت کیسا ہوگا؟ ایک ملٹی سرگزشت میں شوکت تھانوی صاحب کا تعارف ہوا۔ شہر خیال میں داخل ہوا تو راجا ثاقب نواز ثاقب کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ تبصرہ خوب لکھا۔ سدرہ بانو ناگوری نے کراچی کی صورت حال کے بارے میں لکھا۔ اعجاز حسین سخار کا خط بہترین لگا۔ سعید احمد چاند، ملک ثاقب شاد تنولی، مونا گل، ایم اے خالق بھٹی، رانا محمد شاہد، محمد ایاز راسی، طاہرہ گلزار، سہیل عباسی، افتخار احمد کسمن، معراج الدین، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی کے خطوط اچھے رہے۔ منظر علی خان، رانا محمد سجاد کے تبصرے خوب رہے۔ ان خطوط میں یہ بات بھی نمایاں رہی کہ اس ملک کا نوجوان باصلاحیت ہے اور ہمیں ان صلاحیتوں کو اُجاگر کر کے اس معاشرے میں بے یقینی کی فضا کو دور کرنا چاہیے۔ اخبارات ان کے انٹرویو شائع کرے۔ درجنوں فنی جوتلو ہیں ان کو سامنے لائیں۔ سیاست دانوں کے ناک شوز کی جگہ ایسے نوجوانوں کے کارنامے عوام کو دکھائے جائیں تاکہ ان کے نقش قدم پر کئی نوجوان چلیں۔ حضرت دانیال کے چند واقعات میں نے بچپن میں اپنے والد صاحب مرحوم و مغفور سے سنے تھے جس میں شیروں کے آگے آپ کو ڈال دیا گیا لیکن شیر آپ کو کچھ نہ کر سکے۔ استنبول کا عاشق میں نوبل انعام یافتہ ادیب کے بارے میں پڑھا۔ ان کا نام تو سن رکھا تھا لیکن

اب ادا کیا جاتا بھی پڑھی۔ شروع میں ناکامیوں سے واسطہ پڑا۔ تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن آخر کار کامیاب ادیب بن گئے۔ اہل احتیول کے عاشق، بغاب کے وزیر اعلیٰ صاحب بھی ہیں جو لاہور کو استنبول جیسا شہر بنانے کے شوق میں جم جوش ہیں۔ ہندو ماہ اہل احتیول کے مہر بھی لاہور آئے۔ استنبول بنانے کے لیے اس کو حریہ بد صورت بنایا جا رہا ہے، کئی جگہ سے سڑکیں توڑ دی گئیں۔ سہارنپور کے بڑے بڑے باپ سڑکوں کے کنارے پڑے ہیں۔ جانے کب یہ کام مکمل ہوں گے۔ علی سفیان آفاقی ایک عرصے کے بعد فلمی اہل لکھنے کے ساتھ حاضر رہے۔ جاوید اختر ہندوستانی فلمی صنعت سے وابستہ شاعر اور ادیب کی سرگزشت بھی اس دفعہ پڑھنے کو ملی۔ ساکھو لوجی میں ایک پراسرار مذہب کا تعارف ہوا۔ حیرت اس بات کی ہوئی کہ کراچی کے چند افراد نے اس کے بانی کا جنم دن منایا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کراچی کے حالات نے لوگوں پر کیسے اثرات مرتب کیے، ایک منگیترنے کس طرح انتقام لیا۔ لیکن اس میں لڑکی کا قصور نظر آتا ہے۔ جب اس نے دولت کی خاطر اپنے شوہر کو چھوڑ دیا جس کا نتیجہ بہت ہیایک نکلا۔ مکمل میں ایسے شخص کا قتلہ پڑھا جو محبت کر کے بُری طرح پھنس چکا ہے۔ شاید یہ لڑکی اس کو تب تک نہیں چھوڑے گی جب تک کوئی اور اس کی کو اپنے حسن میں گرفتار نہ کر لے۔"

✍ اعجاز حسین سخار، نور پور تحصیل سے لکھتے ہیں "پرچہ ہاتھ آیا تو لسٹ چیک کی اور برادر علی سفیان آفاقی کا نام پڑا کہ دل خوش ہو گیا اور سارے سلسلوں کو چھوڑ کر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ مختلف ڈاکٹروں اور ٹیکسوں کے بارے میں پڑھا تو خود کو بیمار محسوس کرنے لگے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ایسی قابل قدر شخصیات کے ہنر سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہے جس کی وجہ کم علمی اور لاہور سے دوری ہے۔ مقدور کی بات میں جاوید اختر کے متعلق معلومات مختصر ہیں لیکن جامع اور مکمل ہیں۔ واقعی وہ مقدور کے سکندر ہیں۔ سلیم کے بعد اکیلے بھی کامیابیاں کمیشن اور اپنی صلاحیتوں کا نوبہا منوایا۔ وہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بھی تصویر میں چاق و چوبند نظر آ رہے ہیں۔ جس سے لگتا ہے، وہ ابھی لمبے عرصے تک کام کرتے رہیں گے۔ شہید مرتے نہیں پڑھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ واقعی شہید باقیامت زندہ رہیں گے۔ سراب کے واقعات میں سلسل اور روانی عروج پر ہے۔ سچ بیانیوں میں انتقام روائی اور معاشرتی کہانی ہے۔ دھول بھرا ستانے دہلا کر رکھ دیا ہے۔ انور نے عشق و محبت کی انتہا کو چھو لیا تھا اس لیے وہ ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہوا۔ اسے کیا خبر تھی کہ حاصل جنوں اتنا بھیا تک ہوگا۔ اب ملک اور انور ایک کشتی کے سوار ہیں وہ دونوں کا دکھ ایک ہے اور بچھتاوا بھی ہے۔ دونوں سے ناوائستگی میں غلطی ہوئی، ملک کے پاس غم غلط کرنے کے سوراہے ہیں لیکن انور کے پاس تنہائی اور سوچنے کے سوا کوئی مصروفیت نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس سے بڑھ کر کیا سزا ہوگی۔ دوسری شادی میں ایک عجیب صورت حال سامنے آئی ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کھاتے پیچے، بے فکرے لوگوں کے چوٹیلے ہیں ہمارے ہاں تو شوہر بیوی دونوں کے بچے ہوتے ہیں۔ دوسری شادی کے بعد یہ تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اکیلے میں محمد سلیم اختر نے صحیح تجزیہ کیا ہے کہ ہم سب مکمل سمجھے ہیں جو شخص پیغام پاس کر کے آگے بھیج رہے ہیں جہاں تک ناظم اور چیئر مین ٹائپ لوگوں کی بات ہے، یہ زور دار بیان دے کر اور فوٹو چھپا کر غوش ہو جاتے ہیں ورنہ شروع سے ہی عملی قدم کا ارادہ نہیں ہوتا، یہ سب ہم روزمرہ کے معمولات میں دیکھ سکتے ہیں بلف اور کھیل متاثر نہیں کر سکتے۔ پلاٹ انتہائی کمزور ہیں اس لیے بدھڑکی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ بے گناہ گناہگار سستی آموز کہانی ہے۔ اگر اس کا ہار یک بنی ہے ہار نہ لیا جائے تو کئی جھول ہیں۔ گہراکتواں میں صرف ایک شخص کے رویے، کردار اور بد فطرتی نے ہمارے خاندان میں قہر شایا ہوا اور آخر ہائی کے کنارے لاکڑا کیا۔ وہ جس ماحول میں رہ کر آیا تھا، وہاں سے خباثتیں بھی سمیٹ لایا تھا۔ یہ واقعات خاص طور پر والدین کے لیے آئندہ ہیں، انہیں بے رحمی سے جوڑتے ہوئے محض دولت کو بنایا نہیں بنانا چاہیے۔ شرافت، ایمانداری اور انسانی ہمدردی کے ہند ہاتھ کو بھی ہر گناہ لاری ہے۔ لوٹے رشتے میں شوہر کے علاج میں کوتاہی الگ جرم ہے جس کی سزا ملے گی کیا خبر تیک نیکی یا کسی ایک عمل کے نتیجے میں ہمارا مل جائے لیکن اپنے مرض کو حالات پر چھوڑ دینا زیادتی بلکہ خیانت ہے اس لیے جی جان سے اپنا علاج کرائیے، یہ قدم تو خود غشی کے زمرے میں آتا ہے، یوں گناہوں میں اضافہ نہ کیجئے اور اللہ سے لو لگا کر گناہوں کی بخشش کے ساتھ رحمت طلب کیجئے۔"

✍ محمد طیب کا تنجن آباد سے ای میل "سرگزشت ایک معیاری جریہ ہے۔ علم و ادب کا ایک لازوال خزانہ ہے۔ میری تجویز ہے کہ سرگزشت کے ابتدائی صفحات پر دنیا کی کم عمر مگر وسوسہ سریشناغذ پریشیل عرفہ کریم کی داستان حیات تفصیل سے شائع کریں۔ ایک تفصیلی مضمون ساجن گلپیش کے حوالے سے بھی شائع کریں۔ وہاں موجود فنی جوانوں کے شب و روز پر بھی تفصیلی تحریر شائع کریں۔" (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے)

✍ افتخار احمد کسمن کا خلوص نامہ، لاہور سے "اس دفعہ شمارے میں مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی کا تعارف ہوا۔ اگرچہ نام سے بہت پہلے ہی واقف تھی، جب نصابی کتب میں ان کے مزاحیہ مضامین پڑھتے تھے لیکن اب مختصر تعارف بھی ہو گیا۔ تفصیلی سرگزشت بھی شائع کریں۔ ان کی سودیشی ریل کے بارے میں پہلے بھی پڑھا ہوا ہے (جون 1999ء میں شوکت تھانوی پر بھرپور مضمون آچکا ہے) شہر خیال میں راجا ثاقب نواز ثاقب ساجد بڑا ہی طویل تبصرہ لکھا۔ سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سخار، سعید احمد چاند، ملک ثاقب شاد، مونا گل، ایم اے خالق بھٹی کے خطوط اچھے رہے۔ آج کل کراچی کے حالات پر تمام اہل وطن پریشان ہیں اور حیران بھی کہ آخر کب تک کراچی والے ایسے

حالات میں رہیں گے اگر نہیں پریشان تو اعلیٰ حکومت ہیں جو تماشا دیکھ رہے ہیں ہر روز کئی گھرانے اجڑ رہے ہیں۔ اگر اسے جانور بھی اگر مغرب کے کسی ملک میں روز ہلاک ہوں تو وہاں کے حکمران کو تشویش ہوتی ہے۔ مگر ہمارے یہاں عوام کٹڑے کوڑے سے بھی بدتر ہے، ہر روز اس ملک کے کسی علاقے سے کوئی نہ کوئی خبر ایسی آتی رہتی ہے۔ پیش گوئی حضرت دانیال علیہ السلام کے بارے میں پڑھا، آپ کو تعبیر دیا کا بھی خاص علم دیا گیا تھا۔ تو اہل انعام یافتہ ترک ادیب کے بارے میں پڑھا۔ اس پر تنقید بھی ہوئی، تان سین کے بارے میں یہ قصہ بھی پڑھا کہ اس نے کسی کو قتل کر دیا تھا۔ کیسے کیسے قتلے تان سین کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ علی سفیان آفاقی صاحب فلمی الف لیلے کے ساتھ حاضر تھے، یہ دیکھ کر اطمینان ہوا۔ انتقام میں لڑکی کے ساتھ بہت بُرا ہوا، اس نے اپنی محبت ٹھکرا کر دوسرے سے شوکر کھائی۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا سوائے بچھڑانے کے۔

✽ مدیحہ خان ایچہ مار یہ خان، چک بلی خان، راولپنڈی سے "ہم پہلی بار محفل شہر خیال میں شرکت کر رہے ہیں (خوش آمدید) جب سے ارد گرد لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ ماہنامہ سرگزشت، پاکیزہ، سچس اور جاسوسی، چار شمارے بغیر خرچہ مفت آل سسٹرز دفینڈز مفت پڑھتی ہوں۔ ہمارے اکل مستقل قاری ہیں، چند پڑانے شمارے مطالعہ کے بعد ہماری عاجزانہ فرمائش پر مطالعے کے بعد بھائی کے ہاتھ بھی خود یا کسی آنے والے کے ہاتھ، کبھی ڈاک سے بڑا پارسل بنا کر بھیج دیجئے ہیں، اب جبکہ بفضل خدا مدیحہ خان کی گود بھی ہری ہو چکی ہے، والدین اور سر تاج کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود ہم بھوکے وہ گریہ سرگزشت و پاکیزہ کی اتنی خوبصورت دلچسپ تحاریر سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں ہم خود نہیں خرید سکتے مگر ہمارے بچوں میں ملنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ اکل کہتا ہے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک شمارے بہت جلد ملنے کے ساتھ کم نہیں ہوتے۔ مطلوبہ پتے پر خریدار وصول نہ کرے تو واپس آفس چلا جاتا ہے۔ اگر ہم 3 سے 5 سال کا خرچہ خریداری سرگزشت و پاکیزہ کو یکمشت ارسال کر کے پتہ دیں تو کیا شمارے بروقت مل جائیں گے تاکہ مطالعہ کے بعد جلد تیسرہ کی محفل میں شرکت کر سکیں۔" (ڈاک کے ذریعے رسالے نہایت آسانی سے آپ گھر بیٹھے حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کا طریقہ اشتہار کی صورت میں آپ کو ہر سال مل جائے گا اور قیمت بھی لکھی ہوئی ہوگی)

✽ سعید احمد چاند کا پیام کراچی سے "مہراج رسول صاحب نے کٹھ اڈالنے والوں کے لیے لکھا ہے۔ اگر بجلی کے مجھے والے لوگوں کو میسر دیں تو کسی کو کیا ضرورت ہے کٹھ اڈالنے کی۔ لوگ مجبوری میں کٹھ اڈالنے ہیں، ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی قائمہ اٹھاتے ہیں۔ اگر سب لوگوں کو جائزہ طریقے سے بجلی ملے تو سب لوگ بجلی قابل بھریں تو محکمہ بجلی کبھی خسارے میں نہ جائے۔ مگر یہ کام دیانت دار انسپکٹروں کا ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں نظر رکھیں تاکہ کسی کو جرأت ہی نہ ہو کٹھ اڈالنے کی۔ ایک مٹی سرگزشت میں شوکت تھانوی کی سرگزشت پڑھی، کچھ تو ہم جانتے ہی تھے، تفصیل سے اب معلوم ہوا۔ شہر خیال میں داخل ہوئے۔ شکر ہے ہم موجود تھے۔ دل کو کچھ تھلی ہوئی۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، امجاز حسین سخا، ایم اے خالق بھٹی، رانا محمد شاہد، ملک ثاقب شاد تنولی، طاہرہ گلزار، سہیل احمد عباسی، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، رانا محمد سجاد، رانا حبیب الرحمن، منظر علی خان، سدرہ ہالونا گوری کے تبرے اچھے تھے۔ ڈاکٹر ردی نفس اس وفد پر غیر حاضر ہیں۔ لگتا ہے انہیں اب شہر خیال سے دلچسپی نہیں رہی۔ آفاقی صاحب کو اللہ نے شفا دی، دل کو اطمینان ہوا۔ ان کی فلمی الف لیلے اچھی جا رہی ہے۔ کاشف زہیر کی سراب بھی اچھی جا رہی ہے۔ جو بچہ بیانیہاں پسند آئیں وہ یہ ہیں۔ طلعت کا انتقام، انور علی کا دھول بھراستا، ہانوکراچی کا گہراکتواں، کوثر زید حسن کے ٹوٹے رشتے باقی زیر مطالعہ ہیں۔ ادارے سے ایک بات پوچھنی تھی، علمی آزمائش نمبر 80 کی 30 مئی میں ابھی ایک مہینہ ہے ہو جاتا ہے۔ کیا ہم قریبی تاریخوں میں بھیجیں؟" (ٹوکن آنے کے ساتھ متعلقہ شعبہ کو دے دیا جاتا ہے۔ وہ فوراً کیمپ میں لپک کر لیتے ہیں)

✽ جویریہ قاضی کی شکایت، مظفر گڑھ سے "اپریل 2012ء کا سرگزشت ہمیشہ کی طرح زبردست، بہترین اور اعلیٰ ترین تھا۔ ادارے میں اکل ہمیں کے آگے مین بجاتے نظر آئے۔ اکل، بھلا بیٹاں بھی لپن موسیقی کا ذوق رکھتی ہے۔ شق نا کام نمبر کے تعارفی فقرات نے دل کی دھڑکن تیز کر دی ہے، امید ہے یہ نمبر بہت کامیاب ہوگا۔ پھر شق نا کام نمبر کے بعد آپ ایک اور نمبر نکالیں گے اور وہ ہوگا..... جی ہاں، وہ ہوگا..... اولیا نمبر۔ کیا میں لکھ کر رہی ہوں؟ (فی الحال ہم اسلامی موضوعات سے گریز کر رہے ہیں پہلے دیگر عنوانات تکمیل پر پہنچ جائیں) شہر خیال میں اس وفد بہت سی نواثر یز تھیں۔ سب بہن بھائیوں کے تبرے اچھے تھے۔ ملک ثاقب شاد تنولی و کالت کے پیشے سے بہت متحرک نظر آ رہے تھے۔ لگتا ہے انہیں یہ پیشہ اس نہیں آیا۔ ورنہ آج کل تو دو کیلوں کی بڑی ٹور ہے۔ لوگ تو اس پیشے کے ذریعے طلال و حرام کی تیز کیے بغیر لاکھوں کمارہے ہیں۔ یعقوب جمیل کی وقات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ اس ماہ بھی بہت سی شاندار تحریریں ہماری منتظر تھیں۔ اس ماہ کی سراب ہمیشہ سے کہیں زیادہ اچھی اور معیاری تھی۔ اس طرح کی ایکشن سے بھرپور تحریریں بسا اوقات یکسانیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مگر کاشف زہیر نے اپنے مشاق اور مایہ ناز قلم سے اسے کبھی یکسانیت اور یوریت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ بدقسمت میں اردنٹ ہم کو بے بذات خود بدقسمت نہیں تھا البتہ اپنے ڈپریشن اور ٹیکنیوایر وچ کی وجہ سے اسے اپنی خوش قسمتی بھی بد قسمتی لگتی تھی۔ ویسے اس طرح کے خاندان کے بارے میں پہلی دفعہ سنا ہے جس کی موروثی بیماری خود کشی ہو۔ عزم کی بیکہ میں خیر پاکستان شرمین عید چٹائے کی سرگزشت بہت پسند آئی۔ یہ سرگزشت کا خاصہ ہے کہ اس میں ہمیشہ کرنت اور بات لہو لہو پر قلم اٹھایا جاتا ہے۔"

✽ راجا ثاقب نواز ثاقب کی رتی مٹی، ساہیوال سے آمد "اب کی بار ثاقب قدرے نہیں بہت ہٹ کے بٹا گیا ہے۔ خاص طور پر اس ماہ کی مہمہ جو کہ بہت کچھ کہتی محسوس ہو رہی ہے۔ ابتدائی طور میں معراج رسول جی نے اس قدر خوبصورتی سے ملکی حالات کا تجزیہ اپنے الفاظ میں کیا ہے۔ اب کی بار تو کالم کے آخر میں شعر بھی نظر آیا۔ شوکت تھانوی کے حالات زندگی کو چند سطروں میں سمو کر کمال کر دیا گیا۔ اسلامی جی ادا خان ٹائٹل کو لے ایمان تازہ کر دیا۔ نوبل انعام یافتہ اور خان تو بکے استنبو لیے ثابت ہوئے۔ جنون آزادی میں رابرٹ اور جینا اپنے خاندان مہمہ ٹھہرا، دیزائر آسٹریا پہنچ گئے۔ کپتان جیراڈ نے جان بھیلی پر رکھ کر خطرناک مہم کی تکمیل کی۔ راگ کی آگ پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ ہمارے بیشتر پاپ سٹار بھی جس طرح کی بے ہنگم اچھل کود کرتے نظر آتے ہیں، شاید ان پر بھی دچک راگ کا سایہ ہے۔ آفاقی صاحب نے اپنی ہماری کی نسبت سے جتنے بھی ڈاکٹروں اور محکموں کا تذکرہ کیا، انہیں جنت میں پہنچا کر ہی دم لیا۔ مقدر کی بات جاوید نامہ ثابت ہوئی۔ ساکھو لونی مختصر ترین رہی مگر ہماری مذہب سے دوری کی نشاندہی بھی کر گئی۔ شہید مرتے نہیں، قرآن ہی کی ایک آیت کی عملی تفسیر ہے۔ پہلی بج بیتی اللہ، طلعت نے جو بویا، اس کی توقع سے کہیں زیادہ اس کی فصل اس نے کاٹی۔ دھول بھراستا میں بھی ملکیت انو نے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک بھیا تک فیصلہ کیا اور اپنی محبت رمشا کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسری شادی کے آخر میں جو سوالات پوچھے گئے ہیں، ان کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قائم ہونے والی بیخوشیاں ہی اوز ڈالر زور پونڈ ڈاکٹل کرنے کے لیے ہوتی ہیں، لوگوں کے معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے لیے نہیں۔ اہل مختصر ترین مگر بہترین ثابت ہوئی۔ بلف میں تو دولت خاں صاحب کے ساتھ وہی معاملہ ہوا کہ لوٹ کے بدحوکہ کو آئے۔ کبل میں فرقان اسلم صاحب کو پورے نو عدد کبیلوں نے آن گھیرا ہے۔ بے گناہ میں ہار گنہگار ہوتے ہوئے مکافات عمل کا شکار ہو کر دست قدرت سے نہ بچ سکا۔ گہراکتواں میں اتنے نزدیکی رشتے کا انتہائی گھناؤنا کردار دیکھا۔ نویں مگر آخری بچ بیانی ٹوٹے رشتے میں زید حسن اپنے نام کے ہالکل برعکس انتہائی گھٹیا سوچ کا حامل شخص ثابت ہوا۔"

✽ حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ، ضلع میانوالی سے لکھتے ہیں "آپ کی گفتگو سے آغاز مطالعہ کیا ہے۔ وطن عزیز کے کونا کون مسائل، لؤڈ شیڈنگ، بد امنی، دھماکے، دہشت گردی، بے روزگاری سے دل ہول جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وطن عزیز کو ان مسائل سے جلد نجات دلائے، آمین۔ سودیشی لکھاری شوکت تھانوی ایک چراغ تھے۔ اس وفد علی سفیان آفاقی صاحب کی الف لیلے کے ذریعے واپسی پر خوشگوار حیرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سفیان آفاقی صاحب کو صحت کاملہ اور عمر طویل عطا کرے، آمین۔ محکموں اور ڈاکٹروں کے تجربات بیان کرنے کے بعد سابقہ فلمی دنیا کی حکایات بیان کرتے ہوئے ہدایت کار حسن عسکری کی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کی پیش گوئی میں حضرت دانیال علیہ السلام کے واقعات کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ قارئین کے لیے دلچسپ معلومات ہیں۔ سراب کا لکھ بھر ہے۔ اب آتے ہیں بچ بیانیوں کی طرف تو یقیناً یہ سرگزشت کا ایک اچھوتا اور دلچسپ سلسلہ ہے۔ ان کہانیوں میں قارئین کے لیے ایک کانی دلچسپی اور سبق آموز مواد موجود ہوتا ہے۔ طلعت صاحبہ کی انتقام میں یقیناً عارف نے انتقام لیا ہے۔ موصوفہ کو ایٹان کا وفادار رہنا چاہیے تھا۔ شوہر ہی کے لیے سارا ہان کا کام دیتا ہے۔ انور علی کی دھول بھراستا میں انور علی نے انتقام کی آگ میں اپنی محبوبہ رمشا کو کھود دیا۔ اس لیے ہمارے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ دشمن سے انتقام لینا مسائل کا حل نہیں ہوتا۔ اہل اچھی معاشرتی کہانی ہے۔ ہم لوگ دعوے تو بلند ہانک کرتے ہیں مگر ہم میں قربانی کا مادہ کم ہوتا ہے۔ ایک گناہ دیہاتی نے قربانی دے کر امرائے منہ پر طمانچا مارا۔ شہزاد حسن زاہد کی بے گناہ گنگا ہار نے انتہائی متاثر کیا۔ ناحق قتل کا ظون ہوتا ہے۔ ٹوٹے رشتے میں عورت کی قربانی جو کہ وہ اولاد کے لیے دیتی ہے، ایک سبق آموز تحریر ہے۔ ہاں ماہنامہ سرگزشت ایک انتہائی دلچسپ ماہنامہ ہے جو کہ اردو ادب کا شاہکار ماہنامہ کہلانے کا مستحق ہے۔ بچ بیانیوں کے لیے میں بھی ایک کہانی بھیجے گا ارادہ رکھتا ہوں، امید ہے۔ آخر میں شہر خیال کے دوستوں، راجا ثاقب نواز ثاقب، سدرہ ہالونا گوری، عبدالعزیز بی، سعید احمد چاند، مونا گل، ملک ثاقب شاد تنولی، ایم اے خالق بھٹی، طاہرہ گل نواز، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، افتخار احمد کھسن اور رانا محمد سجاد کے محبت نامے پڑھے، سب کو ولی مبارک باد۔"

✽ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی برہ ذلی مجھ سے رقم طراز ہیں "آفاقی صاحب کی صحت یابی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی، ساتھ میں تمام قارئین و اراکین ادارہ سے درخواست ہے کہ چھوٹے بھائی اور رنگ زیب محمد خان کی شفا یابی کے لیے خصوصی دعا فرمائیں کہ شافی مطلق انہیں شفا یاب فرمائیں۔ سدرہ ہالونا، خون دل میں قلم ڈبو کر لکھا گیا الم نامہ پڑھا، شہر کراچی جسے کبھی غریب اور حردور کی ماں کہا جاتا تھا، جو ابی مفلوک الحال اور تنگ دست وہاں جاتا، اس کے حالات بدل جاتے تھے۔ اس شہر مہربان کو دادی مرگ بنا دیا گیا ہے۔ سہیل احمد عباسی صاحب، شرمین عید کو آسکر سے نوازا جانا خالی از شر نہیں، دال میں کچھ کالا ضرور ہے، کچھ زیادہ خور کریں تو ساری وال ہی کانی نظر آئے گی۔ آسکر کے فیصلوں میں یقینی طور پر تعصب کا فرما ہوتا ہے۔ مارچ 2010ء کے فیصلوں پر ہی خور کریں تو سیاسی دخل اندازی اپنے کردہ چہرے کے ساتھ نظر آ جائے گی۔" ایوانار "بنانے پر لگ بھگ 250 ملین ڈالر رقم خرچ ہوئی تھی اور یہ قلم اتنی پسند کی گئی تھی کہ 106 ٹکٹوں کے 15 ہزار ٹکٹا گھروں میں اس کی نمائش کی گئی، مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کئی مہینوں تک تو سینما گھر کچھ بھیج ہی بھرے رہے اور اس قلم کی ابتدائی آمدنی ہی 200 کروڑ ڈالر تھی۔ ہرٹ لاکر کی تکمیل 11 ملین ڈالر میں ہوئی صرف 535 سینما گھروں میں نمائش ہوئی اور چند دنوں میں اُتر گئی۔ ہرٹ

لاکڑی ساری کی ساری آمدنی پونے دو کروڑ ڈالر تھی یعنی ایوانار کی ابتدائی آمدنی سے بھی 248 کروڑ 25 لاکھ ڈالر زکم۔ 95 فی صد قلمی ناقدین کا فیصلہ یہ تھا کہ ہرٹ لاکر کے مقابلے میں ایوانار کئی درجے معیاری اور بڑی قلم ہے لیکن غیر قلمی طور پر آسکر ایوانار ہرٹ لاکر کو دیا گیا اور یہ فیصلہ سیاسی وجوہات کی بنا پر ہی کیا گیا تھا کیونکہ قلم ہرٹ لاکر عراق میں امریکی جارحیت کے لیے جواز فراہم کرتی ہے جبکہ ایوانار کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہونے کے باوجود اس لیے محروم کر دیا گیا کہ یہ نوآبادیاتی نظام اور عالمی استحصال کے مخالف سوچ پیدا کرتی ہے جو کہ امریکا مخالف سوچ ہے، سعید احمد چاند، طاہرہ گلزار، افتخار احمد کھنن اور سہیل احمد عباسی خط پسند کرنے پر آپ سب کا شکریہ۔ رانا محمد سجاد، آپ جیسے اچھے لوگوں کی محفل میں جگہ ملنا ہی کم اعزاز نہیں، ہم ایسا اچھا سہرا کر ہی نہیں پائے کہ اول درجے پر جگہ حاصل کر سکیں جب باوجود بہترین تبصرے کے یہ مقام نہ دیا گیا تو پھر رند صاحب کی طرح شکوہ شکایت کریں گے کہ ایک قاری کی حیثیت سے یہ حق بھی کو حاصل ہے۔ راگ کی آگ کی فرضی کہانی تاریخی سفید جھوٹ ہے۔ سانٹو لوجی مختصر مگر معلوماتی مضمون تھا۔ ذین مہدی کا مضمون کچھ تفصیل طلب تھا۔ ابن کبیر، سلیم فاروقی، ڈاکٹر بھی اور تنویر ریاض بھی بہترین نگارشات لے کر آئے۔ مسودہ دیکھ کر پوشیمیں انسان دوستی کی مفصل داستان حیات شائع ہونی چاہیے۔ باری ڈول کے خاتمے پر خوشی ہوئی۔ زلفی شاہ کی غیر حاضری شدت سے محسوس ہوئی۔

مختصر مل خان، ناؤن شپ لاہور سے لکھتے ہیں "مئی کا شمار 28 اپریل کو ملا۔ شہر خیال میں اپنے خیالات کے ساتھ حاضر ہوں۔ پیش کو کے عنوان سے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا تحریر کردہ حضرت دانیال علیہ السلام کا تذکرہ نظر سے گزرا۔ خوب اور بہت خوب تحریر ہے۔ استنبول کا عاشق نوبل انعام یافتہ مسلمان مصنف کے حالات پر مبنی تحریر ہے جو کہ یورپ میں بھی مقبول ہیں۔ کسی نبوی کی پیش گوئی کہ یہ لکھا جا چکا ہے اور پوری دنیا میں اس کے نام کا ڈکھا ہے گا۔ کسی روشن خیال اور جدید معاشرے میں عجیب سی بات لگتی ہے۔ جنون آزادی میں رابرٹ کا ایک کیونسٹ اور جبر پر مبنی معاشرت اور نظام سے فرار انسان کی فطری طور پر آزاد زندگی گزارنے کی خواہش اور جدوجہد کا اظہار ہے۔ مگر کیا یہ سرمایہ دارانہ نظام جس میں مساوات اور برابری کی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل نہیں ہے، یہ بھی بہر حال کوئی مثالی طرز زندگی نہیں ہے۔ قلمی الف لیلے ہماری قلمی دنیا کے انداز و اطوار پر مبنی دلچسپ تحریر ہے۔ خطرناک ہم میں حب الوطنی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی جان سے گزر جانے کا جذبہ کارفرما ہے۔ راگ کی آگ فن موسیقی کے معجزوں پر مبنی کہانی ہے۔ وچک راگ ملہاراگوں پر نیکو ہو جانے سے مافوق الادراک واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ موسیقی سے گلاس توڑ دینے کا واقعہ بھی کہیں پڑھا تھا۔ منتشر انجانی کے دور میں شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ کیونکہ خیالات کی یکسوئی اور ارتکاز توجہ سے بہت سے محیر العقول واقعات پیش آسکتے ہیں۔ مقدس کی بات کے عنوان سے جاوید اختر کا تذکرہ خوب ہے۔ منیر نیازی، قیل شغائی جیسے قلمی شاعروں کے حالات بھی خاصی دلچسپی کے حامل ہوں گے۔ (دونوں کے حالات زندگی شائع ہو چکی ہے) سانٹو لوجی ایک خفیہ مذہب کی کہانی دلچسپ ہے۔ نظام فطرت پر یقین رکھنے والا بہت سے نیچری مذہب کے بید و کار موجود ہیں۔ لیکن نیچر کے بارے میں ہر ایک مذہب کی توجیہات الگ الگ ہیں۔ روحانی شعور، مادی جسمانی، ذہنی اور جذباتی شعور سے کہیں زیادہ لطیف اور موثر ہے۔ مادی شہید مرتے نہیں اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ استنبول کے سمندر کے قریب حضرت ابوالیوب انصاری اور حذیفہ صحابی کی خواب میں آنے اور ان کے جسد خاکی کی منتقلی کا واقعہ عاباً 1930ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ جسے لاکھوں لوگوں نے دیکھا کہ ان کے جسد مبارک صبح و سالم موجود تھے۔ شہد اور صادقین کی تو بات ہی کچھ اور ہے ورنہ فرعون بادشاہ کی لاش کا محفوظ رہنا بھی کچھ صدیوں کی کہانی ہے۔ سچ بیانیوں میں دھول بھرا ستارہ، گہرا کنواں اور انتقام توجہ طلب اور بہترین تحریریں ہیں۔"

دلدار احمد چٹھہ کا اختصار بھر اخط، حیدرآباد سے "محترم، میں نے کچھ گیت لکھ رکھے ہیں، اس بارے میں محترم علی سفیان آفاقی صاحب سے مدد لینا چاہتا ہوں۔ براؤ کریم میرے یہ گیت ان تک پہنچا دیں۔ جو ابی لغافہ میرا ہے۔ براؤ کریم میری طرف سے ان سے خیال رکھنے کا کہیں اور رائے چاہے کچھ بھی ہو، جواب سے ضرور نوازیں۔" (علی سفیان آفاقی بستر علالت پر ہیں، بڑی مشکلوں سے الف لیے لکھ رہے ہیں۔ آپ کے گیت خوبصورت ہیں، مگر میں بھی ہیں)

لکھنا احمد خان توحیدی کراچی سے رقم طراز ہیں "معراج رسول صاحب موصوفیہ کا کلام بنا کر رکھنے کے لیے لوڈ شیڈنگ قحری ہیں سوٹ والوں کی سازش ہے۔ وطن میں جا بجا ڈیم قحریل پاور ٹربائن بن سکتے ہیں (مگر نہیں بنے) قدرت کا حسین شاہکار و قدرتی وسائل سے مالا مال۔ بلوچستان دشمنی علاقہ جات ہر طرف لہو بکھرا رہا ہے۔ سودیشی لکھاری، شوکت قناری، شکر تھانوی عرف تغیر احمد عرف محمد عمر سے ہم لاعلم تھے۔ راجا ثاقب، ساہیوال کرسی صدارت مبارک ہو، تبصرہ گڈ۔ ایم اے خالق بھی صاحب نے کھانے پینے، موج اُڑانے کا فرمایا ہے۔ آج 2 مئی تک ہمیں مارچ کی تنخواہ بھی نہیں ملی۔ موج کیسے اُڑائیں۔ سدرہ ناگوری، آپ کی فکر درست خدا جانے کس وقت کیا ہو جائے۔ ڈسک کے عظیم نتیجے نے دنیا میں ریاضی میں ٹاپ کیا۔ ذرا غم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ مجاہد مصطفیٰ، منکر لاہور، رانا حبیب گوچرہ، سعید احمد چاند کراچی اچھے تبصرے۔ ماہا ایمان، غار بٹ ڈوک، قمری کھوڈا، ابن مقبول پنڈی غائب ہیں۔ افتخار احمد کھنن آملہ کا شکر ہے۔ ظہیر مجسم، کراچی، اول دو سال کے سرگزشت ہوں تو پتا دیں میں دی پی منگوالوں کا (پڑانے شماروں کے لیے معذرت پھر بھی آپ سرکولیشن سیکشن والوں سے بات کریں، وہ انتظام کر سکتے

ہیں) ایم اے خالق بھی رجم یار خان، معراج رسول صاحب جیسے سر پھرے باظہیر سدا ہے خمیر و شنان ملک، ملت کے تعاقب میں رہے ہیں انا شاہ، شادی مبارک۔ حادثے کا افسوس ہے۔

ایمان خالہ یوسفی، لید سے رقم طراز ہیں "گزشتہ پرچے میں بھی شفق، دھنک، روپ سروپ، مہتاب تارے، گمنائیں، لیلے، طہر، اندام، مگھماں، گلاب کے پھول، جلتنگ، مٹھاس سمیت سب کچھ تھا لیکن ہم جس پر فریفتہ و شیفتہ ہیں وہ نام نظر نہ آیا تو دل کو طول ہوا اور اک بے نام سی اداسی نے گھر کر لیا۔ جی ہاں، وہ سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری جن کا خاصہ ہے ہم سب کے پیارے آفاقی جی کو پا کر یقین مایہ سوکھے و حانوں پانی پڑ گیا۔ پہلی فرصت میں قلمی الف لیلے پڑھی اور جب صفحات ختم ہوئے تو احساس اک فحش کا تھا، ارے صاحب لاہور کا ذکر شروع ہوتے ہی قلم ختم ہوئی۔ ابھی تو حروہ آنے لگا تھا خیر میری طرف سے انہیں نیک دعائیں اور صحت و سلامتی سے ہر ماہ نمودار ہونے کی دعا بھی مانگتا ہوں۔ ادارے میں معراج رسول صاحب نے جو لکھا اس کے بارے میں یہی کہیں گے کہ نوبت وہ آج بھی کہ جو کچھ خدا دکھائے سونا چاند دیکھنا۔ ہم ایسے بے عمل اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ قارئین کی محفل کا رنگ خوب زوروں پر تھا کبھی کو میری طرف سے چاہت بھرا سلام، مضامین سارے نوبت تھے۔"

معراج الدین نے مرجان سے لکھا ہے "ادارے میں سر معراج رسول صاحب کی ملکی حالات پر ایک پُر آشوب تحریر پڑی۔ لودشیڈنگ کے مسئلے کا ملکی صنعت و صرمت کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کے مستقبل یعنی طلباء پر بھی انتہائی بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ پڑھائی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ شہر خیال کے راجہ حانی میں راجا ثاقب صاحب تخت صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ ان کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ اعجاز حسین شکار اکل حسب معمول مفصل اور خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ سعید احمد چاند خط پسند کرنے پر شکریہ۔ عجیب بات ہے کراچی میں رہتے ہوئے بھی آپ کو شمار لیٹ ملتا ہے۔ ملک ثاقب صاحب ہم ڈھائی میل کی مسافت چار پانچ بار طے کرتے ہیں۔ اب موازنہ کیجیے۔ رانا محمد شاہد صاحب کے بارات کے حادثے کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ شکر خدا ہے کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ زخموں کو اللہ صحت دے۔ طاہرہ باجی! ہماری رہائش پشاور میں ہے۔ حصول علم کی خاطر مروان میں مقیم ہوں۔ آپ کا خوبصورت تبصرہ اس بار بھی حریہ دار تھا۔

ناصر حسین رند نے بہاولپور سے لکھا ہے "اس دفعہ حضرت دانیال علیہ السلام کا قصہ پیش گو پڑھ کر عجیب سا حیرت طاری ہو گیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے اس دفعہ تو کمال کر دیا۔ پُر اسراریت نمبر سے جوانہوں نے تحریریں شروع کی تھیں۔ پہلے ابن مقفع پھر وہ کون، سائرس اعظم اور اب پیش گو لکھ کر۔۔۔ اپنی پُر اسرار تحریروں کی بیشک کر ڈالی۔ ویسے پیش گو ایک ایسا موضوع تھا جس پر ایک خاص نمبر نکل سکتا تھا۔ انبیائے کرام میں سے پیش گوئی میں حضرت دانیال علیہ السلام کو جس طرح ملکہ حاصل تھا اس طرح صحابہ کرام میں سے حضرت حذیفہ کو بھی قیامت تک ہونے والی پیش گوئیاں اور اسرار پر مہارت حاصل تھی۔ ایسے نیک لوگوں میں شاہ نعمت اللہ دلی، ناسر ڈیس جس کی زیست کے بارے میں تو پُر اسراریت نمبر شائع ہوا تھا لیکن پیش گوئیاں آپ کے وعدے کے باوجود شائع نہیں ہو سکیں۔ مدرشتن یوسفی ماں کی پیش گوئیاں اور اس طرح اہرام مصر کی دیواروں پر بنی تصویری پیش گوئیاں۔۔۔ اس طرح کا ایک خاص نمبر شائع ہو جاتا تو یہ آپ کا ہم پر احسان ہوتا۔ خاص نمبر کا دوسرا ایسی ہستیاں ایک شمارے میں دستیاب ہو جاتی۔ بہر حال حضرت دانیال علیہ السلام 606 ق م میں ایک پیش گوئی کی تھی جو کچھ ہوں ہے کہ آخری زمانے میں یروشلم بیت المقدس پر بنی اسرائیل 45 سال تک اپنا قبضہ پرترا رہے گا۔ 45 سال مکمل ہو لے پھر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت بنی اسرائیل کی جزا کاٹ دے گی۔ یہودیوں اور اسرائیل کی ریاست کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حضرت دانیال علیہ السلام کی اس پیش گوئی کا تجزیہ کیا جائے تو 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے اردن پر حملہ کر کے شری بیت المقدس سمیت مہر اقصیٰ پر قبضہ کر لیا تھا۔ جس کے 45 سال 2012ء میں مکمل ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی اسرائیل ایمان اور پاکستان کے انجی پروگرام کو اپنی لے لے کر لے رہا ہے اور 2012ء کو ایران پر حملے کے امکان واضح ہیں اور پاکستان کے لیے بھی انتہائی اہمیت کا سال ہے۔ جیسے 1947ء کا سال تھا۔ اس دفعہ پھر 27 رمضان المبارک 14 اگست 2012ء ویسے اکتھے آرہے ہیں جیسے 1947ء کو یہ دن ملے تھے اور جسے قربانی ان دنوں دینی پڑی تھی ایسے ہی اب حالات اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ پہلے 1947ء کو ہم برطانیہ سے آزاد ہوئے تھے اب کے انشا اللہ امریکا سے آزاد ہوں گے۔ شہید مرتے نہیں۔ شہیدوں کے بارے میں ایک ایمان افروز واقعہ تھا۔ آج سے کافی سالوں پہلے اس طرح کا ایک واقعہ حضرت خلیفۃ المسیح اور حضرت جابر صمد کے خواب میں آئے اور ان کو اس جگہ سے منتقل کیا گیا تھا جس کا بی بی پر براہ راست اور اس موقع پر لاکھوں لوگوں نے ان صحابہ کرام کی زیارت کی تھی۔ اس واقعہ کو پڑھ کر ہمیں وہ واقعہ یاد آ گیا۔ (سبحان اللہ) شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

لمحوش رفیق نے لاغشی، کراچی سے لکھا ہے "معراج اکل کے نوپک بہت دلچسپ ہوتے ہیں ہمیشہ دل کو ان کی بات لگتی ہے۔ لوڈنگ نے تو جینا حرام کیا ہوا ہے۔ نہ دن کو سکون ہے نہ رات کو۔ بے چارے لوگ سڑکوں پر آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر کیا فائدہ؟ پورے ملک میں دھشت گردی ہو رہی ہے نیوز دیکھنے کا دل بھی چاہتا ہے تو ہٹ جاتی ہوں ٹی وی کے آگے سے کہ کوئی اچھی خبر شاید ہمارے نصیب میں نہیں ہے۔ ہر جگہ دھشت گردی اور عوام کو چھسا جا رہا ہے بس عوام کو مضبوط کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والوں اور ان کو اپنا کردار نبھانا ہو گا کیا وہ

اپنا کردار نبھانے کے اکل؟ اپریل کا مہینا ہمارے لیے کافی سوگوار تھا۔ ہم نے کتنے اپنوں کو کھویا ہے۔ سیاحین میں برقانی پہاڑی تو دے سکتے دے ہوئے سرزمین کے بیٹے ان کا دکھ ہی اتنا بڑا تھا کہ دوسرا دھچکا لگا بھوجا لائن کر لیں کا آ۔ 127 افراد کوئی بھی نہیں بچا پھر دودن بعد لاہور انٹیشن میں بم دھماکا کیا دکھانا چاہ رہے ہیں ہم دوسری قوموں کو کتنا عظیم نے پاکستان کے لیے محبت، امن کا پیغام نہیں دیا بلکہ دہشت گردی کا دیا تھا۔ اب لیاری آپریشن چل رہا تھا وہ بھی بنا مقصد ختم ہو گیا۔ کیا بنے گا پاکستان کا.....؟ اب آتے ہیں شہر خیال کے ہاسیوں کی طرف سب سے پہلے تو تمام شہر خیال کو سلام اور یاد کرنے کے لیے شکر ہے۔ راجا ثقب لواز ثقب کو کرسی صدارت پر براجمان دیکھا ویسے ہمارے نصیب میں یہ کرسی کب آئے گی، پتا نہیں (آپ کوشش کریں) سدرہ بانو ناگوری صاحبہ دل چھوٹا کر لیں۔ ایک ایسا وقت آئے گا جب سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں گی۔ لگتا ہے اعجاز حسین سینا اور رانا محمد سجاد سے لگاؤ ہے کہ کافی لمبا خط شائع کیا ہے۔ رانا محمد سجاد صاحب آپ کی گزارش ٹوٹ کر لی ہے۔ جی زندگی نے وفا کی تو باقاعدگی کے ساتھ شہر خیال میں حاضری دیں گے۔ رانا حبیب الرحمن تبصرے کو جاندار ماننے کے لیے شکر ہے۔ سہیل احمد عباسی صاحب سرائیکی کی تعریف کرنے کا شکر یہ مابدولت بھی سرائیکی ہیں۔ جناب ایم اے خالق یعنی صاحب پسندیدگی کے لیے شکر ہے۔ ہمیشہ کی طرح ظہیر احمد تبسم، سعید احمد چاند، ملک ثقب شاد بخوی، مونا گل، مجاہد مصطفیٰ، رانا محمد شاہد، محمد ایاز راہی، طاہرہ گلزار، سہیل احمد عباسی، افتخار احمد کھن، معراج الدین، ملک جاوید محمد خان سرکانی، منظر علی خان سب کے تبصرے بہت ہی پسند آئے۔

حلا طاہر الدین بیگ کا میر پور خاص سے تہنیت نامہ "شہر خیال میں دختر پاکستان کا خط پڑھا۔ یہ خط بڑا ہی دکھوں سے لبریز تھا۔ یہ ایک دختر پاکستان کا المیہ نہیں بلکہ یہ ان سب بہن بھائیوں کی آواز ہے جو بڑی ہی تکلیف میں ہیں۔ میری بہن سدرہ بانو ناگوری اب تمہاری آوازیں کر کوئی محمد بن قاسم نہیں آئے گا کیونکہ یہاں کوئی مجاز بن یوسف نہیں بلکہ بھاری مینڈیٹ لیے ہوئے منتخب لوگ ہیں جن کا کام صرف اور صرف بیان بازی کرنا ہے مگر گھبراؤ مت رات چاہے کتنی ہی تاریک ہی کیوں نہ ہو سویرا اتنا ہی روشن اور چمکدار ہوتا ہے۔ خدا کی لاشی بے آواز ہے اور اللہ کے گھر دیو ہے اندھیر نہیں۔ مظلوم کی آواز سے تو عرش بھی کانپ اٹھتا ہے اور جب اللہ کی لاشی چلے گی تو پھر ظالم کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سدرہ بانو ناگوری کو حوصلہ اور ہمت عطا کرے اور ملک خدا داد پاکستان پر اپنے نور کی برسات کرے (آمین) پچھلے دنوں سے ملک پاکستان میں جو حالات ہو رہے ہیں۔ لیاری میں آگ اور خون کا دریا بہہ رہا ہے۔ مارنے والا بھی مسلمان اور مرنے والا بھی مسلمان پھر بہن سدرہ کا دکھ بھر اٹھا..... نہ کچھ پڑھنے کو دل چاہا اور نہ ہی کچھ لکھنے کو۔ اللہ ملک پاکستان کی حفاظت کرے، آمین۔" (بے شک اللہ ہی ہم سب کا حامی و ناصر ہے۔ مطالعہ ہمیشہ جاری رکھیں کیونکہ علم کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ ایک حالیہ ریسرچ کے مطابق دوسروں کی دکھ بھری کہانیاں پڑھنے والوں کے اور ہنسنے والے افراد اپنے غم کو بھول کر اللہ کا زیادہ شکر ادا کرتے ہیں اور دوسروں کے لیے دعا۔ اللہ ہم سب کی دعاؤں سے مملکت پاکستان کو استحکام اور امن عطا فرمائے (آمین) اور ساتھ ہی سدرہ بانو کا خط آپ کو ہمت اور عزم بھی یقیناً دلانے گا)

سدرہ بانو ناگوری کا مکتوب کراچی سے "سرگزشت کا شمار اس دفعہ بھی 26 تاریخ تک مل گیا۔ حینہ کے عقب سے نظر آنے والا منظر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا واقعی جب حاکم شہر قلم کے بجائے بدوق سے اہل شہر کی تقدیر لکھنے پر بندھ تو اس کی فائدہ لبو لہان کیوں نہ ہو۔ اتنا معنی خیز مرد و قمر سرگزشت ہی کو زیب دیتا ہے، ویلڈن۔ اگلے کا ادارہ ایک نئی دعوت نگر میں جلا کر گیا اگلے جی آپ نے جو کلمات بتائے ہیں ان سے بڑی ڈھارس ملی ہے شکر یہ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ ایک بار پھر کراچی کے لیے دعاؤں کی طالب کہ مرض بڑھتا ہی جا رہا ہے جوں جوں دو اور ہی ہے۔ سراب اس دفعہ ملی جلی رہی وہی ست روی سے آگے بڑھتی ہوئی اور ہر سو پر شہباز ملک کو نئے خواب دکھاتی ہوئی کہ جن کی تعبیر ہنوز سراب ہے۔ قلمی الف لیلے نہیں پڑھی مگر اس کے ذریعے اگلے آفاقی کی خیریت معلوم ہوئی دل کو بڑی خوشی ہوئی۔ خیال ہے کہ ذریعے فرار بھی دل کی دھڑکنوں کو تیز کرنے میں کامیاب رہی کیل، انصار حسین کی ہر سطر نے سکرائے پر مجبور کر دیا۔ بے گناہ، گناہ گار شہزاد حسین زاہد پڑھ کر چند برسوں پہلے پڑھی ہوئی ایک بات یاد آگئی کہ غلطی کی معافی ممکن ہے لیکن گناہ کی معافی کسی صورت بھی ممکن نہیں واقعی اللہ کی لاشی بے آواز ہے۔ شہید مرتے نہیں، زین مہدی نے جو سچا واقعہ بیان کیا ہے اسے پڑھ کر بے اختیار ہی دل سبحان اللہ کہہ اٹھا اگر تاریخ اسلام سے سچے واقعات سرگزشت کا حصہ بنتے رہے تو قارئین کو بہت سی معلومات سے آگاہی حاصل ہوگی۔"

محمد اشفاق سرائے عالمگیر، کجرات سے رقم طراز ہیں "سرگزشت کی تعریف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ واحد رسالہ ہے جو میں پورا پڑھتا ہوں۔ بہر حال خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اپریل میں ارنسٹ ہیمنگ وے اور اس ماہ یعنی مئی میں فرید احمد خان پاک کی داستان شائع کی گئی۔ کہنا یہ ہے کہ کیا ان دونوں کے ناول اردو زبان میں شائع ہو گئے ہیں۔ پلیز جس مصنف کی بھی داستان شائع کریں اس کے بارے میں یہ ضرور تحریر کریں کہ آیا اس کے ناول اردو زبان میں شائع ہوئے ہیں اور اگر ہوئے ہیں تو کہاں سے مل سکتے ہیں بلکہ اگر آپ مہربانی کر کے ان لوگوں کے ناول اردو میں ترجمہ کروا کر جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر شائع کر دیں تو کیا ہی بات ہوگی (کوشش کریں گے کہ آپ کی خواہش پوری کر سکیں) میرا خیال ہے میں پہلے بھی آپ کو لکھ چکا ہوں یہ بات دسمبر 2010ء کے سرگزشت میں کلید صدیقی نے کوئن آف سسٹینس نامی تحریر

لکھی تھی جو ایک امریکی خاتون ناول نگار کے بارے میں تھی۔ اگر اس کے ناول ترجمہ کر کے جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر دیے جائیں تو ناول پڑھنے والوں پر آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ایک ضروری بات نمبر آپ ضرور نکالیں بلکہ میں شاید پہلے ہی بار جب بھی خط لکھتا تھا تو یہ ضرور لکھتا تھا کہ ہر سال جنوری میں تینوں پڑچوں کے خاص نمبر دیے جائیں۔ خاص شمارہ اگر 350 صفحات کا ہو تو پتا چلے کہ واقعی خاص شمارہ ہے۔ عشق نام کام نمبر امید ہے 350 صفحات سے زیادہ کا ہوگا۔ کاشف ذہیر صاحب کی سراب بہت اچھی جا رہی ہے۔ کتابی شکل میں کب تک آجائے گی؟"

رانا محمد سجاد نے پورے والا سے لکھا ہے "اپریل کا مہینا اپنے ساتھ بہت سے واقعات، ہنگامے اور انکشافات لیے رخصت ہو چکا ہے۔ اسی ماہ کے دوسرے ہفتے میں گیارہویں سیکٹر برقانی تو دہ کرنے سے پاک فوج کے 139 جوان دب گئے۔ تادم خیر ان کو نکالنے کی کوششیں جاری ہیں۔ خدا کرے کوئی معجزہ ہو جائے امید کی لود ہم نہیں ہوتی چاہے۔ ابھی کیا پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ بھوجا لائن کے حادثے نے قوم کو اور دھکی کر دیا۔ طیارے حادثے پر وہی وعدے۔ میان بازی، الزام تراشی۔ گزشتہ دو تین ماہ سے ملنے والے مقدمہ کا اعلیٰ عدلیہ نے فیصلہ سنایا اور اس پر رجیم نے تو عسکروں کی رہی اسکی اخلاقیات کو بے قیاس کر دیا۔ انہی حالات میں ماہنامہ سرگزشت موصول ہوا محترم معراج رسول کے خیالات واقعی پریشان کر دیتے والے تھے۔ پاکستان مخالف سیاستدانوں اور کونسل کے حوالے سے پریشان کن حالات لیکن عسکروں کو تو اپنی ایک حلقہ سے کامیابی ملانے سے فرصت نہیں وہ کیوں بھلا اس پر غور کریں کہ بے جا ذہن کشی کا شعر بھی بہت پر عمل تھا۔ سوڈنی ریل اسٹیشن سے بے شک ان کو اس صفے کے لیے محروم رکھا گیا حیرت ہے۔ شہر خیال میں راجا ثقب لواز سے ملے مختصر تبصرہ، جناب ہمارے لیے صدر کا نام تجویز نہ کریں۔ سدرہ بانو ناگوری کراچی کے واقعات پر اپنے درد کا اظہار کر رہی تھیں۔ کراچی کے حالات تو واقعی انتہائی کشیدہ ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو جلد از اس مشکل وقت سے نکالے (آمین) پوری قوم کی دعا ہے آپ کے ہمراہ ہیں۔ طاہرہ گلزار، ایاز راہی خطوط میں بھی کھار نظر آتے ہیں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ جو نو جوان ملک چھوڑ کے جا رہے ہیں ان کا بھی قصور نہیں حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں۔ سہیل احمد عباسی خط پسند کرنے کا شکر یہ۔ افتخار احمد کھن آپ کا تبصرہ انتہائی مختصر۔ معراج الدین ملک جاوید سرکانی کے تبصرے بھی پسند آئے۔ مسعود کھدر پوش کا ذکر کیا تو ان کے حوالے سے ایک بات یاد آ رہی ہے کہ سندھ طاس معاہدے پر انہوں نے اپنے تحفظات کا ذکر کیا تھا تو ایوب خان نے ان کو دھمکی دی کہ وہ اسے گولی مار دیں گے۔ دیکھیے ان کی بات آج سچ ثابت ہو رہی ہے۔ منظر علی خان کا تبصرہ سناڑ کن تھا۔ رانا حبیب الرحمن تو سال کی عمر میں تو اردو پڑھنی نہیں آتی اور آپ ڈائجسٹ پڑھتے تھے وہ بھی سرگزشت، بہت خوب لیکن سرگزشت میں اتنی دیر سے حاضری اس کی شکایت ہے؟ حضرت دانیال کے متعلق ڈاکٹر ساجد امجد کا مضمون کوئی خاص نہیں لگا البتہ یہ بات پہلی بار پتا چلی کہ بخت نصیر ایک توحید پرست تھا اور دوسری بات یہ کہ امت محمدیہ کے حوالے سے سبحان اللہ کیا شان ہے اس امت کی تو اس امت کے والی کی کیا شان ہوگی۔ استیصال کا عاشق ابن کبیر کی اچھی تحریر تھی۔ جنون آزادی جیسی تحریریں سرگزشت میں شروع سے پڑھتے آ رہے ہیں بہر حال اچھی کاوش تھی۔ باری ڈل کا دوسرا حصہ کافی بہتر رہا لاسٹ سرفلم ایک بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا کوئی خاص نہیں لگی۔ کین وینسٹ کو کب سرگزشت کے صفحات پر پیش کر رہے ہیں؟ خطرناک ہم میں ایک شخص کی قربانی نے باری ہوئی بازی جتوا دی۔ راگ کی آگ ایک اور خوب صورت تحریر تھی۔ قلمی الف لیلے میں آفاقی صاحب بھر تشریف لائے۔ خدا کرے اب یہ سلسلہ قائم رہے تا دیر۔ ہمارا سلام پہنچا دیجیے گا۔ آفاقی صاحب تک جاوید اختر صاحب کی زندگی کے واقعات مختصر تحریر تھی۔ شہید مرتے نہیں عنوان بے حد پسند آیا۔ سائنٹو نوٹی محمد امجد کی ایک مظلومی تحریر تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باطل مذاہب سے محفوظ رکھے، آمین۔ سراب کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کتابی شکل میں کب تک آئے گا؟ طلی آڈائٹس میں نام شامل نہیں تھا حالانکہ جواب بھی ارسال کیا تھا۔ وصولی بھراستانا، بے گناہ گناہ گار، گہراکتواں، ٹوٹے رشتے پسند آئی۔ خصوصاً گہراکتواں ایک اور بات سرگزشت اب کی بار کوئی خاص رنگ نہیں جیسا کہ خصوصی نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔"

احمد حیدر ریاست بھٹی، راول پنڈی سے رقم طراز ہیں "جناب ایک کہانی ماہنامہ سرگزشت کی انفرادیت کے پیش نظر ارسال کر رہا ہوں چونکہ اس کا تعلق میرے ساتھ پیش آمدہ واقعہ سے ہے اور پھر اسرا ریت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے شاید دلچسپی کا سبب بن جائے اور کوئی اس سے سبق حاصل کرے نام اس کا میں نے میڈیا راجد تجویز کیا ہے میں اس کے ساتھ کچھ دستاویزات منسلک کر رہا ہوں تاکہ آپ کے مطلوبہ معیار پر ہر اتر سکے اگر ہو سکے تو اسے شائع کر دیجیے گا۔ بس گزشتہ 21 سال سے سرگزشت کا قاری ہوں اور یہ اس ماہنامے کی دلچسپی ہے کہ ہمیں اسے طویل عرصے سے پابند مطالعہ کیا ہوا ہے۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو حیدر پراسرار واقعات کو بھی سپرد قلم کرنے کی جسارت کروں گا۔" (آپ کی تحریر پڑھنے کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ سرگزشت کے حراج کی ہے یا نہیں اس شمارے سے قارئین کو کئی دیکھنا ہوگا)

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط
الحاج کرم الہی اموان، لاہور۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ نسیم محمد اود پٹنڈی۔ نازش علی، لید۔ اکبر علی قریشی، حیدر آباد۔ مانی ملتان، ملتان۔ زاہد علی، ملتان۔



اس کے دل میں فقط ایک ہی جذبہ بھیہے سمندر کی طرح ٹھائی مار رہا تھا۔ دل و دماغ میں فقط ایک ہی لک تھی کہ پوری دنیا پر اسلام کا پرچم لہرائے۔ اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے اس نے اپنی ساری خوشیاں تہ دیں۔ آرام کو خود پر حرام کر لیا اور کبھی مشرق میں تو کبھی مغرب میں وہ دشمنان اسلام کو ان کی اوقات بتانے لگا۔ اس کے نام سے اسلام دشمن طاقتیں لرزہ بر اندام تھیں۔ اس کے خلاف پورا یورپ متحد تھا مگر اسے کسی کا خوف نہ تھا۔ وہ راہ حق میں موت کو گلے لگانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔ شاید اسی لیے اپنی کی سازشیں بھی اسے خوفزدہ نہ کر سکیں۔ اس نے ہر سازش کا مقابلہ کیا، بیخ کنی کی کوشش کی اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک پرچم تلے متحد کرنے کی سعی کی۔

نور الدین زنگی کے بارے میں ایک یادداشت

روشن کر دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک ابھی تک اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ تہجد کی نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

نماز ادا کرنے کے بعد اس نے چراغ گل کیا اور اندھیرے میں راستہ بناتا ہوا اپنے کمرے تک آ گیا۔ اندازے سے اپنا بستر تلاش کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ سلطان نور الدین زنگی سلطان دمشق تھا لیکن درویش صفت انسان تھا۔ خلوت و جلوت ہر جگہ اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اس نے ساری عمر سونا، ریشم اور ہیرے جواہرات استعمال نہیں کیے۔ اپنی رہائش کے لیے چند کمرے منتخب کر رکھے تھے جو ہر قسم کی آرائش اور تکلفات سے عاری تھے۔ نہ ان میں قیمتی قالین تھے اور نہ سونے چاندی کے ظروف۔ اپنے اہل و عیال کے لیے وہ صرف اتنا لیتا تھا جس قدر اسے علماء نے از روئے شریعت اجازت دی تھی۔ اس کے دسترخوان پر اکثر جو کی روٹیاں یا کبھی کبھی گیسوں کی خمیری روٹیاں اور گوشت ہوتا تھا۔ نماز ادا کرنے کے لیے ہمیشہ مسجد میں جاتا تھا اور ہر شخص سے بے تکلف ملتا تھا۔

چوگان البتہ کھیلتا تھا اور اس کا جواب وہ یہ پیش کرتا تھا کہ ہم دشمنان خدا کے قریب رہتے ہیں۔ معلوم نہیں کب

سلطان نور الدین زنگی عالم خواب میں بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پٹنی پٹنی آنکھوں سے کمرے میں پھیلی تاریکی میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اسے وہ خواب یاد آنے لگا جسے دیکھنے کے بعد وہ چونک کر اٹھا تھا۔ خواب اسے یاد آ گیا۔

اس کے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تھے۔ آپ سنہری بالوں والے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے تھے، نور الدین! مجھے ان دونوں سے بچا۔

سلطان اس چراغ کی طرف گیا جس میں وہ اپنے پیسوں سے تیل ڈالتا تھا۔ بیت المال کے پیسوں سے صرف اس کمرے میں چراغ جلتا تھا جہاں بیٹھ کر وہ سرکاری کام کرتا تھا۔ چراغ میں تیل بہت تھوڑا رہ گیا تھا اس لیے کمرے میں بہت کم روشنی ہوئی تھی۔ اس نے اس روشنی میں دیکھا کہ اس کی زوجہ اپنے بستر پر بے خبر سو رہی ہے۔ اسے خیال آیا کہ روشنی سے کہیں اس کی نیند خراب نہ ہو۔ اس نے چراغ پر آستین رکھ دی۔ روشنی چراغ میں دم توڑ گئی۔ وہ اندھیرے میں ٹوٹا ہوا باہر نکلا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ نماز ادا کرتا تھا۔ یہاں بھی ایک چراغ رکھا ہوا تھا۔ اس نے چراغ

مداخلت یا دھاوا بولنے کی ضرورت پیش آ جائے۔ جب ہم یہ کھیلتے ہیں تو ہمارے گھوڑے دشمن کے اچانک حملے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اگر ہم ان کو تھانوں پر باندھ دیں گے تو وہ سست ہو جائیں گے۔ چونکہ بازی سے ہمارا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے تاکہ ہم خود اور ہمارے جانور دشمنان خدا کے مقابلے کے لیے ہر وقت مستعد رہیں۔

اسے صلیبی جنگوں کا سامنا تھا لہذا اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنالیا تھا کہ صلیبی جنونیوں کی گردن ہمیشہ کے لیے توڑ کر رکھ دے یا ان کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو جائے۔ اس کے عظیم کردار نے عام مسلمانوں میں بھی جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی تھی۔ اس نے اس مہیب خطرے کو بھانپ لیا تھا جو صلیبی جنگجوؤں کی صورت میں دنیائے اسلام کو زیر و برباد کرنے کے لیے نہایت سرعت سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

ایسے بے مثل انسان کے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آنا تعجب انگیز نہیں تھا۔ تعجب تو اس پر تھا کہ وہ دونوں اشخاص کون تھے، جن کی طرف حضور نے اشارہ فرمایا تھا اور آپ یہ کیوں فرما رہے تھے کہ مجھے ان دونوں سے بچاؤ۔

سلطان نور الدین زنگی اس خواب کے مضمون پر دن بھر غور کرتا رہا تھا۔ دوسری رات آئی اور نیند نے اس کی آنکھیں بند کر دیں تو اس نے یہ خواب پھر دیکھا۔

اسے یہ خواب دیکھتے ہوئے مسلسل تین راتیں ہو گئی تھیں۔ سنہری بالوں والے دو افراد سامنے کھڑے تھے اور حضور فرما رہے تھے مجھے ان دونوں سے بچاؤ۔ سلطان نے اپنے وزیر جمال الدین موسیٰ کو بلایا جو بڑا متقی اور دانش مند تھا اور اس کے سامنے یہ خواب بیان کیا۔

”سلطان مکرم! خواب کی تعبیر تو واضح ہے۔ آپ حضور کو اس دنیا سے پردہ فرما چکے۔ آپ کا روضہ اطہر ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ کوئی گستاخ اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہے یا آپ کا جسد مبارک ہے جسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ وہاں جائیں اور تحقیق کریں۔“

سلطان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ ”میرے آقا نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میرے آقا نے مجھے طلب کیا ہے۔ میں ضرور جاؤں گا۔“

سلطان اور وزیر جمال الدین ایک بڑے قافلے کے ساتھ مدینہ منورہ جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

دو ایسے آدمی جو مراکشی مجلس میں تھے، مدینہ منورہ میں

داخل ہوئے اور ایک سرائے میں جا کر ٹھہرے۔ سرائے کے مالک سے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ وہ اندلس کے رہنے والے ہیں۔ وہ روزانہ سرائے سے نکلنے اور مختلف محلوں کو دیکھ بھال کر لوٹ آتے۔ جو مسجد نظر آتی اور نماز کا وقت ہوتا تو مسجد میں جا کر نماز پڑھتے تاکہ لوگ انہیں متقی بھی سمجھیں اور ان سے واقف بھی ہو جائیں حالانکہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ عیسائی تھے اور انہیں عیسائیوں نے ایک خاص منصوبے کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا۔

آخر چند روز کی چھان بین کے بعد انہوں نے روضہ اطہر کے پاس ایک مکان کرائے پر لیا اور اس میں رہنے لگے۔ خود کو متقی ظاہر کرنے کے لیے باقاعدگی سے مسجد نبوی میں نمازیں ادا کرنے لگے تھے۔ غریبوں اور مسکینوں کے لیے اپنا دسترخوان وسیع کر دیا۔ ان کی سخاوت کی ایسی شہرت ہوئی کہ دور دور سے حاجت مند آنے لگے۔ جو آتا، یہ دونوں خاموشی سے اس کی ضرورت پوری کر دیتے۔ لوگ انہیں اتنا نیک اور بارسا سمجھنے لگے تھے کہ کسی کو ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے گھر کے ایک کمرے سے ایک سرنگ نکھودنا شروع کر دی جسے زمین کے اندر اندر روضہ اطہر تک پہنچانا تھا۔ سرنگ سے جو مٹی نکلتی تھی وہ اس کو اپنے مکان کے کونوں میں ڈالتے رہتے۔ کبھی اس مٹی کو چڑے کی مشکوں میں بھر کر لے جاتے اور جنت البقیع میں ڈال آتے تھے۔

☆☆☆

ہزار آدمیوں پر مشتمل سلطان زنگی کا قافلہ 12 دن کا سفر طے کر کے مدینہ منورہ پہنچا۔ سلطان مسجد نبوی میں حاضر ہوا اور دو گنا دانہ کر کے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے؟ وزیر نے اس کی محویت میں دخل دیا ”سلطان مکرم! یہاں تک تو آگئے۔ آپ کے خیال میں اب کیا کرنا چاہیے۔“

”میں میں سوچ رہا ہوں۔ کام کہاں سے شروع کیا جائے۔ ان دو آدمیوں کی شناخت کیسے ہو جن کو میں نے خواب میں دیکھا ہے۔“

”اگر وہ دونوں آدمی سامنے آگئے تو کیا آپ انہیں پہچان سکیں گے؟“

”میں نے تین مستقل راتوں ان کے چہرے دیکھے ہیں۔ انہیں میں ایک نظر میں پہچان سکتا ہوں۔ ان کے سنہری بال بھی ایک بڑی پہچان ہیں۔“

”آپ کے حکم سے میں مدینہ منورہ کے تمام باشندوں کو بلاتا ہوں۔ وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے سے گزریں گے۔ یہ بھی مشہور کر دیتا ہوں کہ سلطان کی جانب سے خیرات بھی تقسیم کی جائے گی۔ جو خیرات لینا نہ چاہے نہ لے لیکن آئے ضرور۔“

یہ عمل کئی دن جاری رہا۔ ایک عمر رسا نے بیٹھ گیا تھا جو ہر آنے والے کا نام لکھتا جا رہا تھا۔ جو لوگ آئے ان میں کوئی بھی وہ نہیں تھا جسے سلطان نے خواب میں دیکھا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ سلطان نے کہا ”خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ جاؤ معلوم کرو۔ سب آگئے یا کوئی رہ بھی گیا ہے؟“

تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر میں دو لوگ ایسے ہیں جو نہیں آئے اور اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔ انہیں سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی دونوں تھے جنہیں بادشاہ نے خواب میں دیکھا تھا۔

”تم دونوں کیوں نہیں آئے تھے؟“ سلطان نے پوچھا۔

”ہمیں خیرات کی ضرورت نہیں تھی۔“

”یہ بھی تو کہا گیا تھا کہ خیرات لو پاؤ، آنا ضروری ہے۔“

”ہم آئے تھے مگر بھڑ دیکھ کر واپس چلے گئے تھے۔“

”تم یہاں کے باشندے تو نہیں ہو؟“

”ہم مراکش کے رہنے والے ہیں۔“

”مدینہ منورہ میں کیوں آئے تھے؟“

”حج و زیارت کے لیے آئے تھے۔“

سلطان نے ان دونوں کو اپنے آدمیوں کے حوالے کیا اور خود اپنے وزیر کو ساتھ لے کر ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ سلطان نے انہیں پہچان تو لیا تھا لیکن مجرم ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت تھی۔

گھر کی تلاشی کے دوران بھی کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ دینار و درہم کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک کونے میں مٹی کا ڈھیر ضرور پڑا تھا۔ کچھ ایسے اوزار تھے جن سے زمین کھودی جاتی ہے۔ چڑے کے مشینزے تھے۔ یہ بھی کوئی ثبوت نہیں تھے۔ ناگاہ سلطان کا پاؤں لکڑی کے ایک تختے پر پڑا۔ اس تختے کو ہٹایا تو اس تختے کے نیچے ایک ایسی سرنگ کا راستہ آجا جو عمرہ مطہرہ تک جاتا تھا۔ اب پوری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ ان بد بختوں کا مقصد یہ تھا کہ اس سرنگ کے ذریعے یہ دونوں مزار اقدس تک جائیں اور آقا کے نامدار کا جسد مبارک وہاں سے نکال لیں۔

خواب کی تعبیر سامنے تھی۔

یہ ایسا ثبوت تھا جس سے وہ انکار نہیں کر سکتے تھے لیکن

ماہنامہ جاسوسی



جون 2012 کے
ماہنامہ جاسوسی

بے شمار زندگی کی دل فریبیاں سچائی میں مضمر ہیں...
جھوٹ مگر فریب سے اسے بے ثبات بنائیں
ٹالے بچہ گولوں کی عکاس صحنہ الدین نواب کی تحریر

مغرب کے نرالی انداز

مغربی ماحول در آمد حرا اور محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں

گرداب

مسلسل ایک نئی منزل کی جانب رواں
دواں اسما قادری کی سلسلے دار کہانی

لنگار

نئے امتحانات سے ۱۱ چار تالیف اور ممران کے
کارنامے طاہر جاوید مغل کا سلسلہ

سرورق کی کھاساں

ایک نوجوان کو پیش آنے والے بے درے سنسنی خیز
واقعات سلیم فاروقی کے جادو قلم سے

داخل شناس

دوستی سے دشمنی کے سفر پر گامزن اجل شناسوں کا
عبرت انگیز احوال خاکسار عبدالرب بھٹن کا انداز

آپ کے قلم سے...
مشوبہ محبتیں... شکایتیں...
اور کئی نئی دلچسپ باتیں... کہتا ہیں



پھر بھی انکار کرتے رہے۔
”ہم نے تو یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ ہمیں کیا خبر تھی اس میں ایسی سرنگ کھدی ہوئی ہے۔“

وہ انکار کرتے رہے لیکن جب ان پر کوڑے برسائے گئے تو انہوں نے اقبال جرم کر لیا۔ انہوں نے اقرار کیا کہ وہ مراکشی بھیس میں عیسائی ہیں جنہیں ان کے بادشاہ نے کثیر رقم دے کر یہاں بھیجا ہے تاکہ وہ جسد اطہر کو نکال کر اپنے ساتھ لے جائیں۔

دونوں کا جرم ثابت ہو جانے پر سلطان نے انہیں سزائے موت کا حکم دیا اور ان کی نعشوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد سلطان نور الدین نے حجرہ مطہرہ کے چاروں طرف ایک خندق کھدوائی اور اس خندق کے اندر سیسہ پھینکوا کر بھردوا دیا تاکہ آئندہ کوئی شخص دیواریں توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کر سکے۔

☆☆☆

نور الدین زنگی کے والد والی موصل عماد الدین زنگی تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی متعصب عیسائیوں کے خلاف جنگوں میں گزاری۔

صلیبیوں کی چیرہ دستیوں حد سے تجاوز کر چکی تھیں اور مسلمانوں کو ایک ایسے مرد مجاہد کی ضرورت تھی جو اتحاد و قیادت کے عناصر فراہم کر کے عالم اسلام کا موثر طور پر دفاع کر سکے۔ مسلمانوں کو ایسا مرد مجاہد عماد الدین زنگی کی صورت میں مل گیا۔ عماد الدین نے سب سے پہلے تو موصل کے نظم و نسق کو درست کیا۔ اس کے بعد مسلمان امیروں کی نا اتفاقیوں کو اتفاق میں بدل دیا جن کی نا اتفاقی کا فائدہ اٹھا کر صلیبیوں نے طوقان بدتمیزی بچا رکھا تھا اور تمام عیسائی فرقے متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

عماد الدین نے تمام مسلمانوں کو متحد کیا اور اپنے لشکر کو منظم کر کے موصل سے نکلا اور پھر جہاں پہنچا اپنے اقتدار کا جھنڈا گاڑتا چلا گیا۔ عیسائی دنیا اس کے نام سے کانپتی تھی۔

نور الدین زنگی اسی عماد الدین زنگی کے گھر 13 شوال 511ھ موصل میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش نے آگے چل کر چراغ سے چراغ جلنے کی مثال کو زندہ کیا۔ وہ اپنے باپ کا حقیقی وارث بنا۔

اس کے والد کی خواہش تھی کہ نور الدین علوم دینی سے بہ خوبی واقف ہو اور اس کا شمار عالم اسلام کے بہترین علما میں ہو۔ عجیب بات تھی کہ ایک ایسا شخص جسے ہتھیاروں سے پیار تھا، اپنے بیٹے کو کتابوں کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے

لے اس نے نور الدین کو مدرسے میں داخل کرادیا جہاں اسے بہترین اساتذہ میسر آئے۔

نور الدین نے بھی حق شاگردی ادا کر دیا۔ شانہ روز کی محنت سے اس نے مدارس کا مروجہ نصاب مکمل کر لیا اور تمام علوم اسلامیہ مثلاً قرآن و تفسیر، علم حدیث کے علاوہ اصول فقہ اور صرف و نحو، ادب و تاریخ و مناظرہ میں مکمل طور پر یدِ طولی حاصل کیا۔ اس کی ایسی بے مثال ترقی نے اس کے اساتذہ کو بھی درطہ حیرت میں ڈال دیا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ مدرسے کی دیواروں تک محدود رہتا۔ مجاہدانہ خون کی طرف بھی راغب ہوا۔ قلیل عرصے میں وہ ایک عمدہ قسم کا شمشیرزن، نیزہ باز اور تیر انداز بن گیا۔ گھڑ سواری میں تو کوئی اس کا ثانی ہی نہیں تھا۔

اب وہ سپاہیانہ اقدار میں ایسا کامل ہو گیا تھا کہ باپ کے ساتھ عیسائیوں سے ہونے والے معرکوں میں شریک ہونے لگا۔

ان معرکوں میں اس کی شرکت ہوئی تو اس کی بہادری نے عیسائی مراکز میں کھلبلی مچادی۔ دنیا دیکھ رہی تھی کہ چراغ سے چراغ جل چکا ہے جو پہلے چراغ سے بھی زیادہ روشن ہے۔

نور الدین کے باپ عماد الدین نے جب عیسائیوں کے مرکز و محور ایڈیسہ کو فتح کر کے صلیبی قسراتدار کے اہم ستون کو منہدم کر دیا تو مسلمانوں کی فتح صاف نظر آنے لگی۔

عماد الدین فتح و ظفر کا پرچم لہراتا ہوا دریائے فرات کے مشرقی علاقے کی طرف بڑھا اور کئی قلعے فتح کر ڈالے۔ وہ قلعہ جبریا جبر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ نور الدین زنگی بھی اس کے ہمراہ تھا کہ رات کے وقت عماد الدین کے ایک غلام نے اسے سوتے میں شہید کر ڈالا۔

اس لشکر میں ایک کردی امیر اسد الدین شیر کوہ بھی تھا جو نور الدین زنگی سے مخلصانہ شفقت رکھتا تھا۔ اس نے یہ خبر سنی تو دوڑتا ہوا نور الدین کے خیمے میں آیا۔

”آپ کو اپنے جاں نثاروں کے ساتھ فوراً حلب چلے جانا چاہیے۔ مرکز حکومت موصل و وزیراعظم جمال الدین کے زہراثر ہے اور چونکہ وزیراعظم سیف الدین غازی (نور الدین زنگی کا بڑا بھائی) کا ساتھی اور ہم نوا ہے اس لیے آپ کا وہاں جانا ضرور رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ حلب جا کر اپنا اقتدار قائم کریں۔“

نور الدین زنگی کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔ اس نے یہ مشورہ قبول کیا اور حلب چلا گیا۔ اس شہر میں اس کا خاص خزانہ تھا۔

استقبال ہوا۔ کسی طرف سے مخالفت کی کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ نور الدین زنگی نے شہر کا انتظام سنبھال لیا۔

اس طرح عماد الدین کی حکومت دونوں بھائیوں میں تقسیم ہو گئی۔ حلب اور اس کے نواحی علاقے نور الدین زنگی کے حصے میں آئے اور موصل پر سیف الدین کا قبضہ ہو گیا۔

دونوں بھائی محض غلط فہمی کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے لیکن دونوں کو احساس تھا کہ آپس کے اختلاف سے صلیبی حکمران فائدہ اٹھائیں گے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف جو ”جہاد مقدس“ (عیسائی صلیبی جنگوں کو اسی نام سے پکارتے تھے) شروع کر رکھا ہے اس میں انہیں کامیابی مل جائے گی۔

سیف الدین نے چھوٹے بھائی کو منانے کے لیے کئی خط لکھے لیکن نور الدین موصل آتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ سیف الدین کو شک ہوا کہ نور الدین کہیں بغاوت پر آمادہ نہ ہو گیا ہو۔ اس نے نور الدین کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اپنی فوج کے ہمراہ حلب کی طرف روانہ ہوا اور شہر کے مضافات میں پہنچ کر نور الدین کو اپنے پاس بلایا۔

نور الدین اب بھی خائف تھا۔ اس نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اکیلا سیف الدین کے پاس جائے یا سیف الدین اپنی فوج کے ہمراہ اس سے ملاقات کرے۔ دونوں بھائیوں میں طے ہوا کہ وہ دونوں پانچ پانچ سو سواروں کی معیت میں ملاقات کریں گے۔

نور الدین جب اپنے بھائی کے قریب پہنچا تو بڑے بھائی کو دیکھ کر شہید باپ کی یاد آگئی۔ وہ گھوڑے سے اتر گیا اور آگے بڑھ کر بھائی کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ کچھ دیر آنسو ہاتھیں کرتے رہے پھر رندمی ہوئی آواز میں سیف الدین نے پوچھا۔

”بے وقوف، تو میرے پاس آنے سے کیوں گریزاں تھا؟“

”میں ڈرتا تھا بھائی۔“

”کس بات سے ڈرتا تھا۔ کیا ہماری تربیت ایسی ہوئی ہے کہ میں تیرے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں گا۔ ارے میں تو بے اپنا بازو سمجھتا ہوں۔“

”برادر من! بے شک یہ میری غلطی تھی۔“

”وعدہ کر کہ ہم دونوں مل کر دشمنان اسلام سے جنگ کریں گے۔ عیسائیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ عماد الدین شہید ہے۔ لیکن جہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اس کے لیے دونوں بیٹے

”بھائی، اب میرے لیے کیا سلم ہے؟“

”اب تمہارا حلب پر حکومت کرنا ہی مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔ مجھے خود سے دور مت سمجھنا۔ اگر عیسائیوں کی شرانگیزی تمہیں پریشان کرے تو بلا تامل مجھے آواز دینا۔“

دونوں اس خوشگوار ملاقات کے بعد اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ نور الدین زنگی اس ملاقات کے بعد حلب پہنچا۔ نئے عزائم اس کے ساتھ تھے نیا جوش اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے تمام امرا اور عوام کو جمع کیا اور ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

”دوستو! گواہ رہنا، میں نے حکومت کی ذمہ داریاں اس لیے قبول نہیں کی ہیں کہ قیصر و کسریٰ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے عیش و عشرت کی زندگی بسر کروں بلکہ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ اپنی تمام صلاحیتوں کو ان فرنگی طالع آزمائوں کے خلاف بروئے کار لاؤں جو گزشتہ پچاس برسوں سے مسلمانوں کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔“

مجھ کو بھی بادشاہ یا سلطان مت سمجھنا بلکہ قوم و ملک کا ایک خادم تصور کرنا۔ اگر میں کبھی کوئی غلطی کروں تو مجھے متنبہ کر دینا یا میری حمایت سے دست کش ہو جانا۔“

عوام اور امرا نے اس کی تائید کی اور نور الدین حکومت کے کاموں میں منہمک ہو گیا۔

☆☆☆

نور الدین کے والد عماد الدین شہید نے جب ایڈیسہ کو فتح کیا تھا تو وہاں کا حکمران جو طین ثانی فرار ہو کر دریائے فرات کے ایک مغربی شہر میں روپوش ہو گیا تھا۔ اب عماد الدین اس دنیا میں نہیں رہا تو اس کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے ایڈیسہ کے عیسائی باشندوں سے ساز باز کر کے ایڈیسہ پر شب خون مارا اور مسلمان محافظوں کو روندنا ہوا شہر کے اندر داخل ہو گیا لیکن اچھا یہ ہوا کہ قلعے کے مسلمان بروقت خبردار ہو گئے۔ انہوں نے دروازے بند کر لیے اور جو طین ثانی کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور نور الدین کو مدد کے لیے پکارا۔

نور الدین زنگی کو جو خبر ملی وہ دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر ایڈیسہ کی طرف بڑھا اور شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

عیسائی دونوں طرف سے مسلمانوں کی زد میں آ گئے۔ قلعے کے اندر سے محصور مسلمان تیروں کی بارش کر رہے تھے۔ باہر سے نور الدین کی فوج شمشیر زنی کر رہی تھی۔ نہ بائیں نہ

دائیں نہ جانے مانع و لا معاملہ تھا۔ ایک ایک کر کے جو طین

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

**or
send message at
0336-5557121**

خالی گھروں میں صرف وہی لوگ رہ گئے جو اپنا جتے یا بہت بوڑھے تھے یا پھر عورتیں رہ گئی تھیں۔ باقی سب لوگ صلیب برداروں میں شامل ہو گئے۔ بعد میں صلیب بردار عورتوں کی فوج بھی تیار ہو گئی۔

سینٹ برنارڈ فرانس سے فارغ ہو کر جرمنی گیا اور بادشاہ کو جنگ مقدس (صلیبی جنگ) میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ اس کی تقریروں نے یہاں بھی اثر دکھایا۔ شاہ جرمنی نے بھی جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا۔ جرمنی اور فرانس کے کونے کونے سے صلیبی جنونیوں کا سیلاب اٹھ آیا۔

”شاہ فرانس اور شاہ جرمنی نے اپنی سلطنتوں کے انتظام کے لیے نائب مقرر کیے اور خود جرار فوجیں لے کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے۔

شاہ فرانس لوئی ہفتم کے ہمراہ عورتوں کی فوج کے علاوہ ایک لاکھ جنگجو تھے۔ شاہ جرمنی کے ساتھ اس قدر فوج تھی کہ شمار مشکل تھا۔

مورخین کا اندازہ ہے کہ دونوں بادشاہوں کے جھنڈے تلے نو لاکھ جنگجو تھے۔

انسانی سروں کے اس سمندر نے پہلا پڑاؤ قسطنطنیہ میں کیا اور پھر ایشیائے کوچک میں داخل ہو گیا۔ اس کی قیادت جرمنی اور فرانس کے بادشاہان کر رہے تھے۔

ایشیائے کوچک میں سلطان مسعود سلجوق (اول) کی حکومت تھی۔ اس نے مقابلے کی تیاری کی اور اپنی فوجوں کو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پھیلا دیا۔ عیسائی لشکر جیسے ہی زد میں آیا، سلجوقی ان پر ٹوٹ پڑے۔ پہاڑوں میں گھرے ہوئے عیسائی ہاتھ پاؤں چلائے بغیر کلتے رہے۔ پہاڑوں سے نکلے تو ان کے لشکر کے نو حصے مکمل طور پر تباہ ہو چکے تھے صرف ایک حصہ یہ مشکل تمام بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا۔ شہنشاہ جرمنی، بچی بچی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچا جہاں شاہ فرانس دوسرے راستے سے پہنچ چکا تھا۔

شاہ فرانس اس حملے سے محفوظ رہا تھا۔ دونوں بادشاہ بقیہ میں ملے تو گلے لگ کر رو دیے اور عہد کیا کہ دونوں اکٹھے قسطنطنین جائیں گے لیکن شہنشاہ جرمنی، اپنی فوج کے نو حصے تباہ کر چکا تھا۔ اس میں اب مزید حوصلہ نہیں تھا۔ وہ موسم سرما گزارنے کے بہانے قسطنطنیہ چلا گیا۔

شاہ فرانس اکیلا ہی بقیہ سے نکلا اور لاؤڈیسیا کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے اپنی فوج کے دو حصے کر دیے تھے۔ ایک آگے روانہ ہوا، دوسرا اس کے پیچھے۔

کے تمام سردار مارے گئے البتہ جو سلین فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ نورالدین کا لشکر شہر کے اندر داخل ہوا۔ ان عیسائیوں کے گھروں کو جی کھول کر لوٹا جنہوں نے جو سلین سے ساز باز کی تھی۔

نورالدین نے ایڈریسہ میں چند دن قیام کیا۔ شہر اور قلعے کی حفاظت کے از سر نو انتظامات کیے اور باپ کی اس نشانی کو دوبارہ قبضے میں لے کر حلب کی طرف لوٹ آیا۔ جو سلین کی اس شکست نے پورے یورپ کو یاد دلایا کہ عمادالدین ابھی مرا نہیں۔ اس کی شکل میں اس کا بیٹا نورالدین موجود ہے۔

ایڈریسہ کے پادریوں کا ایک گروہ رات کی تاریکی میں نکلا اور اپنی فریاد لے کر پوپ یوکیس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی داستان سن کر پوپ نے اعلان کیا ”ارض مشرق کے عیسائیوں کی مدد کرنا خداوند یسوع مسیح کے تمام نام لیواؤں کا فرض اولین ہے۔ اگر وہ اس وقت نہ اٹھے تو یروشلم کو اپنے ہاتھوں سے گنوا دیں گے۔ اٹھو اور مسلمانوں کے عزائم خاک میں ملا دو۔“

پوپ کا یہ بیان گویا دوسری صلیبی جنگ کا آغاز تھا۔ پوپ کی آواز ابھی گونج رہی تھی کہ یورپ میں سینٹ برنارڈ نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنا شروع کیا۔ اس کی دھواں دھار تقریروں نے وہی کیفیت پیدا کر دی جو پہلی صلیبی جنگ میں ہوئی تھی۔ ہر طرف مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔

دنیا بھر اسلام میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس قدر عظیم کا مقابلہ کرتا۔

جگہ جگہ عیسائیوں کے اجتماع ہونے لگے۔ ایسا ہی ایک اجتماع ویزی (فرانس) کے مقام پر ہوا۔ اس اجتماع کی رونق اور اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی جب عوام کے بے پناہ جہوم میں طبقہ امرا کے لوگ بھی شامل ہو گئے بادشاہ فرانس لوئی ہفتم بہ نفس نفیس اس اجتماع میں شرکت کے لیے آیا تھا۔

سینٹ برنارڈ کی ولولہ انگیز تقریر نے جوش و غضب کی ایسی آندھی چلائی کہ شاہ فرانس نے آگے بڑھ کر بیٹ کے ہاتھوں سے صلیب لی اور اعلان کیا۔ ”میں اس جنگ مقدس میں ضرور حصہ لوں گا۔“

اس اعلان نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ہر طرف سے صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ”صلیب کی سر بلندی کے لیے ہم اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔“

اس اجتماع کے ختم ہوتے ہی شہر اور گاؤں خالی ہو گئے۔

سلجوقی اب بھی پیچھا کر رہے تھے۔ انہوں نے گھات لگا کر ایسا حملہ کیا کہ آگے روانہ ہونے والی فوج کو گاجرمولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا لیکن لوئی شاہ فرانس پہاڑی راستوں سے گزرتا ہوا اطالیہ کی بندرگاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں سے وہ سمندر کے راستے انطاکیہ پہنچا جہاں ریمینڈ حکمران تھا جو ملکہ فرانس کا چچا تھا۔ ریمینڈ نے بادشاہ فرانس اور اس کے لشکر کی جواب ایک چوتھائی رہ گیا تھا، شاہانہ خاطر مدارات کی لیکن جلد ہی ریمینڈ اور لوئی ہفتم میں بد مزگی ہو گئی۔ لوئی ہفتم نے رخت سرفراہ اور یرود شلم پہنچ گیا۔

یہاں کے عیسائیوں نے اس کے پہنچنے پر خوب خوشی منائی۔ مسرت کا ایک موقع اس وقت میسر آ گیا، شہنشاہ جرمنی بھی یرود شلم پہنچ گیا۔

یرود شلم کا بادشاہ بلڈون ثالث تھا۔ اسے اپنا مفاد نظر آیا کہ جب دو بادشاہ مل گئے ہیں تو ان کی فتوحات کے نتیجے میں یرود شلم کی سلطنت میں بھی وسعت ہوگی۔ ملک گیری کی اس ہوس نے اسے بھی اس جنگ میں شامل ہونے پر اکسایا۔ وہ بھی ان بادشاہوں کے ساتھ مل گیا۔ تینوں بادشاہوں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں ملے پایا کہ مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کے لیے سب سے پہلے دمشق پر حملہ کیا جائے۔

تینوں بادشاہوں کا متحدہ لشکر ملے شدہ منصوبے پر تیزی سے دمشق کی طرف بڑھا۔ شہر کے تین طرف مٹی کی مضبوط فصیل بنی ہوئی تھی اور ایک طرف گنجان بانگوں کی اس قدر کثرت تھی کہ کوئی بڑا لشکر ان میں سے یہ آسانی نہ گزر سکتا تھا۔ صلیبیوں نے اسی طرف سے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں کا حاکم امیر مجیر الدین ایک نہایت نااہل تھا۔ اس کا وزیر معین الدین سیاہ سپید کا مالک بنا ہوا تھا۔ معین الدین کئی ماہ تک صلیبی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا رہا۔ جب کامیابی کی کوئی صورت نہیں نکلی تو اس نے مدد کے لیے سلطان نور الدین زنگی کو آواز دی۔ نور الدین نے اپنے بھائی سیف الدین کو خط لکھ دیا اور خود ایک بڑی جمیعت کے ساتھ دمشق کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اسے سیف الدین بھی مل گیا۔

عیسائیوں پر ان دونوں لشکروں کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ جنگ کی نوبت آنے سے پہلے ہی راتوں رات محاصرہ اٹھا کر یرود شلم کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس پسپائی نے سب کی ہمتیں توڑ دیں۔ شہنشاہ جرمنی واپس چلا گیا۔ شاہ فرانس بھی کچھ عرصہ فلسطین میں رہا اور پھر وہ بھی واپس چلا گیا۔

یہ صلیبی جنگ جس جوش و خروش سے شروع ہوئی تھی اتنی

ہی سرعت سے ختم ہو گئی۔ یورپ نے اس جنگ میں لاکھوں آدمی کٹوا ڈالے لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ صلیبی جنگ ختم ہو گئی لیکن عیسائیوں کا غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ صلیبی جنگ نے تعصب کی جو آندھی چلائی تھی اس کے اثرات جگہ جگہ ظاہر ہو رہے تھے۔ شامی مقبوضات میں عیسائیوں نے عام بغاوت کر دی۔ جگہ جگہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔

اس بغاوت نے اس خیال سے سر اٹھایا تھا کہ عماد الدین زنگی کے بعد اس کے بیٹے اپنی وسیع سلطنت کو کسی صورت میں نہیں سنبھال سکیں گے۔ نور الدین زنگی نے ان کے اس خیال کو جلد ہی زائل کر دیا۔ سلطان نے ان حالات کا نہایت حل سے جائزہ لیا اور پھر باغیوں کے مراکز پر ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ باغیوں کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ کچھ مارے گئے، کچھ بھاگ نکلے۔

بھاگے ہوئے باغی کچھ دن چپے رہے اور پھر وہ بصری کے مقام پر جمع ہوئے اور یہ ملے پایا کہ ارض شام کے تمام عیسائی متحد ہو کر حلب پر حملہ کر دیں۔ اس لڑائی میں اسے الجھایا جائے اور نصف عیسائی لشکر دوسرے اسلامی مقبوضات پر حملہ کر دے۔ نور الدین حلب چھوڑ کر نہیں جاسکے گا۔ اس طرح نور الدین کی قوت کئی حصوں میں بٹ جائے گی۔

سلطان نور الدین کے وقائع نگاروں نے وقت سے پہلے اس سازش کا پتا لگالیا۔ اس سے پہلے کہ عیسائی اس سازش پر عمل پیرا ہوتے، سلطان حلب سے ایک زبردست فوج کے ہمراہ نکلا اور شورش پسندوں کے سر پر جا پہنچا اور شرارت کا آغاز کرنے سے پہلے ہی چل دیا۔ وہ عیسائی جو شام کے کونے کونے سے یہاں جمع ہوئے تھے، مارے گئے اور باقی فرار ہو گئے۔

سلطان شام میں تھا کہ اسے اپنے بڑے بھائی سیف الدین والی موصل کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر آئی کہ اس کے چھوٹے بھائی قطب الدین نے موصل کی حکومت سنبھال لی ہے۔ نور الدین موصل پر اپنا حق تسلیم کرتا تھا۔ وہ موصل حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ قطب الدین کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنی فوج کو لے کر نکلا۔ دونوں کے درمیان جنگ چھڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وزیر جمال الدین کی فراست کام آئی اور دونوں بھائیوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ قطب الدین نے نور الدین کی اطاعت قبول کر لی۔ نور الدین نے اسے اپنی طرف سے موصل کا امیر مقرر کر دیا۔

روانہ والی انطاکیہ نے سلطان نور الدین کے مقبوضات کا مسد اندازی کرنے کا ارادہ کیا اور پانچ ہزار سواروں کے ہاتھ حلب کی طرف بڑھا۔

نور الدین تین ہزار کا لشکر لے کر نکلا اور ایک مقام پر ٹھہر گیا۔ ریمینڈ کی فوج پہلے ہی اس مقام پر پہنچ چکی تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو نور الدین اور اس کے سپہ سالار امیر الدین شیرکوہ نے اس جنگ میں کمال جواں مردی دکھائی۔ ایسا گھمسان کارن پڑا کہ ریمینڈ اس لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد عیسائیوں کے قدم کہاں رک سکتے تھے۔ وہ بے ترتیبی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ریمینڈ کے علاوہ کئی اور سردار بھی مارے گئے تھے۔ نور الدین کے لیے بہت آسان تھا کہ انطاکیہ پر قبضہ کر لیتا لیکن اس نے کسی مصلحت کے تحت قبضہ نہیں کیا اور لوٹ آیا۔ ریمینڈ نے اپنے پیچھے یوہیمینڈ نامی ایک کمسن بچہ چھوڑا تھا جو اس کے بعد تخت نشین ہوا۔

دمشق کے وزیر معین الدین کی وفات ہو گئی۔ دمشق کا نظم و انتظام امیر مجیر الدین نے خود سنبھال لیا۔ اس کی نااہلی سب پر واضح تھی۔ عیسائیوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے نواحی علاقوں کو تاراج کرنا شروع کر دیا۔ امیر نے کوئی کارروائی نہیں کی تو ان کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ دن دہاڑے مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لے جاتے اور انہیں غلام بنا کر فروخت کر ڈالتے۔ نور الدین زنگی کی حیثیت نے جوش مارا۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ عیسائیوں کی سرکوبی کرے گا۔ اس نے وال دمشق سے اس کام میں مدد دینے کے لیے ایک ہزار سوار طلب کیے۔ امیر غیرت و حمیت سے بالکل ہی عاری ہو چکا تھا۔ اس نے مدد دینے کے بجائے عیسائیوں سے ساز باز کر لی اور مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔ نور الدین نے اپنی فوج کو در حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کو حران کی طرف روانہ کیا جہاں عیسائی لوٹ مار میں مصروف تھے اور دوسرے حصے کو اپنے ساتھ لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوا اور دمشق کے قریب جا کر مقیم ہو گیا۔ والی دمشق کو اس کی آمد کی خبر ملی تو ایک گستاخانہ خط سلطان کے پاس بھیجا۔

”بہتر یہی ہے کہ تم واپس چلے جاؤ ورنہ ہماری تلواریں تمہیں واپس بھیجیں گی۔“

سلطان نے اس گستاخی کو نہایت تحمل سے برداشت کیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ خود یہاں آئے اور باہمی گفت و شنید و معاملات طے کر لے۔ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ یہاں عیسائیوں کی حج کئی کے لیے آیا ہے، دمشق پر قبضہ کرنا

اس کا مقصد نہیں۔ امیر دمشق پر اس کا بھی اثر نہیں ہوا بلکہ اسے اس نے سلطان کی کمزوری سمجھا اور بہ دستور اپنی ضد پر اڑا رہا کہ سلطان واپس چلا جائے۔

سلطان آپس کی لڑائیوں سے گریزاں رہتا تھا لیکن امیر کے رویے نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ نواح دمشق سے نکلا اور دمشق کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ امیر دمشق نے جب سلطان کے یہ تیور دیکھے تو اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ صلح کی درخواست لے کر حاضر ہو گیا۔ معاہدہ صلح تحریر ہوا جس کے مطابق امیر نے تسلیم کیا کہ جامع دمشق میں خلیفہ بغداد کے بعد خطبوں میں سلطان نور الدین کا نام پڑھا جائے گا۔ تمام فوجی سرداروں کا تقرر نور الدین کی منظوری سے ہوا کرے گا اور اسی کے نام کا سکہ جاری ہوگا۔ مالی معاملات امیر کے پاس رہیں گے۔

سلطان اس صلح کے بعد حلب واپس آ گیا۔ اس کی فوج کا دوسرا حصہ بھی عیسائی مفسدوں کی شرانگیزی کا خاتمہ کر کے واپس آ چکا تھا۔

نور الدین ایسی قسمت لے کر آیا تھا کہ اسے ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ دمشق سے فرصت ملی تو جو سلیم ثانی اس کے سامنے کھڑا تھا جو ایڈیہ کے معرکے میں نور الدین سے شکست کھا کر بھاگ گیا تھا اور حلب کے شمال میں کچھ علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ آئے دن اسلامی علاقوں پر چھاپے مارتا رہتا تھا۔ اس کے اکسانے پر دوسرے علاقوں کے عیسائی بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔

سلطان نور الدین یلغار کرتا ہوا اس کے علاقے میں جا گھسا۔ جو سلیم نے انطاکیہ اور شام کے عیسائیوں کو بھی اپنی مدد کے لیے بلالیا۔

دو ماہ تک مسلمانوں اور عیسائیوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔

اطراف و جوانب سے عیسائیوں کی تازہ دم فوجیں پہنچتی رہیں۔ کسی مسلمان کی غیرت نے جوش نہیں مارا جو سلطان کی مدد کو پہنچتا۔ عیسائیوں کی فوجیں اس بڑی تعداد میں جمع ہو گئیں کہ دوسری صلیبی جنگ کی یاد تازہ ہو گئی۔ نور الدین کی فوج تعداد میں بہت کم تھی اور اب تو عیسائیوں کے سامنے اس کی کوئی وقعت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ نور الدین کی فوج اس کا ساتھ چھوڑ گئی لیکن وہ خود فرار کا طوق اپنے گلے میں نہ ڈال سکا۔ چند ساتھیوں کو ساتھ لیا اور ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔

عیسائی یہ سمجھ کر بھاگتے ہوئے مسلمانوں کا تعاقب

کر رہے تھے کہ سلطان بھی ان کے ہمراہ ہوگا جبکہ سلطان ایک خاص ارادے سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک اونچے ٹیلے پر چھپا ہوا تھا۔

عیسائیوں نے کچھ دور تک مسلمانوں کا تعاقب کیا اور پھر پلٹ آئے۔ جب وہ واپس پلٹ رہے تھے اور اس ٹیلے کے نیچے سے گزر رہے تھے تو سلطان نے ان پر حملہ کر دیا لیکن عیسائیوں کی تعداد زیادہ تھی اور پھر وہ فتح کے نشے سے سرشار تھے، انہوں نے سلطان کے مٹی بھر سپاہیوں کو اپنے نیزوں پر رکھ لیا۔

سلطان کو اپنی اب تک کی زندگی میں پہلی شکست ہوئی۔ وہ بچ و تاب کھاتا ہوا حلب کی طرف واپس ہو گیا۔ سلطان کو شکست ہوئی تھی، اس کے حوصلے کو نہیں۔ وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں لگا رہا۔ یہ موقع اسے بہت جلد مل بھی گیا۔ یوں ہوا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے بعد جو سلیم ثانی کی توقعات حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ مسلمانوں کو شکست بھی دے سکتا ہے۔ ایڈیہ اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اس نے سوچا ابھی سلطان نورالدین اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا ہوگا۔ ایڈیہ میں اس کی معمولی سی فوج ہے جسے زیر کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ ایڈیہ پر قبضہ کر لیا جائے۔

سلطان نے اسے راستے ہی میں جا دیوچا۔ ایک جزار فوج کے ساتھ اس کے سامنے آ گیا۔ سلطان نے اس مرتبہ ایک جنگی چال چلی اور جو سلیم اس کے فریب میں آ گیا۔ سلطان نے خلاف معمول قلب لشکر کو اپنے سپہ سالار شیر کوہ کے سپرد کیا اور خود مینہ سنبھال لیا۔ جو سلیم نے اپنا سارا زور مسلمانوں کے قلب پر ڈال دیا۔ شیر کوہ نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ یہ عمل سلطان کی ہدایت کے مطابق تھا۔ سلطان نے اپنے مینہ کے ہمراہ دو کوس کا چکر کاٹا اور عیسائیوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ عیسائیوں نے اس کے مقابلے کے لیے جو بھی پیچھے کا رخ کیا، شیر کوہ نے ان پر حملہ کر دیا۔ اب عیسائی دونوں طرف سے گھر گئے تھے۔ اس افتاد نے ان کی قدم اکھاڑ دیے۔

جو سلیم نہایت بے بسی کے عالم میں گرفتار ہو گیا۔ امرا کا اصرار تھا کہ جو سلیم جیسے شیطان صفت کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ لیکن سلطان کی نرم گیری نے گوارا نہیں کیا کہ اس کے خون سے ہاتھ نہ لگے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اس دشمن اسلام کو کھلا چھوڑ دے۔ اس نے حکم دیا کہ جو سلیم کو حلب میں قید کر دیا جائے۔

جو سلیم حلب کے قید خانے میں نو برس تک زندہ رہا۔ اس دوران اس کی بصرات بھی جاتی رہی اور پھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اسی قید خانے میں مر گیا۔

جو سلیم کی گرفتاری کے بعد سلطان نورالدین نے ایڈیہ کے باقی علاقوں کی طرف فاتحانہ شان سے پیش قدمی شروع کر دی۔ عیسائیوں کی کئی جماعتیں ان علاقوں کے دفاع کے لیے پہنچیں لیکن نورالدین کی فتوحات کا سیلاب نہ ٹھم سکا۔ تھوڑے ہی عرصے میں جتنے علاقے عیسائی سرداروں کے قبضے میں تھے، وہ سب فتح کر لیے۔

عیسائیوں کا ایک مضبوط گڑھ ”جلدک“ تھا۔ اس قلعے میں ہزاروں عیسائی جنگجو جمع تھے۔ قلعے کی فصیلیں نہایت مضبوط تھیں لیکن نورالدین کے ارادوں سے زیادہ مضبوط نہیں تھیں۔ مسلسل سنگ باری سے قلعے کی فصیلوں میں شکاف پڑ گئے اور مسلمان نعرہ بکیر پڑھتے ہوئے قلعے میں داخل ہو گئے۔ عیسائی خفیہ راستوں سے بھاگ نکلے اور ایک دوسرے قلعے ”دلوکا“ میں جا کر پناہ لے لی۔ سلطان ان کا پیچھا کرتے ہوئے ”دلوکا“ پہنچ گیا اور یہاں بھی اپنا پرچم نصب کر دیا۔

دلوکا کی فتح کے بعد نورالدین عیسائیوں کے مضبوط ترین قلعہ قل باشر کی طرف متوجہ ہوا۔ قل باشر کے عیسائی مددوں سے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے، ان کا سر کھٹا لازمی تھا۔

ان لوگوں کو جو نبی سلطان کی آمد کا علم ہوا، انہوں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ دلوکا کی فتح کے بعد سلطان کا رعب ان پر ایسا طاری تھا کہ کسی میں لڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ سلطان کی اطاعت قبول کر لی جائے۔ سلطان بڑا ڈاڈالے ہوئے تھا کہ عیسائیوں کی سفارت اس کے پاس پہنچی تاکہ شرائط صلح طے کر لی جائیں۔

”آپ لوگوں کی کیا شرط ہے؟“ سلطان نے پوچھا۔ ”ہماری کوئی شرط نہیں۔ آپ جن شرائط پر چاہیں صلح کر لیں۔ ہمیں ہر شرط منظور ہوگی۔“

سلطان نورالدین نے ان کے ساتھ نہایت نرم دلی کا مظاہرہ کیا اور معمولی سے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر ان کو عام شہریوں جیسے حقوق شہریت مرحمت فرمائے۔

ایک طرف یہ عیسائی تھے جو نورالدین سے شرائط صلح طے کر رہے تھے، دوسری جانب دالی دمشق امیر بحیر الدین تھا جس نے بعض شرائط پر نورالدین سے صلح کر لی تھی لیکن وہ اب ان کی وجہیں بکھیر رہا تھا۔ چپکے چپکے عیسائیوں سے ساز باز کر رہا تھا۔ عیسائیوں نے بھی اس سے عہد کر لیا تھا کہ وہ نورالدین پر جب

ہی چڑھائی کرے گا، وہ اس کا ساتھ دیں گے۔

سلطان کے دقائق نگار امیر دمشق کی حرکات و سکنات سلطان کو مسلسل آگاہ کر رہے تھے لیکن سلطان ایک طمان کے خلاف لشکر کشی سے گریز کر رہا تھا لیکن جب پانی مر سے اٹھا ہونے لگا تو وہ لشکر جبار لے کر حلب سے نکلا اور اہمالات دمشق میں ٹھہر گیا۔ یہاں سے اس نے امیر دمشق کے نام پیغام بھیجا۔

”میں خدا کے فضل سے مسلمان ہوں اور ہزار ہا مسلمانوں کی جانوں کا امین ہوں۔ میں مسلمانوں کی کسی حکومت کا دشمن نہیں ہوں۔ میرا مقصد حیات صرف دشمنان اسلام کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ میں نے دمشق پر صرف اس لیے چڑھائی کی ہے کہ تم نے عیسائیوں سے ساز باز کر لی ہے، مسلمانوں کے دشمن ہیں، اس طرح تم بھی اس جہاد کے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہو جو میں نے شروع کیا ہوا ہے۔ تم اگر میرے ساتھ اس جہاد میں شامل ہو جاؤ تو میرا اور تمہارا کوئی جھگڑا نہیں رہ جاتا۔ میں ابھی محاصرہ اٹھا کر چلا جاؤں گا ورنہ تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو دشمنان اسلام کے ساتھ کرتا ہوں۔“

امیر دمشق پر اس پیغام کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ سلطان نے اس کی تیاریوں کو دیکھتے ہوئے دمشق کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔

امیر دمشق نے پونہی سرنہیں اٹھایا تھا۔ اس کی مدد کے لیے عیسائیوں کا ایک لشکر بڑھا چلا آ رہا تھا۔ سلطان کے امرا نے اس نازک موقع پر سلطان کو مشورہ دیا کہ پہلے عیسائیوں سے نمٹ لیا جائے۔ سلطان نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ اپنے سپہ سالار شیر کوہ کی سرکردگی میں روانہ کیا اور دوسرے حصے کو لے کر خود روانہ ہوا اور ”قدایا“ کے مقام پر ٹھہر گیا۔

امیر دمشق باہر نکلا اور عیسائیوں کے ساتھ مل گیا۔ سلطان نے ایسے نکلا اور دمشق پر زبردست دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

دمشقی فوج سے جھڑپیں شروع ہو گئیں لیکن سلطان مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا تھا اس لیے کسی بڑے حملے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ ہر شام دمشق فوج کو پیغام بھیج دیا کرتا تھا۔ میں مسلمانوں کے خلاف طاقت استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ تمہارے آدمی مریں یا ہمارے، خون تو مسلمانوں کا ہے گا۔ تم ہتھیار پھینک دو۔ چند جھڑپوں کے بعد دمشق فوج مصلحہ پار ہوئی۔

امیر دمشق ایک مرتبہ مصلح کی درخواست کر لے پر ہار ہو گیا۔ سلطان دوسرے پہلے بھی امیر کو آزما پا تھا لیکن عیسائیوں کو زیر کرنے میں امیر دمشق بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا اسی لیے سلطان اسے بار بار معاف کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس شرط پر صلح کر لی کہ عیسائیوں سے جہاد کے وقت دالی دمشق کو فوج اور سامان حرب سے اس کی مدد کرنی ہوگی۔ دمشق سے واپسی کے بعد بہت دن تک سلطان کو کسی جنگ کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔

وہ امن و امان کے ساتھ حلب میں دن گزار رہا تھا اور رعایا کی فلاح و بہبود کی تدبیروں میں مصروف تھا کہ ایک روز ایک نوجوان کو اس کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس نوجوان کا نام صلاح الدین یوسف تھا جو اپنے باپ نجم الدین ایوب سے رخصت ہو کر اپنے چچا شیر کوہ کے پاس حلب آیا تھا۔ یہی صلاح الدین تھا جو صلاح الدین ایوبی کے نام سے دنیائے اسلام میں حامل شہرت ہوا۔ قدرت خود انتظام کر رہی تھی کہ نورالدین کے بعد صلیبیوں سے نشٹنے کے لیے کوئی تو ہو۔ چراغ سے چراغ کی طرح توجیلے۔

سلطان کی نگاہ مردم شناس نے صلاح الدین کی غیر معمولی لیاقت اور فہم و فراست کا اندازہ کر لیا۔ اس کو نہ صرف اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا بلکہ مختلف شہروں میں کئی جاگیریں بھی عطا کیں۔

دالی دمشق نے ایک مرتبہ پھر بد عہدی پر کمر باندھی۔ وہ ایک طرف سلطان کو مطمئن کیے ہوئے تھا دوسری جانب عیسائیوں سے ساز باز کر رہا تھا۔ وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں رہا تھا کہ عیسائی اپنے مفاد کے لیے اس سے تعلق استوار کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد دمشق پر قبضہ کرنا تھا۔ ہالہ ان شاہ برہنہ کی نظر میں دمشق اور مصر پر ہل ہوئی تھیں۔ ان دو طاقتوں پر قبضہ ہو جانے کے بعد نورالدین کو گھیرے میں لے لینا بہت آسان تھا۔ نورالدین کو شکست دینے کے بعد پھر کوئی طاقت نہیں رہ جاتی تھی جو عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتی۔

سلطان نورالدین عیسائیوں کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ دمشق اور مصر پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جائے لیکن دالی دمشق کی منافقت سے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ دمشق کے اس منافقانہ رویے کی وجہ سے نہ تو وہ مصر کی طرف بڑھ سکتا تھا اور نہ برہنہ پر ضرب لگا سکتا تھا۔ اب اس نے اس منافق کی طاقت کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے اپنے سفارت

کار شیر کوہ کو ایک ہزار سواروں کے ہمراہ سفارت کار کے طور پر دمشق روانہ کیا۔ والی دمشق نے یہ موقع بھی ضائع کر دیا۔ اس نے نہ تو شیر کوہ سے ملاقات کی اور نہ اس کی فوج کے لیے رسد کا انتظام کیا۔ وہ دمشق کے قریب ہی خیمہ زن ہو گیا اور سلطان کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ امیر کا یہ رویہ سلطان کی سخت توہین تھی۔ اس نے جانباڑ لشکر ساتھ لیا اور منزلیں مارتا ہوا دمشق کے مشرقی دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اور امیر دمشق کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر حملہ آور ہو گیا۔ دوسری طرف سے شیر کوہ نے جبل جنگ بجا دیا۔ دمشق لشکر نے شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے اور فصیلوں پر سے تیر اور آگ کے گولے برسانے لگے۔ ایک دن اور ایک رات یہی کیفیت رہی لیکن دوسرے دن سلطان کی فوج فصیل کو ایک جگہ سے توڑ کر شہر کے اندر داخل ہو گئی۔ دمشق فوج پہلے ہی بدول ہو رہی تھی۔ دیوار ٹوٹنے ہی ان کے حوصلے بھی ٹوٹ گئے۔ انہوں نے ہتھیار رکھ دیے۔

سلطان نے اندر داخل ہوتے ہی اپنی فوج کو حکم دیا کہ کسی شہری کی جان اور مال کو نقصان نہ پہنچایا جائے، کسی بھاگتے ہوئے کا تعاقب نہ کیا جائے۔ امیر دمشق قلعے میں چھپ گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن سلطان کی خدمت میں پہنچ کر طالب معافی ہوا لیکن اب اس کی جان بخشی نہیں کی جاسکتی تھی، دمشق میں اس کا رہنا مسلمانوں کے لیے خطرناک تھا۔ سلطان نے اسے حصص کا شہر جاکیر میں دے کر ہمیشہ کے لیے دمشق سے رخصت کر دیا۔ نور الدین زنگی دمشق کا وارث بن گیا۔ یہ قبضہ اہم ترین واقعہ تھا۔ اس سے نور الدین کی سلطنت موصل سے حران تک پھیل گئی اور یروشلم تک جانے کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔

دمشق پر قبضہ ہو گیا تو قاعدے کے مطابق دمشق کے تمام مقبوضات پر بھی نور الدین کی سیادت مسلم ہو گئی لیکن قلعہ بعلبک کے حاکم نے قبضہ دینے سے انکار کر دیا لہذا نور الدین کو بے زور طاقت اس قلعے پر قبضہ کرنا پڑا۔ دمشق سے ٹھٹھنے کے بعد نور الدین نے قلعہ "حارم" پر لشکر کشی کا ارادہ کیا۔ عیسائیوں کا یہ مشہور قلعہ حلب کے مغرب میں واقع تھا۔

اس وقت نور الدین زنگی کے لشکر کا شمار نہیں تھا۔ اس کے شوقی جہاد نے عام مسلمانوں میں بھی روح جہاد پھونک دی تھی۔ مسلم لوجوان جوق در جوق اس کے لشکر میں شامل ہو رہے تھے اور اس کے حکم پر سرسبز کھیتوں کو تیار کھینچ رہے تھے۔

مقبوضات اسے ہونگے تھے کہ ہر جگہ فوج کی تعیناتی ضروری تھی۔ وہ اپنے ساتھ بہت تھوڑی فوج رکھتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر قریب ترین مقام سے فوج طلب کر لیا کرتا تھا۔ اس کا لشکر جب سیاہ جھنڈے لہراتا ہوا نکلا، جن پر کلمہ توحید کلا جتو سے لکھا ہوا تھا تو اہل حارم اس کے خوف سے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک سیاہ آندھی تھی جو قلعے کے سامنے آ کر ٹھہر گئی تھی۔ اٹھا کیہ کا والی بوہنڈ ایک لشکر جبار لے کر اہل حارم کی مدد کو یہ سوچ کر آیا کہ اہل حارم قلعے سے باہر نکل آئیں گے۔ دوسری طرف سے وہ پہنچ جائے گا۔ مسلمان درمیان میں پھنس جائیں گے لیکن محصورین کی اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ قلعے سے نکلتے۔ سلطان کی فوج کا ایک حصہ محاصرے پر ڈٹا رہا، دوسرے حصے نے بوہنڈ کے حملے کا ایسا جواب دیا کہ اس کا منہ پھیر دیا۔

محمصورین جب مایوس ہو گئے تو انہوں نے بوہنڈ کو پیغام بھیجا کہ نور الدین سے لڑنا فضول ہے۔ وہ محاصرہ اٹھا کر بھیجی نہیں جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ نفع مضائقات حارم اسے دے کر صلح کر لو۔ بوہنڈ بھی اب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ وہ اس جنگ میں کود پڑا تھا۔ اب اسے اٹھا کیہ کی فکر ہو رہی تھی۔ اس کا باپ سلطان کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کا انجام ابھی بھولا نہیں تھا۔ اہل حارم کی رضا ملتے ہی اس نے اسی شرط پر صلح کر کے سلطان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور اٹھا کیہ کو بچالیا۔

ابھی وہ صلح نامے پر دستخط کر رہا تھا کہ اس کے وقائع نگاروں نے اطلاع دی کہ کئی چھوٹے چھوٹے عیسائی امرا نے جمع ہو کر حلب پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ دراصل جب بھی سلطان اپنے مرکز سے دور ہوتا تھا، عیسائیوں کا کوئی نہ کوئی گروہ اس موقعے کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ سلطان نے فوراً اپنی فوج کا ایک حصہ ان عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ سلطانی فوج نے ان عیسائیوں کو چند روز میں کچل کر رکھ دیا۔

سلطان بھی حارم کا محاصرہ اٹھا کر حلب آ گیا۔

☆☆☆

1156ء کا سال تھا کہ ایک ہولناک قیامت نے شام کی سرزمین کا رخ کر لیا۔ زمین نے کروٹ بدلی اور گاؤں کے گاؤں زمین میں دھنس گئے۔ ایسا وحشت ناک زلزلہ آیا کہ بے دینوں کو بھی خدا یاد آ گیا۔ حلب اور حماہ کے اکثر دیہات یوں غائب ہو گئے جیسے کبھی نہ بنے ہوں۔ صرف حمص کے علاقے بچے۔

میں مرے والوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ شیر میں کسی کو اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ گھر سے باہر نکلا۔ مرنے والوں میں یہاں کا حاکم بھی تھا۔

اس قیامت کا سامنا اہل دمشق کو بھی کرنا پڑا۔ قدیم عمارتیں اور یادگاریں زمین میں بوس ہو گئیں۔ شاید ہی کوئی شہر یا قلعہ ایسا بچا ہو جس کی شہر پناہ یا فصیل برباد نہ ہو گئی ہو۔

سلطان نور الدین نے اس تباہی کو آبادی میں بدلنے کے لیے آرام خود پر حرام کر لیا۔ خزانے کے منہ کھول دیے۔ اپنی فوج کو ہر طرف پھیلا دیا۔ اپنے محل میں آرام سے نہیں بیٹھا بلکہ خود قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں جا کر نقصانات کا اندازہ کرتا اور حاجت مندوں کی مالی مدد کرتا۔ سرکاری خرچ پر لوگوں کے مکانات کی تعمیر کا حکم دیا۔ قلعوں اور شہروں کی مہندم فصیلیں ہنگامی بنیادوں پر بنوائیں کیونکہ اس نازک وقت میں بھی وہ عیسائیوں کی شرانگیزی سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس موقعے سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

☆☆☆

عیسائیوں میں ایسی خفیہ تنظیمیں وجود میں آ گئی تھیں جو مسیحی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہوئے دہشت گردی کی طرف مائل تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ جگہ جگہ لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو فوجی گروہوں کی صورت میں منظم کر لیا تھا۔ ان تنظیموں کا ہر مقصد تو یہ تھا کہ یروشلم کے عیسائی زائرین کی حفاظت اور خدمت کریں گے لیکن درپردہ اپنی کوششوں کو مسلمانوں کی ہتھیوں پر چھاپے مارنے پر مرکوز کیا ہوا تھا۔

زلزلے کی تباہ کاریوں سے فرصت پاتے ہی سلطان نے ان "خدا کی فوجداروں" کی سرکوبی کے لیے دو لشکر الگ الگ روانہ کیے۔ ایک لشکر حصص اور حماہ کی طرف گیا، دوسرا حلب کے نواحی علاقوں میں اس طرح گھات لگا کر بیٹھ گیا جسے چوروں کو پکڑنے کے لیے پولیس سمجھتی ہے۔

بہت جلد ان لٹیروں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ بڑے پیمانے پر قتل ہوئے جو قید کر لیے گئے انہیں شہر میں تشدد کرا کے قتل کر دیا گیا۔

مورخین کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر نور الدین کے ذریعے مسلمانوں پر احسان نہ کرتا تو فرنگی محاصرے اور لڑائی کے بغیر ہی اسلامی ممالک میں گھس جاتے۔

عیسائیوں کی یہ خفیہ تنظیمیں یونہی کام نہیں کر رہی تھیں بلکہ انہیں یروشلم کی پشت پناہی حاصل تھی اور تمام عیسائی ان کی مدد میں تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ جب سلطان نے ان

تنظیموں کے افراد کو قتل کر دیا تو شاہی مہتمموں نے اہتمام کیا اور حصص و حماہ کے کئی نواحی علاقوں کو روند ڈالا۔ سلطان کو خبر ہوئی تو طوقان بن کر ان پر دوڑ پڑا اور ایک خونریز لڑائی کے بعد ان کا تعاقب کرتا ہوا بانیاس پہنچا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محصور عیسائیوں نے ایسا دلیرانہ مقابلہ کیا کہ سات دن تک ایک مسلمان بھی قلعے کے قریب نہ جاسکا۔

شیر کوہ فصیل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے بارودی سرنگ لگا کر شمالی فصیل کو اڑا دیا۔ لشکر اندر داخل ہوئے اور ایک برج پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔ محصورین اس عالم میں بھی مقابلہ کرتے رہے لیکن جب جانی نقصان بہت ہو گیا تو "امان امان" کے نعرے بلند کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ایک ہزار سپاہیوں کو گرفتار کر لیا اور مالی غنیمت کی ایک بڑی مقدار ان کے ہاتھ آئی۔

ابھی وہ پوری طرح فتح کی خوشی سے سرشار بھی ہونے نہیں پایا تھا کہ اسے اطلاع ملی، اس کے چھوٹے بھائی نصرت الدین کی ایک آنکھ شہید ہو گئی ہے۔

اس حادثے کی اطلاع دیتے ہوئے اس کے امیر تذبذب میں تھے لیکن جب اسے خبر سنائی گئی تو اس نے یہ خبر طمینان سے سنی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ اسی وقت بھائی کو دیکھنے گیا اور اسے سلی دی۔

بانیاس میں چند روزہ قیام کے بعد سلطان حلب لوٹ آیا تھا لیکن کوئی ایسا مرض ساتھ لگایا تھا کہ آتے ہی سخت طویل ہو گیا۔ بیماری نے ایسا طویل پکڑا کہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ اسے شہر حلب سے قلعے میں پہنچا دیا گیا۔

سلطان کی حالت روز بروز بدلتی جا رہی تھی۔ کبھی تو اس کی سانس اکڑ جاتی تھی۔ ایک روز کچھ حالت کھل گئی تو اس نے اراکین سلطنت کو مشورے کے لیے طلب کیا۔

"اب مجھے لگتا ہے کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ مجھے یہ افسوس ہمیشہ رہے گا کہ میں عیسائیوں کا پوری طرح قلع قمع نہیں کر سکا لیکن آپ لوگ گواہ ہیں کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ فروغ اسلام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اب جو خدا کی مرضی۔ آپ لوگوں سے استدعا یہ ہے کہ میرے شروع کیے ہوئے جہاد کو آگے بڑھاتے رہنا۔"

"سلطان اکرم! ہم آپ سے عہد کرتے ہیں کہ اس جہاد کو جاری رکھیں گے۔"

"آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ اگر میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو میرا جانشین کون ہوگا؟"

"ہم میں سے کسی کو شوقی بادشاہ نہیں۔ ہم تو اسلام کی

خدمت کے لیے آپ کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔ آپ جو بھی نام پیش کریں گے، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”میں اپنے بھائی نصرت الدین کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں اور شیرکوہ نصرت الدین کی نیابت کریں گے۔ اگر آپ لوگوں کو اب بھی کوئی اعتراض ہو تو میں اپنی رائے بدلنے کو تیار ہوں۔“

”اگر آپ زیادہ اصرار کرتے تو ہم بھی یہی نام پیش کرتے۔ ہمیں ان ناسوں پر کوئی اعتراض نہیں۔“

سلطان نے اسی وقت شیرکوہ کو حکم دیا کہ وہ دمشق چلا جائے۔

”دمشق پر عیسائیوں کے حملے کا خدشہ ہے اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنا قیام دمشق میں رکھیں۔“

”حضور کو اس حال میں چھوڑ کر؟“

”سیری عیادت سے زیادہ دمشق کی حفاظت ضروری ہے۔“

شیرکوہ اسی وقت دمشق کے لیے روانہ ہو گیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان انتظامات کے بعد سلطان کی حالت تیزی سے سنبھلنے لگی۔ اس دوران سلطان کی علالت کو دیکھتے ہوئے صلیبی لشکروں نے کئی علاقوں پر حملے کیے جنہیں سلطان کے فوجیوں نے ناکام کر دیا۔ ان میں ایک علاقہ شیرز بھی تھا جس پر فرانسیسی فوج نے حملہ کر دیا تھا۔ مگر اسماعیلیوں نے اطراف و جوانب سے جمع ہو کر فرانسیسیوں کی مزاحمت کی اور انہیں پسپا کر دیا۔

سلطان علیل تھا۔ یہ خبریں سن کر وہ بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ پھر جب وہ صحت یاب ہو گیا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شیرکوہ کو ایک مضبوط فوج کے ساتھ شیرز کی طرف روانہ کیا۔ یہ قلعہ سلطان کے قبضے میں نہیں تھا لیکن اس کا محل وقوع ایسا تھا کہ اگر وہاں عیسائیوں کا تسلط ہو جاتا تو سلطان کے لیے مستقل دردِ سر بن جاتا۔

یہ قلعہ ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اس کے تین اطراف اونچے اونچے پہاڑ تھے اور چوتھی طرف دریا تھا۔ قلعہ کے باہر ایک گہری خندق تھی۔

اس قلعے کو فتح کرنا بہ ظاہر مشکل معلوم ہو رہا تھا لیکن جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہاں کا حاکم زلزلے میں ہلاک ہو گیا تھا اور اس کا جانشین ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ اس لیے سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ شیرکوہ جیسے ہی شہر کے قریب پہنچا، اہل شہر نے باہر نکل کر سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔

شیرکوہ نے شہر میں داخل ہو کر شہر پناہ کو از سر نو تعمیر کرایا۔

اور وہاں اپنے امیروں میں سے ایک امیر کو سلطان کے حکم سے حاکم بنا کر واپس آ گیا۔

قلعہ حارم کے محاصرے کے دوران صلح کرتے ہوئے عیسائیوں نے حارم کے نصف مضافات دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب وہ اپنے قول سے پھر گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ قریب و جوار کے اسلامی علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے تھے۔ ان کی سرکشی کو چکنا چوری تھا۔ سلطان نے شیرکوہ کو آگے روانہ کیا اور پھر خود بھی حلب سے حارم کی طرف چل پڑا۔

ابھی سلطان پہنچا بھی نہیں تھا کہ شیرکوہ نے عیسائیوں پر ایسی کاری ضریمیں لگا دی کہ ان کو دوبارہ اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اسی اثنا میں خبر ملی کہ حران اور صیدا میں عیسائیوں نے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ سلطان نے شیرکوہ کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا اور خود دمشق چلا گیا۔

شیرکوہ کی اس مہم میں صلاح الدین ایوبی بھی شامل تھا۔ شیرکوہ نہایت خاموشی سے پیش قدمی کرتا رہا اور پھر عیسائیوں کو مہلت دے بغیر ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس حملے میں لا تعداد عیسائی مارے گئے، بھاگ گئے یا قیدی بن گئے۔

یہ فتح اتنی اہم تھی کہ سلطان نور الدین نے دمشق سے باہر نکل کر فتح مند لشکر کا استقبال کیا اور انعام و اکرام سے نوازا۔

جب سلطان حران و صیدا کے عیسائیوں سے نمٹ چکا تو اس نے یروشلیم کی صلیبی ریاست کے حکمران بالڈون ثالث کی طرف توجہ دی کیونکہ تمام مفسدوں کے پیچھے بالعموم اس کا ہاتھ ہوتا تھا۔ اس توجہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ یروشلیم کے اندر گھس کر صلیبی شریکوں سے دو دو ہاتھ کرے۔ اس نے دمشق سے کوچ کیا اور اپنی سرحد عبور کر کے عیسائی علاقے میں داخل ہو گیا۔

عیسائیوں کو اس حملے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی اور انہوں نے پوری تیاری کر لی تھی۔ عیسائیوں کی سرحد کے چند میل اندر جمیں نای ایک بلند ٹیلہ تھا۔ عیسائیوں نے وہاں بیٹھ کر انتظار کیا تاکہ مسلمانوں کو یروشلیم تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لیا جائے۔

عیسائی اتنی تیاری سے آئے تھے کہ چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد انہوں نے مسلمانوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ پیچھے ہٹتے چلے گئے لیکن سلطان اس نازک وقت میں بھی جاں نثاری کے ایک دستے کے ہمراہ میدان جنگ میں ڈنارہا۔ جب عیسائی تین اطراف سے اس پر ٹوٹ پڑے تو جمیں کے

ماتے شروع کر دیے۔

اس کے سپاہی تیرہ سارے تھے اور وہ خود بجدے میں گر اٹھا۔

”انہی تو نے مجھ بندہ ناتواں کو اس ملک کی حکومت دی۔ میں نے تیرے شہر کو آباد کیا اور میں نے ان میں بسنے والوں کو ان کا حق سے روکا جس سے تو نے مجھے روکا۔ بے شک! مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی اور میں تمہارا ان کفار کو جو تیرے دین اور مصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ہیں دفع نہیں کر سکتا اور میں اپنے نفس کے سوا اور کسی شے کا مالک نہیں ہوں اور بے شک میں نے اس (نفس) کو تیرے دین کی حفاظت اور تیرے نبی کی حمایت کے لیے ان کے سپرد کر دیا ہے۔“

اس نے کچھ دیر کے لیے ٹیلے سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ عیسائی چونکہ نشیب میں تھے اس لیے ان کا بہت نقصان ہوا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مراسمہ تھے کہ پورے لشکر کو انہوں نے بھگا دیا اور سلطان اپنی دست فوج کے ساتھ ان کی جان کو عذاب بنا ہوا ہے۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے رات کی تاریکی میں روپوش ہو گئے۔

سلطان کے ساتھ اس وقت بہت ٹھوڑے آدمی تھے اس لیے دشمن کے علاقے میں مزید پیش قدمی نہیں کی جاسکتی تھی۔ سلطان واپس لوٹ آیا۔

اس معرکے کے بعد سلطان پھر علیل ہو گیا۔ مرض نے ایسی شدت اختیار کی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا۔ غذا بالکل ترک ہو گئی۔ کمزوری اتنی ہو گئی کہ بار بار غشی کے درمیان پڑتے تھے۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنی سلطنت کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی گزشتہ علالت کے دوران اپنے بھائی نصرت الدین کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ نصرت الدین سے کچھ ایسے اقدامات سرزد ہوئے تھے کہ سلطان اس سے خوش نہیں تھا۔ اب تک اس لیے خاموش تھا کہ اس کی نگرانی کے لیے خود موجود تھا لیکن اس بیماری نے اسے پھر ہوش دلادیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا اور یہی وصیت برقرار رہی تو مسلمانوں کے حق میں بہتر نہیں آگا۔ اس نے تمام امرا کو جمع کیا اور انہیں اپنی نئی وصیت سے آگاہ کیا۔

”میں نے اپنی گزشتہ علالت میں نصرت الدین کے حق میں وصیت کی تھی اور اسے اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی سیادت عظمیٰ کا اہل ثابت نہیں کیا۔ اہل میں اپنی پہلی وصیت کو منسوخ کرتا ہوں۔ اور تم کو ناکید

کرتا ہوں کہ میرے بعد قطب الدین مودود، امیر موصل (سلطان کا ایک اور بھائی) کے ہاتھ پر بیعت کر لینا کیونکہ اس کے اخلاق پسندیدہ ہیں اور اس کے دل میں دشمنانِ دین کے خلاف جہاد کرنے کا جذبہ بھی ہے۔“

تمام امرانے اس وصیت پر حلف اٹھایا اور عہد کیا کہ وہ سلطان کی اس وصیت پر عمل کریں گے۔ سلطان نے امرا کی رضامندی دیکھ کر قطب الدین کو دمشق آنے کے لیے خط لکھ دیا۔

ان امرانے بعض دہ بھی تھے جنہیں یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے خفیہ اجلاس کر رہے تھے اور نصرت الدین کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے طے کیا کہ نصرت الدین کو دمشق پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی جائے اور اسے اپنی حمایت کی ضمانت دی جائے۔ انہوں نے نصرت الدین کے نام ایک خط لکھا اور قاصد کے حوالے کر دیا کہ وہ حلب جا کر یہ خط نصرت الدین تک پہنچا دے۔

یہ قاصد حلب پہنچ گیا تھا لیکن اتفاق سے گورنر حلب کے سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اس کی تلاشی لی گئی تو یہ خط برآمد ہوا جس میں نصرت الدین کو دمشق پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

گورنر نے یہ خط اسی وقت سلطان نور الدین کو بھیج دیا۔ تمام سازشی امرا گرفتار کر لیے گئے۔ سازش پکڑی گئی تھی لیکن یہ سازش اپنا کام دکھا چکی تھی۔ یہ بات نصرت الدین کی سمجھ میں آگئی تھی کہ دمشق پر قبضہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس نے ایک لشکر کو ساتھ لیا اور دریائے فرات عبور کر کے دمشق کی طرف بڑھنے لگا۔

شیرکوہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ نصرت الدین کو روکنے کے لیے دمشق سے چل پڑا۔ نصرت الدین کو معلوم ہوا کہ شیرکوہ حرکت میں آ گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سازش پکڑی گئی ہے تو وہ راستے ہی سے واپس ہو گیا۔ لیکن شہر حران پر قبضہ کر لیا۔

سلطان نے صحت یاب ہوتے ہی بذاتِ خود حران کا رخ کیا۔ سلطان شہر کے قریب پہنچا تو نصرت الدین اپنے اہل و عیال کو قلعہ میں چھوڑ کر خود تنہا فرار ہو گیا۔ سلطان نے اتنی رعایت کی کہ اس کے متعلقین کو اس کے پاس پہنچانے کا حکم دیا اور حران کو اپنے ایک امیر کی جاگیر میں دے کر دمشق واپس آ گیا۔

عیسائیوں کے علم میں ابھی تک یہ تھا کہ سلطان بستر علالت پر ہے اور اس کے بھائی جانشین کے مسئلے پر ایک

دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ قسطنطنیہ اور فرانس کے بادشاہوں نے متحد ہو کر سلطان کے مقبوضات پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ وہ ایک زبردست فوج لے کر حمص اور حماہ کی طرف بڑھے۔ سلطان اس عرصے میں صحت یاب ہو چکا تھا۔ وہ صلیبوں کی یلغار کی خبر سن کر ان کے مقابلے کو پہنچ گیا۔ عیسائی اسے اپنے مقابلے پر دیکھ کر حیران رہ گئے اور جنگ سے گریز کی راہیں ڈھونڈنے لگے۔ قسطنطنیہ (روم) کے بادشاہ نے پہل کی اور بادشاہ کو یہ پیغام بھیجا کہ ہمارا یہاں آنے کا مقصد جنگ و جدال نہیں بلکہ ہم ان عیسائی قیدیوں کو چھڑانا چاہتے ہیں جو آپ کی قید میں ہیں۔ ان کے عوض ہم مناسب زرخیز زمین دینے کے لیے تیار ہیں۔

سلطان ان کی چالاکی کو سمجھ رہا تھا۔ وہ حمص یہ پیغام دینے کے لیے تو حمص اور حماہ تک نہیں آئے تھے۔ یہ کام تو ایک قاصد بھی کر سکتا تھا لیکن سلطان اس وقت تک خوزیری پر آمادہ نہیں ہوتا تھا جب تک دوسرا فریق آمادہ جنگ نہ ہو۔ ہمیشہ سے اس کا یہی دتیرہ رہا تھا۔ اس نے یہ درخواست قبول کرنی اور تمام عیسائی قیدیوں کو رہا کر دیا۔

سلطان کی اعلیٰ ظرفی کا ایک مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب شاہ یروشلم بالذون کا اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ اعلیٰ پائے کا منتظم اور نہایت دلیر بادشاہ تھا۔ اس کی وفات نے یروشلم پر بہت بُرے اثرات چھوڑے۔ یروشلم کا نظم و نسق بگڑ گیا۔ ابتری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سلطان نورالدین کے امرانے اسے مشورہ دیا کہ یروشلم کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر حملہ کر دینا چاہیے۔

”اگر اس وقت یروشلم پر حملہ کر دیا جائے تو دفاع کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یروشلم پر بہ آسانی قبضہ ہو جائے گا اور عیسائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں گے۔“ سلطان نے یہ کہہ کر ان کے مشورے کو رد کر دیا۔

”اس وقت عیسائیوں سے ان کا ایک اہم بادشاہ جمن گیا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس وقت جبکہ وہ اس کا سوگ منا رہے ہیں ہم ان پر حملہ کر دیں۔ لڑائی کے بہت مواقع آئیں گے۔ یروشلم پر قبضہ بھی ہو جائے گا لیکن اس وقت نہیں۔“

اگر اس وقت سلطان، یروشلم پر حملہ کر دیتا تو کامیابی یقینی تھی لیکن سلطان نے اس وقت حملہ کرنا مردانگی سے بعید سمجھا۔ سلطان کی اس اعلیٰ ظرفی پر اس کے امراء گم رہ گئے اور یہ کہتے سنے گئے کہ جو شخص اپنے دشمن پر احسان کر سکتا ہے اسے کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔ ہم پر بھی لازم ہے کہ ایسے بادشاہ کی

حفاظت کے لیے اپنی جانیں نچاؤ کر دیں۔ عیسائیوں پر اس احسان کا بدلہ عیسائیوں نے یہ دیا کہ کاؤنٹ ریمونڈ والی طرابلس نے شرارت پر کمر باندھی اور اپنی ریاست کے نواحی مسلم علاقوں کو تاراج کرنا شروع کر دیا۔ ان علاقوں کے مسلمانوں نے سلطان کے نام کی دہائی دی۔ سلطان نے اس آواز پر لبیک کہا اور مجاہدوں کا لشکر لے کر طرابلس کی طرف چل دیا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ قلعہ اکراد میں عیسائی جنگجو جمع ہیں اور لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ سلطان نے اس قلعے کے قریب بقیعہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔

اسے توقع تھی کہ عیسائی اس سے مقابلے کے لیے میدان میں نکلیں گے لیکن عیسائی قلعہ بند ہو گئے تھے۔ سلطان مسلسل پڑاؤ ڈالے ان کے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔ عیسائی بھی اس پر نظر رکھے ہوئے تھے اور مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سلطان کی فوج ہتھیار کھول کر اپنے خیموں میں آرام کر رہی تھی۔ سلطان بھی اپنے خیمے میں دھوپ سے بچ کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

محافظوں کی نظریں دور نظر آنے والے پہاڑی پر بنے قلعے پر تھیں جہاں کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ دور تک خاموشی تھی اور میدان میں پھیلی ہوئی دھوپ تھی۔

قلعے کے اندر اس وقت بڑی پرسراہر سرگرمیاں دیکھی جاسکتی تھیں۔ کئی دن سے مشاہدہ کیا جا رہا تھا کہ دوپہر کے وقت سلطانی فوج اپنے خیموں میں آرام کرتی ہے۔ چند پہرے دار ہوتے ہیں جو لشکر کی نگرانی کے لیے جاگ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی نظریں صرف معروف راستوں پر ہوتی ہیں۔ عیسائیوں نے اس دوپہر اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے قلعے کے خفیہ دروازے سے نکل کر باہر آ رہے تھے۔ جب سب باہر نکل آئے تو وہ پہاڑوں کو دیوار بنا کر ایسے راستے پر آ گئے جو سلطانی لشکر کے محافظوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔

سلطان کے پہرے دار بیٹھے بیٹھے اوجھنے لگے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اچانک ایک شور بلند ہوا۔ عیسائی لشکر حملہ آور ہو گیا تھا۔ یہ ایسا شب خون تھا جو دن کے وقت مارا گیا تھا۔ عیسائی، محافظوں کو قتل کر کے مختلف خیموں میں کھس گئے۔ مسلمانوں کو اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ ہتھیار سنبھال سکتے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو عیسائیوں نے شہید کر ڈالا۔ کچھ عیسائی سلطان کے خیمے کے سامنے جمع ہو گئے۔ سلطان نے بھرپور شجاعت کا

”میر ہمت اٹھ کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے اس کا لشکر کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اچانک اس پر سوار ہوا اور اس میں آگے پیچھے دار کرتا ہوا دور تک پھیلے ہوئے اس کے ہاتھوں کے درمیان سے نکل گیا۔ نیزوں نے اسے ہمواریں دیکھتی رہ گئیں۔“

سلطان نے گھوڑے کی رفتار میں کمی نہیں آنے دی۔ ۲۰ ہٹا گیا۔ اس نے چھ کوس کا فاصلہ طے کیا اور حمص کے پہلے پہلے قدم قدم کے کنارے ایک جگہ ٹھہر گیا۔ وہ اس وقت ہاتھوں میں اس امید پر رک گیا تھا کہ شاید اس کے کچھ فوجی بھی اچھوڑے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں۔ پھر سوچا جائے گا کہ اب کیا کرنا ہے؟ کچھ ہی دیر میں وہ مسلمان وہاں پہنچ گئے۔ عیسائیوں کی لکڑیوں کا شکار ہونے سے بچ گئے تھے۔

”سلطان مکرم! ہم اس وقت بہت تھوڑے ہیں۔ بے سامان ہیں۔ بہت سے ہتھیار بھی وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ ہمیں ممکن ہے عیسائی ہمارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں۔ اس کھلی جگہ پڑاؤ ڈالنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ ہم اس کے اندر جا کر قیام کریں۔“

سلطان نے بگڑ کر جواب دیا ”میں شہر پناہ میں چھپ کر نہ کی گزرنے کے لیے نہیں بنائوں۔ اگر میرے ساتھ صرف ایک ہزار سوار رہ جائیں تو بھی جب تک عیسائیوں سے شہید مسلمانوں کا بدلہ نہیں لے لوں گا ہرگز کسی دیوار کے سائے میں نہ بیٹھوں گا اور نرم بچھونے مجھ سے دور رہیں گے۔“

وہ حمص سے صرف چھ کوس کے فاصلے پر تھا لیکن اس نے قلعہ کے اندر جانا گوارا نہیں کیا اور کھلے میدان میں پڑا رہا۔ اسی وقت دمشق اور حلب سے خیمے، گھوڑے اور آلات حرب (ہتھیار) وغیرہ منگوائے۔ شہید فوجیوں کے ورثہ کو بھی طلب کر لیا تاکہ ان کے نقصان کا ازالہ کیا جائے۔

لشکریوں کا جو نقصان ہوا تھا اسے پورا کرنے کے لیے اس نے لشکریوں میں دینار تقسیم کرنے شروع کیے۔ ہر شخص اپنا نقصان بتا رہا تھا اور سلطان اتنے دینار سے دینا جاتا تھا۔ سلطان کے دیوان نے یہ تقسیم دیکھی تو آگے بڑھ کر سلطان سے عرض کیا ”لوگ جس قدر نقصان کا دعویٰ کر رہے ہیں، اس پر ان سے حلف لیا جائے کہ نہ تو کسی کو غلط بیانی کا کام لے رہے ہیں۔“

سلطان نے جواب دیا ”کسی سے کوئی حلف نہیں لیا جائے گا۔ میں جو کچھ دے رہا ہوں اس کا اجر و ثواب بھی میرے ہاتھوں سے ملے گا۔ اگر کسی کو کچھ زیادہ مل جائے گا تو وہ مجھے دعا میں لے گا۔“

ایک امیر قریب کھڑا تھا، اس نے کہا ”آپ کو اجر و ثواب کا خیال ہے تو آپ کے شہر میں حاجت مند بھی ہیں، صوفیہ اور فقہاء بھی، ان کو دیتے۔“

سلطان کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔ ”کیا تم انہیں جو میدان جہاد سے دور بیٹھے ہیں اور انہیں جو جہاد کے لیے نرم بچھونوں کو چھوڑ کر تیرہوں اور لکڑیوں کے سائے میں شب و روز گزارتے ہیں براہ کھتے ہو۔ کیا میں ان کا حق چھین کر دوسروں کو دے دوں؟“

سلطان کا جواب سن کر سب کو سانپ سوگھ گیا۔ سلطان نے دولاکھ دینار سرخ تقسیم کر دیے۔

عیسائی چاہتے تھے کہ آگے بڑھ کر حمص پر قبضہ کر لیتے لیکن چھ کوس پرے بیٹھے سلطان نورالدین کا خوف ایسا غالب تھا کہ جارحانہ اقدام کی بجائے اپنے دفاع کی فکر کرنے لگے۔ انہوں نے سلطان کی طرف صلح کا پیغام بھیجا لیکن سلطان کا غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس پیغام کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

عیسائیوں نے سلطان کی سردمہری دیکھی تو انہیں گرمیوں میں سردی لگنے لگی اور وہ اپنے اپنے علاقوں کی طرف منتشر ہو گئے۔

سلطان دمشق لوٹ آیا لیکن اب اس کے شب و روز اسی فکر میں گزرتے تھے کہ کب عیسائیوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

مصر یروشلم سے قریب تر تھا۔ یہاں فاطمی خلافت قائم تھی۔ نورالدین نے مصر پر حکومت قائم کرنا ضروری سمجھا اور اس پر چڑھائی کر دی۔ فاطمی اس کے مقابل ٹھہر نہ سکے اور خلیفہ مصر نے شیرکوہ کو مصر کا وزیراعظم مقرر کر کے سلطان کی حاکمیت تسلیم کر لی۔

ابھی شیرکوہ کو دینا ہی تھا کہ دو مہینے ہوئے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اب پھر نئے وزیراعظم کی ضرورت پیش آئی۔

شیرکوہ کے ساتھ نوجوان صلاح الدین ایوبی بھی مصر آیا تھا۔ بعض امراء کی نگاہ انتخاب اس پر پڑی لیکن چند امراء کو اختلاف بھی تھا۔ خلیفہ نے انہیں سمجھایا کہ موجودہ نازک حالات میں صلاح الدین ہی کو وزارت کے لیے آگے بڑھانا مناسب ہے کیونکہ وہی مصر کی بے چیدہ سیاست سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

صلاح الدین ایوبی کو وزارت کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔

سلطان نورالدین نے صلاح الدین کی وزارت کی

خبر بڑی مسرت کے ساتھ سنی۔ وہ مصر کے مفتوح ہونے کو اپنی کامیابی سمجھتا تھا اور صلاح الدین کو اپنا قابل اعتماد نمائندہ تصور کرتا تھا۔

صلاح الدین کی اس کامیابی پر مسلمانوں نے خوشی منائی لیکن عیسائی انگاروں پر لوٹنے لگے۔ مصر پر سلطان کے تسلط کی وجہ سے یروشلیم کی ریاست چکی کے دوپائوں میں پھنس گئی تھی۔ شاہ یروشلیم نے اس خطرے کو بھانپ کر مصر کے ساحلی شہر دمياط پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس حملے کے لیے شاہ قسطنطینیہ اور سسلی نے بھی یروشلیم کا ساتھ دیا۔

صلاح الدین ایوبی نے دفاعی انتظامات کیے لیکن ساتھ ہی سلطان نورالدین کو بھی خط لکھ دیا۔

”میں کشمکش میں پڑ گیا ہوں۔ اگر مصر چھوڑ کر جاتا ہوں تو خدشہ ہے مصری امرا کوئی فتنہ برپا کر دیں گے اور تاخیر کرتا ہوں تو دمياط ہاتھ سے جاتا ہے۔ دمياط ہاتھ سے چلے جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دمياط کو مرکز بنا کر مصر پر بار بار حملے کرتے رہیں گے۔“

سلطان نے خط ملتے ہی جنگجوؤں کے دستے دمياط کی طرف بھیجے شروع کر دیے اور خود عیسائی مقبوضات کو تاراج کرنا شروع کر دیا تا کہ عیسائیوں کی توجہ بٹ جائے۔

سلطان کی یہ حکمت عملی سودمند ثابت ہوئی۔ عیسائی پچاس دن کے محاصرے کے بعد حواس باختہ ہو کر اپنے مقبوضات کو بچانے کے لیے دوڑ پڑے۔

سلطان نے بعد میں مصر سے کلی طور پر فاطمی خلافت کا خاتمہ کر دیا اور مصر کو مکمل طور پر اپنے زیر اقتدار لے آیا۔ وہاں کا نظم و نسق حسب سابق صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ میں رہا لیکن اب اس کی حیثیت سلطان نورالدین کے ایک گورنر کی تھی۔ مصر میں عباسی خلیفہ اور سلطان نورالدین کے ناموں کا خطبہ پڑھا جانے لگا اور سکوں پر بھی نورالدین کا نام کندہ کرایا گیا۔

مصر پر سلطان نورالدین کے قبضے نے یروشلیم کی صلیبی سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

مصر پر تسلط قائم ہوئے تھوڑی ہی عرصہ ہوا تھا کہ سلطان نورالدین کو عیسائیوں نے پھر لڑائی پر مجبور کر دیا۔ مسلمانوں کی دو تجارتی کشتیاں مصر سے شام کی طرف جا رہی تھیں۔ عیسائیوں نے ان کشتیوں کو پکڑ لیا اور ان پر سوار تمام تاجروں اور ملاحوں کو گرفتار کر لیا۔

سلطان کو اس بزدلانہ حرکت کی خبر ہوئی تو اس نے عیسائیوں کو کشتیاں واپس کرنے کے لیے لکھا۔ عیسائیوں نے اس خط کا خاطر خواہ جواب نہیں دیا تو سلطان برہم ہو گیا۔ اس

نے شام، موصل اور جزیرہ کی فوجوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ فوجیں اس کے حکم پر تیار رہا کرتی تھیں۔ حکم پہنچنے کی دیر ہی نہ ہوئی فوجیں جمع ہو گئیں۔ سلطان نے ان فوجوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا بیٹا یروشلیم پر چکا ہے۔ وہ بار بار اپنے امیروں سے کہتا تھا کہ اگر عیسائیوں نے میرے پورے لشکر کو بھی گرفتار کر لیا ہوتا تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا اور سمجھ لیتا کہ انہوں نے مجھ سے کوئی انتقام لیا ہے لیکن تاجر اور صلاح تو بے قصور تھے۔ ان کا قصور اگر تھا تو شخص یہ کہ وہ مسلمان تھے۔

اس نے اس لشکر کے ایک حصے کو طرابلس کی طرف بھیجا دوسرے کو اٹاکیہ کی طرف، تیسرے کو قلعہ عریمہ کی طرف اور چوتھے حصے کو اپنے ساتھ لے کر قلعہ عرقتہ کی طرف چل پڑا۔

سلطان نے قلعہ عرقتہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسی اثنا میں فوج کا وہ حصہ جو قلعہ عریمہ کی طرف گیا تھا، قلعہ فتح کر کے سلطان کے پاس آ گیا۔ اس فوج کے آ جانے سے سلطان کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ صرف چار دن کے محاصرے کے بعد محصورین نے ہتھیار ڈال دیے اور امان کی درخواست کر دی۔ سلطان نے ان سب کو معاف کر دیا لیکن اس شرط پر کہ قلعہ خالی کر کے کہیں چلے جائیں۔

عیسائیوں نے قلعہ خالی کر دیا تو سلطان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ کچھ دن وہاں قیام کیا اور پھر یلغار کرنا ہوا طرابلس پہنچ گیا۔ فوج کا ایک حصہ پہلے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اب اس کی فوج کے چاروں حصے طرابلس میں تھے۔ سلطان بذات خود موجود تھا۔ عیسائیوں کو سلطان کے سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی، لہذا انہوں نے صلح کے پیغام بھیجنے شروع کر دیے۔ سلطان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ جن تاجروں کو گرفتار کیا گیا ہے، انہیں واپس کر دیں۔ آخر عیسائیوں نے شرط قبول کر لی اور اسی شرط کے ساتھ صلح نامہ مرتب کر لیا گیا۔

اس کے بعد سلطان نورالدین بہت دن تک خاموش رہا۔ صلاح الدین ایوبی اس کے نمائندے کی حیثیت سے عیسائیوں سے اُلجھا رہا۔ اس نے نورالدین کے حکم سے کئی قلعے فتح کیے۔ ان فتوحات سے عیسائی دنیا میں صلاح الدین کا نام متعارف ہونے لگا۔ انہیں اندازہ ہوا کہ ایک طاقت آگے بڑھ رہی ہے جسے انہیں کچلنا ہوگا۔

اب سلطان نورالدین کی ایک ہی آرزو تھی کہ فتح بیت المقدس کا سہرا اس کے سر بندھے۔ وہ اکثر اپنی اس خواہش کا اظہار ان لفظوں میں کیا کرتا تھا۔

”میں اللہ تعالیٰ سے اس بات کی توفیق چاہتا ہوں کہ وہ

مگر ہر قصود تک پہنچا دے۔ مجھے توفیق دے کہ میں اسی کے مقدس محکم کو تھلیٹ پرستوں سے پاک کر دوں۔“

اس نے یروشلیم پر لشکر کشی کے لیے تیاریاں شروع کر دیں اور کئی ہزار دینار خرچ کر کے حلب و دمشق کے نامی حکمرانوں سے ایک منبر تیار کرایا تھا کہ فتح کے بعد اس کو مسجد اقصیٰ میں رکھا جائے گا اور اس پر خطبہ پڑھا جائے گا۔ جہاد کا احسان بھی کر دیا گیا تھا اور پوری توجہ فوجوں کی تربیت پر مرکوز کر دی تھی۔

1092ء میں عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کر لیا۔ یہ قبضہ اس وقت سے اب تک چلا آ رہا تھا۔

عید الفطر 1174ء کو سلطان نورالدین نے علی الصباح اور ہر غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے غربا میں صدقات تقسیم کیے۔

محافظ دستہ تیار کھڑا تھا۔ محل سے دمشق کے مشہور میدان الامزنیک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر محافظ دستے تھے اور وہ لوگ بھی جو بادشاہ کو گزرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ سلطان کو اسی راستے سے گزر کر نماز عید کے لیے جانا تھا۔ سلطان اس طرف سے گزرا تو یہی دیکھنے والے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عید گاہ تک آئے اور سلطان کے ساتھ نماز عید ادا کی۔

خطبے میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا۔

”اے خدا اپنے بندے کی اصلاح کر جو تیری رحمت کا محتاج ہے اور تیری ہیبت سے خائف ہے اور تیری قوت سے وابستہ ہے اور تیری راہ میں جہاد کرنے والا ہے اور تیرے دین کے دشمنوں سے جھگڑنے والا ہے۔“

(وہ کون ہے) ابوالقاسم محمود بن زنگی بن آقسنصر ناصر امیر المومنین۔

اے اللہ، اس کو حق دکھا، اے اللہ اس کی مدد کر، اے اللہ اسے توفیق دے۔“

اکثر بادشاہ اور سلطان اپنے نام کے ساتھ لمبے چوڑے القاب اور تعریفی الفاظ لکھا کرتے تھے اور خطبوں میں ان کے نام بڑی شان و شوکت سے لیے جاتے تھے لیکن سلطان نورالدین زنگی نے خطبے میں اس سادہ سی دعا کو اپنے لیے تجویز کیا تھا۔

سلطان نورالدین کو چوگان کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ عید کے دن اس نے اس پر مسرت مونتے پر عید کے دوسرے دن اس نے اپنے امرا کو جمع کیا اور میدان اخضر میں جہاں ایک دن پہلے

اس نے نماز عید ادا کی تھی، چوگان کھیلنے جا گیا۔ ہمدردی کے ساتھ اور پھر امرا کے ساتھ ہاتوں میں مصروف ہو گیا۔

اس کے ایک امیر نے ہاتوں ہاتوں میں کہا ”کتنا بابرکت دن ہے کہ آج ہم سب اس میدان میں جمع ہیں لیکن خدا معلوم آئندہ سال ہم میں سے کون یہاں ہوگا۔“

سلطان نے کہا ”سال تو آپ نے بہت زیادہ کہہ دیا۔ ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایک مہینے کے بعد ہم سب یہاں جمع ہو سکیں گے یا نہیں۔“

اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ایک مہینے کی یہ مدت سلطان خود اپنے لیے مقرر کر رہا ہے۔ یہ محفل بھی خوشی ختم ہوئی۔ کسی کو یاد بھی نہیں رہا کہ وہاں کیا باتیں ہوئی تھیں۔ یہ باتیں کوئی ایسی انوکھی باتیں بھی نہیں کہ جنہیں یاد رکھا جاتا۔

چھ دن نہیں گزرے تھے کہ سلطان نے اپنے گلے میں معمولی سی تکلیف محسوس کی۔ پھر یہ تکلیف بڑھتے بڑھتے ایک مرض ”خناق“ کی صورت اختیار کر گئی۔ اطباء اور معالجین اپنی سی کوشش کر رہے تھے لیکن اس کی آواز اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ یونے میں سخت دقت ہو رہی تھی۔ قریب بیٹھا ہوا آدمی بھی بڑی مشکل سے اس کی آواز سن سکتا تھا۔ معالجین اس کے ارد گرد جمع تھے لیکن اب اسے کسی سے امید نہیں رہی تھی۔

وہ قلعہ دمشق کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک سادہ سے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سلطان جس کے قبضے میں آدمی اسلامی دنیا تھی، اس کی سادگی کا یہ عالم، اس کے معالجین اس تنگ و تاریک کمرے کو دیکھ کر اسے مشورہ دے چکے تھے کہ وہ اپنا کمر تبدیل کر لے لیکن وہ تیار نہیں ہوتا تھا۔

”سلطان معظم! اس مرض کے علاج کے لیے ضروری ہے کہ فصد لی جائے۔“ اطباء نے قائل کر کہا۔

”کمال کرتے ہو۔ میری عمر ساٹھ کے قریب ہو گئی ہے۔ اس عمر کے آدمی کی فصد نہیں لینی چاہیے۔ کوئی اور علاج تجویز کرو۔“

سلطان نے اس تجویز کو برہمی سے رد کر دیا۔ واصل اس کا وقت آخر آ پہنچا تھا۔ ملک الموت اسے کسی تدبیر پر آمادہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اطباء علاج پر علاج تجویز کرتے رہتے تھے لیکن وقت آخر آ پہنچا تھا۔

569ھ مطابق 1174ء کو اسلام کے اس مجاہد اعظم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھاون سال تھی۔ اس نے 28 برس حکومت کی۔

وفات کے وقت اس کی تمام آرزوئیں قریب قریب

الزبدۃ یورپ

مریم کے خات

وہ بگولوں کی طرح اٹھے اور سارے یورپ پر چھا گئے۔ حیوانیت ان کے سامنے بیچ تھی۔ درندگی بھی ان سے شرما جاتی تھی۔ وہ جنونیت کے آخری پائیدان پر تھے۔ روم ان کے خوف سے لرزتا تھا تو مسیحیت کا مرکز ویش کن سٹی دہلتا تھا کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ سرزمین یورپ پر صرف ان کا حق ہے۔ مگر وہ جس تیزی سے ابھرے تھے، اسی تیزی سے غائب ہو گئے۔ ان کی نسل کہاں گئی، اب وہ لوگ کہاں ہیں، کسی کو پتا نہیں مگر ان کے ظلم و جبر کے قصے آج بھی زبان زد عام ہیں۔



درخت پودے اور جالور قدرت کے اسی چکر کے تابع ہیں۔ انسان ان سے مختلف مخلوق ہے جسے قدرت نے عقل اور فیصلے کی قوت دی ہے۔ لیکن وہ بھی قدرت کے قوانین سے بالاتر نہیں... بلکہ ناخوش طریقے سے یہ بھی قدرت کے اسی چکر کا اسیر ہے۔

انسانوں کے خاندان بنتے ہیں اور خاندانوں سے قبیلے وجود میں آتے ہیں۔ یہ قبیلے زمین اور خوراک کے لیے آپس میں لڑتے ہیں۔ ان میں سے کچھ فنا ہو جاتے ہیں اور

خزاں آتی ہے پتے جھڑتے ہیں اور درخت ٹٹو منڈ جاتے ہیں۔ یہی پتے فرش پر بچھ جاتے ہیں ان پر برف گر جاتی ہے اور یہ زمین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ زمین کی گری اور برف کی بچ ان کو گلا دیتی ہے اور آنے والے بہار میں وہ برف پھلتی ہے تو یہ پتے زمین کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں بعد میں یہ درختوں کی خوراک بن کر دوبارہ شاخوں پر پتوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہ قدرت کا چکر ہے جو وہ زمین پر زندگی کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے چلائی رہتی ہے

سلطان کو اسی خاک مقدسہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔
قبر پر ایک سادہ سی لوح نصب کی گئی تھی جس پر عبارت درج ہے۔
”یہ شہید نور الدین کی قبر ہے۔“

سلطان کا مزار آج بھی دمشق میں ”مرقد نور الدین شہید“ کے نام سے مشہور ہے اور لوگوں میں عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔
دمشق کا قلعہ جس میں سلطان کا انتقال ہوا تھا ایک مسجد میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

سلطان نے اولادیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑی تھیں۔ لڑکے کا نام الملک الصالح اسماعیل تھا اور لڑکی کا نام شمس النساء تھا۔

سلطان کی رحلت کے وقت ملک الصالح کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ سلطان نے اپنی پہلی وصیت میں اپنے بھائی قطب الدین موود کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا لیکن قطب الدین کا انتقال سلطان کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ اس لیے تمام امیروں اور سرداروں نے سلطان کے گیارہ سالہ بیٹے ملک الصالح کو اتفاق رائے سے سلطان کا جانشین مقرر کیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔

مرحوم سلطان کا نائب بااثر اور طاقتور سردار صلاح الدین ایوبی والی مصر تھا۔ مخالفت کا امکان اس کی طرف سے ہو سکتا تھا لیکن اس نے بھی بلا جھجک اس کی اطاعت قبول کر لی۔ مصر میں اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ بھی اسی کے نام کا معروض کرایا۔

صلاح الدین ایوبی نے نہ صرف ملک اسماعیل کو جانشین تسلیم کیا بلکہ تعزیت نامہ بھی تحریر کیا۔

”مولانا نور الدین کی وصیت سے ہم مطلع ہو گئے ہیں کہ اس کا فرزند اس کا جانشین ہے۔ اگر وصیت کے مطابق سب حاضر و غائب نے اس کی اطاعت قبول کر لی ہے تو ہمارا مقصد برآیا اور نہ جو شخص مولانا الملک الصالح کی مخالفت کرے گا، ہماری تلوار اس کے خلاف نیام سے باہر آ جائے گی۔ اگر برخوردار موصوف اور اس کے باپ کے وزیر اور امرا کے درمیان اتفاق اور اتحاد ہو تو میرا ولی مدعا پورا ہو جائے گا۔ خدا سے ڈرتے رہو اور اپنے اندر کسی قسم کے اختلاف نہ سمجھنے دو کہ اس سے دشمن کو فائدہ پہنچے گا۔“

ماخذ: نور الدین زنگی، تاریخ کے آئینے میں تحقیق و ترتیب: کامران اعظم سوہدروی

پوری ہو چکی تھیں۔ عیسائیوں کو وہ شام سے نکال چکا تھا۔ مصر پر اس کا قبضہ تھا۔ صرف ایک آرزو وہ اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ بیت المقدس کی فتح اس کی تشنہ آرزو تھی۔ بیت المقدس کی فتح صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں لکھی تھی جو بعد میں پوری ہوئی۔

سلطان کی وفات کی خبر جو نہی قلعہ دمشق سے باہر آئی تو دمشق آہوں اور سسکیوں سے گونج اٹھا۔ دمشق کا چہہ چہہ شور محشر کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

اس خبر کو شہر پناہ سے باہر نکلنے دیر نہیں لگی۔ خلیفہ بغداد کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔ صلاح الدین دہائیں مار مار کر رونے لگا، شعرا نے مرثیے لکھے۔

”ملک الغادل کی رحلت پر ملک اور عدل ماتم کناں ہیں۔ تمام عالم پر تاریکی چھا گئی ہے۔ نہ آفتاب ہے اور نہ سایہ ہے اور جب نور الدین ہم سے رخصت ہو گیا تو محفل تاریک ہو گئی اور تازگی اور نیکی زائل ہو گئی اور شر و فحش بڑھ گیا۔ لڑائی اور سخاوت اور بخشش کی موت آ گئی اور ناامیدی اور بخل زندہ ہو گئے۔ بے کمالی کو غلبہ حاصل ہوا۔ اہل فضل و کمال اور خود صاحب کمال دب کر رہ گئے اور اہل علم کیا کر سکتے ہیں جب جہالت کا زور بڑھ گیا ہے اور نور الدین کا نام نہ رہ جاتا اگر اس کے مثل اس کی اولاد نہ ہوتی۔“

اس کی تعزیت اور ماتم سے فرصت کب ملنے والی تھی۔ یہ رونا تو عمر بھر کا تھا۔ اس سے زیادہ تو یہ ضروری تھا کہ اس کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا جائے۔ میت کو علما اور صلحا نے غسل دیا۔ پاک کپڑے میں دھنپایا۔ جنازہ اٹھایا گیا تو نالہ و شہیوں کی آوازیں آسمان تک پہنچیں۔

اس کا جنازہ اسی میدان اخضر میں لے جایا گیا جہاں وہ نماز عید ادا کرتا تھا جہاں چوکان کھلتا تھا اور جہاں ابھی کچھ دن پہلے اپنے امرا کے ساتھ بیٹھ کر کہا تھا ”ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایک مہینے کے بعد ہم سب یہاں جمع ہو سکیں گے یا نہیں۔“ اب سب تھے، وہی نہیں تھا۔

لوگوں کی بھیڑ تھی کہ چھٹنے میں نہیں آتی تھی۔ میدان میں اتنی جگہ ہی نہیں تھی کہ تمام لوگ ایک ساتھ سائیں۔ لوگ انبوہ درانبوہ آتے تھے۔ نماز جنازہ پڑھتے اور دوسرے دروازے سے نکل جاتے۔ ان کی جگہ دوسرے آ جاتے۔ اس طرح کئی مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ پھر میت کو مدرسہ نوریہ میں لایا گیا۔ یہ مدرسہ اس نے سفر آخرت سے پہلے اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ یہیں سلطان کی آخری آرام گاہ تیار کی گئی۔

خدارا © خدارا شوگرمریض ذرا عقلندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور نا کارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدا را آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ایک VP وی پی شوگر ٹیماٹ کورس منگالیں۔ اور اماری ہمالی کو آرائیں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں

شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

ابھی ہے۔ یہ ماہرین اسی خطے کو ہن قبائل کی پیدائش ۱۱۱۱ء میں۔ یہاں سے اٹھ کر یہ سخت جان قبائل یورپ ۱۱۱۱ء میں ہاپٹیم تھے۔ ایک زمانے میں ان کی وجہ سے رومن ۱۱۱۱ء کا مسئلہ لاحق ہو گیا تھا۔ لیکن ایشیانا گہانی مرگ ۱۱۱۱ء اور اگر ہن قبائل منتشر نہ ہوتے تو عین ممکن تھا ۱۱۱۱ء میں سلطنت چوگی عیسویں میں قصہ پارینہ بن کر ۱۱۱۱ء ہائی۔

☆☆☆

وہ ننھا خانہ بدوش اپنی دادی سے اپنے آباد اجداد کی لہا لیاں غور سے سنتا تھا جن میں ان کی ہمت و بہادری کی داستانیں ہوتی تھیں کہ وہ کتنے بہادر اور کتنے بڑے شکاری تھے۔ ۱۱۱۱ء دوسروں کی سرزمین پر گھس کر شکار کھیلتے تھے۔ بچہ ۱۱۱۱ء گیا اس نے دادی سے کہا۔ ”آج ہم نے بھی ایسا ہی کیا ۱۱۱۱ء ہم بارہ سینکے کا چھچھا کر رہے تھے وہ دوسرے قبیلے کی حد میں چلا گیا مگر ہم نے وہاں بھی اس کا چھچھا کر کے اسے مار ۱۱۱۱ء۔ اسے میرے تیر نے ہلاک کیا تھا مجھے شکار کرنا آ گیا ۱۱۱۱ء۔“ کہتے ہوئے بچے کے لہجے میں فخر آ گیا۔ وہ شفاف ۱۱۱۱ء اور کھڑے نقوش والا مضبوط لڑکا تھا جس کی عمر بارہ ۱۱۱۱ء مال سے زیادہ نہیں تھی۔ دادی نے محبت سے اپنے اس ۱۱۱۱ء اکوڑے پوتے کو دیکھا۔

”میرے بچے یہ صرف ایک شکار ہے اس سے تمہیں ۱۱۱۱ء ہمت کچھ سیکھنا ہے۔“

”تمہاری دادی ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ بچے کے باپ ۱۱۱۱ء مانگ نے خیمے کے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تم ایک ۱۱۱۱ء نے بچے ہو لیکن کل تمہیں بڑا ہونا ہے اور اپنے قبیلے کا ۱۱۱۱ء مراد بننا ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے آباد اجداد کیا ۱۱۱۱ء کرتے تھے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ہزاروں میل کا سفر ۱۱۱۱ء کے اس جگہ آئے ہیں جہاں ایک طرف ہمارے دشمن ۱۱۱۱ء ہرمن قبائل ہیں اور دوسری طرف رومن سلطنت بھی ہماری ۱۱۱۱ء دست نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود دوسرے ہن قبائل بھی دوست ۱۱۱۱ء ہیں۔“

”تب ہمارا دوست کون ہے؟“ بچے نے سوال کیا۔ ۱۱۱۱ء۔“ مانگ نے اپنی تلوار نکال کر اس کے سامنے ۱۱۱۱ء لی۔ ”یہ ہماری واحد دوست ہے اور ہمیں ہمیشہ اسی پر بھروسہ ۱۱۱۱ء لانا چاہیے۔“

نھا لڑکا دلچسپی اور حیرت سے تلوار دیکھ رہا تھا۔ وہ تیر ۱۱۱۱ء والی کا ماہر تھا لیکن اس کے پاس کوئی تلوار نہیں تھی۔ اس کی ۱۱۱۱ء والی نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ”ممکن ہے میرا پوتا ہی وہ شخص

رہتے تھے اور ان میں ہی سفر کرتے تھے۔ سفر اور شکار یہی ان ۱۱۱۱ء کی زندگی تھی۔

ان قبائل میں سب سے مشہور صحرائے گوبی کے اُس بار ۱۱۱۱ء اٹھنے والے مشہول قبائل تھے جنہوں نے ایک زمانے میں ایشیا ۱۱۱۱ء اور یورپ کے بڑے حصے کو تہہ بالا کر دیا تھا لیکن جلد زوال پذیر ۱۱۱۱ء ہو کر واپس لوٹ گئے اور مفتوح علاقوں میں رہ جانے والے ۱۱۱۱ء مقامی نسلوں میں ضم ہو گئے۔ ان کے علاوہ یورپ کے شمال میں ۱۱۱۱ء آباد قبائل تھے۔ جو شاید پہلے تو مختلف ناموں سے جانے جاتے ۱۱۱۱ء تھے۔ لیکن جب انہوں نے یورپ کے متعدد علاقوں کی طرف ۱۱۱۱ء پیش قدمی شروع کی تو انہیں متفقہ طور پر ہن کا لقب دے دیا گیا ۱۱۱۱ء تھا۔ یہ شکاری اور چرواہے تھے۔ منگولوں کی طرح حملہ آور جنگجو ۱۱۱۱ء اور لوٹ مار و غارتگری کے ماہر تھے۔ یہ خیموں میں رہتے ۱۱۱۱ء تھے اور کبھی اپنا تمدن نہیں چھوڑتے تھے۔ جہاں سے گزرتے ۱۱۱۱ء وہاں صرف تباہی اور بربادی کے نشانات چھوڑ جاتے تھے۔ رحم ۱۱۱۱ء نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھے۔

ماہرین آج بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ چوٹی صدی ۱۱۱۱ء عیسویں میں یورپ میں قہر بن کر نازل ہونے والے ہن قبائل ۱۱۱۱ء کا وطن اصل میں کہاں تھا؟ کیونکہ پہلے پہل یہ بحیرہ اسود کے ۱۱۱۱ء شمالی ساحلوں کے ساتھ موجود یوکرین اور رشین فیڈریشن ۱۱۱۱ء کے علاقوں میں نمودار ہوئے اور پھر یونان کے اوپر سے ۱۱۱۱ء ہوتے ہوئے مشرقی یورپ اور بالآخر مغربی یورپ تک جا پہنچے ۱۱۱۱ء تھے۔ بحیرہ اسود سے اوپر یہ کہاں سے آئے؟ اس کا حتمی یقین ۱۱۱۱ء آج بھی مشکل ہے کیونکہ مشرق اور جنوب میں موجود اقوام ۱۱۱۱ء ان خطوں میں تین ہزار سال سے زیادہ عرصے سے آباد ہیں ۱۱۱۱ء اور ہن قبائل کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا، ان میں سے زیادہ تر ۱۱۱۱ء قبائل شمال مغرب سے آنے والے والی کنگ تھے۔ جرمن، ۱۱۱۱ء گائٹک اور دوسرے مغربی یورپ میں بسنے والے قبائل اصل ۱۱۱۱ء میں والی کنگ نسل سے ہیں۔ مشرقی یورپ میں آباد سلاو نسل ۱۱۱۱ء بھی ان سے مختلف ہے اور پہلے پہل یہ سویڈن، فن لینڈ اور ۱۱۱۱ء ناروے کے آس پاس آباد تھے۔

اگر یہ وسط ایشیا کے اوپر ساہیو کے کسی علاقے سے ۱۱۱۱ء آئے تھے تو ان کو یورپ تک پہنچنے کے لیے نہ صرف بہت طویل ۱۱۱۱ء سفر کرنا پڑتا بلکہ راستے میں آباد بے شمار طاقتور قبائل سے بھی نمٹنا ۱۱۱۱ء پڑتا جو بے ظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ ماہرین کے مطابق اب ایک ۱۱۱۱ء ہی علاقہ بچتا ہے۔ کوہ یورال سے، اس طرف قطب شمالی کا ۱۱۱۱ء نزدیکی علاقہ ہمیشہ سے سخت موسم اور سخت ترین زندگی کے لیے ۱۱۱۱ء مشہور رہا ہے۔ یہاں سال کے آٹھ مہینے برف جمی رہتی ہے اور ۱۱۱۱ء صرف چار مہینے کے لیے گرمیاں آتی ہیں۔ آج بھی یہاں رہنا

کچھ دوسروں میں ضم ہو جاتے ہیں۔ یوں انسانوں میں بھی فنا ۱۱۱۱ء و بقا کا ایک چکر چلتا رہتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے جب ۱۱۱۱ء انسان نے منظم ہو کر رہنا سیکھا تو قبیلوں اور نسلوں کی فنا و بقا کا ۱۱۱۱ء چکر بھی شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دنیا میں ۱۱۱۱ء تین براہ اعظم ہیں جنہیں انسانیت کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ ۱۱۱۱ء ایشیا، یورپ اور افریقا۔ ان میں ایشیا کو انسانوں کا اولین ۱۱۱۱ء گہوارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ کیونکہ اس وسیع و عریض ۱۱۱۱ء براہ اعظم میں انسان سب سے پہلے آباد ہوا اور یہیں منظم ۱۱۱۱ء آبادیاں وجود میں آئیں۔ بے شمار نسلوں اور قبیلوں نے ۱۱۱۱ء یہاں جنم لیا بڑھے، چھائے اور بالآخر مٹ گئے۔

آثار بات کے ماہرین وسط ایشیا کے میدانوں کو ۱۱۱۱ء انسانوں کی اولین پرورش گاہ قرار دیتے ہیں کیونکہ انسان پہلے ۱۱۱۱ء چرواہا تھا۔ لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہموار اور سرسبز میدان موسمی ۱۱۱۱ء پالنے والوں کے لیے موزوں ترین تھے۔ یہاں سے اٹھنے ۱۱۱۱ء والے آریاؤں نے ایشیا اور یورپ کے بڑے حصے پر قبضہ کر ۱۱۱۱ء لیا۔ خاص طور سے یورپ میں آباد سفید قام اقوام آریائسل سے ۱۱۱۱ء ہیں۔ یہ وسط ایشیا میں ترک، ایران میں ایرانی اور برصغیر میں ۱۱۱۱ء راجپوت اور باہر سے آنے والی دوسری نسلوں کی صورت میں ۱۱۱۱ء آباد ہیں۔ افغانی اور چین میں آباد ترکستانی بھی آریائسل سے ۱۱۱۱ء ہیں۔ ان کے بعد دوسری اہم نسل زرد اقوام ہیں۔ ان میں ۱۱۱۱ء مشرق بعید کی تمام اقوام شامل ہیں جو منگولیا سے لے کر انڈونیشیا ۱۱۱۱ء تک میں آباد ہیں۔ تیسرے سائی ہیں ان میں عرب ممالک کی ۱۱۱۱ء قومیں شامل ہیں۔

وسط ایشیا کو اگر چہ آریاؤں کا گھر کہا جاتا ہے لیکن اس ۱۱۱۱ء کے بعید کناروں پر کچھ ایسے قبائل بھی آباد تھے جو آریائیں ۱۱۱۱ء تھے۔ ان کے بارے میں ماہرین کہتے ہیں کہ یہ آریا اور زرد ۱۱۱۱ء نسلوں سے مل جل وجود میں آئے ہیں۔ شاید یہ کسی وجہ سے ۱۱۱۱ء دونوں نسلوں سے فرار پانکا لے ہوئے لوگ یا قبیلے تھے جو شمال ۱۱۱۱ء کی سخت موسموں والے خطوں میں جا کر آباد ہوئے اور آپس ۱۱۱۱ء میں میل ملاپ سے نئی نسل وجود میں آئی۔ یہ بنیادی طور پر ۱۱۱۱ء چرواہے اور شکاری تھے۔ گرمیوں میں یہ شکار کر کے اس پر ۱۱۱۱ء گزارہ کرتے تھے اور اپنے جانوروں کو چرا کر مونا تازہ کر ۱۱۱۱ء لیتے تھے اور طویل سرمای میں ان جانوروں کے گوشت پر گزارہ ۱۱۱۱ء کرتے تھے۔ اون، بالوں اور کھالوں سے یہ خیمے بناتے تھے ۱۱۱۱ء اور اپنے لیے لباس بھی تیار کرتے تھے۔ شکار اور سفر کے لیے ۱۱۱۱ء یہ گھوڑے استعمال کرتے تھے۔ گدھے اور تیل ان کی گاڑیاں ۱۱۱۱ء تھپتھپتے تھے۔ ان میں سے بعض قبائل گاڑیوں پر ہی گھر بنا کر

ہو جو بکھرے ہن قبائل کو جمع کرے گا اور مارس کی تلوار کا مطالبہ کرے گا۔

یہ ایک اساطیری داستان تھی۔ جو ہن قبائل میں صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ اس پیش گوئی کے مطابق آنے والے دنوں میں ایک شخص ہن قبائل کو رومنوں کے خلاف جمع کرے گا اور بادشاہ بننے سے پہلے وہ مارس کی تلوار حاصل کرے گا۔ مارس پرانے زمانے میں ہنوں کا ایک بڑا سردار تھا جس کی بہادری اور تیج زنی کی دھوم تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی تلوار غائب ہو گئی تھی۔ مانسک اپنے اس چھوٹے سے قافلے کا سردار تھا۔ یہ اصل قبیلے سے الگ ہو کر شمالی اٹلی سے پرے یورپ کے میدانوں میں خیمہ زن تھا۔ یہ پورا علاقہ ہنوں کے چھوٹے چھوٹے قبائل میں بٹا ہوا تھا۔ وہ ایک جگہ رہائش رکھتے تھے لیکن ان کی رہائش آج بھی خیموں میں تھی اور ان کا طرز زندگی ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ مانسک کے پاس جوان کم تھے لیکن وہ سب بہت بہادر اور لڑاکا تھے۔

اب تم سو جاؤ۔ مانسک نے بچے کو حکم دیا تو وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا اور اس کی دادی نے اسے اون سے بیٹا ہوا کھیل اوڑھ لیا۔

صبح وہ حسب معمول روشنی ہوتے ہی اٹھ گیا تھا۔ سورج نکلنے والا تھا اور اس کے قبیلے والے بیدار ہو کر معمولات زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ بچے کے ذمے صبح جانوروں کو چارادینا تھا اس نے چارے والا تھیلا اٹھایا اور اپنا کام کرنے لگا۔ ابھی وہ جانوروں کو چارادے رہا تھا کہ اس نے مشرق سے سورج کے ساتھ ابھرتے سایوں کو دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سائے کئی گھڑ سواروں میں بدل گئے۔ بچے نے تھیلا پھینک دیا اور چلا کر اپنے لوگوں کو خبردار کیا۔ اس کا باپ اور دوسرے مرد اپنے خیموں سے نکل کر نکل آئے اور حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئے۔ مگر آنے والے تعداد میں ان سے زیادہ اور تیز گھوڑوں پر سوار تھے انہوں نے ہستی میں گھستے ہی قتل و غارت گری شروع کر دی اور جو سامنے آیا اسے بلا امتیاز بوڑھا، بچہ اور عورت قتل کرنے لگے۔ وہ چالاکی سے کام لیتے ہوئے جنگجو مردوں کو دور سے تیروں کا نشانہ بنارہے تھے جبکہ کمزوروں کو ہاتھ سے قتل کر رہے تھے۔

بچہ یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس کا چہرہ غصے اور جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے پاس پڑی ایک کپھاڑی اٹھائی اور ایک حملہ آور کی طرف بھاگا تھا جو ایک عورت کو پکڑے ہوئے تھا لیکن اس تک جانے سے پہلے کسی نے اسے جکڑ

لیا۔ یہ اس کی دادی تھی وہ اسے کھینچ کر ایک گاڑی تلے آئی اور اس کے نیچے دھکیل کر کہا۔ ”یہاں بیٹھے رہو خبردار باہر مت نکلتا۔“

بچہ گاڑی تلے دبک گیا اس کے سامنے اس کا باپ کی حملہ آوروں میں گھرا ہوا لڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے مانسک کو قابو کر لیا اور پھر ایک نے تلوار سے کئی وار کر کے مانسک کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ نصف گھنٹے سے بھی کم وقت میں حملہ آور تمام قبیلے کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے اور کچھ عورتوں کو زندہ پکڑ لیا تھا۔ اب وہ سامان کی تلاشی لینے پھر رہے تھے۔ بچے نے خطرہ محسوس کیا تو گاڑی سے نکل کر بھاگا مگر فوراً ہی دو گھڑ سوار اس کے پیچھے آئے اور اسے گھیر لیا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھا اس نے سبز آنکھوں والے حملہ آور سردار کو دیکھا۔ ”میری دادی کہاں ہے؟“

”وہ مر چکی ہے۔“ سبز آنکھوں والے نے بے رحمی سے کہا۔ ”تمہارا باپ اور اس کے ساتھی بھی مر چکے ہیں۔ کل ہمارے علاقے میں تمہیں کر شکار کھیلنے کا صلہ ہے۔ تم زندہ رہ سکتے ہو میرے غلام بن کر۔“

”گھنٹوں کے بل جھک جاؤ۔“ سردار کے ساتھی نے حکم دیا۔ لیکن جب بچے نے اس کا حکم نہیں مانا تو اس نے کمان سے تیر مارا جو بچے کے پیروں کے پاس زمین میں گر گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”جھک جاؤ۔“

بچے نے ایک نظر اسے دیکھا اور جھکتے ہوئے اچانک زمین سے تیر کھینچ کر نکالا اور اسے سردار کے ساتھی کی ران میں گاڑ دیا۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ گھوڑے سے گرا اور دوسرے ہی لمحے بچہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا کر گھوڑا بھاگا، سردار اور اس کے ساتھی بھی بھاگے۔ انہوں نے تیر برسائے لیکن بچہ نکلتا چلا گیا۔ بہت دیر بعد جب وہ خطرے سے باہر آ گیا تو اس نے گھوڑا روکا۔ ایک تیر پیچھے زمین میں اٹک گیا تھا۔ یہ گھوڑا سامنے آگے ہوتا تو اس کی پشت میں اتر جاتا۔ وہ پہلے بھی اس علاقے میں نہیں آیا تھا۔ ویران جگہ تھی جہاں سردی تھی اور کھانے یا پینے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ دو دن آگے جلا کر اس ویرانے میں بیٹھا رہا۔ وہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اسے معلوم تھا کہ وہاں اسے کچھ نہیں ملے گا سوائے لاشوں اور راکھ کے۔ تیسرے دن اس نے بھوک اور پیاس سے بیتاب ہو کر گھوڑے کے گردن میں حیر مار کر خون نکالا اور اسے پینے لگا۔ یہ شمال کے تمام خانہ بدوشوں کی مشترک عادت تھی۔ جب انہیں کھیں فیض متوجع بھوک پیاس سے واسطہ پڑتا تھا تو وہ اپنے گھوڑے

لہو اساطیرن ہی لیا کرتے تھے اس سے ان کی بھوک پیاس ہٹا دیا ہوتا تھا۔ ابھی وہ خون پی رہا تھا کہ عقب گھوڑوں کے پاؤں کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایک مہمنا گروہ تھا اور ان کا انداز جارہانہ نہیں تھا۔ ان کی لاکھ ایک کنبے سردار شخص کر رہا تھا۔ وہ بچے کے پاس آ کر

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایٹلا۔“ بچے نے جواب دیا۔ ”مانسک کا بیٹا۔“

”سنجے آدمی نے سر ہلایا۔“ مجھے پچھانا؟“

بچے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سنجے آدمی نے کہا۔“

”میں ابھی وہاں مانسک کا بھائی۔“

”میرا باپ، دادی اور سارا قبیلہ مر چکا ہے۔“ ایٹلا نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے اور اب میں قاتلوں کی تلاش میں ہوں۔ میرے ساتھ آؤ اب تم میری ذمے داری ہو۔“

ایٹلا نے کہا اور گھوڑا موڑ کر واپس جانے لگا۔ ایٹلا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر وہ بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے چچا اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے چل پڑا تھا۔ ایٹلا کو معلوم تھا کہ اس کا ایک چچا ہے جو اصل میں اس کے قبیلے کا سربراہ ہے اور اس کا باپ کسی اختلاف کی وجہ سے اس سے الگ ہو کر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان میدانوں میں چلا آیا تھا۔ اب اس کا باپ باقی نہیں رہا تھا تو اس کا چچا ہی اس کا سہارا تھا۔ ایٹلا دو اسے کچھ مسافت پر موجود اپنے قبیلے میں لے آیا۔ یہاں اس کے ساتھ بہت سارے لوگ تھے۔ ایٹلا نے محسوس کیا کہ اس کا اصل قبیلہ یہی ہے۔ وہاں سب نے اسے خوش آمدید کہا تھا سوائے ایک شخص کے اور یہ اس کا سب سے بڑا بھائی تھا۔ ایٹلا نے وہ چینی نقوش رکھتا تھا کیونکہ اس کی ماں کا تعلق انتہائی مال میں بسنے والے خانہ بدوش قبائل سے تھا۔ وہ بچپن میں اپنے قبیلے سے اغوا کر لی گئی تھی اور مختلف ہاتھوں سے ہونی اور اس کے ہاتھ آئی تھی جس نے اسے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ ایٹلا عمر میں ایٹلا سے چار سال بڑا تھا اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اس کی جانشینی میں رکاوٹ بنے گا۔ اس کا

بھائی بعد میں درست ثابت ہوا تھا۔

ایٹلا دو ایک زیرک اور طاقتور حکمران تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کب دشمن پر حملہ کرنا چاہیے اور کب پسپا ہو جانا چاہیے، اس کی اپنی ماں اور بھائی کی موت وہ فراموش نہیں کر سکا تھا۔ اس کے آدمیوں نے جلد اس قبیلے کو تلاش کر لیا جس نے ایٹلا

کے خاندان پر حملہ کیا تھا۔ قتل و غارت گری کے بعد زندہ بچنے والے افراد کو ایٹلا دو کے آدمی زندہ گرفتار کر لائے تھے۔ ان میں وہ سبز آنکھوں والا سردار اور اس کے ساتھی بھی تھے جنہوں نے ایٹلا کے خاندان پر حملہ کیا تھا۔ ایٹلا دو نے ان کی قسمت کا فیصلہ ایٹلا کے سپرد کر دیا۔ سب کا خیال تھا کہ ایٹلا ان کی موت کا فیصلہ کرے گا اس نے اپنا تیر کمان اٹھایا اور ان کے سامنے آ کر اٹھایا اس نے سبز آنکھوں والے سردار سے کہا۔

”گھنٹوں کے بل جھک جاؤ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

سبز آنکھوں والے سردار نے ایٹلا کے انداز میں اپنے لیے قطعی فیصلہ محسوس کر لیا تھا اور وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ گھنٹوں کے بل جھک گیا اور اس نے ایٹلا کی حاکمیت قبول کر لی۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے ساتھی بھی جھک گئے تھے۔ اب وہ سب ایٹلا کے غلام تھے۔ ایٹلا نے تیر کمان ایک طرف پھینک دیا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ ایٹلا دو اس کا طرز عمل دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ ایٹلا کے اندر صرف ایک جنگجو نہیں ہے، ایک لیڈر بھی ہے۔ اسے انسانوں پر حکومت کرنا آتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے موقع دے گا اور ایٹلا اس کی طاقت میں اضافہ کرے گا۔

چند سالوں میں ایٹلا نو عمر لڑکے سے طاقتور جنگجو جوان میں بدل چکا تھا۔ وہ صرف پندرہ برس کی عمر سے جنگی مہمات پر جانے لگا تھا۔ ہن قبائل بڑی تیزی سے وسطی یورپ میں قدم جمانے کے بعد اب جرمنی، گال (موجودہ فرانس و اسپین) اور سلطنت روم کے مغربی بازو کی طرف لپائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہاں بے پناہ دولت تھی اور بے شمار حسین ترین عورتیں بھی جن سے وہ اپنی افزائش نسل کا کام لے سکتے تھے۔ ایٹلا دو کی کامیاب مہمات کی وجہ سے دوسرے قبائل کے جنگجو بھی اس کے ساتھ شامل ہوتے جا رہے تھے اور وہ ان کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ بیس سال کا ایٹلا ان کا کمانڈر تھا۔ ایٹلا دو بہت ہوشیاری سے اپنے جوانوں کو محفوظ رکھتے ہوئے باہر سے آئے جنگجوؤں کو اپنی مہمات میں استعمال کرتا تھا۔ ایٹلا ان کے ساتھ سلطنت روم کی سرحدوں پر آباد کاشت کاروں اور چرواہوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائی کرنے لگا۔ وہ دولت، اناج اور عورتوں کے ساتھ ایسے جوان بھی لا رہا تھا جو بعد میں اس کی فوج کا ایک حصہ بن جاتے۔ جلد ایٹلا دو کا قبیلہ ہنوں کا سب سے طاقتور قبیلہ بن چکا تھا۔

جس وقت بن قباک روم کے لیے خطرہ بننے کی تیاری کر رہے تھے اس وقت خود مغربی سلطنت کا یہ حال تھا کہ سوائے گال اور کسی قدر جرمنی کے تمام مقبوضات روم کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ افریقا کی سرزمین رومنوں کے لیے اجنبی ہو گئی تھی۔ وہ وہاں فوجی مہمات انجام دے سکتے تھے لیکن وہاں مستقل قبضہ کر کے نہیں بیٹھ سکتے تھے کیونکہ اس کے بعد انہیں مقامی افریقی قبائل کی چھاپہ مار کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان سے نمٹنے میں انہیں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ سلطنت کی یہ حالت تھی کہ خزانہ خالی تھا اور فوجی مہم کا خرچ رومن سرداروں کو برداشت کرنا پڑتا تھا یا پھر فوج جہاں سے گزرتی لوٹ مار کر کے اپنے اخراجات پورے کرتی تھی۔

نکے اور نا اہل سردار زادے فوج کے جنرل تھے اور ان میں سے اکثر کو جنگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مشرقی سلطنت کے پاس محاصل کی فراوانی تھی لیکن اس کے پاس مغربی سلطنت جیسے تجربے کا ریسپا ہی نہیں تھے۔ بحیرہ اسود کے شمالی ساحل پر نمودار ہونے والے بن قباک پہلے مشرقی سلطنت کے لیے خطرہ بنے تھے لیکن مشرقی سلطنت کے حکمران تھیوڈوسیوس اول نے نہایت ہوشیاری سے پہلے انہیں یورپ کی طرف دھکیلا اور پھر ان کا سالانہ خراج باندھ کر ایک طرح سے صلح کر لی۔ اگرچہ وہ اسے مدد کا نام دیتے تھے لیکن یہ ایک طرح کا خراج ہی تھا۔ سالانہ دس ہزار ٹیلنٹ (سونے کا سکہ) دے کر مشرقی رومن سلطنت کو وحشی ہنوں سے محفوظ کر لیتا یقیناً ایک قابل تعریف قدم تھا جو ایک سپاہی ضائع کیے بغیر حاصل کیا گیا تھا۔

روم کا حکمران ویلیٹینا نین سوم ایک نا اہل، عیاش اور دماغی لحاظ سے پسماندہ شخص تھا۔ اس کی تمام باگ ڈور اس کی ماں ملکہ میریا اور اس کے مشیر آکس کے ہاتھ میں تھی۔ روم کا قابل ترین جنرل آئی ٹیس قید میں پڑا تھا کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے مادر ملکہ اقتدار پر اپنا قبضہ مضبوط نہیں کر سکتی تھی۔ آکس بھی اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اس کے حکم پر قید خانے میں اس بہترین جنرل کے ساتھ تیسرے درجے کے قیدیوں کا سلسلوک کیا جاتا تھا۔ اسی آئی ٹیس نے زوال کے آخری دنوں میں گال اور جرمنوں کے خلاف کامیاب مہمات سے روم کا گرتا وقار کسی قدر سنبھالا تھا۔ وہ ان چند رومنوں میں سے تھا جو روم کی عظمت کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ بعض مورخین اسے ”آخری رومنوں“ میں شمار کرتے ہیں۔ آخری رومن ان

قابل ذکر رومنوں کو کہا جاتا ہے جن کی خدمات ہمیشہ روم کو خاطر ہوتی تھیں۔

جب ہنوں نے اٹلی کے شمال میں تاخت و تار شروع کی۔ باج گزار کسانوں اور حلیف قبائل کے لئے قافلے روم پہنچنا شروع ہوئے تو ویلیٹینا نین اور ملکہ میریا کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ سرحدی علاقوں میں قلعہ بند روکی فوج کھلے میدان میں ان وحشیوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔ کسی رومی جنرل میں اتنی استعداد نہیں تھی کہ وہ ہنوں کے خلاف منظم کارروائی کر سکتا۔ ایسے میں آکس نے ملکہ میریا کو مشورہ دیا کہ وہ آئی ٹیس کو قید خانے سے نکال کر اپنے دوبارہ رومن فوجوں کا کمانڈر ان چیف اور شاہ روم کا جنگی مشیر بن دے۔ ملکہ میریا آئی ٹیس سے خوف زدہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک بار آئی ٹیس با اختیار ہو گیا تو اسے دوبارہ سے اختیار کرنا بہت مشکل ہوگا لیکن آکس کا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس نے ملکہ میریا سے کہا۔ ”آئی ٹیس روم کا وفادار ہے اور وہ کسی ذاتی مفاد کے لیے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا جس سے زوال پذیر روم خانہ جنگی کا شکار ہو جائے۔ ہم اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔“ ویلیٹینا نین میں اتنی عقل کہاں تھی کہ وہ آئی ٹیس کے بارے میں کوئی مشورہ دے سکتا۔ ملکہ میریا نے آکس کے اصرار پر خود قید خانے میں جا کر آئی ٹیس سے ملاقات کی اور اسے روم کی فوجوں کی سہ سالاری کی پیش کش کی۔ مگر آئی ٹیس نے اس کی پیش کش مسترد کر دی۔ اس نے کہا۔ ”میں تم لوگوں کے لیے کوئی خدمت انجام دینے کو تیار نہیں ہوں۔“

”کیا تم روم کے لیے بھی کچھ نہیں کرو گے۔“ ملکہ میریا نے عیاری سے کہا۔ ”ہن بہت بڑا خطرہ بن رہے ہیں۔“

”روم میرے لیے اس قید خانے کا نام ہے۔“ آئی ٹیس نے بے نیازی سے کہا۔ ”مسئلہ تمہارا، ویلیٹینا نین کا ہے۔“

ملکہ میریا سمجھ گئی کہ آئی ٹیس اپنی شرائط منوانا چاہتا ہے۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

۲۱ گ۔ وہ اس پر برس پڑی تھی۔ آئی ٹیس نے اس کی بالوں کا اثر لے لیا۔ ”اگر تمہیں یہ شرائط قبول نہیں ہیں تو تم اپنی جان اپنے کم عقل بیٹے کو ہنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پیش کرتی ہو۔“

آئی ٹیس کی بات نے ملکہ میریا کا سارا جوش و خروش مہماں کی طرح بٹھا دیا تھا۔ وہ ٹکست خوردہ انداز میں سر ہٹائے قید خانے سے نکلی اور قید خانے کے نگران اوسٹر سے کہا۔ ”اسے رہا کر دو اب یہ تمہارا کمانڈر ان چیف ہے۔“

آنے والے وقت سے خوف زدہ اوسٹر نے دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو کر آئی ٹیس کو فوجی سلام کیا تھا۔ اس نے آکس کے حکم پر آئی ٹیس کی تذلیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مگر شریف آئی ٹیس نے اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اگلے دن اس نے سینٹ سے توثیق شدہ احکامات ملنے کے بعد باقاعدہ طور پر رومن فوجوں کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ سنبھال لیا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ رومن ہنوں کے سب سے بڑے سردار ایمبر دو سے معاہدہ کرنے جا رہا ہے جس کا مقصد جرمنوں کے خلاف مشترکہ محاذ بنانا تھا۔ ملکہ میریا کا خیال تھا کہ آئی ٹیس اس معاہدے کی مخالفت کرے گا لیکن خلاف توقع اس نے اس معاہدے کی حمایت کی اور پیش کش کی کہ وہ خود جا کر بن سردار ایمبر دو سے بات کرے گا۔ ملکہ میریا نے فوراً اسے یہ ذمہ داری سونپ دی۔

☆☆☆

نوجوان اٹلیا ایک بے رحم جنگجو بھی تھا۔ رحم کرنا ویسے بھی ہنوں کی سرشت میں شامل نہیں ہوتا ہے وہ جب کہیں حملہ کرتے تھے تو اپنے پیچھے کوئی چیز سلامت نہیں چھوڑتے تھے اور کسی انسان کو جیتا چھوڑ کر نہیں جاتے تھے۔ ہاں وہی انسان زندہ بیچتے تھے جنہیں غلام بنا کر ساتھ لے جاتے تھے۔ لیکن اٹلیا کچھ زیادہ ہی بے رحم تھا۔ وہ جس بستی پر حملہ کرتا اس کے تمام افراد کو قتل کر دیتا تھا۔ وہ بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہیں بچاتا تھا۔ ایک بستی پر حملہ کر کے اس کے آدمیوں نے سب کو قہری بنا لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بستی کے ہر فرد کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے آدمی بے بس قیدیوں کے گلے کاٹ رہے تھے کہ اٹلیا کی نظر ایک سرخ بالوں والی لڑکی پر پڑی۔ وہ پانچ عمر تھی اور اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات بتا رہے تھے کہ وہ اس کے آدمیوں سے لڑتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ ایک ہن اس کے گلے پر چاقو چلانے جا رہا تھا کہ اٹلیا نے اسے روک دیا۔ لڑکی کا نام آکا تھا اور وہ شادی شدہ تھی لیکن اس جنگ میں اس کا شوہر مارا گیا تھا۔ اٹلیا نے اسے غلام بنا کر

ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔

جب وہ واپس اپنی بستی پہنچا اور اس نے کامیابی کی خبر کے ساتھ لایا گیا سامان اور قیدی ایمبر دو کی خدمت میں پیش کیے تو وہ اپنے بچنے کی اس کاوش سے خوش ہوا تھا۔ مگر جب قیدیوں کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو خلاف توقع گیلو نے بغیر ایمبر دو سے پوچھے آکا پر قبضہ کر کے اسے اپنی بیوی بنانے کا اعلان کر دیا جبکہ اٹلیا اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ مگر گیلو کے اس اعلان کے بعد اس کے پاس سوائے صبر کے کھونٹ پینے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ کیونکہ اگر وہ آکا پر حق جتاتا تو پھر فیصلہ تلوار کرتی۔ اٹلیا محسوس کرتا تھا کہ ابھی وہ اتنا طاقتور نہیں ہوا ہے کہ گیلو کو چیلنج کر سکے۔ حکمرانی کی خواہش اس کے اندر بچپن سے تھی وہ اپنے آبا و اجداد کی طرح باختیار حکمران بننا چاہتا تھا۔ مگر اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

ان ہی دنوں روم کے جنرل آئی ٹیس کی ایک بڑی ٹکڑی کے ساتھ قاصد کی ہنوں کے علاقے میں آمد نے سنسنی پھیلا دی تھی۔ بن آئی ٹیس کے بارے میں ابھی طرح جاننے تھے لیکن وہ اس کے عزائم سے بے خبر تھے، اگر وہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے آیا تھا تو یہ اچھا شگون نہیں تھا۔ ایمبر دو نے ایک بار اٹلیا سے کہا تھا۔ ”مجھے کسی رومن سے اتنا خطرہ محسوس نہیں ہوتا جتنا جنرل آئی ٹیس سے محسوس ہوتا ہے۔ اگر کبھی بن اس علاقے سے بے دخل ہوئے تو اس کی وجہ یہی شخص ہوگا۔“

اب یہی شخص ایمبر دو سے اس کی بستی میں ملاقات کرنے کا خواہش مند تھا اس کے قاصد کا انداز مہذبانہ اور دوستانہ تھا۔ ایمبر دو نے اس ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی اور آئی ٹیس نے اس ملاقات میں ۱۶ دن سے مل کر جرمنوں اور وحشی گائیکوں کے خلاف کارروائی کا منصوبہ دیا۔ ایمبر دو کو بھی ان قبائل کی ملاقات توڑنے سے دلچسپی تھی۔ اگرچہ گائیکوں اور جرمنوں نے بھی ہنوں کے خلاف کوئی بڑی کارروائی نہیں کی اور محدود جنگوں میں وہ ہمیشہ پسپا ہوئے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ دونوں اقوام بھی خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ ہنوں اور ان میں صرف ایک فرق تھا کہ ہن ان کے مقابلے کہیں زیادہ وحشی اور جنگجو تھے۔

شمال مشرق کی طرف سے ان کی آمد جنگی گھوڑوں پر ہوئی تھی اور ہنوں میں بغیر گھوڑے کے جنگ کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن جب وہ اٹلی سے اوپر ڈیونوب کے آس پاس ہنگری کے وسیع میدانوں میں آباد ہوئے تو ان کی آبادی تیزی سے بڑھی اور ان کے پاس جنگی گھوڑوں کی کمی ہو گئی کیونکہ اس نسل کے

گھوڑے یورپ کے موسم میں افزائش نسل نہیں کر پاتے تھے۔ جب ہنوں نے پیدل فوجی دستے بھی تشکیل دیے شروع کیے۔ ان کو یہاں کا ماحول اور موسم راس آیا تھا۔ ان کے جانوروں کے لیے یہاں چراگاہوں میں بہت گھاس تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی آمد کے نصف صدی کے اندر ہن ڈینوب کے اس پار تقریباً گال تک پھیل چکے تھے اور انہوں نے جرمنی کا خاصا بڑا حصہ قبضے میں کر لیا تھا۔ البتہ انہوں نے براہ راست روم میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہنوں کی اس ہچکچاہٹ کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ اول تو وہ متفرق قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی قوت بے پناہ مگر منتشر تھی۔ دوسرے انہیں احساس تھا کہ زوال کے دنوں میں بھی رومن بہت بڑی جتنی قوت رکھتے تھے اور ہنوں کا حملہ مشرقی اور مغربی دونوں سلطنتوں کو ان کے خلاف متحد کر دیتا اور وہ اس متحدہ قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے خوف کی ایک اور وجہ اپنے وطن سے بہت زیادہ دوری تھی۔ وہ اتنے آگے آچکے تھے کہ اب واپسی کا سفر ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ یورپ کی سرزمین پر قابض ضرور ہوئے تھے لیکن ابھی تک اس سرزمین کو پوری طرح اپنا نہیں سکے تھے۔ وہ اجنبیت محسوس کرتے تھے اور شاید یہی ان کی ہچکچاہٹ کی بڑی وجہ تھی۔ مگر سب سے بڑی وجہ مرکزی قیادت کی عدم موجودگی تھی جس نے طاقتور ہنوں کو کنزور کیا ہوا تھا۔

آئی ٹیس ہنوں کی ان کمزوریوں سے واقف تھا لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک قابل شخص کی قیادت میسر آتے ہی ہن طاقتور ہو جائیں گے اور اس کے بعد انہیں جنوب کی طرف پیش قدمی سے روکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ایمبرو دو سے ملاقات کے دوران نوجوان اٹھلا اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس نوجوان میں کوئی خاص بات ہے۔ اس نے ایمبرو دو سے درخواست کی اتحادی کی حیثیت سے وہ جرمنوں کے خلاف جو فوج سپرد کرے گا اس کا سربراہ اٹھلا کو بنا کر اس کے ساتھ کیا جائے وہ اس کی تربیت بھی کرے گا۔ ایمبرو دو نے یہ بات مان لی اور اٹھلا کو آئی ٹیس کے سپرد کر دیا گیا۔ اٹھلا خود بھی اس مشہور جنرل کے ساتھ رہتا اور اس سے سیکھنا چاہتا تھا۔

یورپ میں صدیوں سے سوائے رومنوں کے اور کوئی طاقت موجود نہیں تھی لیکن رومن سلطنت کا در دس ہمیشہ سے جرمن قبائل رہے تھے۔ یوں تو یورپ میں گاتھک، وائی کنگ، وینڈل اور دیگر سمیت بے شمار قبائل آباد تھے جو اکثر رومنوں کے خلاف لڑتے رہے لیکن ان میں سب سے زیادہ

مزاحمت سفید بالوں والے جرمن قبائل نے کی تھی۔ خاص طور سے جب تھیوڈورک اول ان کا بادشاہ بنا تو جرمن قبائل بڑی طاقت بن گئے۔ آئی ٹیس نے نوجوانی میں تھیوڈورک کے خلاف کامیاب جنگیں لڑی تھیں۔ اس کے دل میں جرمن شاہ کے خلاف ذاتی عناد بھی تھا کیونکہ وہ جس عورت سے محبت کرتا تھا اسے جرمن شاہ نے اڑا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قید سے آزاد ہوتے ہی آئی ٹیس نے سب سے پہلے تھیوڈورک کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا۔

اس جنگ سے پہلے بھی یورپ میں عام ناثر یہی تھا کہ ہن رومنوں کے پیچھے حلیف ہیں کیونکہ ان کے حملوں کا نشانہ زیادہ تر رومن کے دکن قبائل بنتے ہیں اور انہوں نے بھی روم کے اندر یا اس کے متبوضات میں پیش قدمی کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہن رومنوں کے شانہ بشانہ لڑنے جا رہے تھے۔ یہ مشترک لشکر جرمن قبائل کی حدود میں داخل ہوا تو اس نے تھیوڈورک کو اپنے لشکر کے ساتھ منتظر پایا۔ امن کی ایک دہائی میں اس نے اپنی فوجی قوت میں خوب اضافہ کیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی تک جرمن قبائل بت پرست ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ عیسائی مبلغوں نے ان میں عیسائیت کا پرچار کرنا شروع کیا اور چوتھی صدی عیسوی تک جرمن قبائل کا بڑا حصہ عیسائیت قبول کر چکا تھا۔ دوسری رومن سلطنت تیسری صدی میں ہی عیسائیت کے زیر اثر آگئی تھی اور اب ویٹی کن میں بیٹھاپوپ بھی امور سلطنت میں دخل اندازی کرتا تھا۔ مگر مشترکہ مذہب نے جرمنوں اور رومنوں کی دشمنی پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ مزے کی بات تھی کہ ویٹی کن نے بھی ان کی دشمنی ختم کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو مغربی سلطنت کا سابق روی رسم و رواج پر قائم رہنا تھا۔ وہ مذہب اور ویٹی کن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دوسرے ویٹی کن کے کرتا دھرتاؤں نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک وہ اس خطے کو چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں تبدیل نہیں کر دیتے۔۔۔۔۔ ان کی اجارہ داری قائم ہونا مشکل ہے اس لیے وہ خانہ جنگیوں کی حمایت کرتے تھے۔

مشرقی سلطنت پہلے ہی عیسائیت کے زیر اثر آچکی تھی اور وہاں کا حکمران قیصر کلیسا کا خادم کہلاتا تھا۔ فلسطین اور خاص طور سے بیت المقدس پر مشرقی سلطنت کا قبضہ تھا۔ اس لیے مذہبی معاملات میں مشرقی سلطنت کی اہمیت نمایاں تھی اور اسے کلیسا کی پوری حمایت حاصل تھی۔ دوسری طرف کلیسا کا اقتدار اصل میں ویٹی کن میں تھا اور یہ مغربی سلطنت میں واقع تھا۔ اس لیے اب کلیسا کی کوشش تھی کہ مغربی سلطنت کو

بھی اپنا ساتھ لائے یا اسے نیست و نابود کر دے۔ تاکہ مالے میں حکومتی امور بھی اس کی مرضی سے طے کیے جاسکیں۔ بعد میں ویٹی کن اپنی کوششوں میں کامیاب رہا۔ نہ اٹلی بلکہ پورا وسطی یورپ اور خاص طور سے میڈی اہاں کا خطہ چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں بٹ گیا جو اپنے وجود کے لیے ویٹی کن کی منظوری کی محتاج تھیں۔ صرف لڑائیں، جرمنی اور انگلینڈ بڑے ممالک کے طور پر قائم رہے۔ اور یہی ممالک بعد میں سیکولر ازم کا گڑھ بنے۔ کیونکہ یہ ممالک مکمل گرفت سے آزاد رہے تھے۔

اس جنگ میں تھیوڈورک کے لشکر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ تقریباً تباہ ہو گیا۔ اب آئی ٹیس اور اٹھلا کے لشکر کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا لیکن اس موقع پر چالاک تھیوڈورک نے صلح کی درخواست کی اور آئی ٹیس نے جو شرائط پیش کیں وہ بے چوں چرا کیے قبول کر لیں۔ رومن اور ہن لشکر یہیں سے واپس ہو گیا۔ اس جنگ میں اٹھلا نے پہلی بار رومنوں کے طرز جنگ کا مشاہدہ کیا۔ آئی ٹیس نے بھی اٹھلا کا ہاتھ لیا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس شخص کو چھوٹ دی گئی تو آنے والے دنوں میں وہ روم کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن جائے گا۔ مگر فی الحال وہ ان کا حلیف تھا۔ اس کے ہاں وجود آئی ٹیس نے اسے اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور ہن لشکر کو ہنگری کی سرحد پر چھوڑ کر آئی ٹیس گال چلا گیا اور اس نے وہاں کے معاملات درست کیے۔ نا اہل کمانڈروں کو ہٹا کر اہل لوگ تعینات کیے۔ سرحدی قلعوں کو مستحکم کیا جہاں سے وحشی قبائل کے خلاف کارروائی کی جاتی تھی اور سرحدوں کا نلام بہتر کیا۔ اس نے اٹھلا سے کہا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرے وہ اسے واپسی میں روم لے جائے گا جو ایک جہان میں انتخاب ہے۔

جب آئی ٹیس فاتحانہ انداز میں روم واپس آیا تو اس کے ساتھ اٹھلا بھی تھا۔ ویلیٹا نینن، دوسرے ارکان حکومت اور شہریوں نے فاتح لشکر کا دالہانہ استقبال کیا۔ مالی غنیمت اور غلاموں کے ساتھ واپس آکر آئی ٹیس نے اپنی دہ ساکھ بحال کر لی تھی جو برسوں کی قید نے دھندلا دی تھی۔ اس نے ثابت کیا کہ وہی روم کا اصلی محافظ ہے۔ ملکہ میریا اور آکٹس کے لیے اس کی کامیابی ضروری لیکن ناقابل برداشت تھی۔ آئی ٹیس جانتا تھا کہ اب اس کے خلاف سازشوں کا ہینڈ ورابا کس کھل جائے گا۔ اس لیے اس نے پہلے ہی جوانی سازش تیار کر لی۔ اس نے محسوس کیا کہ کم عقل ویلیٹا نینن کو قابو میں رکھنا آسان ہوگا اگر وہ ملکہ میریا، شہزادی ہنوریا اور

آکٹس کو راستے سے ہٹا دے۔ اس نے قید خانے کے گمران اوسٹر کو استعمال کیا اور اسے ملکہ کا میکس دے کر راضی کیا کہ وہ شاہی محل کے باغ میں داخل ہو کر ویلیٹا نینن کو قتل کر دے۔ اس نے اسے سو پلنٹ دینے کا وعدہ کیا۔

مگر جب اوسٹر میکس دکھا کر باغ میں داخل ہوا اور وہاں ٹپلتے ویلیٹا نینن پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو عین موقع پر آئی ٹیس نے وہاں پہنچ کر اوسٹر کو قتل کر دیا اور پھر ویلیٹا نینن نے اوسٹر کے پاس سے اپنی ماں کا میکس برآمد کیا۔ اس کے بعد آئی ٹیس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ شاہ کو اس کی ماں کے خلاف بھڑکا دے لیکن ساتھ ہی اس نے ویلیٹا نینن کو مشورہ دیا کہ وہ ابھی اپنی ماں پر کچھ ظاہر نہ کرے اور خود اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے۔ آئی ٹیس جانتا تھا کہ ملکہ، شہزادی اور آکٹس تینوں اس سے شدید نفرت کرتے تھے۔ وہ ان کی طرف سے ویلیٹا نینن کو برگشتہ کرنا چاہتا تھا۔ اٹھلا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ روم اس کی توقع کے خلاف ثابت ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا یہاں اسے ہر طرف فوجی تیاریاں نظر آئیں گی مگر یہاں تو جنس، دولت اور سازشوں کی ایسی جنگ جاری تھی جس سے اٹھلا جیسے خانہ بدوش بے خبر تھے۔

کہتے ہیں کہ آکٹس نے سازش کر کے آئی ٹیس اور اٹھلا دونوں کو بیک وقت قتل کرانے کی کوشش کی لیکن خوش قسمتی سے جس وقت وہ دونوں زہریلے جام پینے جا رہے تھے آئی ٹیس کی بیٹی لیوٹو دیلیا نے اسے ایک سرکاری خط لاکر دیا جس میں ہن سردار ایمبرو دو کی موت کی اطلاع تھی۔ جب آئی ٹیس نے یہ خبر اٹھلا کو دی تو وہ فوراً واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کا جام وہیں رہ گیا تھا جسے ایک خادم لی گیا اور جب آئی ٹیس واپس آیا تو اس نے خادم کو اپنے ہاں رکھ لیا۔ دیکھا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے آئی ٹیس نے مناسب سمجھا کہ کچھ دنوں کے لیے روم سے باہر چلا جائے۔ اس نے ویلیٹا نینن کو مشورہ دیا کہ مشرقی سلطنت کے حکمران تھیوڈورکس دوم سے بات کی جائے اور دونوں سلطنتوں کو اپنے دشمنوں کے خلاف مشترکہ کارروائی کے لیے اتحادی بنایا جائے۔ اس کی تجویز مان لی گئی اور آئی ٹیس کو اس وفد کا سربراہ بنا کر تھیوڈورکس دوم کے پاس بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر عین روانگی کے وقت وفد کو روک لیا گیا۔

☆☆☆

ہن قبائل میں عام طور سے سب سے طاقتور ہی حکمران بنتا تھا لیکن ایمبرو دو کی موت کے بعد گیلو کو چیلنج کرنے والا کوئی

نہیں تھا اس لیے حکمرانی کا تاج گلیو کے سر پر رکھا جانے والا تھا۔ مگر عین تاج پوشی کے وقت اٹیلا وہاں پہنچ گیا اور اس نے گلیو کو چیلنج کر دیا کہ وہ اس تاج کا مستحق نہیں ہے۔ گلیو نے مقابلے سے بچنے کے لیے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اٹیلا کو گرفتار کر لیں لیکن ابھی وہ باضابطہ حکمران نہیں بنا تھا اس لیے کسی نے بھی اس کے حکم کی تعمیل کی کوشش نہیں کی۔ اٹیلا نے گلیو سے کہا کہ اسے اپنی سرداری ثابت کرنے کے لیے اس سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ مجبوراً گلیو کو اس کا چیلنج قبول کرنا پڑا۔ ایک دن بعد دونوں میدان میں آمنے سامنے تھے۔ اس مقابلے میں اٹیلا خود شدید زخمی ہوا تھا مگر بالآخر اس نے گلیو کو شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کے بعد تمام قبیلے نے متفق ہو کر اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا۔

ایمر دو کی وراثت کے ساتھ گلیو کی تمام دولت اور اس کی بیویاں بھی اٹیلا کے حصے میں آئی تھیں مگر اٹیلا نے اس کی تمام بیویوں کو آزاد کر دیا اور صرف آکارا کو اپنی بیوی کے طور پر منتخب کیا تھا۔ آکارا اس اعزاز پر بہت خوش تھی اور وہ بھول گئی تھی کہ یہی اٹیلا اس کے تمام قبیلے اور خاندان والوں کی موت کا ذمے دار تھا۔ اسے صرف یہ یاد رہا کہ اٹیلا اس سے محبت کرتا ہے اور اس نے تمام عورتوں اور دو شیرازوں کو چھوڑ کر اسے اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ کیا تھا وہ اس پر بہت خوش اور راضی تھی۔ وہ سچ سچ اٹیلا سے محبت کرنے لگی تھی۔ شادی کے بعد اس نے اٹیلا کو اکسایا کہ وہ اب ہنوں کا بادشاہ بننے کی کوشش کرے۔ چاہے اس کام کے لیے اسے خون کی ندیاں کیوں نہ بہانی پڑیں۔

حکمران بنتے ہی اٹیلا نے ایمر دو کی سکون پسندی کی پالیسی کو خیر باد کہا اور آس پاس کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ جس بستی کے لوگ بنا کسی مقابلے کے اس کی اطاعت تسلیم کر لیتے تھے انہیں امان مل جاتی تھی۔ ان سے صرف خراج لیا جاتا اور اس کے جوان اٹیلا کی فوج میں بھرتی کر لیے جاتے تھے۔ لیکن جس بستی سے مزاحمت کی جاتی تھی وہ اٹیلا کی وحشت کا شکار ہو جاتی، اس کے تمام باشندوں کو قتل کر دیتا اور بچنے والوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ بستی کو مکمل طور پر اوث کر جلا دیا جاتا تھا۔ مرنے والوں کی کھوپڑیاں ہانسون پر لگا دی جاتی تھیں اور بستی کے پاس سے گزرنے والے اس منظر کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتے تھے۔ مختصر عرصے میں اٹیلا کا نام دہشت کا نشان بن گیا تھا۔ لوگ صرف اس کا نام سن کر قہر اٹھاتے تھے۔ اس کا لشکر جس بستی کا رخ کرتا تھا مگر اس کے باشندے اطاعت پر تیار نہیں ہوتے تھے تو بستی سے نکل

بھاگنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ اٹیلا سے مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اسے خدا کا نذر کہنے لگے تھے۔

اٹیلا نے بچپن میں جو خواب دیکھا تھا وہ اس کی تعبیر کا ایک حصہ حاصل کر چکا تھا۔ مگر وہ ہنوں کا بادشاہ بننا چاہتا تھا اور یہ خواب مارس کی تلوار حاصل کیے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تلوار غائب تھی اور کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اٹیلا کی فوجی مہمات کی وجہ سے آس پاس کے تمام علاقے اس کے زیر نگیں آ چکے تھے۔ ڈینوب کے وسیع میدانوں میں اب اس سے زیادہ طاقتور حکمران اور کوئی نہیں تھا۔ اس کے پاس ایسا لشکر جمع ہو گیا تھا جس میں دولاکھ کے قریب جنگجو اس کے ایک اشارے کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اٹیلا روم کی شان و شوکت دیکھ کر آیا تھا اور اس کے ذہن میں ویسا ہی ایک محل بنانے کا خیال تھا۔ شاہی محل میں ایک محفل طرب و نشاط کے دوران اس کی ملاقات شہزادی ہنور یا سے ہوئی اور شہزادی اسے محل کے خاص حصے میں لے گئی۔ یہاں ایک شاندار زیر زمین نہانے کا تالاب تھا جس میں گرم پانی آ رہا تھا اور اس سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اٹیلا کو شہزادی کے حسن نے اتنا متاثر نہیں کیا تھا جتنا اس تالاب کی خوب صورتی نے کیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ بادشاہ بنا تو ایسا ہی عالی شان محل اور اس میں تالاب بنوائے گا۔

ہنور یا سے اس کے تعلقات بس اس ایک رات تک محدود رہے تھے لیکن وہ تالاب اس کے ذہن میں بس گیا تھا اور جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے اپنے لیے ویسا ہی تالاب بنانے کا حکم دیا تھا۔ ہنوں میں مکان بنانے کا تصور نہیں تھا چہ جائیکہ سنگ مرمر کا تالاب بنانا۔ بڑی مشکل سے پکڑے جانے والے غلاموں کی مدد سے یہ تالاب بنایا گیا۔ پھر اٹیلا نے اپنے لیے محل بنانے کا حکم دیا۔ اب تک اس کی بستی خیموں پر مشتمل تھی لیکن اٹیلا کی دیکھا دیکھی اس کے سرداروں نے بھی پتھر اور لکڑی کے کچے مکانات بنانا شروع کر دیے۔ عام ہن اب بھی خیموں میں رہتے تھے مگر آبادی کے لحاظ سے اٹیلا کا دارالحکومت بہت وسعت اختیار کر گیا تھا۔ اگر اسے ترقی کا موقع ملتا تو شاید آنے والے دنوں میں یہ سچ سچ کا شہر بن جاتا۔

اٹیلا نے محسوس کیا کہ مارس کی تلوار حاصل کیے بغیر وہ اپنا خواب پورا نہیں کر سکتا ہے۔ ہن اسے طاقتور سردار تو مانتے تھے لیکن تمام ہنوں کا بادشاہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان ہی دنوں آکارا اس کے بیٹے کو جنم دینے کے دوران انتقال کر گئی۔ اٹیلا کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا کیونکہ وہ آکارا سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس کی موجودگی میں اس نے کوئی کنیز تک

رہی تھی اور خود کو صرف آکارا تک محدود رکھا تھا۔ یہ انگیزات تھے کہ ہنوں میں کثیرالازدواجی عام بات تھی۔ معمولی قبیلوں کے سردار بھی کئی کئی بیویاں رکھتے تھے۔ آکارا کی جدائی میں غم سے دیوانہ اٹیلا اپنے گھوڑے پر وار ہو کر کہیں چلا گیا اور جب تک اس کے محافظ اور سردار اس کے پیچھے جاتے وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اٹیلا کئی دن غائب رہا اور جب اس کے آدی سمجھ رہے تھے کہ وہ کسی دشمن کے حملوں اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے تو واپس آ گیا اور اس کے پاس ایک تلوار تھی جس کے بارے میں اس نے دعویٰ کیا کہ وہ مارس کی تلوار ہے اور اس نے آکارا کی روح کے ایک الہی اشارے کے تحت اسے تلاش کیا ہے۔

دعویٰ کرنے والا اٹیلا تھا اس لیے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اسے جھٹلا سکے۔ یوں اٹیلا کے بادشاہ بننے کی راہ ہوار ہو گئی اور اس نے ہنوں کے بادشاہ کا تاج سر پر رکھ لیا اور اس کے اچھی آس پاس ہنوں کے تمام قبائل میں پھیل گئے۔ اس نے سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ خود آکر اس کی بادشاہت تسلیم کر لیں دوسری صورت میں اس کا لشکر حرکت میں آجائے گا اور پھر تلوار سردار کا فیصلہ کرے گی۔ تو بے فیصلہ ہن سرداروں نے اٹیلا کی بادشاہت تسلیم کرنے میں عافیت جانی تھی اور صرف دس فیصد باغی رہے۔ مگر اٹیلا نے ان کے قبیلوں کو تباہ کرنے کے بجائے صرف ان سرداروں کو سزا دی اور انہیں قتل کر کے ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو سردار بنادیا۔ یوں چند سال کے اندر ہنوں کے تمام قبائل اس کے جھنڈے تلے جمع ہو چکے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت یورپ میں جنگجو ہنوں کی تعداد چھ سے سات لاکھ کے درمیان تھی اور یہ تمام کے تمام اٹیلا کی قیادت میں تھے۔ اتنی بڑی فوجی قوت بھی رومنوں کے پاس بھی نہیں رہی تھی۔ یہ قوت ایسی نہیں تھی جسے آس پاس کے رہنے والے نظر انداز کر سکتے۔ وہ سب دہل کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

سب سے زیادہ خوف زدہ مغربی رومن سلطنت کے حکمران تھے۔ کیونکہ ہن ان کے سردوں پر بیٹھے تھے اور اب انہیں اٹیلا جیسا حکمران مل گیا تھا۔ آئی ٹیس کو مشرقی سلطنت کے پاس جیسے کا فیصلہ اتنا کا شکار تھا اور آئی ٹیس کی گئی بار کی درخواست کے باوجود اسے روانہ نہیں کیا گیا تھا اس کے پس پشت ملکہ میریا اور آکٹس کا ہاتھ تھا۔ لیکن جیسے ہی اٹیلا کا خطرہ محل کر سامنے آیا۔ ملکہ میریا اور آکٹس کا خیال بدل گیا اور انہوں نے آئی ٹیس کو مشرقی سلطنت کے ساتھ معاہدے کے لیے بھیجنے پر آمادگی

ظاہر کر دی۔ اگرچہ آئی ٹیس کے خیال میں ان لوگوں نے بہت دیر کر دی تھی۔ اس کام کے لیے بہترین وقت وہ تھا جب مشرقی سلطنت نے اٹیلا کو خراج دینے سے انکار کر دیا تھا اور اسے اپنے مغربی بازو کی مدد کی ضرورت تھی۔

ان ہی دنوں کی وجہ سے شاہ ویلیٹا نمین اپنی بہن ہنور یا سے برگشتہ ہو گیا اور اس نے اس پر اپنے خادم کے ساتھ ملوث ہونے کا الزام لگایا اور اسے قید کر دیا۔ ملازم محبوب کو قتل کر دیا گیا تھا اور ہنور یا کو آئی ٹیس کے سپرد کیا کہ وہ اسے مشرقی سلطنت میں واقع مسیحیوں کی سب سے بڑی خانقاہ پہنچا دے جہاں ہنور یا تمام عمر نرن بن کر رہے گی۔ حالانکہ اس وقت وہ امید سے تھی اور اس کی کوکھ میں لپٹے والا بچہ یقیناً اس کے خادم محبوب کا تھا۔ آئی ٹیس خوش ہوا کہ روم میں اس کا ایک مخالف کم ہو گیا اور وہ ہنور یا کو لے کر مشرقی سلطنت کے دارالحکومت روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں مشرقی سلطنت میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ تھیوڈوسیوس دوم گٹر سواری کے دوران گرنے سے ہلاک ہو گیا تھا اور اس کے جانشین مارسین نے ہنوں سے کیے تمام معاہدے ختم کر دیے تھے اور ان کو خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کھلی جنگ۔ ایسے میں مشرقی سلطنت کو بھی مغربی سلطنت کی ضرورت تھی۔ آئی ٹیس اور اس کے وفد کے وہاں پہنچنے سے پہلے خبریں مارسین تک پہنچ گئی تھیں اور وہ آئی ٹیس کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ ذاتی طور پر آئی ٹیس کا مداح تھا اور اس کے خیال میں مغربی سلطنت ابھی تک آئی ٹیس جیسے وفاداروں کی وجہ سے قائم تھی۔ اس نے آئی ٹیس کے لیے اپنا دربار لگایا اور اسے ایک سربراہ مملکت کا پرہیزگار دلہنہ لکھن شہزادی ہنور یا کو اپنی درباری خانقاہ سے آلے والی ٹوں کے سپرد کر دیا گیا تھا جو اسے پہنچا دے گی۔ یہی درستی وہاں سے آئی ٹیس۔ ہنور یا کسی صورت میں نہیں ملنا چاہتی تھی لیکن ان طاقتور تلوں کے مقابلے میں اس کی ایک نہ پھلی۔

مارسین ادیٹر عمر کا چہرے سے چالاک اور عیاں نظر آنے والا شخص تھا۔ رومن ہونے کے باوجود وہ حلیے سے کوئی مشرقی بادشاہ نظر آتا تھا اور اس کے محل کی شان و شوکت اور خوب صورتی روم کے شاہی محل سے کہیں زیادہ تھی۔ آئی ٹیس کو یہاں کہیں زیادہ نفیس اور شاندار ساز دسامان دکھائی دیا تھا۔ مارسین نے دربار کے بعد اس کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دعوت میں آئی ٹیس ایک سرخ بالوں والی خادمہ کو بار بار دیکھ رہا تھا مارسین سمجھا کہ وہ اسے پسند آگئی ہے۔ اس نے کہا۔ ”جنرل آئی ٹیس اگر تمہیں یہ

خادمہ پسند ہے تو یہ آج سے تمہاری ہے۔“
”میں اس تحفے کے لیے شہنشاہ کا شکر گزار ہوں۔“

آئی ٹیس نے اپنا جام اٹھاتے ہوئے کہا۔
”کاش کہ تم میری فوج میں جنرل ہوتے۔ یقین کرو تم اس سے کہیں زیادہ مرتبہ پاتے۔“ ماریسین نے ترغیب آمیز لہجے میں کہا۔

”شہنشاہ میں روم کا خدمت گزار ہوں اس طرح سے میں آپ کا بھی خادم ہوں یہ بھی ایک طرح سے روم ہی ہے۔“ ماریسین جانتا تھا کہ آئی ٹیس صحیح معنوں میں روم کا خدمت گار ہے۔ دعوت کے بعد وہ سنجیدہ موضوعات کی طرف آئے جن میں سرفہرست اٹھلا تھا۔ آئی ٹیس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھلا کو ایک سخت ترین دشمن قرار دے دیا۔ ”شہنشاہ معظم! اس کی فوجی قوت روم کے مشرقی اور مغربی بازوؤں سے کہیں زیادہ ہے اور اس کے سپاہی رومن سپاہیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ میں ان کو لڑتے دیکھ چکا ہوں اور ان کی بے جگری کا معترف ہوں۔“

”اس صورت میں ہمیں اٹھلا سے نمٹنے کے لیے کیا حکمت عملی اپنانی چاہیے؟“

”سازش۔“ آئی ٹیس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہن بہت طاقتور ہیں لیکن اٹھلا سے پہلے ان کی حیثیت بھیڑیوں کے الگ الگ گروہوں جیسی تھی۔ اب اٹھلا کی وجہ سے وہ ایک ہو گئے ہیں۔“

ماریسین نے آئی ٹیس کی بات پر غور کیا۔ ”یعنی ہمارا اصل نشانہ اٹھلا ہونا چاہیے؟“

”بالکل شہنشاہ، اگر اٹھلا نہ رہا تو ہن دوبارہ پہلے کی طرح منتشر ہو جائیں گے اور ہم ان سے آرام سے نمٹ سکیں گے۔“

”کیا تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے؟“ آئی ٹیس نے جواب دیا۔ ”کیا آپ کے پاس ایسا کوئی آدمی ہے جو رومن نہ ہو اور ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہو۔ وہ آپ کا اتنا وفادار ہو کہ آپ کے حکم پر آگ کے دریا میں کود جائے اور اپنی جان کی پروا نہ کرے۔“

”بالکل ایسا ایک آدمی ہے۔ وہ اتنا ماہر مخبر باز ہے کہ آٹھ بند کر کے صرف آواز پر نشانہ لگا سکتا ہے۔“ ماریسین نے کہا اور اپنے اس غلام کو طلب کیا۔

گوڈین نامی یہ شخص شامی نژاد عرب تھا اور برسوں سے ماریسین کا خاص خادم تھا۔ وہ اس سے بہت خاص کام لیتا تھا۔ گوڈین سے مل کر اس کے کمالات دیکھ کر جب آئی ٹیس

اپنی خواب گاہ میں پہنچا تو سرخ بالوں والی لڑکی پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ آئی ٹیس نے اس کا نام پوچھا اس نے جواب دیا۔

”اولڈو کا۔“

”تمہارا تعلق کس جگہ سے ہے۔“
”ہنگری کے میدانوں میں آباد ایک قبیلے سے۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”میرے قبیلے پر اٹھلانے حملہ کیا اور میرے باپ اور بھائیوں سمیت تمام قبیلے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صرف مجھے جیسی جوان عورتوں اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑا۔ ہمیں غلام بنا کر بیچا گیا۔ میں کئی ہاتھوں سے ہوتی ہوئی۔۔۔ یہاں شہنشاہ کے پاس آئی ہوں۔ میری حیثیت محل کی خادماؤں کی سی ہے۔“

”اٹھلا کے لیے تمہارے دل میں کیا جذبات ہیں؟“

اولڈو کا نے اس سوال پر چونک کر آئی ٹیس کی طرف دیکھا۔ ”میں کبھی نہیں معزز جنرل؟“

”اگر تمہیں موقع ملے تو کیا تم اٹھلا سے بدلہ لینا پسند کرو گی؟“

اولڈو کا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ جنرل اس سے مذاق کر رہا ہے مگر جب آئی ٹیس سنجیدہ رہا تو اس نے جواب دیا۔ ”ہاں میں اس سے بدلہ لینا پسند کروں گی۔“

”اگر تمہیں اس کے لیے اپنی جان دینا پڑے تب۔۔۔؟“

”تب بھی میں اٹھلا کو مارنا پسند کروں گی چاہے اس کے بعد مجھے دنیا کا بدترین عذاب دے کر مارا جائے۔“

آئی ٹیس اس کے الفاظ تو ل رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ لڑکی واقعی اٹھلا سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ جب آئی ٹیس انیمرو سے ملنے گیا تھا تب ہی اس کی زیرک نگاہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ گیلو کی بیوی آکارا اور اٹھلا کے درمیان پسند کا رشتہ ہے۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا بعد میں اٹھلانے اسی عورت سے شادی کی اور وہ اس کے بیٹے کو جنم دیتے ہوئے مر گئی تھی۔ اب اس نے اولڈو کا کو دیکھا تو اسے لگا جیسے آکارا دوسرا جنم لے کر اس کے سامنے آگئی ہو، وہ ہو ہو آکارا تھی۔ اسی وجہ سے وہ دورانِ دعوت بار بار اولڈو کا کو دیکھ رہا تھا اور ماریسین اس کی توجہ سے کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ آئی ٹیس نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں موقع دوں گا اور جب تم اٹھلا کے پاس جانے میں کامیاب ہو گی تب تمہیں اس پر یقینی وار کرنا ہو گا یا درکنادہ بچ نہ سکے۔“

”آپ فکر نہ کریں ایک بار مجھے موقع مل گیا تو اٹھلا بچ

لکھیں ملے گا۔“ اولڈو کا نے پورے یقین سے کہا تھا۔

اس دوران میں اٹھلا اپنے زیریں علاقوں میں مضبوط اور قلعہ چوکیاں بنوا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اگر کسی علاقے پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا ہے تو مضبوط قلعوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے وہ کسی قلعے پر قبضہ کرتا تو اسے تباہ کرنے سے گریز کرتا تھا البتہ اس کی پوری آبادی کو ضرورت سے قلعہ کر دیتا تھا اور نکل جانے والوں کو غلام بنا کر لے جاتا تھا۔ وہ تمام ہنوں کو اپنے ماتحت لے آیا تھا اور اس نے پندرہ سال سے پچاس برس تک کے ہر ہن مرد پر فوجی خدمت لازمی قرار دے دی تھی۔ اب انہیں اپنے جانوروں کی دیکھ بھال اور کھیتوں میں کام کرنے کے لیے غلاموں کی ضرورت تھی۔ اس لیے کسی آبادی پر حملے کے بعد وہاں بچ جانے والے ہر جوان مرد اور عورت کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ البتہ بوڑھوں اور بعض اوقات بچوں کو اٹھلا قتل کر دیتا تھا۔ اس کے نزدیک بوڑھے اور بچے ہر جگہ ہوتے تھے اور ان کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

رومن سلطنت کی طرف بڑھنے سے پہلے اٹھلانے یورپ کے دوسرے قبائل کو اپنا مطیع بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ان تمام سرداروں کو طلب کیا جن کے قبائل اس کے علاقے کے آس پاس موجود تھے۔ طلب کرنے کے ساتھ اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ جو سردار حاضر نہیں ہوا سمجھا جائے گا وہ اٹھلا سے جنگ پر آمادہ ہے۔ اس دھمکی کے بعد کسی سردار کے لیے اٹھلا کی طلبی کو نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ وہ ایک ایک کر کے اٹھلا کے زیرِ تعمیر دار الحکومت میں حاضر ہو کر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلانے لگے۔ جواب میں اٹھلا ان سے اس کی استعداد کے مطابق خراج طلب کر کے انہیں امن و امان کی یقین دہانی کرا دیتا تھا۔ ان میں سے اکثر قبائل کی دوسرے قبائل سے دشمنی تھی اور مناسب خراج کے بدلے اٹھلا کے تحفظ کی چھتری ان کے خیال میں بڑا سودا نہیں تھا۔

اپنے ماتحت علاقوں میں امن قائم رکھنے کے لیے اٹھلا نے باقاعدہ قوانین نافذ کر دیے جس کے تحت اس کے مقرر کیے ہوئے اعمال لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کرتے تھے اور معاملہ دو قبیلوں کے درمیان ہوتا تو اسے براہِ راست اٹھلا کے سامنے پیش کر دیا جاتا تھا۔ یوں اٹھلا بچ بادشاہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ چاروں طرف سے خراج کا اتاج، سونا، ہانڈی، ہتھیار، غلام اور گھوڑے چلے آ رہے تھے۔ اس لڑانے سے اٹھلا نے نئی فوج تیار کرنا شروع کر دی تھی۔ اس کی نظر بس اب روم پر تھیں۔ بادشاہ بننے کے بعد قسمت اس پر مہمان تھی اور اسے واحد دھچکا مشرقی بازنطینی سلطنت کے

حکمران ماریسین کی طرف سے لگا تھا جس نے خراج کی رقم دینے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے سرحدی قلعوں کو ہنوں کے خلاف مضبوط کرنے لگا تھا۔

مگر چالاک اٹھلا نے اس کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا۔ اول تو بازنطینی سلطنت اس کے علاقے سے فاصلے پر تھی اور وہاں فوج کشی کرنے کے لیے اسے بہت بڑے لشکر کی ضرورت پڑتی اور پھر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اسی حساب سے نہ صرف رسد لے جانی پڑتی بلکہ رسد کے راستوں کی حفاظت کی فکر بھی لازمی تھی۔ اس کے بعد اسے تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ اس کے مقابلے میں روم کی مغربی سلطنت نہ صرف نزدیک تھی بلکہ وہ کمزور بھی تھی اور اٹھلا اس کی کمزوریوں سے بھی واقف تھا اس لیے اس نے اسے اپنے نشانے کے طور پر منتخب کر لیا۔ مگر ابھی روم کی طرف بڑھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

اٹھلا جانتا تھا کہ روم کی اصل طاقت اس کے مقبوضات ہیں۔ گال اور اسپین سے روم کو خراج آتا تھا اور اسی رقم سے روم کی فوجی طاقت برقرار رکھی جاتی تھی۔ اگر روم سے گال کا صوبہ اور اسپین چھین جاتے تو چند سالوں میں اس کی فوجی قوت ختم ہو سکتی تھی۔ افریقی مقبوضات اور شام و مصر اس سے پہلے ہی چھین چکے تھے۔ خاص طور سے مصر جو اتاج اور روم کی ضرورت پوری کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا ان مشرقی بازنطینی سلطنت کے ماتحت تھا اور وہاں کے حکمران صدیوں پہلے روم سے ٹکڑی کا رشتہ توڑ چکے تھے۔ حد یہ کہ سسلی اور قبرص کے صوبے بھی روم کے ہاتھ سے لکل چکے تھے۔ میڈی ٹرینین میں چھوٹی چھوٹی ملکیتیں بحری قوت کے بل بوتے پر سر اٹھارہ تھیں۔ روم کی بحری قوت ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔ البتہ اٹلی کی مدد تک رومی سلطنت پہلے کی طرح طاقتور تھی۔

اٹھلا نے اپنی حکمت عملی پر عمل شروع کیا اور گال کے علاقے میں اس کے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے حرکت کرنے لگے۔ وہ گاؤں دیہات پر حملہ کرتے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے بعد وہ بچ جانے والوں کو غلام بنا کر گاؤں کو نذر آتش کر دیا کرتے۔ اس سے پہلے ہنوں نے اکا دکا حملے کیے تھے اور رومن دستوں نے انہیں بے آسانی مار بھگایا تھا لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی۔ ہن فوجی دستے نہایت تیز رفتاری سے حملہ کرتے تھے اور اس سے پہلے کہ رومی دستے علاقے میں آتے وہ سامان اور غلاموں سمیت اپنے علاقے میں واپس لوٹ جاتے تھے۔ سرحدی قلعوں کے محافظ پہلے اپنی حفاظت کی تدبیر کرتے تھے پھر اپنے باج گزاروں کی مدد

کی کوشش کرتے لیکن اتنی دیر میں وہ بے چارے ہر مدد سے بے نیاز ہو چکے ہوتے تھے۔

یہ مقامی لوگ رومی نہیں تھے بلکہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ہاں ان کا رومنوں سے مشترک رشتہ مذہب کا تھا۔ پادریوں کی کوشش سے ان میں سے بیشتر قبائل عیسائیت قبول کر چکے تھے لیکن بدقسمتی سے رومنوں کے خیال میں مذہب سے زیادہ نسل کا رشتہ اہم تھا اور وہ رومنوں کے ماتحت اور باج گزار تھے۔ ان کی زندگی اور موت کا روم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ پہلے بھی انہیں فوجی طاقت کے نل بوتے پر دباتے آئے تھے اور ان کے خیال میں آنے والے وقت میں بھی وہ فوجی قوت سے فرمانبردار رہ سکتے تھے اور رومنوں کا یہ خیال کسی حد تک درست بھی تھا۔ اگر رومن طاقتور نہ ہوتے تو یہی قبائل بھی اس کی اطاعت قبول نہ کرتے۔

ایٹلیا روم کی ان ہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ دوسرے قبائل سے تعلق رکھنے والے ایٹلیا کے جاسوس اپنے ہم نسل قبائل میں اس کا پیغام پھیلا رہے تھے۔ وہ ان قبائل کو رومنوں کے خلاف اکساتے تھے، جو قبائل رومنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایٹلیا کے جاسوسوں کے اکسانے میں آکر روم کو خراج دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ جو قبائل ان جاسوسوں کے بہکاوے میں نہیں آتے تھے ان پر ایٹلیا کے چھاپے مار دیتے تھے۔ انہیں اس لیے غیظ و غضب کی آگ میں جلا کر خاکستر کر دیتے تھے۔ اس لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے ایٹلیا ایک طرف تو روم کی رسد کے راستے روک رہا تھا دوسرے وہ محکوم قبائل کو رومنوں کے خلاف اکسا رہا تھا جو ان کے سامنے ان کی حفاظت کرنے سے قاصر تھے۔ اس لیے قبائل میں بغاوت پھیل رہی تھی اور یہی ایٹلیا چاہتا تھا کہ جب وہ گال پر حملہ کرے تو مقامی قبائل رومنوں کا ساتھ دینے سے گریز کریں۔ ایٹلیا پورے گال اور ایتھین پر قبضہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس صورت میں اسے بہت زیادہ فوج ان علاقوں میں استعمال کرنی پڑتی جبکہ وہ اپنی فوجی قوت روم پر حملے کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار روم پر اس کا قبضہ ہو جاتا تو مقبوضات خود بہ خود اس کے ہاتھ آ جاتے۔

ایٹلیا کا اصل منصوبہ روم اور گال و ایتھین کے درمیانی راستوں پر قبضہ کرنا تھا کہ مقبوضات میں رومن فوج پھنس جائے۔ ایک طرف تو روم سے رابطہ کٹنے سے رسد اور مدد کے راستے بند ہونے سے رومن فوج کا مورال گرنا دوسرے ان کے مخالف مقامی قبائل کا حوصلہ بلند ہونا اور وہ رومنوں پر حملے

شروع کر دیتے۔ دوسری طرف رومی سلطنت اپنی ساکھ بحال رکھنے کے لیے ایٹلیا سے زیر قبضہ علاقے چھڑانے کے لیے فوج بھیجتی اور ایٹلیا کے چھاپے مار دیتے اس فوج کو راستے میں تباہ کرنا شروع کر دیتے۔ ایٹلیا کا یہ منصوبہ اس کے ذہن اور اس کے چند معتمد ساتھیوں کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں تھا۔ اگر رومنوں کو اس منصوبے کی بھٹک بھی پڑ جاتی تو وہ پہل کرتے ہوئے ایٹلیا کی سلطنت اور گال کے درمیانی علاقوں پر قابض ہو جاتے اور ایٹلیا کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔

لیکن یہ منصوبہ بناتے ہوئے ایٹلیا ایک شخص کو فراموش کر بیٹھا تھا یہ ایک طرح سے اس کا استاد آئی ٹیس تھا۔ جس وقت ایٹلیا اپنے دارالحکومت میں بیٹھا اپنے منصوبے کے ابتدائی حصوں پر عمل کر رہا تھا میں اس وقت چاروں طرف سے امنڈ کر آنے والے حلیف قبائل کی بھیڑ میں بھس بدل کر آئی ٹیس اپنے چند ساتھیوں اور اولڈوکا کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے اولڈوکا کو خود سے الگ کیا اور اسے دارالحکومت کی تعمیر میں کام کرنے والے کارکنوں میں شامل کر دیا۔ اولڈوکا نے اپنے سپرد واز کو بتایا کہ وہ لاوارث ہے اور اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ دوسری عورتوں کی طرح اولڈوکا کو بھی ہلکے کاموں پر لگا دیا گیا اور وہ کام کرنے والے مزدوروں کو پانی پلانے کا کام کرنے لگی۔

آئی ٹیس کی اس حکمت عملی کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایٹلیا سے اچھی طرح واقف تھا اور اسے معلوم تھا کہ ایٹلیا اپنے دارالحکومت میں آنے والے ہر فرد کی نگرانی کرنا ناہوگا وہ جلد یا بدیر اس کے آدمیوں کی نظر میں آجائے گا اور ایسے وقت اولڈوکا کا اس سے دور رہنا ضروری تھا۔ اگر اس کا تعلق آئی ٹیس سے نکل آتا تو ایٹلیا چوکنہ ہو جاتا اور پھر اولڈوکا سے بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی۔ اس کے بعد آئی ٹیس سکون سے انتظار کرنے لگا کہ کب ایٹلیا کے آدمی اس کی موجودگی سے واقف ہوتے ہیں اور اسے لے جا کر اس کے حضور پیش کرتے ہیں۔ آئی ٹیس ایٹلیا سے ملاقات کر کے اس کے عزائم کا اندازہ لگاتا چاہتا تھا کیونکہ اسے خاصی حد تک یقین تھا ایٹلیا جتنا طاقتور ہو گیا تھا اس کے بعد وہ لازماً روم پر حملہ کرنے کا سوچتا۔ مگر اس سے پہلے وہ کیا کرنا چاہتا تھا آئی ٹیس اس بارے میں فکرمند تھا۔

آئی ٹیس کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک رات جب وہ اپنے خیمے میں موجود تھا ایٹلیا کا معتمد خاص اور اس کا سپہ سالار ایتھلس چند سپاہیوں کے ہمراہ آیا اور آئی ٹیس کو گرفتار کر کے ایٹلیا کے پاس لے گیا۔ یہ بہت خوفناک وقت تھا۔ آئی ٹیس نے ایٹلیا کی جو کہانیاں بعد میں سنی تھیں وہ اسے

بہت قناک انسان ثابت کرتی تھیں۔ اس کا امکان بھی تھا کہ وہ آئی ٹیس کی بات سنے بغیر اسے جلاد کے حوالے کر دے اور اگلے دن اس کا سر کسی بانس پر لٹکا ہو۔ اس کا بھی امکان تھا کہ ایٹلیا اس سے بات تو کرنا لیکن اس کے بعد ہمیشہ کے لیے اسے کسی قید خانے میں ڈلوادیتا۔ اگر ایٹلیا کی جگہ خود آئی ٹیس ہوتا تو کم سے کم یہ کام تو کر گزرتا۔ مگر آئی ٹیس نے ایک چانس لیا تھا۔ وہ ایٹلیا کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ ایٹلیا جتنا بڑا بادشاہ تھا اس کا دفتر اتنا ہی سادہ سا تھا وہاں معمولی سے فرنیچر اور بیچنے والے کے لوازمات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایٹلیا نے خلاف توقع اہمیر کسی طرز اور الزام کے اس کا استقبال کیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "میں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔"

ایتھلس اس کے حق میں نہیں تھا لیکن ایٹلیا کا حکم تھا وہ سر جھکا کر اپنے ساتھیوں سمیت رخصت ہو گیا۔ ان کے جاتے ہی ایٹلیا مسکرایا۔ "مجھے روم کے عظیم جنرل کو اس سادہ لباس اور اپنے دارالحکومت میں دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی۔"

"مجھے معلوم ہے کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

ایٹلیا نے اپنے اور اس کے لیے جام نکالا اور اسے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ جب آئی ٹیس بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"عظیم ایٹلیا سے ملنے جو اب ہنوں کا بادشاہ ہے۔"

ایٹلیا نے اس کی بات پر غور کیا۔ "آئی ٹیس میرا خیال ہے تم اس قابل ہو کہ روم کے حکمران بن سکو۔"

"میں روم کا خادم بن کر بھی خوش ہوں۔" آئی ٹیس نے محتاط انداز میں کہا۔

"ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ روم چلوں اور وہاں کے عجائبات دیکھوں۔" ایٹلیا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ہاں لیکن یہ بات اب پرانی ہو چکی ہے۔" آئی ٹیس سپاٹ لہجے میں بولا۔ وہ ایٹلیا کی بات میں چھپا منہبوم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

"مگر میں پھر بھی جانا چاہوں؟"

"تب تمہیں ہر راستے پر آئی ٹیس ملے گا۔" آئی ٹیس نے صاف گوئی سے کہا۔ ایٹلیا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

"کیا میں اس کا یہ مطلب لوں کہ عظیم آئی ٹیس مجھ سے اب میدان جنگ میں ملاقات کرنا چاہتا ہے۔"

"اگر عظیم ایٹلیا روم کی طرف جانا چاہے گا تو یقیناً ایسا ہی ہوگا۔"

"اگر میں روم کے علاوہ کہیں اور جانا چاہوں؟"

"تب آئی ٹیس اسی وقت حرکت میں آئے گا جب اسے ایسا کرنے کا حکم دیا جائے۔"

"کیا مارسیں نے معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

ایٹلیا کی اس بات سے آئی ٹیس کو جھٹکا لگا تھا اس کا نہیں خیال تھا کہ ایٹلیا کے جاسوس اتنے تیز ہوں گے۔ اسے علم تھا کہ آئی ٹیس مارسیں کے پاس سے آیا ہے۔

"اگر اس سے معاہدہ ہو جاتا تو مجھے تمہارے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مارسیں نے روم سے معاہدہ کیوں نہیں کیا جبکہ وہ ہنوں سے تمام معاہدے ختم کر چکا ہے اور خراج دینے سے بھی انکار کر رہا ہے۔"

"اس کی وجہ تم ہو ایٹلیا دی ہن۔" آئی ٹیس نے جواب دیا۔ "خراج دینے سے مشرقی سلطنت نے انکار کیا ہے لیکن تم جارہا نہ نقل و حرکت مغربی سلطنت کے خلاف کر رہے ہو۔ ہمارے مقبوضات میں حملے کر رہے ہو۔"

"مقبوضات روم کے نہیں ہیں۔" ایٹلیا نے چالاکی سے کہا۔ "جو ان پر قابض ہو جائے یہ اس کے ہوتے ہیں۔"

آئی ٹیس کے خیال میں بات ختم ہو گئی تھی ایٹلیا کے عزائم اس کے سامنے تھے اس نے پوچھا۔ "اب میرے ساتھ کیا ہوگا؟"

ایٹلیا مسکرایا۔ "عظیم آئی ٹیس کو پورے عزت و احترام کے ساتھ واپس روم بھیج دیا جائے گا۔"

دو دن پہلے رات سوتے وقت ایٹلیا پر قحطانہ حملہ ہوا لیکن وہ بچ گیا اور اس نے حملہ کر لے والے کو پکڑ لیا تھا بعد میں وہ مارسیں کے خصوصی خادم گوائن کی ٹیم سے شناخت کیا گیا تھا لیکن ایٹلیا نے اسے سزا دینے کے بجائے واپس مارسیں کو بھجوا دیا تھا۔ آئی ٹیس نے سکون کا سانس لیا جب ایٹلیا نے اس سے گوائن کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ورنہ اس کا خیال تھا کہ اس کی گرفتاری اسی سلسلے میں کی گئی ہے۔ اگلے دن ایٹلیا نے اسے ایک فوجی دستے کے ساتھ واپس روم بھیج دیا۔ جاتے وقت آئی ٹیس فکرمند تھا اسے ایٹلیا کے عزائم ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اس نے روم کے بارے میں کوئی واضح بات کرنے سے گریز کیا تھا اس کا مطلب تھا وہ روم کے لیے بھی عزائم رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب تھا وہ روم کے بارے میں بیان ہی واضح تھا اور آئی ٹیس سے بہتر کون جانتا تھا کہ گال اور ایتھین روم کے لیے ناگزیر ہیں ان کے بغیر روم اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔

59

واپس پہنچتے ہی آئی ٹیس نے شاہ روم سے ملاقات کی اور اسے اپنے سفر کا احوال سنایا لیکن اسے اٹھلا سے ملاقات کے بارے میں بے خبر رکھا۔ اس نے جو کیا تھا یہ اس کی ذاتی کاوش تھی۔ وہ اس بارے میں کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ البتہ اس نے اٹھلا کے عزائم سے باخبر کر دیا۔ اس نے اٹھلا سے مار سین کے بارے میں جھوٹ نہیں کہا تھا اس نے جس معاہدے کی پیش کش کی تھی اس کے مطابق اگر اٹھلا یا کوئی اور شمالی طاقت مشرقی سلطنت پر حملہ کرے تو روم اس کی مدد کرے گا لیکن جواب میں مشرقی سلطنت صرف مالی مدد کی پابند ہوتی۔ روم کو جتنی مالی مدد کی ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ اسے افرادی قوت درکار تھی۔ آئی ٹیس کی نظروں میں اٹھلا کو اس کی حد میں رکھنے کا ایک طریقہ اور بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے ملکہ، ویلیفائینین اور آکٹس کے سامنے تجویز پیش کی۔

”اگر ہم پوپ کی مدد حاصل کریں تو....“

”پوپ کی مدد حاصل کرنے کا مطلب ہوگا ہم کلیسا کا جوا اپنی گردن میں ڈال لیں۔“ آکٹس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”اس وقت خطرہ اٹھلا ہے۔“ آئی ٹیس نے کہا۔

”ہمیں سب سے بڑا خطرہ اٹھلا اور جرمنوں کے اتحاد کا ہے اور اس اتحاد کو صرف پوپ روک سکتا ہے۔ تم جانتے ہو تھیوڈورک سے کیا گیا معاہدہ ختم ہونے والا ہے اور اس کے بعد وہ کسی کا بھی حلیف بننے کے لیے آزاد ہوگا۔“

”اس کی وجہ بھی تم ہو۔“ آکٹس کا لہجہ الزام دینے والا تھا۔ ”صرف تم سے عصمت کی وجہ سے تھیوڈورک روم کا دشمن بنا ہے۔“

”یہ غلط ہے جرمن کبھی ہمارے حلیف نہیں تھے۔“

ملکہ میریا معاملے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہنوریا کو جلا وطن کر کے خانقاہ بھیجنے کے بعد سے اس کے بیٹے سے تعلقات کشیدہ چلے آ رہے تھے اور سوائے ضروری امور کے ان کے درمیان بات چیت بھی کم رہ گئی تھی۔ ملکہ میریا چاہتی تھی کہ ہنوریا کو واپس بلا لیا جائے مگر ویلیفائینین اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر اب ملک اور اقتدار کی بقا کا معاملہ تھا اس لیے وہ اپنے اختلافات بھلا کر ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ خلاف توقع ملکہ میریا نے آئی ٹیس کی تائید کی۔ ”جزل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں پوپ کی مدد حاصل کرنی چاہیے اگر وہ تھیوڈورک اور اٹھلا کا اتحاد روک دے تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہوگی۔“

”اٹھلا کو مقبوضات میں داخلے سے روکنے کے لیے

ہمیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔“ آئی ٹیس نے زور دے کر کہا۔

”پوپ سے بات کون کرے گا؟“

”میرا خیال ہے اس کام کے لیے روم کا لاٹ پادری موزوں شخص ہے۔“ آئی ٹیس نے تجویز پیش کی۔

بحث کے بعد ملے پا گیا کہ لاٹ پادری کو پوپ کے پاس بھیجا جائے اور وہ اس سے درخواست کرے کہ وہ تھیوڈورک پر دباؤ ڈالے کہ وہ اٹھلا سے اتحاد کرنے کے بجائے اس کے خلاف روم کا ساتھ دے۔ اٹھلا کا فر تھا جبکہ روم اور جرمن دونوں عیسائی تھے۔۔۔۔۔ اس وقت پوپ لیو اول ویٹی کن میں موجود تھا۔ اس نے شاہ روم کی درخواست مان لی اور تھیوڈورک کے پاس ایک وفد بھیجا جس نے اسے قائل کر لیا کہ اسے کافر اٹھلا کے بجائے عیسائی ویلیفائینین کا ساتھ دینا چاہیے۔ جرمن نئے نئے عیسائی ہوئے تھے اور ان میں دینی جذبہ کہیں زیادہ تھا۔ تھیوڈورک خود میں اتنی جرات نہیں پاتا تھا کہ پوپ کا حکم رد کر سکے۔ کہتے ہیں یورپ کی سیاست میں یہ دینی کمین کی پہلی دخل اندازی تھی جو آنے والے دنوں بڑھتی ہی چلی گئی۔

دوسری طرف اٹھلا بھی غافل نہیں تھا۔ اس کے جاسوس اسے کل کل کی خبریں دے رہے تھے۔ جیسے ہی تھیوڈورک نے پوپ کے حکم پر اس کے خلاف روم کا اتحادی بننے کا فیصلہ کیا اٹھلانے ان جرمن قبائل سے روابط شروع کر دیے جو ابھی عیسائی نہیں ہوئے تھے اور اپنے قدیم مذہب پر قائم تھے۔ ان میں سے اکثر نے اٹھلا کے رابطے کا مثبت جواب دیا۔ روم کی سفارت کاری کا اس سے موثر جواب اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اٹھلانے اپنی فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ ان فوجوں کا بیشتر اجتماع گال کی حد میں ہو رہا تھا۔ اٹھلانے تمام اتحادیوں کو درجن حدود میں جمع ہونے کا حکم دیا تھا۔ اس کی فوج کی آمد تک وہ وہاں تباہی و بربادی پھیلا کر رومنوں کے لیے مزید مشکلات کھڑی کر سکتے تھے۔

جس وقت اٹھلا فوجی دستے تیار کر کے دارالحکومت سے گال کی طرف روانہ کر رہا تھا ان دنوں اسے اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ اپنی بیویوں اور بچوں کی طرف توجہ دے سکے۔ آکارا کے بعد اس نے کئی شادیاں کیں اور اس کے درجن سے بھی زیادہ بچے تھے لیکن جو مقام آکارا اور اس سے پیدا ہونے والے بیٹے کا تھا وہ کسی کا نہیں تھا۔ اٹھلا اپنے سب سے بڑے بیٹے آٹیلیوس (اٹھلا کا بیٹا) کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا لیکن وہ اسے جنگی مہمات میں لے جانے سے گریز کرتا تھا۔ اب وہ پندرہ سال کا بھرپور جوان تھا لیکن اس کی پرورش

دادہ فرمل میں عورتوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ اٹھلا اپنے دارالحکومت میں اکیلے ہی گھومتا رہتا تھا اور اس کے ساتھ عام طور سے ایک دو محافظوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا تھا اپنی محافظت کے بارے میں اٹھلا کا کہنا تھا کہ جو حکمران اپنی محافظت نہ کر سکے وہ اپنے لوگوں کی حفاظت کیسے کرے گا؟

ایک دن وہ کھڑا ہو کر اپنے لوگوں کو سرگرمی سے جنگ کی تیاری کرتے دیکھ رہا تھا جب اس کی نظر مزدوروں کو پانی پانی اس خوب صورت لڑکی پر پڑی جس کے بال سرخ تھے اور وحشت انگیز حد تک آکارا سے مشابہہ لگ رہی تھی۔ اس نے آٹیلیوس سے لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”غلام ہے۔“ آٹیلیوس نے جواب دیا۔ ”یہاں مزدوروں کو پانی پلانے کا کام کرتی ہے۔“

”معلوم کر داس کا نام کیا ہے اور اس کا تعلق کہاں سے ہے؟ پھر اسے شاہی محل پہنچا دو۔“

”حکم کی تعمیل ہوگی۔“ آٹیلیوس نے سر جھکا کر کہا۔

کچھ دیر بعد ہی اٹھلا کو علم ہو گیا کہ لڑکی کا نام اولڈو کا تھا اور اس کا تعلق ہنگری کے میدانوں میں آباد ایک چھوٹے قبیلے سے تھا یہ قبیلہ اٹھلا کی فوجوں کا نشانہ بنا تھا اور اس کے بیشتر افراد مارے گئے تھے معدودے چند بچنے والوں کو قیدی بنالیا گیا تھا۔ قیدیوں سے کام لینے والوں نے اسے اس خدمت پر لگا دیا تھا۔ لڑکی کو اٹھلا کے محل میں منتقل کر دیا گیا تھا لیکن ابھی اٹھلانے اس سے ملاقات نہیں کی تھی۔ گال کی طرف پیش قدمی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور اٹھلانے فیصلہ کیا کہ وہ وہاں سے واپسی پر اولڈو کا سے ملاقات کرے گا۔ چند دن بعد وہ اپنے خاص ہن دستوں کے ساتھ گال کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی بڑی فوج پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور مشرقی گال کو تباہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

اٹھلا کی پیش قدمی کی خبر نے ملکہ میریا، شاہ روم اور وزیر آکٹس تینوں کے ہوش اُڑا دیے تھے۔ مگر آئی ٹیس پریشان نہیں تھا۔ اس نے ان تینوں کو تسلی دی۔ ”بے شک روم لدا ل پڑ رہا ہے لیکن ابھی اتنا کمزور بھی نہیں ہوا ہے کہ خانہ بدوشوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔“

”خانہ بدوش۔“ ویلیفائینین نے تقریباً رو دینے والے انداز میں کہا۔ ”اس کے ساتھ کم سے کم چار لاکھ کی فوج ہے اور جنگ کی اطلاع پا کر ہمارے دشمن قبائل بھی اس کے ساتھ مل سکتے ہیں۔“

”جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ آئی ٹیس نے سکون سے

سے جواب دیا۔ ”لیکن جنگ میں فیصلہ تعداد نہیں بلکہ عہدہ اور حکمت عملی کرتی ہے۔“

”آئی ٹیس تم فوراً فوج لے کر روانہ ہو جاؤ۔“ شاہ ویلیفائینین نے فیصلہ صادر کیا۔ ”مجھے امید ہے تم فتح کی خبر لاؤ گے۔“

آئی ٹیس چند دن پہلے اپنی جاگیر کی طرف جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ تمام رومن فوجوں کا کمانڈر ان چیف تھا لیکن ابھی تک وہ اپنی جاگیر اور اس پر موجود رہنے والی ذاتی فوج بحال نہیں کر سکا تھا۔ اسے فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ کسی کڑے وقت میں یہی ذاتی فوج اس کے کام آ سکتی تھی۔ جنگ ایک بار پھر اس کے عزائم کے آڑے آئی تھی اس کا سامان تک تیار ہو گیا تھا۔ وہ واپس گھر آیا تو اس کی بیٹی لیوٹو ویلیا بہت خوش تھی۔ اس نے آئی ٹیس سے کہا۔ ”پاپا میں کسی کو پسند کرنے لگی ہوں۔“

”مجھے خوشی ہے تم کسی کو پسند کرنے لگی ہو لیکن ابھی ہم گال جارہے ہیں۔“

”کیوں....؟“ لیوٹو ویلیا سراپا احتجاج بن گئی تھی۔

”کیونکہ اٹھلا وہاں پیش قدمی کرنے والا ہے۔“

لیوٹو ویلیا یہ سن کر سنجیدہ ہو گئی اس نے کہا۔ ”تب مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہوگا۔“

آئی ٹیس نے غور سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ”ہاں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

آئی ٹیس نے اپنی آمد سے پہلے گال میں موجود فوجی دستوں کو حکم دیا کہ وہ قلعوں کو محکمہ کر لیں اور رسد جمع کریں تاکہ انہیں طویل محاصرے کی صورت میں ”کل نہ ہو۔ رومنوں کی اصل فوج گال میں ۱۰۰,۰۰۰ فوجی آئی ٹیس اپنے ساتھ صرف مخصوص ہتھیار لے کر گیا تھا۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ اٹھلانے کئی رومی قلعوں کو روند ڈالا ہے اور اب گال کے وسطی حصے کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ آئی ٹیس نے رومی کمانڈروں کو حکم بھیجا کہ اٹھلا کے سامنے مزاحمت کرنے کے بجائے اسے راستہ دیتے رہیں اور عقب میں اس کی رسد کی لائن کو کاٹتے رہیں۔ آئی ٹیس کا مقصد یہی تھا کہ فیصلہ کن جنگ سے پہلے اٹھلا اپنے مرکز سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جائے۔ آئی ٹیس نے شمال کی طرف جانے کے بجائے مغرب کی طرف سے چکر کاٹا اور براہ راست گال کے صوبے میں داخل ہو گیا۔ موجودہ فرانس اور اسپین کے مقام پر اس کی فوجیں کہیں جمع ہو رہی تھیں۔

آئی ٹیس وہاں پہنچا تو جرمن شاہ تھیوڈورک وہاں پہلے

سے موجود تھا۔ اس جنگ میں وہ رومنوں کا اتحادی تھا۔ مگر یہ اتحاد اس کی مجبوری تھا اگر پوپ لیو اول اسے خود حکم نہ دیتا تو کبھی رومنوں کا اتحادی نہ بنتا۔ پہلی ملاقات میں اس نے آئی ٹیس پر واضح کر دیا کہ یہ اتحاد صرف اس جنگ کی حد تک ہے اور اس کے بعد اس کا روم سے دشمنی کا رشتہ ہوگا۔ پھر اس نے آئی ٹیس سے ایک غیر متوقع مطالبہ کر دیا۔ ”مجھے لیونو ویلیا چاہیے جو میری بیٹی ہے اور تم اسے میرے پاس سے لے گئے تھے۔“

”وہ روم میں ایک اچھی زندگی گزار رہی ہے۔“ آئی ٹیس نے کہا۔

”روم میں اچھی زندگی گزارنے کے لیے روم کا باقی رہنا ضروری ہے۔“ تھیوڈورک نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر مجھے میری بیٹی واپس نہ ملی تو روم باقی نہیں رہے گا۔“

آئی ٹیس کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تھیوڈورک اس موقع پر یہ مسئلہ اٹھائے گا اس کا خیال تھا کہ وہ شاید اپنی بیٹی کو بھول چکا ہے۔ لیکن تھیوڈورک بھولا نہیں تھا۔ لیونو ویلیا اسی عورت کی بیٹی تھی جس سے آئی ٹیس محبت کرتا تھا لیکن اسے تھیوڈورک نے ہتھیالیا تھا اور جواب میں آئی ٹیس اس کی بیٹی لے آڑا تھا۔ آج تھیوڈورک کے پاس موقع آیا تھا کہ وہ حساب برابر کر سکے۔ آئی ٹیس کی زندگی میں اس سے مشکل وقت پہلے نہیں آیا تھا وہ سچ لیونو ویلیا سے بیٹی کی طرح محبت کرتا تھا۔ مگر اب اسے بیٹی یا روم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ آئی ٹیس نے بیٹی کی محبت کا گلا گھونٹتے ہوئے روم کا انتخاب کیا اور تھیوڈورک سے کہا۔

”ٹھیک ہے اگر تم لیونو ویلیا کے بدلے اس جنگ میں ہمارا ساتھ دو گے تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔“

کچھ دیر بعد تھیوڈورک اپنے سپاہیوں کے ہمراہ آئی ٹیس کے خیمے میں پہنچا اور سپاہی اس کے سامنے لیونو ویلیا کو بازوؤں سے جکڑ کر لے گئے اور وہ ”پاپا... پاپا“ چلاتی رہ گئی۔ تھیوڈورک نے فاتحانہ نظروں سے آئی ٹیس کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔ آئی ٹیس دانت پیٹتا رہ گیا۔

ایٹلیا میدان جنگ میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس درتہ پہاڑی علاقے میں رومنوں کی فوج پہاڑیوں پر موجود ہے اور تھیوڈورک نے اپنی فوج جنگلوں میں رکھی تھی۔ جرمن جنگ کے دوران جنگل میں رہنے کے عادی تھے کیونکہ وہ کھلے مقام کے بجائے جنگلوں میں لڑنے کے زیادہ ماہر تھے اس لیے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ دشمن کو بھیج کر جنگل میں لے آئیں۔ وہ ہنوں کی طرح بے قاعدہ جنگ کے عادی

تھے۔ اور کسی بے ترتیب جھوم کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔ ان کے ہتھیار بھی مخصوص نہیں تھے۔ وہ تیر کمان، تلوار، نیزے اور فولادی زنجیروں سے لے کر کلہاڑی تک ہر ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ دست بہ دست جنگ میں ان کا پسندیدہ ہتھیار جاتو تھا تقریباً سب ہتھیار بن بھی استعمال کرتے تھے لیکن بن ذاتی حفاظت کے لیے کوئی چیز نہیں پہنتے تھے جیسے خود یازرہ بکتر وغیرہ۔

آئی ٹیس اس جنگ کا کمانڈر ان چیف تھا اس لیے منصوبہ اس کا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے ہنوں کو حملہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس نے اپنے کیمپ کے آس پاس پہاڑیوں کے دامن میں چھپی خندقیں کھدوا دی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ ہن گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑنے کے ماہر ہوتے ہیں لیکن انہیں پیدل جنگ میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس نے اس درتہ پہاڑی علاقے کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کہ یہاں ہن اور ان کے اتحادیوں کے بڑے بے قاعدہ جھوم حرکت کرنے میں دشواری محسوس کرتے۔ ایٹلیا نے بھی یہ حکمت عملی بھانپ لی اور اس نے اپنی ساری فوج کو ایک جگہ جمع کرنے کے بجائے پورے علاقے میں پھیلا دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ پہاڑوں پر موجود رومن فوجوں کو نیچے نہ آنے دیں اور پہلے جرمنوں سے نمٹ لیا جائے۔ جرمنوں سے لڑنے کے لیے اس نے اپنے جرمن حلیفوں کو سامنے رکھا تھا۔ وہ جنگل کے اندر پیش قدمی کر کے جرمنوں کا صفایا کرتے اور اگر جرمن جنگلوں سے باہر آتے تو ان کے استقبال کے لیے ہن دستے موجود ہوتے۔

جنگ کا آغاز ایٹلیا نے اپنے خاص دستے کے ہمراہ کیا اور وہ اس پہاڑی کی طرف بڑھا جس پر آئی ٹیس کا کیمپ تھا۔ لیکن ان کے گھوڑے چھپی خندقوں میں پھنس کر گر گئے۔ ایٹلیا اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اتر آئے اور پیدل ہی پہاڑیوں پر چڑھنے لگے لیکن یہ کام آسان نہیں تھا ان کی جوتائی جنگ میں استعمال ہونا بھی وہ پہاڑیوں پر چڑھتے ہوئے ضائع ہو گئی اور رومن دستوں نے نہایت آرام سے انہیں واپس دھکیل دیا۔ اس جھڑپ میں رومنوں کا پلہ بھاری رہا تھا اور ایٹلیا اپنے بے شمار فوجیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسے پسپا ہونا پڑا اور نیچے آتے ہی تھیوڈورک کے دستے اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس جنگ میں بھی ایٹلیا کی فوجوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن اس کے پاس ابھی فوج کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔

ایٹلیا کی فوج عارضی طور پر پسپا ہوئی اور اس کے اٹلیا پر اس کے جرمن اور ہاربرین حلیف حرکت میں

آئی ٹیس نے ایک طرف تو رومنوں کو نیچے آنے سے روک دیا اور دوسری طرف وہ جنگلوں میں چھپے تھیوڈورک واپس کا صفایا کرنے لگے۔ اس دوران... ایٹلیا اور اس کے ہن دستے آرام کر رہے تھے۔ آئی ٹیس پہاڑی کے اوپر دیکھ رہا تھا اور اس کے کمانڈر بے چین تھے کہ وہ کب انہیں حرکت میں آنے کا حکم دیتا ہے۔ مگر آئی ٹیس خاموش تھا وہ پہرہ ایٹلیا کی فوج تھیوڈورک کی بیشتر فوج کا صفایا کر رہی تھی اور اب شکست کے آثار نمایاں لگ رہے تھے۔ رومن فوج کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ ایٹلیا کی عظیم فوج کا مقابلہ کر سکتی اور اب یہ ظاہر اس جنگ میں رومنوں کی شکست صاف نظر آرہی تھی۔ جس وقت ایٹلیا اور اس کے ساتھی پسپا ہو رہے تھے آئی ٹیس نے ان پر حملہ کرنے کا سنہری موقع گنوا دیا تھا۔ اب ہن سنبھل گئے تھے اور ان پر حملہ کرنا خودکشی کے مترادف تھا لیکن آئی ٹیس نے اس وقت حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا اور اس نے اپنے ایک کمانڈر کو حکم دیا۔

”جنگ کا جو بھی انجام ہو لیکن تھیوڈورک کو میدان جنگ سے زندہ واپس نہیں جانا چاہیے۔“

اس کے ساتھ ہی رومن فوج پہاڑیوں سے اترنے لگی اور ہنوں کے ساتھ جنگ مغلوہ لڑتی جرمن فوج کی مدد کو پہنچ گئی۔ اگرچہ اب خاصی دیر ہو چکی تھی۔ رومی کمانڈر چھپتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں سے وہ تھیوڈورک کو نشانہ بنا سکتا تھا اور اس نے عقب سے تیر مار کر جرمن شاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جرمن سمجھے کہ ان کے شاہ کو کسی ہن تیر انداز نے نشانہ بنایا ہے کیونکہ وہ تیر اندازی میں ماہر سمجھے جاتے تھے اس پر وہ غضب ناک ہو کر ایٹلیا کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ ایٹلیا کے لیے پسپا ہوتے جرمنوں کا یہ حملہ نہایت سخت تھا۔ اس کے بے شمار سپاہی اس حملے میں مارے گئے۔ اوپر سے رومن فوجی دستے بھی آگے اور وہ جنگ جس کے بارے ایٹلیا کیا اس کے دشمنوں کو بھی یقین تھا کہ وہ جیت چکا ہے شام ہوتے ہوتے وہ دوبارہ ہمدردی کی سطح پر پہنچ گئی تھی۔ جب رات کی تاریکی میں دونوں فوجیں اپنے اپنے کیمپوں کی طرف واپس لوٹیں تو جتنی تعداد میں رومن اور ان کے حلیفوں کی لاشیں میدان جنگ میں پھری پڑی تھیں اس سے زیادہ تعداد میں ایٹلیا اور اس کے حلیف اپنے سپاہیوں سے محروم ہو چکے تھے۔

آئی ٹیس کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا اس نے تھیوڈورک کو مروایا اور اس قدم کا نتیجہ بھی اس کے حق میں نکلا۔ تھیوڈورک کا بیٹا مائی سین اس کا جائین تھا۔ وہ ایٹلیا سے اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن جب دوسری صبح طلوع

ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ ایٹلیا کی فوج اپنا سامان ہاتھ کر وہاں سے رخصت ہو رہی تھی۔ آئی ٹیس یا اور کوئی نہیں جان سکا کہ ایٹلیا نے اچانک جنگ سے ہاتھ کیوں اٹھا لیا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس جنگ کے دوران ایٹلیا زخمی ہو گیا تھا اور اس وجہ سے فوج کی قیادت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اس لیے اس نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ ممکن ہے ایٹلیا کے خیال میں اس کی قیادت کے بغیر اس کی فوج پورے دل سے نہیں لڑتی اور ممکن ہے وہ ایک اچھی پوزیشن سے جنگ ہار جاتا اس لیے اس نے باعزت پسپائی بہتر سمجھی۔

دوسری طرف آئی ٹیس نے یہ کیا کہ پسپا ہوتے ایٹلیا اور اس کی فوج کو جانے کا راستہ دے دیا۔ اسے روکنے یا اس پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایٹلیا بغیر کسی مزید نقصان کے واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ آئی ٹیس کے لیے یہ بہترین موقع تھا اس نے تھیوڈورک کا خاتمہ کر کے لیونو ویلیا کو واپس حاصل کر لیا تھا۔ اس نے گال کے سرحدی علاقوں میں برباد ہونے والی چوکیوں کو از سر نو بحال کیا اور وہاں تازہ دم رومن دستے تعینات کیے۔ جو گاؤں اُجڑ گئے تھے انہیں بے طور جاگیر رومن سرداروں کے حوالے کر دیا تاکہ وہ انہیں آباد کریں اور یہاں سے روم کو تاج کے ساتھ خراج بھی حاصل ہو سکے۔

مگر جب آئی ٹیس اس فتح کے ساتھ واپس روم آیا تو خلاف توقع اس کا استقبال الزامات کے ساتھ کیا گیا۔ عام میں وہ ہیر و تھا جس نے ایٹلیا جیسے خطرے کا مدد موڑ دیا تھا لیکن آئی ٹیس سے خوف زدہ اقتدار کی ٹکون اسے ہیر و مانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سب سے پہلے اس پر الزام آ گیا کہ اس نے جنگ کے دوران تھیوڈورک کے ہتھوں کی مدد کر کے فتح کا موقع گنوا دیا۔ اس الزام میں کسی حد تک قیامت تھی۔ دوسرا الزام یہ تھا کہ جب ایٹلیا کسی وجہ سے پسپا ہو رہا تھا تو آئی ٹیس نے اسے بغیر کسی مزاحمت کے جانے دیا۔ ملکہ میرا نے اجلاس کے دوران کھل کر کہا۔

”تم نے روم کے سب سے بڑے دشمن کو جانے کا موقع دیا۔ تاکہ تم اپنی اہمیت برقرار رکھو۔“

”یہ الزام ہے۔“ آئی ٹیس نے سکون سے کہا۔ ”اگر میں ایٹلیا کو چھیڑتا تو ممکن ہے وہ پلٹ کر سخت حملہ کرتا۔ اس شکست کے باوجود اس کے پاس فوج کی تعداد ہم سے کہیں زیادہ تھی۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ اسے جانے دوں اور اپنے علاقوں میں اپنی پوزیشن بہتر بناؤں۔“

”اس سانپ کو نکل جانے کا موقع ملا ہے اب وہ

دوبارہ پلٹ کر حملہ کرے گا۔“

”جب وہ حملہ کرے گا تو ہم اس کے لیے تیار ہوں گے۔ مشرقی سلطنت سے بہت بڑا خزانہ جلد یہاں پہنچ جائے گا اور اس کی مدد سے ہم نئی فوج تیار کر سکیں گے۔“

”جب تک تمہاری نئی فوج تیار ہوگی اٹھلا کی فوج روم تک پہنچ جائے گی۔“ آکٹس نے حقارت سے کہا۔

آکی ٹیس نے ان تینوں کو دیکھا اور بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تم تینوں کے دل میں کیا ہے لیکن میں روم کا خادم ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں اٹھلا یہاں نہیں پہنچ سکتا۔“

آکی ٹیس نے خبر تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں روم میں کیا تبدیلی آئی تھی۔ ملکہ میریام نے کوشش کر کے ہنور یا کو واپس بلا لیا تھا لیکن ویلیفانٹین نے اسے معافی دینے سے انکار کرتے ہوئے نظر بند کرنے کا حکم دیا اس پر ملکہ میریام اور شاہ کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور تب ویلیفانٹین نے ماں سے کہا کہ اس نے اسے قتل کرانے کی کوشش کی اور اس کا میکس اسے دکھایا۔ ملکہ میریام نے بیٹے کو بتایا کہ یہ میکس اس سے آکی ٹیس نے مانگا تھا اور پھر اسے واپس نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف ہنور یا نے بتایا کہ آکی ٹیس چھپ کر اٹھلا کے پاس گیا تھا اور کسی کو نہیں معلوم کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا؟ آکی ٹیس کے خلاف شبہات چنپ رہے تھے اور اس کا خادم روم ہونے کا تاثر دھندلا رہا تھا۔

☆☆☆

اٹھلا واپس دارالحکومت پہنچا۔ ہنوں کے لیے پسپائی کوئی انوکھی چیز نہیں تھی وہ اسے جنگ کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک زندہ رہنا زیادہ اہم تھا کیونکہ زندہ انسان ہی کچھ کر سکتا ہے۔ ان کا طریقہ جنگ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ کبھی وہ اچھا خاصا لڑتے لڑتے بھاگ کھڑے ہوتے اور جب دشمن ان کا پیچھا کرتا تو وہ اسے گھیرے میں لے کر اچانک ہی پلٹ کر اسے تلواریں دھار پر رکھ لیتے تھے۔ اس لیے ہنوں نے اس پسپائی کو سرے سے شکست تسلیم نہیں کیا۔ اٹھلا اگر جنگ میں زخمی ہوا بھی تھا تو اس کے دھم راتے میں بھر گئے تھے اور اب وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا شاہی محل ایک عمارت پر مشتمل نہیں تھا بلکہ متعدد مختلف کاموں کے لیے مخصوص عمارتوں پر مشتمل تھا۔ ان دنوں وہ اپنے لیے ایک نئی خواب گاہ بنوا رہا تھا۔ اس کی بیویوں کے لیے ایک بڑی محل نما عمارت مخصوص تھی اور اولڈوکا وہیں موجود تھی۔ ایک صبح اٹھلا چہل قدمی کے لیے اپنے محل کے پاس جنگل کی طرف گیا اور اس نے اولڈوکا کو وہیں طلب کر لیا۔

اولڈوکا کو لانے والے اسے وہاں پہنچا کر چلے گئے اور اولڈوکا نے پہلی بار اس باجروت بادشاہ کو سامنے سے دیکھا جس کی آنکھوں میں بڑے بڑے سردار جھانکتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اولڈوکا بھی گھبرا رہی تھی اسے ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس کا پول تو نہیں کھل گیا۔ اور اس ویرانے میں اٹھلا اس کو فرد جرم بنا کر اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دے گا لیکن اٹھلا کے تاثرات نرم تھے اس نے نرم ہی لہجے میں کہا۔ ”حیرانام اولڈوکا ہے؟“

”جی شاہ اعظم!“

”تیرا تعلق ہنگری کے ایک گاؤں سے ہے جسے میری فوجوں نے تباہ کر دیا تھا اور سب کو مار ڈالا تھا۔“

”جی شاہ اعظم لیکن یہ پرانی بات ہے۔“ اولڈوکا سہم کر بولی۔ ”مجھے تو اب یاد بھی نہیں ہے کہ وہاں کیا ہوا تھا؟“

”لیکن مجھے افسوس ہے۔“ اٹھلا نے کہا۔ ”جہیں اندازہ ہے میں نے اپنے محل میں کیوں بلایا تھا؟“

”شاید.... میں شاہ اعظم کو پسند آگئی ہوں۔“ اٹھلا مسکرانے لگا۔ ”یہ درست ہے کیا تم میری ملکہ بننا پسند کرو گی؟“

اولڈوکا دنگ رہ گئی تھی وہ سزا کی منتظر تھی اور اٹھلا اسے اتنی بڑی پیش کش کر رہا تھا۔ اٹھلا کی بیویاں تو کئی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو اس کی بیوی بننے کا اعزاز حاصل نہیں تھا۔ ”شاہ اعظم مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا۔“

”ابھی نہیں آ رہا ہے لیکن جلد آ جائے گا۔“ اٹھلا نے کہا۔

اس جنگ سے واپسی پر جسے مورخین چالوس کی جنگ کہتے ہیں اٹھلا ایک نئے جذبے کے ساتھ فوجی تیاریوں میں لگ گیا تھا اور ایسا لگ رہا جیسے اس بار وہ براہ راست روم کی طرف پیش قدمی کرے گا۔ چالوس کی جنگ میں اسے بہت بڑا جانی نقصان ہوا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کے ایک لاکھ سے زیادہ جنگجو اس جنگ میں ہلاک ہوئے تھے بعد میں جن مورخین نے اس علاقے کو دیکھا جہاں جنگ ہوئی تھی تو وہاں میلوں تک زمین سے انسانی ہڈیاں جھانک رہی تھیں۔ مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ اس خونریز جنگ نے جو دو قوموں کے درمیان لڑی گئی تھی، اس نے یورپ کی سیاست کا رخ بدل دیا اور رومن سلطنت کی قسمت پر مہر ثبت کر دی۔

مگر مورخین بھول جاتے ہیں کہ ابھی اٹھلا زندہ تھا اور وہ پہلے سے زیادہ تیاریوں اور فوج کے ساتھ روم پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا اس لیے چالوس کی جنگ خوریز تو بہت تھی لیکن

میں کسی طریق کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا تھا۔ اٹھلا کو اس جنگ میں ہارم لگے تھے جن کی وجہ سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوا تھا لیکن اس سے اس کے عزائم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس کے جوش و جذبے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور یہ اس حد تک زیادہ تھا کہ اس نے اولڈوکا کو پر پوز کرنے کے لیے ۱۰۰ جہازیں بھی شادی اپنی اگلی فوجی مہم کے بعد تک کے لیے بھی کر دی تھیں۔ اٹھلا نے اپنے تمام حلیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی تمام فوجیں لے کر اس کے پاس آ جائیں۔ جلد ہی چاروں طرف سے فوجی دستے دارالحکومت پہنچنے لگے۔

تیاری مکمل کرتے ہی اٹھلا شمالی اٹلی کی طرف بڑھا۔ ہنگری کے میدانوں کے سامنے کوہ الپس کا پہاڑی سلسلہ تھا، سلسلہ کئی ملکوں کے درمیان حائل تھا۔ لیکن اٹھلا اس کی پاندیوں سے کترا کر اس کی وادیوں سے گزرا اور اٹلی کے اوپر ایڈریاتک کے دہانے پہنچ گیا۔ 452 عیسوی میں اٹھلا نے روم کے خلاف دوسری مہم شروع کی اور اس کا پہلا نشانہ شمالی اٹلی میں روم کا اہم شہر آکیولیا بنا۔ یہ بہت بڑی فوجی چھاؤنی تھی اور اٹھلا نے اسے اس طرح برباد کیا کہ یہ زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ اس کے تمام ہی باشندوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ صرف آکیولیا ہی نہیں بلکہ راستے میں آنے والے تمام ہی گاؤں دیہات قبضے اٹھلا کی فوجوں کا نشانہ بنے اور ان میں سے والے کسی ایک انسان کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا ہاں جو لڑا رہے تھے اس کا میاں رہے وہی بچے تھے۔ دوسرے بڑے شہر جو نشانہ بنے ان میں ویش (یہ وہ ویش نہیں ہے جو بعد میں سمندر کے کنارے آباد ہوا اور آج بھی آباد ہے بلکہ یہ شمالی اٹلی کا کوئی چھوٹا شہر تھا) میلان، ویرونا اور پاڈوا نامی شہر بھی برباد ہوئے اور ان کی ساری آبادی قتل کر دی گئی۔ اٹھلا کی سفاکی اس مہم میں کہیں زیادہ سامنے آئی تھی ایسا لگ رہا تھا وہ اٹلی کے خطے میں بسنے والے کسی انسان کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

رومی افواج کسی بھی مقام پر اٹھلا کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اب اٹھلا کو روم تک جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا کہ اچانک ہی اٹھلا نے پیش قدمی کر دی اور پھر وہ واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ مورخین آج بھی حیران ہیں کہ پینر کی ٹھوس وجہ کے اٹھلا نے اپنی فاتحانہ یلغار کیوں روک دی تھی؟ وہ واپس کیوں چلا گیا؟ آج ہمارے پاس اس بارے میں صرف کہانیاں

ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اٹھلا شدید بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی بیوی کو واپس کا حکم دیا۔ لیکن یہ بات ہم نہیں جانتے۔ کیونکہ

رومی افواج کسی بھی مقام پر اٹھلا کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اب اٹھلا کو روم تک جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا کہ اچانک ہی اٹھلا نے پیش قدمی کر دی اور پھر وہ واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ مورخین آج بھی حیران ہیں کہ پینر کی ٹھوس وجہ کے اٹھلا نے اپنی فاتحانہ یلغار کیوں روک دی تھی؟ وہ واپس کیوں چلا گیا؟ آج ہمارے پاس اس بارے میں صرف کہانیاں

ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اٹھلا شدید بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی بیوی کو واپس کا حکم دیا۔ لیکن یہ بات ہم نہیں جانتے۔ کیونکہ

رومی افواج کسی بھی مقام پر اٹھلا کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اب اٹھلا کو روم تک جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا کہ اچانک ہی اٹھلا نے پیش قدمی کر دی اور پھر وہ واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ مورخین آج بھی حیران ہیں کہ پینر کی ٹھوس وجہ کے اٹھلا نے اپنی فاتحانہ یلغار کیوں روک دی تھی؟ وہ واپس کیوں چلا گیا؟ آج ہمارے پاس اس بارے میں صرف کہانیاں

ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اٹھلا شدید بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی بیوی کو واپس کا حکم دیا۔ لیکن یہ بات ہم نہیں جانتے۔ کیونکہ

رومی افواج کسی بھی مقام پر اٹھلا کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اب اٹھلا کو روم تک جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا کہ اچانک ہی اٹھلا نے پیش قدمی کر دی اور پھر وہ واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ مورخین آج بھی حیران ہیں کہ پینر کی ٹھوس وجہ کے اٹھلا نے اپنی فاتحانہ یلغار کیوں روک دی تھی؟ وہ واپس کیوں چلا گیا؟ آج ہمارے پاس اس بارے میں صرف کہانیاں

ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اٹھلا شدید بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی بیوی کو واپس کا حکم دیا۔ لیکن یہ بات ہم نہیں جانتے۔ کیونکہ

رومی افواج کسی بھی مقام پر اٹھلا کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اب اٹھلا کو روم تک جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا کہ اچانک ہی اٹھلا نے پیش قدمی کر دی اور پھر وہ واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ مورخین آج بھی حیران ہیں کہ پینر کی ٹھوس وجہ کے اٹھلا نے اپنی فاتحانہ یلغار کیوں روک دی تھی؟ وہ واپس کیوں چلا گیا؟ آج ہمارے پاس اس بارے میں صرف کہانیاں

ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اٹھلا شدید بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی بیوی کو واپس کا حکم دیا۔ لیکن یہ بات ہم نہیں جانتے۔ کیونکہ

رومی افواج کسی بھی مقام پر اٹھلا کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اب اٹھلا کو روم تک جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا کہ اچانک ہی اٹھلا نے پیش قدمی کر دی اور پھر وہ واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ مورخین آج بھی حیران ہیں کہ پینر کی ٹھوس وجہ کے اٹھلا نے اپنی فاتحانہ یلغار کیوں روک دی تھی؟ وہ واپس کیوں چلا گیا؟ آج ہمارے پاس اس بارے میں صرف کہانیاں

ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اٹھلا شدید بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی بیوی کو واپس کا حکم دیا۔ لیکن یہ بات ہم نہیں جانتے۔ کیونکہ

رومی افواج کسی بھی مقام پر اٹھلا کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اب اٹھلا کو روم تک جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا کہ اچانک ہی اٹھلا نے پیش قدمی کر دی اور پھر وہ واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ مورخین آج بھی حیران ہیں کہ پینر کی ٹھوس وجہ کے اٹھلا نے اپنی فاتحانہ یلغار کیوں روک دی تھی؟ وہ واپس کیوں چلا گیا؟ آج ہمارے پاس اس بارے میں صرف کہانیاں

ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اٹھلا شدید بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی بیوی کو واپس کا حکم دیا۔ لیکن یہ بات ہم نہیں جانتے۔ کیونکہ

کوئی فاتح کسی بیماری کی وجہ سے اپنی مہم ترک کر کے واپس نہیں جاتا۔ اگر وہ بیمار تھا تو رک کر آرام کر سکتا تھا اور علاج کرا کے صحت یاب ہو سکتا تھا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ بیمار تھا تب بھی یہ بیماری شدید نوعیت کی نہیں تھی کیونکہ وہ واپس دارالحکومت پہنچا تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور آتے ہی اس نے اولڈوکا سے شادی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس لیے بیماری والی کہانی درست نہیں لگتی۔

دوسری کہانی یہ ہے کہ اس مہم کے دوران اٹھلا سے لڑتے ہوئے وہ تاریخی تلوار ٹوٹ گئی جس کے ٹکڑے پوتے پر اس نے ہنوں کا بادشاہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور اس تلوار کو وہ اپنی بادشاہت کی علامت سمجھتا تھا اور اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ جب تک یہ تلوار اس کے پاس ہے دنیا کی کوئی طاقت اسے شکست نہیں دے سکتی ہے اس تلوار کے ٹوٹنے سے اٹھلا کے حوصلے پر بہت بُرا اثر پڑا تھا اور اس نے روم کی مہم ترک کر کے ہونے فوری واپسی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے سہ سالہ راستے نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اٹھلا اب کسی صورت لڑنے کو تیار نہیں تھا۔ مگر سنجیدہ مورخین میں سے کوئی بھی اس بات کی تصدیق نہیں کرتا۔

ایک تیسری کہانی یہ ہے شمالی اٹلی میں پوپ لیو اول نے اٹھلا سے ملاقات کی۔ پوپ کی ملاقات کا مقصد اٹھلا کو روم کی طرف پیش قدمی سے روکنا تھا۔ اس نے اٹھلا سے کہا کہ اگر اس نے اپنی مہم ترک نہ کی تو جلد وہ خدا کے عذاب کا دھار ہو جائے گا۔ اس کہانی میں مزید رنگ آمیزی اس طرح کی گئی کہ اس ملاقات کے فوراً بعد سینٹ ہال اور سینٹ پلر اٹھلا کو خواب میں آئے اور اسے دھمکی دی اگر اس نے پوپ کی درخواست نہ مانی تو اسے لمبے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس لیے اٹھلا نے خوف زدہ کر پوپ کی بات مان لی اور اپنی فوج لے کر واپس چلا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پوپ لیو اول نے اٹھلا سے ملاقات کی تھی لیکن اس کا مقصد یقیناً روم سے زیادہ دینی کن کا تحفظ ہوگا جو اٹلی کی حد میں واقع ہے۔

مگر ان کہانیوں سے قطع نظر مورخین کو اٹھلا کی واپسی میں کئی دوسرے عوامل نظر آتے ہیں، ایک تو اٹلی میں اٹھلا کی فوجوں کو رسد کی کمی کا سامنا تھا۔ شمالی اٹلی نہایت دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہے جہاں بہت بڑی فوج کو لازمی بہت زیادہ رسد کے ساتھ سفر کرنا نہایت دشوار ہوگا۔ دوسرے ان ہی دنوں اٹلی میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور یہ وبا اٹھلا کی فوج میں بھی آ گئی تھی۔ لیکن واپسی میں سب سے اہم وجہ مشرقی سلطنت کے حکمران مارسین کی طرف سے ایک فوجی مہم بھیجنا



قاتل ہیرو مختار آزاد

اس کی شہرت چہار سو پھیلی تھی، وہ ماہر علوم فلسفہ تھا۔ اس کی روداد زندگی پر شاعری کی گئی، ناول لکھے گئے اور ڈرامے پیش کیے گئے۔ یہ بھی ایک کمال تھا کہ اس کی زندگی پر کھیلے جانے والے ڈرامے کئی کئی سال چلتے تھے، اس پر لکھے گئے ناول کے بیس بیس ایڈیشن شائع ہوتے..... مگر پھر بھی اس پر قتل کا جرم تھوپ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ساتھ ہی منصف نے حکم صادر کر دیا کہ لاش کو پھندے سے نیچے نہیں اتارا جائے گا، گوشت گل سڑ کر خود ہی گریں گے، ہڈیاں کھل کھل کر زمین پر آئیں گی۔

مختار آزاد کی زندگی پر لکھے گئے ناولوں کی فہرست

برطانیہ کے عہد وکٹوریہ کے مشہور رومانی ادب میں ایک نام کا بہت چرچا رہا ہے۔ یہ چرچا اُس کی موت کے بعد بھی ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے تک بر زبان خاص و عام رہا۔ دنیا سے چلے جانے کے بعد اسے ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ شاعری، ادب اور مشہور ترین تھیٹر ڈرامے اُس کی یاد تازہ کرتے رہے۔ وہ دانشور اور استاد تھا مگر لوگوں میں اُس کی یاد ادب اور ڈراموں میں اُس کا کردار زندہ رہنے کی وجہ اُس کی بد قسمتی تھی۔ موت کے بعد صدیوں تک انگلستان کے رومانی ادب اور پرفارمنگ آرٹ کے منظر نامے پر زندہ رہنے والا یہ دانشور اور ماہر علوم فلسفہ یوگن ایرم تھا۔

عمر میں وہ دنیا سے اچانک رخصت ہوا اور اپنے پیچھے بھیڑوں کی طرح لاوارث ہن قبائل چھوڑ گیا جنہیں پہلی بار ایک بہترین رہنما ملا تھا۔ اس کے مرتے ہی ہن چند ہائیوں میں یورپ کے آفتی سے یوں غائب ہوئے جیسے بھی تھے ہی نہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی یورپ میں ان کا مقابلہ کرنے والی کوئی قوت باقی نہیں تھی۔ اٹیلوس کو اٹیلہ کا جانشین بنایا گیا تھا لیکن اس سے بھیڑیوں کا یہ نگہ سنبھالا نہ گیا۔

اٹیلہ کی موت ایسی بات نہیں تھی جو چھپ جاتی۔ ایک ہفتے بعد ایک قاصد مار سین کے دربار میں داخل ہوا اور اس نے ایک سر بہ مہر لفظ شہنشاہ کو پیش کیا اور اس نے بے تابی سے اسے چاک کیا جیسے ہی اس کی نظر خط کے متن پر گئی اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ جب آئی ٹیس کو یہ اطلاع ملی تو اس نے قہقہہ نہیں لگایا تھا صرف افسردگی سے سر ہلایا تھا۔ اٹیلہ اس کا نہیں روم کا دشمن تھا۔ بلکہ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اٹیلہ اس کا محسن تھا۔ اسی وجہ سے آئی ٹیس کو قید خانے سے نکال کر روی افواج کا کمانڈر ان چیف بنایا گیا تھا اور اب اٹیلہ باقی نہیں رہا تھا تو اب اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ ابھی آئی ٹیس اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ روم سے اس کا بلاوا آ گیا۔ وہ جانتا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے جانا تھا۔

دربار میں شاہ ویلیخانین، ملکہ میریا اور آکس آئی ٹیس کے منتظر تھے۔ آئی ٹیس نے اٹیلہ کی موت کی اطلاع دی لیکن یہ روم تک پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اقتدار کی کنون پر قابض ان ہوس پرست لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اٹیلہ کی موت آئی ٹیس کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے اور اس نے روم کو وحشی ہنوں سے بچالیا ہے۔ اس کی خدمت کا صلہ یوں دیا گیا کہ شاہ ویلیخانین نے اپنے ہاتھ سے آئی ٹیس کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا کیونکہ اب اسے آئی ٹیس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس واقعہ پر شاہ کے ایک مشیر نے اس سے کہا۔

”آپ نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کو کاٹ دیا ہے۔“
مشیر غالباً بھول گیا تھا کہ جب آدمی کے دماغ میں حکمرانی کا خناس سوار ہوتا ہے تو سوچ اور غلطی کی صرف ایک تشریح کرتا ہے جو وہ کہتا ہے اور کرتا ہے وہی سچ ہے باقی سب غلط ہے۔ صرف دو سال بعد آئی ٹیس کے دو دوستوں نے شاہ ویلیخانین کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی دو ہائیوں کے بعد مغربی سلطنت روم کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

تھی جس نے دریائے ڈینیوب پار کیا اور براہ راست اٹیلہ کی سرزمین پر حملہ کیا تھا۔ اٹیلہ اپنی ساری فوج ساتھ لے آیا تھا اور پیچھے ملک کی حفاظت کے لیے کوئی فوج باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے اٹیلہ نے فوری واپسی کا فیصلہ کیا کیونکہ مار سین کا حملہ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس بارے میں اس کے جاسوس مکمل معلومات نہیں رکھتے تھے۔

اٹیلہ یقیناً یہ سوچ کر واپس آیا تھا کہ وہ جلد واپس جائے گا اور اپنی آؤموری مہم مکمل کرے گا۔ اس نے ڈینیوب کے کھلے میدانوں میں دُر آنے والی مار سین کی فوج کو مار بھگانے کے لیے اپنی فوج روانہ کی اور خود دار الحکومت آ گیا۔ یہاں اس نے اولڈوکا سے شادی کا اعلان کیا اور پھر ایک شاندار تقریب میں نہایت دھوم دھام کے ساتھ اٹیلہ اور اولڈوکا رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ شب سہاگ منانے سے پہلے اٹیلہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ہمراہ رات دیر گئے ناچتا اور شراب پیتا رہا۔ اس نے شراب اتنی زیادہ پی لی تھی کہ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ اولڈوکا کے شانوں کا سہارا لے کر اپنی نئی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ یہ چاروں طرف سے الگ ایک گول عمارت تھی۔

اگلی صبح جب اٹیلہ دیر تک اندر سے برآمد نہیں ہوا تو اسٹیکس نے خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی اور جواب نہ ملنے پر وہ اندر داخل ہو گیا۔ اٹیلہ کی طرف سے اسے اجازت تھی کہ وہ کسی بھی وقت اس کے پاس آ سکتا تھا۔ اسی اجازت کے سہارے اسٹیکس اندر داخل ہوا اور اس نے اٹیلہ کو بستر پر اس حالت میں مردہ پایا کہ اس کی ناک سے کچھ خون نکلا ہوا تھا۔ یہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ کسرت شراب نوشی سے اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی تھی اور وہ مر گیا۔ مگر بستر پر ایک طرف بیٹھی اولڈوکا نے اعتراف جرم کر لیا کہ اس نے اٹیلہ کو زہر دے کر ہلاک کیا ہے کیونکہ وہ اس کے قہیلے اور خاندان کی تباہی کا ذمے دار تھا۔ اسٹیکس نے اولڈوکا کو اسی وقت ہلاک کر دیا تھا۔

لیکن کیا واقعی ایسا ہی ہوا تھا؟ یہ حقیقت تاریخ کے پراسرار وحید نگے میں غائب ہے کہ اٹیلہ کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی۔ بادشاہوں کی پراسرار اموات کوئی انوکھی بات نہیں ہے بلکہ اکثر اقتدار کے نشے میں لوگوں سے کھلونوں کی طرح کھیلنے والے ان افراد کا انجام دردناک ہوا ہے اور وہ عموماً اس وقت فنا سے دوچار ہوئے جب ان کے دماغوں میں مستقبل کے حوالے سے بڑے بڑے منصوبے پل رہے تھے۔ اٹیلہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ صرف چالیس سال کی

1829ء میں شاعر قاسم ہڈ نے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم تھی 'یوگن ایرم کا خواب' یہ نظم بہت زیادہ مشہور ہوئی۔ اتنی مشہور کہ عرصے تک اس کے بول راہ چلتے لوگ گنتا تے رہے۔ جہاں آتشدان کے سامنے ڈرائنگ روم کی چھت تلی۔۔۔۔۔۔ لوگ اکٹھے بیٹھتے گفتگو کا رخ.... اُس کی طرف مڑ جاتا تھا۔ موضوع ہوتا تھا 'یوگن ایرم کا خواب' مگر باتیں اس سے بھی آگے تک چلی جاتی تھیں۔ وہ باتیں جس میں عظیم برطانوی دانشور کے پراسرار قتل کے پس پردہ حقائق جاننے کی جستجو نظر آتی تھی۔ مگر یہ جستجو آج تک صرف ایک جستجو ہی ہے۔

بڑی تعداد میں شائقین ان فن پاروں کو دیکھنے کے لیے گیلری آ رہے تھے۔ یہ فن پارے غیر ملکی مصور ایرم گستاؤور نے تخلیق کیے تھے۔ 1829ء میں تھامس ہڈ نے یوگن ایرم کو جو مشہور نظم لکھی تھی، اس کا اضافہ شدہ ایڈیشن 1872ء میں شائع ہوا تھا۔ مصور نے اضافہ شدہ نظم کو موضوع بنا کر، ایرم کے کردار کو عکس شکل میں اُجاگر کرنے کے لیے یہ فن پارے تخلیق کیے تھے۔

۱۰۔ پشاور تھا۔ یوکن جب چھ برس کا تھا تب اس کے
والدین نے اس محل کو چھوڑ کر کچھ میل دور واقع نیو بے ہال
میں سرایہ اور ایلیٹ کے محل نما گھر میں سکونت اختیار کی تھی۔
یہاں سرایہ ورڈ کی زمینوں کو ہموار کر کے اس پر باغ لگانے
لگے آیا تھا۔ وہ سارا دن زمینوں کو ہموار کرنے میں بھرتا رہتا
تھا۔ یوکن سرایہ ورڈ کے پاس بیٹھ کر علم نباتات پڑھا کرتا تھا۔
وہ علم نباتات کے بہت بڑے ماہر بھی تھے۔ اس کے ساتھ ہی
الہ دین اسے لکھنا اور پڑھنا بھی سکھاتے جا رہے تھے۔

مشاہیر عالم کی نظر میں اسلام
حضور پر نورؐ کی شخصیت
ایڈمنڈ ہرک:

اور یادداشت بھی بہت اچھی تھی۔ لہذا بہت تھوڑے عرصے میں اس نے ریاضی کے مضمون میں اعلیٰ سند حاصل کر لی۔ اس کی یہ تعلیمی سند آگے چل کر اس کے پیشے میں مددگار بننے والی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یونانی اور لاطینی زبان کی تعلیم بھی حاصل کرتا رہا اور بہت جلد اس نے ان دونوں زبانوں پر عبور حاصل کر لیا۔

لندن میں کئی سال گزارنے اور تعلیم مکمل کر لینے کے بعد اسے یہاں مزید رہنے کا کوئی جواز نظر نہیں آیا۔ دفتر کے انتظامی امور پر اگرچہ اس کی اچھی خاص گرفت قائم ہو چکی تھی لیکن اس کے خیال میں یہ وہ کام تھا جو کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔ خود اسے پڑھنے پڑھانے سے شغف تھا۔ اس لیے وہ لندن چھوڑ کر برطانیہ چلا آیا۔ لندن سے کافی دور واقع اس علاقے میں اب اس کا خاندان مقیم تھا۔ اس کا باپ پیٹر ایرم سرائیڈ ورڈ کی موت کے کچھ سال بعد یہاں چلا آیا تھا اور اب وہ سر جان انگل بے کی زمینوں کو ہموار کر کے باغ لگانے میں مصروف تھا۔ لندن کے مقابلے میں یہ علاقہ خاصا پرسکون تھا۔ یوگن کو امید تھی یہاں اس کی تحقیقی صلاحیتیں اور زیادہ اچھی طرح اُجاگر ہو سکیں گی۔

یوگن ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر ان کی گزر بسر اچھی طرح ہو رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ پرسکون زندگی اور تحقیقی کاموں کے لیے اس کا برسرِ روزگار ہونا ضروری ہے۔ ریاضی اور لسانیات کی تعلیمی اسناد تو اس کے پاس ہی تھیں۔ اس لیے بہت جلد اسے برطانیہ کے ایک معروف اسکول میں ریاضی کے امتدادی نوکری مل گئی۔

وہ دس برس تک گوئچ ویٹ ہال اسکول میں پڑھاتا رہا۔ برطانیہ میں واقع یہ اسکول اس کی جائے پیدائش رامس رگل سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اسکول کی ملازمت کے دوران وہ ایسے شخص کے روپ میں سامنے آیا جو ڈسپلن کے معاملے میں شاگردوں پر خاصی سختی برتتا تھا مگر اس سخت گیری کے باوجود اس کی شہرت دوسرے اساتذہ سے زیادہ تھی۔ وہ امتداد سے زیادہ اسکالر کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے شاگرد سخت گیر رویے کے باوجود اس سے پیار کرتے تھے اور وہ بھی کوشش کرتا تھا کہ اپنے شاگردوں کے ذہن میں اٹھنے والے ہر سوال کا جواب اس طرح دے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہو جائیں۔ اسکول میں ہی نہیں، اطراف کے دیگر علاقوں کے سماجی حلقوں میں بھی اس کی علیست کے پیش نظر اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ اب تک یوگن ایرم غیر شادی شدہ تھا۔

آخر اسے شادی کا خیال آیا اور پھر 1731ء میں انٹیس کی عمر میں اس نے ایک مقامی لڑکی سے شادی کر لی۔ نام ایسا آپس تھا۔ شادی کے تین برس تک تو یہ جوڑا برطانیہ ہی رہا۔ اب تک وہ اسی اسکول میں پڑھا رہا تھا لیکن پھر دن اس نے ملازمت چھوڑ کر یہاں سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ برطانیہ سے چوبیس کلومیٹر دور واقع ایک بڑے قصبے کی بوروگ منتقل ہو گئے۔ یہ قصبہ نارڈھ یارک شائر میں دریائے کے کنارے واقع تھا۔ کیرس بوروگ میں یوگن کو مالی لحاظ سے زیادہ پرکشش مواقع نظر آئے۔ اس نے بھی ایک انسان کی طرح ان مواقعوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنا اپنا اسکول کھول لیا۔ لندن میں سرائیڈ ورڈ کے دفتر میں سکھنے انتظامی امور اور گوئچ ہال اسکول میں تیرہ برس تک پڑھانے تجربہ، یہاں یہ دونوں چیزیں اس کے کام آئیں۔ اس نہایت کامیابی سے اسکول شروع کر دیا۔ وہ براہِ راست انتظامی اور تعلیمی سلسلے پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ ڈسپلن کی پابندی کے حوالے سے اس کا رویہ تو پہلے ہی سخت گیر تھا۔ یوں اس جملہ ذاتی خصوصیات نے اسکول کو بہت جلد پورے قصبے کا مشہور کر دیا۔ لوگ اب خواہش کرتے تھے کہ ان کے یوگن کے اسکول میں تعلیم حاصل کریں۔ یہی وجہ تھی کہ پورے قصبے کے عام اور خواص، دونوں میں اسے نہایت قابلِ احترام نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ چند سال کے اندر اندر یوگن کیرس بوروگ کے سماج میں ایک اہم ستون کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ یہی نہیں، اس کی شہرت اس پاس کے بڑے بڑے قصبوں اور شہروں تک بھی پھیل چکی تھی۔

کیرس بوروگ میں یوگن کا سماجی مقام کیا تھا، اس بارے کو سمجھنے کے لیے اس پمفلٹ کی تحریر ہی کافی ہے، جو اس پمفلٹ کے خلاف احتجاجاً قصبے کے باشندوں نے شائع کر کے تقسیم کیا تھا:

”وہ اس قصبے میں بدلتوں رہا لیکن اس کے کسی بھی قول فعل یا عمل سے کوئی خرابی یا بُرائی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ وہ مہذبہ شخص کی حیثیت سے ادبِ آداب سے بھرپور زندگی بسر کرتا رہا۔ اس نے کین دین میں کبھی کوئی ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔ یہاں کی قابلِ احترام اور برادری کی شخصیت تھا۔ انہی شخصیت جس کے کردار پر آج تک کسی کو انگلی اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ ہم سب کے لیے نہایت ہی قابلِ احترام انسان ہے۔ اس نے اپنے کردار سے قصبے میں یہ عزت پائی ہے۔ عزت، جسے ولٹ سے دی گئی یہ موت کی سزا بھی نہیں

ملتی۔ وہ ہمیشہ ہماری نظروں میں وقار کے ساتھ زندہ رہا۔“

اگرچہ اس پمفلٹ سے یوگن کی سزا موخر نہیں ہوئی، مگر اس کی شہرت، عزت و وقار میں مزید اضافہ ہوا۔ اسکول کے ذریعے حاصل کی گئی مالی آسودگی مطمئن ہو گئی مگر کرنے کے لیے کافی تھی۔ ایک باغبان کا بیٹا ہو کر بھی وہ فعال زندگی گزار رہا تھا مگر باہر کے مقابلے میں اس کی کمزوری آسودہ نہیں تھی۔ ایسا آپس کے نظروں سے یوگن کے آٹھ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے دو کم عمری میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ بعد میں اکثر وہ اپنی بیوی کو ان بچوں کی موت کا درد قرار دیتا تھا۔ ان کے درمیان لڑائی جھگڑے معمول کی بات تھی۔ خود یوگن بھی سمجھتا تھا کہ بیوی نے اس کی زندگی کو جہنم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ خود ایسا اُسے طے نہ دیتی تھی کہ وہ اسے شوہر کا وہ پیار نہیں دے سکا جو بطور بیوی اس کا ملتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ نا آسودہ جذباتی زندگی کے شاکی تھے اور ایک دوسرے کو ذلت دار ٹھہراتے تھے۔ گھریلو زندگی میں تو ہر کی محبت نہ ملنے کی شاکی ایسا نے جذباتی آسودگی کے لیے آخر ایک راہ منتخب کر لی۔ اس وقت وہ آٹھ بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

ایسا..... نے قصبے کے ایک جوتا ساز ڈیٹیل کلارک سے دوستی کر لی۔ ان کی دوستی بہت جلد گہری دوست میں تبدیل ہو گئی۔ وہ جوتا ساز بہت غریب اور غیر شادی شدہ تھا۔ دراصل وہ نا آسودہ جذباتی زندگی بسر کرنے والی شادی شدہ مگر مالدار مردوں سے دوستیاں کر کے ان سے رقم بٹورتا رہتا تھا۔ ایسا تن من دمن سے اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ سمجھتی کہ اگر اس کی زندگی میں یوگن کے بجائے ڈیٹیل ہو تو وہ زیادہ فلاحیوں بھری زندگی بسر کر سکے گی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی فلاح کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے کچھ کرتی وہ دماغ باز اپنے اصل روپ میں سامنے آ گیا۔

ڈیٹیل کلارک نے قصبے کی ایک خوش حال بیوہ سے شادی کر لی تھی، وہ بھی صرف اس لالچ میں کہ شادی پر وہ اسے تین ہزار نقد دے گی۔ سواری کے لیے اُسے گھوڑا خریدوائے گی اور اس کے لیے ایک اصطلیل بھی بنوادے گی۔ غریب جوتا ساز کے دل میں مدت سے ذاتی سواری کے لیے گھوڑا خریدنے کی خواہش تھی اور یہاں تو کئی اور ان کی خواہشوں کو بھی پورا کرنے کا موقع مل رہا تھا، سو اس نے فوراً فائدہ اٹھایا اور اپنا مدد بھرتی کر لیا۔

مکلف شواہد سے پتا چلا ہے کہ عمر کے اس حصے میں جب

ایسا جوتا ساز سے عشق لڑا رہی تھی، تب یوگن میں ہم جنس پرستی کے میلانات ابھر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک کم عمر لڑکے کو تنہائی میں عورتوں کا لباس پہنا کر کہا کرتا تھا کہ وہ خود کو ایسا سمجھے اور ایک لڑکی کی طرح اس سے اظہارِ عشق کرے۔ اب وہ اکثر شراب بھی پینے لگا تھا۔ کہتے ہی کہ وہ مقامی طور پر تیار کی گئی ایک گھٹیا شراب پینے لگا تھا۔ ٹکسنے والوں نے لکھا ہے کہ کیرس بوروگ میں تیار کردہ کراؤن کیس بوروگ نامی یہ سستی شراب صرف ایک ہی میخانے میں دستیاب تھی۔ وہ میخانہ بھی سستی شراب کی طرح نہایت ہی گھٹیا درجے کا تھا لیکن یوگن اس دونوں کا ترسیا ہو چکا تھا۔ اکثر رات کی تاریکی میں وہ دوسروں کی نگاہوں سے چھپتا چھپاتا اُس میخانے کا رخ کرتا تھا۔ یہیں اس کی دوستی میخانے کے مالک ہنری ٹیری سے ہو گئی۔ وہ مشکوک کردار کا انسان تھا۔ علاقے میں اس کی شہرت بھی خراب تھی مگر یوگن ان تمام باتوں سے لاپرواہ ہو چکا تھا۔ شاید یہ ایسا کے اس معاشرے کا سبب ہو جو اُس نے جوتا ساز سے کیا۔ ایسا سمجھتی تھی کہ یوگن اس راز سے واقف نہیں۔ ویسے بھی اس نے کبھی بیوی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس کے خفیہ عشق کے بارے میں جان چکا ہے لیکن اس جیسے نفس کردار کے مالک کی زندگی کا بیوی کے معاشرے کے بعد جو رخ سامنے آیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ کسی شدید جذباتی صدمے نے اس کی زندگی کو اندر سے الٹ پلٹ دیا تھا۔ یوگن کے ساتھ ساتھ وہاں ایک اور گاہک بھی باقاعدگی سے آتا کرتا تھا۔ اُس کا نام فرانسز تھا۔ اس کے بارے میں افواہیں تھیں کہ وہ جرائم پیشہ ہے اور چوروں سے چوری کا مال خریدتا ہے۔ میخانے کا ایک اور باقاعدہ گاہک رچرڈ ہاؤس مین تھا۔ وہ ان کا معمولی سا جوتا اور مٹوں سے قصبے میں ہی رہتا تھا۔ اُس زمانے کا یہ ذکر ہے، اُس زمانے میں ان کو برطانیہ میں نہایت قیمتی جس سجھا جاتا تھا۔

وہ سردیوں کا موسم تھا۔ ٹھنڈ بہت زیادہ تھی۔ کیرس بوروگ میں زندگی سرِ شام ہی گھروں میں بیٹ جاتی تھی اور رات وقت سے بہت پہلے قصبے پر اُتر آتی تھی۔ وہ سات فروری 1745ء کی ایسی ہی ایک سرد رات تھی۔ آسمان پر بادل کا نام و نشان تک نہ تھا اور چڑھتے چاند کی چاندنی میں پورا قصبہ نہایا ہوا تھا۔ وہ رات کا پہلا پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد نظر آ رہا تھا۔ راستے اور گلیاں بالکل سنسان تھیں۔

رات کے تین بج رہے تھے جب یوگن کے ایک ہمسائے نے اپنے گھر کی کھڑکی سے اتفاقی طور پر گلی میں ڈیٹیل کلارک

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels, Imran series, Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or
send message at
0336-5557121

سے ایک قیمتی نادر طشتری بھی چوری ہو چکی تھی۔ یہ طشتر خالص سونے کی بنی ہوئی تھی۔“

ایک جانب ڈینٹل اور اب اس کے ساتھ بھاری مالیت سامان غائب ہو جانے کی خبریں سرگرم تھیں تو دوسری طرف اس عرصے میں یوگن ایرم حیران کن انداز میں دولت مند ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ قصبے میں معتبر حیثیت کا حامل تھا اور اب تک نہایت شریفانہ انداز میں زندگی بسر کر رہا تھا لیکن مالی فراغت اسے میسر نہیں تھی۔ اس کا گھر رہن رکھا ہوا تھا۔ اس پر کئی سا ہوکاروں کا قرض بھی واجب الادا تھا، جنہیں وہ باقاعدگی سے قسطوں میں ادا کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے اس کے قرض داروں اور قصبے میں اس کے قریبی جاننے والوں کو اندازہ ہوا کہ اس کے پاس اچانک کہیں سے اچھی خاصی دولت آگئی ہے۔

ہوا یہ کہ اس کے ایک قرض دار نے مقامی عدالت میں قرض کی ادائیگی کے لیے یوگن کے خلاف ایک درخواست پیش کر دی۔ جج کے حکم پر اسے قرض نادہندہ کی حیثیت سے پولیس نے گرفتار کر کے عدالت کے رو برو پیش کر دیا۔ قرض دہنے والا بھی وہیں موجود تھا۔ جج نے اس پر لگایا گیا الزام پڑھ کر سنایا۔ یوگن نے قرض دار ہونے کا اعتراف کیا اور پیشکش کی کہ وہ فوری طور پر درخواست گزار قرض دار کا سہا قرضہ ادا کرتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے کوٹ کے نیچے پہنی ہوئی اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب سے سرخ نخل کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور جج کے سامنے ہی سونے کے سکوں سے بھری تھیلی میں سے گن کر سو سکے نکالے اور قرض دار کے حوالے کر کے رسید حاصل کر لی۔ قرض ادا ہو جانے کے بعد جج نے پاس اس کی رہائی کا حکم دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، سوا کہ اس نے ایسا ہی کیا مگر یوگن کو جاننے والوں کی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ اس زمانے کے حساب سے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ جب یوگن کو گرفتار کیا گیا تو اس کے دوستوں خدشہ تھا کہ وہ کمزور مالی حیثیت کے باعث ادائیگی نہیں کرے گا اور جج اسے جیل بھیج دے گا مگر اب وہی دوست اور جاننے والے سب سے زیادہ پریشان تھے کہ اس کے پاس اتنی دولت اچانک کہاں سے آگئی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، صرف قیاس آرائیاں تھیں جو زبان زد دوستاں تھیں۔

یوگن ایرم نے اپنے گھر کو بھی بھاری قرض کے عیوض رہن رکھا ہوا تھا۔ عدالت میں قرض کی ادائیگی کا واقعہ ابھی گزر ہی تھا کہ اس نے رہن کی پوری رقم بیع سود کے ادا کر کے گھر آزاد کر والیا۔ یہ ایسا دوسرا بڑا واقعہ تھا کہ جہن آئے لوگوں

کو دیکھا۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی اور کھڑکی پر پڑے موٹے پردے برابر کر کے پھر بستر پر آ گیا۔

رات کے اُس پہر ڈینٹل کی موجودگی اچھنبے کی بات تھی۔ اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دوسری صبح وہ اپنے گھر سے غائب تھا۔ جب سے اس نے شادی کی اور گھوڑا خریدا تھا، تب سے وہ گھوڑے کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا مگر اُس صبح گھوڑا تو اُٹھٹیل میں اپنے تھان پر بندھا کھڑا تھا مگر ڈینٹل کلاڑک پر اسرار طور پر غائب ہو چکا تھا۔ وہ کہاں چلا گیا؟ اس سوال کی بازگشت اگلے کئی ہفتوں تک قصبے کے کوچہ و بازار میں سنائی دیتی رہی۔

ڈینٹل کلاڑک لمبے قد، چھریرے بدن، نیلی آنکھوں، بھورے ٹھٹھکریا لے بال اور چھریرے بدن کا پُرکشش نوجوان تھا۔ گمشدگی کے وقت اس کی عمر صرف تیس سال تھی۔ ایک ماہ ہونے کو آگیا مگر اس کی گمشدگی بدستور معما بنی ہوئی تھی۔ کسی کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لاپتہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ آخر ایک ماہ بعد مقامی رسالے York Courant نے پہلی بار ڈینٹل کی گمشدگی کے حوالے سے ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی، جس میں صحافی کے بقول اُس کی گمشدگی نہ سمجھ میں آنے والی اصل وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ رسالے نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:

”ڈینٹل کلاڑک متعدد لوگوں سے دھوکا دہی، نو سربازی اور قرض لینے جیسی کارروائیوں میں ملوث تھا۔ اس نے دھوکے سے متعدد لوگوں کی قیمتی چیزیں ہتھیالی تھیں۔ ڈینٹل نے گمشدگی سے پہلے جو چیزیں ہتھیائی ہیں اُن میں قیمتی گھریلو اور آرائشی سامان، نقدی، سونے چاندی کے سکے، ہیرے، قیمتی قلمی کتابیں، نوادرات، انگوٹھیاں، سونے سے بنے ہیرے اور قیمتی موتی جڑے بیش قیمت زیورات، قیمتی گھڑیاں اور بہت سا رادیکر سامان شامل ہے۔ اس نے گمشدگی سے پہلے دھوکے سے حاصل کیا گیا یا چوری سے جو سامان ہتھیایا تھا، اس میں تیار چڑے کی ایک گانٹھ بھی شامل ہے جس کی مالیت پینتالیس برطانوی پاؤنڈ تھی۔ علاوہ ازیں، جن اشیاء کی مالیت اب تک ملے کی جا چکی ہے وہ مجموعی طور پر ڈیڑھ سو برطانوی پاؤنڈ ہے۔ اتنی مالیت کے ساتھ وہ اب تک بدستور لاپتہ ہے۔“

رسالے نے اپنی رپورٹ کے آخر میں ایک چونکا دینے والا انکشاف بھی کیا تھا۔ خبر میں کہا گیا تھا:

”ڈینٹل کی بیوی نے انکشاف کیا ہے کہ جب شوہر کی گمشدگی کے بعد اس نے گھر کی تجوری میں رکھی رقم دیکھی تو وہاں سے دو سو پاؤنڈ کی نقدی غائب تھی۔ اس کے علاوہ گھر

یقین دلا دیا کہ اس کے پاس اچانک بہت بڑی دولت کسی خفیہ طریقے سے آچکی ہے۔ یہ خیال تیزی سے قصبے کے لوگوں میں افواہ بن کر پھیل گیا۔

دوسری طرف ڈینیل کلارک کے ہاتھوں لٹنے والے سرگرمی سے اس کی تلاش میں تھے کہ اپنا لٹ جانے والا مال و متاع حاصل کر سکیں۔ جب یہ افواہ پھیلی تو وہ بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں اب یہ شک ہوا کہ کہیں وہ سارا مال ڈینیل کے ذریعے کوئی خفیہ گم جوڑ کر کے یوگن نے تو نہیں ہتھ لیا ہے۔ کافی سوچ و بچار کے بعد آخر ایک روز ڈینیل کے متاثرین نے یوگن کے گھر کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس پر تیار نہیں تھا مگر قصبے کی انتظامیہ کے آگے بے بس ہو گیا اور پھر تلاشی کا عمل شروع ہوا۔ اس تلاشی کے دوران ڈینیل کے متاثرین نے کچھ مسروقہ سامان برآمد کر لیا۔ یہ نخل اور اون کی وہ کچھ گائیکیں تھیں جنہیں چھانے کے لیے گھر کے باغیچے میں بڑی احتیاط سے دفن کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے فوری طور پر یوگن کو مال مسروقہ گھر میں رکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا۔

عدالت میں یوگن نے اعتراف کیا کہ نخل اور اون کی گائیکیں اس باغیچے سے ملی ہیں، وہ اس کی ملکیت ہیں لیکن اس نے اس سامان سے مکمل لاعلمی ظاہر کی۔ اس کا موقف تھا کہ گھر کی چار دیواری کے باہر کا یہ وسیع رقبہ بالکل کھلا ہوا ہے۔ یہاں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں جو کسی بھی شخص کو یہاں داخل ہونے سے روک سکے۔ نیز یہ کہ باغیچہ مدت سے آجڑ پڑا ہوا ہے۔ وہاں خود درجہ جھاڑیاں ہیں اور اس نے کسی مالی کو بھی ملازم نہیں رکھا ہوا ہے۔ گھر کا کوئی فرد شاید ہی مہینے میں ایک بار وہاں کا رخ کرتا ہو۔ اس لیے اسے یقین ہے کہ یہ سامان ڈینیل یا پھر جس نے بھی اسے چرایا تھا وہاں اسے دفن کر کے گیا تھا تاکہ مناسب وقت پر نکال سکے۔

جسٹریٹ نے اس کے موقف سے اتفاق کیا۔ یوگن کے خلاف دریافت مال کے دعویدار کوئی اور شخص ثبوت پیش نہ کر سکے جبکہ جسٹریٹ کے سامنے اس کا شفاف ماضی بھی تھا۔ یوں اسے چوری کے الزام سے باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔ عدالت سے بری ہونے کے بعد ایک دو ہی ایسے واقعات ہوئے جن پر ایک بار پھر لوگ سوچنے لگے کہ اس کے پاس بہت زیادہ دولت آچکی ہے مگر کہاں سے؟ عدالت سے بری ہونے کے بعد اکثر ایسے خیال کے حامی لوگوں کا ماننا تھا کہ اس کے پاس موجود دولت کو شاید غیر قانونی ثابت کرنا بہت ہی مشکل ہوگا۔ اس لیے یہ خیال صرف چہ میگوئیوں کی حد تک ہی محدود رہا۔ دوسری جانب ڈینیل بدستور لاپتا تھا۔ جب

یوگن کے گھر سے مسروقہ مال برآمد ہوا، تب لوگوں کو یقین آ گیا کہ اس مال کے ذریعے خود یوگن انہیں ڈینیل کا بتا دے گا مگر اس کی بریت کے ساتھ ہی یہ موبہوم امید بھی توڑ گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈینیل کہاں ہے۔ ڈینیل گمشدگی قصبے میں گنگو کا مرکزی موضوع تھی۔ اس پر دوس قصبے والے بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔

مقامی رسالہ York Courant ڈینیل کے حوالے سے قصبے والوں کے لیے تازہ ترین معلومات کا ذخیرہ تھا۔ رسالے کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ جب سے گمشدگی کی خبریں چھپ رہی ہیں، اس کی اشاعت بھی بڑھ گئی ہے۔ رسالے کا ایڈیٹر اور مالک اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یوگن عدالت سے باعزت بری ہو گیا ہے تو انہوں نے یہ واقعہ تازہ رسالے کے لیے اپنے رسالے میں نمایاں انداز میں اشتہار شائع کر ڈینیل کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دینے والے پندرہ پاؤنڈ بطور انعام دیے جائیں گے۔ اس اعلان کے لوگوں میں تجسس پیدا کر دیا تھا۔ گنگو اور فارغ لوگوں کے اس اشتہار میں خاصی کشش تھی۔ کئی لوگ اس بھاری رقم حاصل کرنے میں بھٹ گئے تھے۔

اپریل 1745ء کے دن تھے۔ ڈینیل کا قصبہ اب دھندلاتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی اس واقعے کو یہ تیسرا تھا۔ لوگوں کی یہ چہ میگوئیاں بھی دم توڑ چکی تھیں کہ یوگن اچانک کیسے دولت مند ہو گیا تھا؟

ماہ اپریل کے اس موسم بہار کی ایک صبح یوگن نے سامان اور کپڑے وغیرہ ایک کھیلے میں ڈالے اور بیوی بچوں سے یہ کہہ کر چل دیا کہ وہ چند روز کے لیے اپنے کسی رشتے سے ملنے کے لیے نوٹنگھم جا رہا ہے۔ اس کی بیوی تو شکم میں رہنے والے شوہر کے کسی ایسے رشتے دار کو نہیں جانتی تھی جہاں جانے کا کہہ رہا تھا اور نہ ہی اس نے رشتے دار کا نام پتا اور لوہا آنے کا وقت بتایا تھا۔ ایک صبح جو وہ اس گھر سے نکلا تو پھر بھی لاپتا ہو گیا۔ اگلے تیرہ برس نہ تو وہ لوٹا اور نہ ہی اس کے والوں کو اس کی کوئی خبر ملی۔

☆☆☆

یوگن ایرم قصبے میں اپنے گھر سے نکل کر نوٹنگھم میں رشتے دار کے ہاں نہیں گیا تھا بلکہ اس کی موت کے بعد چھان بین ہوئی تب پتا چلا کہ وہ لندن پہنچ گیا تھا۔ لندن اس نے پکا ڈالے کی ایک اکیڈمی میں نوکری کر لی اور پڑ پڑھانے میں مشغول ہو گیا۔ لندن میں اپنے مطالعے

اس نے محسوس کیا کہ عبرانی اور کیلٹی زبان میں فلسفے کا ۱۱۹ لہرہ موجود ہے لیکن ان دونوں زبانوں سے لاعلمی ۱۹۵۰ء اس کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ اس خیال کے آتے ہی لے ان دونوں زبانوں کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور ۱۹۵۰ء ان زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنے پر قادر ہو گیا۔ ان میں بارہ برس تک پڑھنے اور پڑھانے میں مصروف

مارچ 1757ء میں کرسس سے کچھ پہلے لندن کے ایک ادارے میں شائع شدہ ایک اشتہار اس کی نظروں سے گزرا۔ یہ اشتہار تارفاک کے کنٹرولر اسکل کی انتظامیہ کی طرف سے لایا گیا تھا۔ انہیں ایک ماہر استاد کی ضرورت تھی۔ انہوں نے امیدوار میں جس قابلیت اور خوبیوں کو لازمی قرار دیا تھا، ان پر پورا اُترتا تھا۔ ویسے بھی اب ایک بار پھر اس کا دل اس سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسے ایک بار پھر سکون جگہ کی تلاش تھی۔ اسے یہ اشتہار لندن سے فرار کا ذریعہ محسوس ہوا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر درخواست بھیج دی اور قسمت کی ادا کی کہ اس کا انتخاب بھی کر لیا گیا۔

تارفاک کے اسکول میں ابھی اس نے چند مہینے ہی پڑھایا تھا کہ شاگردوں میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ طالب علم اسے پڑھانے لگے تھے۔ وہ بہت جلد اسکول کے بچوں میں لائیکس اسٹاڈ کا درجہ حاصل کر گیا۔ وہ یہاں پر کئی اور مضامین کے ساتھ ساتھ علم نباتات بھی پڑھاتا تھا۔ یوگن دیگر اساتذہ کے مقابلے میں صرف کتابی علم پر ہی انحصار نہیں کرتا تھا۔ وہ عموماً کوکھانے پھرانے کے لیے جنگلوں میں لے جاتا اور پھر انہیں نباتات کی عملی تعلیم دیتا تھا۔ وہ انہیں پودوں، درختوں، پھولوں، پتیوں اور جڑی بوٹیوں کی پہچان کرواتا، ان کے لوازمات بتاتا اور انہیں وہاں موجود کثیرے مکوڑوں کے حیاتیاتی نظام اور انسانوں کے لیے ان کے فوائد سمجھاتا تھا۔ اس کا یہ طرز تعلیم بچوں کے لیے دلچسپ اور مزیدار تھا۔ کھیل اور لڑائی کے ساتھ ساتھ بچے وہ سب کچھ بہت کم وقت میں سیکھ جاتے تھے جو کتاب کی مدد سے انہیں مہینوں میں بھی اچھی طرح سمجھ نہیں آتا تھا۔

تارفاک اسکول میں اس وقت ان کے شاگردوں میں ایک بچہ جیمز برنی بھی تھا۔ جیمز نے بڑا ہونے پر برطانیہ کے فوجی میڈے میں ملازمت اختیار کی اور ریتیرائیڈ مرل کے اعلیٰ ترین مہدے تک پہنچا۔ جیمز نے یوگن کے حوالے سے اصل کے زمانے کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا: "وہ ایک دن انہیں لے کر باغ میں گھوم رہے تھے کہ

اچانک انہیں ایک کچھوڑ چٹکتا ہوا نظر آیا۔ انہوں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا اور ہماری آنکھوں کے سامنے لٹکاتے ہوئے کہنے لگے۔ "یہ دیکھو..... یہ کافا نہیں ہے۔" اس سے پہلے صرف مجھے ہی جیس، کئی اور بچوں کو بھی کچھوڑ سے بہت ڈر لگتا تھا لیکن یہ دیکھ کر ہمارا ڈر کی حد تک ختم ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں بتایا کہ کچھوڑ نباتات کی صحت کے لیے کتنا اہم ہے۔ انہوں نے اس موقع پر کہا تھا کہ کوئی بھی کیڑا مکوڑا احتیاط سے پکڑا جائے تو چاہے وہ ڈنک بھی رکھتا ہو، تب بھی ڈنک نہیں مار سکے گا۔ یہ بات میرے دل پر اثر کر گئی۔ اس کے بعد میں پھر بھی کسی کیڑے مکوڑے یا جنگلی جانور سے خوف زدہ نہیں ہوا۔"

جیمز نے ایک اور دلچسپ بات بتائی۔ ان کا کہنا تھا: "ایک دن ہم سب ایک باغ میں دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یوگن نے وقت گزاری کے لیے ایک لڑکے کو مختصر سا کتا بچہ دے کر اس میں لکھی ہوئی کہانی پڑھنے کو کہا۔ اس کتا بچے کا نام تھا خفیہ قتل کی دریافت۔ یہ کتا بچہ ناروج کے ڈبلیو پیس نے شائع کیا تھا۔"

اب یہ شاید ایک اتفاق تھا کہ جس وقت وہ بچہ یوگن کے دیے ہوئے کتا بچے میں خفیہ قتل کے انکشاف کا قصہ پڑھ رہا تھا، اس وقت یہاں سے بہت دور کیرس بوروگ قصبے کے نواح میں ایک ایسی لاش کی باقیات مل رہی تھیں جو آنے والے وقت میں اس قصبے کے اس استاد کی زندگی میں فیصلہ کن موڑ لے کر آنے والی تھیں۔

☆☆☆

یہ یکم اگست 1758ء کا دن تھا۔ کیرس بوروگ قصبے کی نواحی پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑ پر ہم توڑ لے کے کام میں مصروف تھے۔ یہ علاقہ ٹائٹ رائٹ مار کے نام سے مشہور تھا۔ چند مہینوں میں گڑے چھوڑے ہوئے ہمارے دل کو دہشت ہوا کر کے میں لگے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ مار کے دہلے کے سامنے کام کر رہے تھے۔ اچانک بچے کے ساتھ ملی اور کچھ ایسی شے بھی باہر آئی جو ان سب کو چونکا گئی۔ یہ انسانی ہڈیاں تھیں۔ ہڈیوں کے ملنے سے صاف ظاہر تھا کہ اس جگہ پر کسی انسان کو دفن کیا گیا ہے۔ وہ اسے قتل قرار دے رہے تھے۔ یہ خیال اس لیے مضبوط تھا کہ یہاں کا قبرستان کافی دور واقع تھا اور ویسے بھی سپت کو باقاعدہ تابوت میں دفن کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی گہرائی میں مگر یہاں تو ایک فٹ گہرا گڑھا کھودنے پر ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ وہاں موجود موزور کا کافی دیر تک شش و پنج میں مبتلا رہے۔ آخر کار سب نے باہمی صلاح و مشورے

آنڈل، روزبتہ، پرل، روبی یا مولی فنانچر؟

10 مئی 1864ء کو بروک لین کے علاقے میں ایک سولہ سالہ لڑکی Mollie Fancher گھوڑے کی پشت سے سر کے نکل کر پڑی۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور دماغ بھی متاثر ہوا، ڈاکٹروں کی کوششوں سے وہ صحت یاب ہو گئی مگر اگلے برس جون کی 8 تاریخ کو اس بد قسمت کا دوبارہ حادثہ ہو گیا، اس مرتبہ اسے گاڑی سے ٹکر لگی تھی۔ کسی کو اس کے بچنے کی امید نہیں تھی مگر ڈاکٹروں کی کوششوں سے وہ ایک بار پھر شیک ہو گئی۔ 3 فروری 1866ء کو ایک شام ڈاکٹر رابرٹ اسپائر نے مولی فنانچر کو دیکھتے ہوئے قریب کھڑی مولی کی خالہ سون کو کہا کہ لڑکی کی حالت اب بہتر ہو رہی ہے۔ ابھی ڈاکٹر نے بات کہی ہی تھی کہ مولی کا بدن ایک دم لرز گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ پورے ایک ماہ بعد جب وہ ہوش میں آئی تو اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کا تعارف اس کے عزیز واقارب اور خالہ سون سے کرایا گیا۔

اس نئی زندگی کا آغاز اس نے بڑے حوصلے سے کیا۔ اس زمانے میں اس نے چھ ہزار کے قریب خطوط تحریر کیے۔ نئے دوست بنائے اور کشیدہ کاری کے بہت سے نمونے تیار کر لیے۔ اس نئی زندگی کو 9 برس ہونے کو آئے کہ مولی ایک بار پھر بے خود ہو گئی۔ اس کی اصل شخصیت واپس آ گئی تھی مگر اسے 9 برس کے درمیان کی کوئی بات یاد نہیں تھی۔ جب اسے 9 برس کے دوران اس کے اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ نمونے اور اسی کے تحریر کردہ خطوط دکھائے گئے تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے، یہ کسی فوت شدہ عورت کا کام ہے۔ اس کے بعد مولی نت نئے تماشے دکھانے لگی۔ اس کی آنکھیں مدھم مدھم ہوتے ہوئے بالکل بے نور ہو گئیں مگر اس کا کہنا تھا کہ اسے اب بھی دکھائی دیتا ہے اور وہ ماتھے سے چیزوں کو دیکھ سکتی ہے، وہ ایک استخراجی بن چکی تھی۔ ایک روز فلکیات دان ہنری پارکسٹ (Henry Parkhurst) مولی سے ملنے آیا۔

قاتل نے اپنا جرم چھپانے کے لیے یہاں دفن کر دیا تھا۔ اس بات میں وزن بھی تھا۔

اول تو یہ کہ گزشتہ دو دہائیوں میں وہی ایک شخص ایسا تھا لاپتا ہوا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس پر الزام تھا کہ وہ بھاری مالیات کا قیمتی ساز و سامان لے کر غائب ہوا تھا۔ اس لیے سب یقین تھا کہ ڈینیل نے جو کچھ کیا، اس پورے قصبے میں کوئی ایسا بھی اس کے ساتھ تھا۔ جس نے مال مسروقہ کو اپنے قبضے میں اور ڈینیل کو مار ڈالا۔ اس طرح اس نامعلوم اور چالاک مجرم نے نہ صرف پورے مال پر ہاتھ صاف کر لیا بلکہ اسے قتل کرنے کے بعد اپنے جرم کا ہر ثبوت مٹا ڈالا۔

آہستہ آہستہ پولیس نے شک کا دائرہ قصبے کے جرائم پیشہ اور ناپسندیدہ شخص رچرڈ ہاؤس مین اور فرانسیز تک بڑھا دیا تھا۔ ساتھ ہی پولیس ہنری ٹیری پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی انہیں شبہ تھا کہ وہ لاپتا ہونے والے شخص کے بارے میں کچھ ضرور جانتا تھا جس سے قاتل کو بے نقاب کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا ان تینوں کو قصبے کے مجسٹریٹ نے پوچھ گچھ کے لیے طلب کر لیا۔

مجسٹریٹ نے سب سے پہلے رچرڈ کے سامنے والے ڈھانچے کی پسندلی کی لمبی ہڈی رکھی اور سنجیدگی سے

سے مزید کھدائی کا فیصلہ کیا۔ کچھ ہی دیر میں مکمل انسانی ڈھانچا زمین سے باہر نکل آیا۔ اس پر اسرار ڈھانچے کا ملنا تھا کہ پورے قصبے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مقامی لوگ سخت خوف زدہ تھے۔

ڈھانچا ملنے کے بعد اس جگہ پر ہر طرح کی سرگرمیاں روک دی گئیں۔ ایک طرف قصبے کی پولیس اس کی تفتیش کر رہی تھی تو دوسری طرف ڈھانچا ملنے کے ایک ہفتے کے اندر مجسٹریٹ نے دوبار پولیس اور دیگر حکام کو بلا کر واقعے کے بارے میں ہائڈس کی تھی۔ ان کے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ ڈھانچے کا اصل معاملہ کیا ہے۔ دو ڈاکٹروں نے بھی ڈھانچے کا معائنہ کیا، تاہم ان کے ذریعے بھی کوئی خاص بات پتہ نہ چل سکی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جس کا بھی ڈھانچا ہے اس کی عمر کم تھی غالباً وہ لڑکپن کی عمر میں تھا۔ دوسری طرف ڈینیل کی عمر لاپتا ہونے کے وقت تیس برس تھی۔ اب پولیس اور مجسٹریٹ بھی محضے کا شکار تھا۔

ڈھانچا ملنے کے بعد قصبے میں سرگوشیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اب بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ لوگ سر عام کہہ رہے تھے کہ جس لاش کا ڈھانچا ملا ہے، وہ کئی برس پہلے لاپتا ہونے والے ڈینیل کلاک کا ہے۔ جسے قتل کرنے کے بعد نامعلوم

ہانے کے لیے کہ یہ لڑکی کسی قسم کی جہلازی کر رہی ہے یا پھر حقیقتاً غیر معمولی طاقتوں کی مالک ہے، وہ خط لکھ کر لگانے لگا۔ مگر مولی اسے بتا دیا کرتی کہ بند لگانے میں کاغذ پر کیا لکھا ہے۔ مولی کو مشاہدات کی صلاحیت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ 1877ء کی ایک رات اس کی چھین سن کر خالہ سون بیدار ہو گئی، مولی کہہ رہی تھی وہاں خون ہی خون ہے۔ غرین کا ہاتھ ۱۸۷۸ء ہے اور اس کا چھوٹا بھائی ہلاک ہو چکا ہے۔ بعد ازاں اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ اس کا بیان تھا کہ وہ اکثر ٹرملک بھر میں گھوم پھر کر دیکھتی ہے حالانکہ اس کا بدن بستر پر دراز ہوتا ہے۔ 1878ء میں ایک رات مولی ایک بوڑھے مالدار جارج سارجنٹ سے محو گفتگو تھی کہ اس نے آنکھیں موند لیں اور گویا نیند میں چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں اس نے کراہ کر آنکھیں کھول لیں اب وہ ڈاکٹر سارجنٹ کو عجیب سی اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، ڈاکٹر نے سنا، مولی کے منہ سے ایک نئی ادال آ رہی تھی۔ مولی کی شخصیت تبدیل ہو چکی تھی۔ نئی مولی فنانچر نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ اسے آنڈل کہا جائے کیونکہ اس کا اصل نام آنڈل ہے۔ آنڈل نے ادھر ادھر کمرے میں مولی کی تیار کردہ کشیدہ کاری دیکھی تو حسد کے مارے سب کے رکھ دیا۔ کچھ مدت بعد آنڈل واپس مولی کی جون میں آ گئی۔ اب کہ اسے حیرت ہوئی کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی کشیدہ کاری کو کون خراب کر رہا ہے۔ اگلے برس اور بھی تماشے ہوئے، ایک رات مولی کے اندر ایک چھ سالہ بچی روز بڈ کی شخصیت نمودار ہوئی معاں اس کی آواز تبدیل ہو کر بچے جیسی ہو گئی اور بچپنا پیدا ہو گیا۔ روز بڈ کے بعد اس نے ایک بار روبی الی مورت کا روپ دھارا۔ مولی فنانچر۔ آنڈل، روز بڈ، پرل یا روبی میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ اس حیرت انگیز شخصیت کا انتقال 11 فروری 1916ء کو ہوا کوئی نہ جان سکا کہ یہ کون مرا ہے آنڈل، روز بڈ، پرل یا روبی یا پھر بڈ ات خود دی فنانچر، اس کی قبر کے کتبے پر لکھا گیا ہے۔ مولی فنانچر..... زندگی کے اسرار سے آگاہ تھی۔

اقتباس: ”قدرت کے اُن کھلے راز“ از ڈاکٹر قاضی محمد سلیمان
مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

خلائی لینے کا حکم دیا، جس کے دہانے کے قریب سے ڈھانچا ملا تھا۔ فوجی سپاہیوں نے فوراً غار کا رخ کیا اور پھر کچھ اندر جانے کے بعد انہیں ایک جگہ پر شک گزرا اور جب وہاں کھدائی کی گئی تو ایک انسانی ڈھانچا ملا۔ اس کا قد بھی لمبا تھا۔ ڈھانچے کی کھوپڑی صحیح سلامت تھی لیکن جب بغور معائنہ کیا گیا تو پتا چلا کہ کھوپڑی کا پچھلا حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ سال لگ رہا تھا اسے سر کے عقبی حصے پر شدید ضرب پہنچا کر موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا۔

دوسرے ڈھانچے کی دریافت کے ساتھ ہی پورے قصبے میں سسنی پھیل گئی تھی۔ اُس وقت یہ سسنی خیزی اور بڑھ گئی جب یوگن ایرم کی بیوی اینا ایرم مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئی۔ اُس کا شوہر بھی کئی سالوں سے لاپتا تھا۔ اُس نے مجسٹریٹ کے سامنے پہنچ کر بیان دیا کہ ”غار کے اندر سے ملنے والا دوسرا ڈھانچا اُس کے لاپتا شوہر کا ہو سکتا ہے۔“ یہاں تک تو اس نے جو کچھ کہا وہ سمجھ میں آنے والا تھا مگر اس کے آگے اُس نے جو کچھ مجسٹریٹ سے کہا وہ نہایت ہی حیران کر دینے والا انکشاف تھا۔

اینا نے مجسٹریٹ کو بتایا کہ یوگن نے رچرڈ اور ایک نامعلوم شخص کی مدد سے ڈینیل کو اسی رات قتل کروایا تھا جس شخص

”جما۔“ بتا سکتے ہو یہ کس کی ہڈی ہے؟“ بس یہی وہ لمحہ تھا جب اس سے ایک سنگین غلطی سرزد ہو گئی۔

”ہاں.....“ رچرڈ نے ایک نظر ہڈی پر ڈالی اور پھر مجسٹریٹ سے کہا۔ ”اگر یہ ڈینیل کلاک کی ہڈی نہیں ہے تو پھر یہ کی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا اور پھر سوالیہ لہجے میں کہا۔ ”لو ہلا تاؤ، میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہڈی کس کی ہو سکتی ہے۔“ اُس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

مجسٹریٹ کے سامنے ہونے والی اس تفتیش کے دوران اس نے ایک حیرت انگیز انکشاف بھی کیا تھا۔ رچرڈ کا کہنا تھا کہ لاپتا ہونے کے کچھ عرصے بعد ڈینیل کو قصبے سے باہر جانے والی سڑک کے ایک ویران مقام پر اُس کے ایک واقف کار نے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور چیز بتا دی۔ ”میں نے مجسٹریٹ سے کہا ”میں نے سنا ہے کہ سینٹ رابرٹ غار سے ایک اور انسانی ڈھانچا ملا ہے۔“

مجسٹریٹ کا نام ولیم تھورن تھا۔ یہ سن کر اسے شک گزرا۔ وہ سمجھا کہ وال میں کچھ کالا ہے۔ 1745ء میں باغیوں کی لڑائی کے لیے یارک شائر بلیوز کے نام سے فوجیوں کی ایک طاقت تیار کی گئی تھی۔ اس نے مشتبہ مجرموں کو حراست میں لیا۔ اہم دیا۔ ساتھ ہی یارک شائر بلیوز کی مدد سے اُس غار کی

سے اُس کی گمشدگی کی خبر پہلی تھی۔ ایسا کہنا تھا کہ اُس رات اس نے اپنے شوہر کو ان چاروں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسا مزید بتایا کہ جس رات یہ واقعہ پیش آیا، اُس رات خاصی دیر کے بعد یوگن، رچرڈ اور وہ تیسرا نامعلوم شخص خاصی رات کو میرے گھر پہلے۔ وہ سیدھے باورچی خانے میں گئے۔ یوگن نے مجھے حکم دیا کہ فوراً آتشدان میں آگ جلاؤ۔ میں نے آگ جلا دی تو یوگن نے اس میں اور زیادہ لکڑیاں ڈال دیں۔ جب شعلے تیزی سے بھڑکنے لگے تب یوگن نے اسے باہر جانے کو کہا۔ ایسا کے مطابق اسے یقین تھا کہ انہوں نے آگ میں تمام ثبوت مثلاً خون آلود کپڑے اور ایسی ہی دیگر چیزیں نذر آتش کر دی تھیں جن کا تعلق قتل کی واردات سے تھا۔ ایسا کا دعویٰ تھا کہ دوسرے دن صبح جب وہ آتشدان روشن کر رہی تھی تب اس نے وہاں کپڑے کے چند ایسے ٹکڑے دیکھے تھے جن پر خون لگا ہوا تھا اور وہ جلنے سے بچ گئے تھے۔ ایسا نے دعویٰ کیا کہ رچرڈ کے سر کے سارے بال جھڑ چکے تھے اور وہ وگ استعمال کرتا ہے۔ جس رات یہ واردات ہوئی، اُس شام وہ سورج غروب ہونے پر ان کے گھر آیا۔ اس نے وگ نہیں پہنی ہوئی تھی۔ اس نے ایسا سے ایک بڑا رومال مانگا تا کہ ٹھنڈے نہجنے کے لیے برہنہ سر پر رومال باندھ سکے۔ ایسا کا کہنا تھا کہ جب آدھی رات کو وہ لوگ پہلے اُٹے اور یہ اُن کے لیے آتشدان روشن کر رہی تھی، تب اس کی نظر اُس کے سر پر بندھے رومال پر پڑی۔ اُس پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔

مجسٹریٹ کے لیے ایسا کا بیان نہایت خوفناک تھا تاہم وہ اس بات سے متفق نہیں تھا کہ دوسرا ڈھانچا اس کے شوہر کا ہو سکتا ہے۔ اب یہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ اس سے کیوں متفق نہیں تھا۔ ایک اور بات حیران کن تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مجسٹریٹ جانتا تھا کہ یوگن ایرم نہ صرف زندہ ہے بلکہ وہ نارفاک میں موجود ہے۔ یہ بات اگلے روز ظاہر ہوئی۔

ایسا کے بیان کے اگلے روز 18 اگست کو مجسٹریٹ نے رچرڈ اور یوگن ایرم کو باضابطہ طور پر ڈیٹیل قتل کیس میں قاتل قرار دے دیا۔ رچرڈ پہلے ہی پولیس کی تحویل میں تھا تاہم اس نے دو پولیس کانسٹیبل شمال کی طرف روانہ کیے تاکہ وہ یوگن ایرم کو گرفتار کر کے اُس کے سامنے پیش کر سکیں۔ تھامس ہڈ نے یوگن ایرم کے بارے میں لکھی گئی اپنی شہرہ آفاق نظم میں ان سپاہیوں کے ہاتھوں اُس کی گرفتاری اور قہرے روائی کا احوال کچھ یوں بیان کیا ہے:

دو سخت گیر درشت چہرے والے لائن سے روانہ ہوئے
راہ میں سخت سردی اور بھاری دھندھی

یوگن ایرم ان دونوں کے درمیان اس طرح چل رہا تھا کہ اُس کی دونوں کلائی میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی کچھ ہی دنوں بعد نارفاک کے کنکڑ لائن اسکول سے گرفتار کیے گئے یوگن ایرم کو مجسٹریٹ ولیم تھورن کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ نے الزام پڑھ کر سنا تو وہ بے تاب اور سپاٹ لہجے کے ساتھ فرد جرم سناتا رہا۔ مجسٹریٹ خاموش نہ تو اسے بولنے کی اجازت دی گئی۔

”جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے، میں اسے تسلیم کرنے سے صاف انکار کرتا ہوں۔“ یوگن نے سرد لہجے، محمیر آواز اور بے تاثر چہرے کے ساتھ صفائی پیش کرنا شروع کی۔ عدالت میں اس وقت قہرے کے لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ سچ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔

”میں ڈیٹیل کلاڑ کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ اتنا ہی جتنا کہ قہرے کے کئی لوگ یہاں رہنے والے بہت سارے دیگر لوگوں کے بارے میں جانتے ہوں گے، بالکل سرسری سا۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد ایک بار پھر اس نے اپنا بیان صفائی شروع کیا۔ ”مجھے قطعی یاد نہیں پڑتا کہ آج سے پہلے میں نے کبھی اُس کے قتل کی کوئی خبر سنی ہو۔ میرے لیے تو ڈیٹیل کلاڑ اتنا پرانا ماضی ہے کہ اب تو مجھے اس کا چہرہ بھی ٹھیک سے یاد نہیں اور یاد رہتا بھی کیوں؟ میرا تو اس سے کوئی جذبات یا عمومی قسم کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔“

جب مجسٹریٹ نے سوال کیا ”تم پر الزام ہے کہ جس رات اُس کا قتل ہوا، تم اُس کے ساتھ تھے؟“ یوگن ایرم نے یہ سن کر مجسٹریٹ کے چہرے کو بغور دیکھا اور پھر جمع بر نظر کی۔ وہاں اس کی بیوی ایسا بھی نہیں ہوئی تھی یوگن پر ڈیٹیل کے ساتھ ہونے کا بیان حلفی خود اس کی بیوی دیتا تھا۔ اس سوال کے جواب میں کچھ خاموشی کے بعد ایرم سر جھکا کر شاعرانہ لہجے میں فقط ایک ہی جملہ کہا۔ ”میں اب اپنی سے زیادہ مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“

ستمبر کے اوائل میں مجسٹریٹ نے رچرڈ، یوگن اور ہنری ٹیری کو یارک شائر کی جیل بھجوا دیا۔ ہنری اُس شراب خانے مالک تھا، جہاں وہ بھی جایا کرتا تھا۔ ہنری پر الزام تھا کہ اس نے وہ مال خریدا تھا جو چوری اور دھوکا دہی کے ذریعے ڈیٹیل نے حاصل کیا اور پھر اُس کے قتل کے بعد، اس نے وہ سامان قاتل سے اونے پونے داسوں خرید لیا تھا۔ یہ تین ایک برس تک اس جیل میں قید رہے۔

مارچ 1759ء میں رچرڈ اُس مین جیل کی صعوبتوں سے گھبرا کر ہمت ہار بیٹھا۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر مجسٹریٹ

اہاں ٹی کر دے تو وہ اس مقدمے میں سلطانی گواہ بنے۔ مجسٹریٹ نے اس کی پیشکش قبول کر لی اور پھر یوں اہاں پہلو سامنے آیا۔

اس نے مجسٹریٹ کے سامنے بطور سلطانی گواہ بیان دیا جس رات ڈیٹیل غائب ہوا تھا، اُس رات میں یوگن، لہجہ اور فرانسز کے ساتھ اُس سے ملا تھا۔ ہم نے اس اس مال کے بارے میں پوچھا جو اس نے مختلف حیلے اس قرض اور دھوکا دہی کے ذریعے اب تک حاصل کیا ہے۔ جاننا چاہتے تھے کہ اس نے وہ سارا مال کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ دھوکا اور دھمکانے پر آخر اس نے ہمیں بتا دیا۔ پہلے اس کو آپس میں بانٹنے کی بات ہوئی لیکن یوگن کے دل میں لپکتا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر ہمیں بھی بتا دیا کہ کیا کرنا ہے۔ ہم ڈیٹیل کو لے کر سینٹ رامیٹ غار پہنچے۔ پھر یوگن ایک بڑے پتھر سے اس کے سر پر پیچھے سے چوٹ ماری۔ پہلی ہی وار میں نیچے گرا اور ختم ہو گیا۔ ہم اس کی لاش کو کھینچتے غار کے اندر لے گئے اور چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں لٹا دیا۔ اس کے بعد ہم باہر آئے اور قریب پہنچے والے گڑھے پانی سے اپنے خون آلود ہاتھ منہ دھوئے۔ رچرڈ کا کہنا تھا کہ اصل کیا دھرا یوگن کا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں اس بارے میں کبھی اپنی زبان کھولی تو وہ مجھے بھی قتل کرے گا۔

رچرڈ کے بیان کے بعد گمشدگی کا معاملہ حل ہو چکا تھا۔ لہذا سارا الزام یوگن ایرم کے سر ڈال دیا گیا تھا۔ مجسٹریٹ اس بیان کی تفتیش مکمل ہونے کے بعد مقدمہ چلانے کے لیے اسے بڑی عدالت میں بھجوا دیا۔

تین اگست 1959 کو جسٹس ٹوکل نے اس مقدمے کی روائی شروع کی جس کا چرچا لندن کے تمام بڑے بڑے مہرمت میں ہو رہا تھا۔ اس مقدمے کی وجہ شہرت یوگن ایرم کو بطور قاتل نامزد کیا جاتا تھا۔ یوگن ایرم کا شمار لندن کی اعلیٰ شہنشاہت میں ہوتا تھا۔ اس کے علمی مقام کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے والوں میں کئی بڑے لوگ شامل تھے۔ یہی نہیں، اس کے علمی مقام کے باعث اس سے حسد رکھنے والوں کی بھی کئی تھیں۔ وہ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ انہارات میں اس مقدمے کا جتنا چرچا اور لندن کی سچی فلموں میں اس پر چینی باتیں ہو رہی تھیں اس بنا پر جسٹس ٹوکل کو بھی طرح طرح اندازہ تھا کہ یہ عام مقدمہ قتل نہیں ہے۔ انہیں اس کی حساسیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

مقدمے میں بطور وکیل جرج فلچر ٹارن کو نامزد کیا گیا

تھا۔ اس کا تعلق طبقہ امرا سے تھا۔ وہ ’سر‘ کا خطاب مالہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ قانونی حلقوں میں اس کی شہرت بہت غراب تھی۔ اسے انصاف سے زیادہ پیسوں کی فکر ہوئی تھی۔ پیسوں کے لیے وہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا تھا۔ لندن کے قانونی حلقوں میں اسے طنزاً ’سریل فیس‘۔ ڈبل فیس‘ کہا جاتا تھا۔ یعنی تیل کے چہرے والا۔ ڈگنی فیس۔“

فلچر اپنے معاصرین ہورس ویل پول اور جان وکیز سے دلی طور پر شدید نفرت کرتا تھا۔ جب مقدمے میں اسے سرکاری طرف سے وکیل جراح کے طور پر لایا گیا تب لندن کے معروف قانون دان لارڈ مینفیلڈ نے کہا تھا کہ ”مجھے خدشہ ہے کہ وہ جیوری کے ارکان کو گمراہ کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ جس نے بھی اس کے ساتھ کسی عدالت میں مقدمہ لڑا ہے، وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی کے ساتھ ہونے والی عدالتی بے انصافی کو روکنا بہت ہی مشکل ہے۔“

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو یوگن کو سچ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس وقت وہ کٹھنرے میں کھڑا تھا۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اگر ساعت کے دوران مجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے جو عدالت کے آداب کے خلاف ہو تو یہ سمجھ کر مجھے معاف کر دیا جائے کہ میں پہلی بار کسی عدالت کے روبرو پیش ہو رہا ہوں۔ مجھے عدالت کے آداب کا کچھ علم نہیں ہے۔“ اس کے بعد وہ کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”جناب والا..... میں یہاں تھا ہوں، میرا کوئی معاون نہیں، میرا کوئی وکیل نہیں اور قانون کے معاملے میں میرا علم بہت ہی محدود اور واجبی سا ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ شاید یہ میرے اپنے ہی الفاظ میں میرے دلائل ثابت ہوں۔“ جج نے اسے کہنے کی اجازت دے دی۔

”جناب والا.....“ اجالات بٹنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ کہنے عدالت مقدمے کی کارروائی سننے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب یوگن نے بولنا شروع کیا تو ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔

یوگن نے سب سے پہلے اپنے سماجی و علمی میرے، مہذب اور قابل عزت زندگی بسر کرنے کے حوالے سے تفصیلی تذکرہ کیا۔ اس موقع پر اُس نے کیرس بوروگ، لندن اور پھر نارفاک کے حوالے دیے اور بتایا کہ ان تینوں مقامات پر اُس نے اب تک کی پوری زندگی بسر کی ہے لیکن کوئی بھی شخص اس کے ذالی کردار پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ”میری پوری زندگی شائستگی اور علم سے عبارت ہے۔ مجھے خوشحالی بھی حاصل ہوئی۔

لوگ مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میری کوئی ایسی مجبوری نہیں تھی کہ جس کی وجہ سے میں ایک غلط کام کر کے اپنی پوری زندگی، کردار اور عزت کو داؤ پر لگا دوں۔“

دوسری اہم بات جو اس نے کی وہ یہ تھی۔ ”اس طرح کا جرم کسی اشد ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے یا پھر آسائش حاصل کرنے کے لیے مگر اس جرم کے سرزد ہونے کے وقت نہ تو میں بہت ہی مجبور تھا اور نہ ہی سخت پریشان۔ رہی بات یہ کہ اگر یہ جرم میں نے کیا تھا تو پھر جو رقم ملی، اس سے مجھے فوراً آسائش حاصل کرنا چاہیے تھیں مگر میں اب تک نہایت سادہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں ملازمت کر کے اپنی گزر بسر کر رہا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اگر جرم میں نے کیا تو پھر وہ دولت کہاں چلی گئی؟“

بیرسٹورسین انیسویں صدی میں برطانیہ کے نہایت اہم قانون دان تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ”قانون کی کتابوں میں یوگن کا مفصل بیان موجود ہے۔ میں نے بھی اسے تفصیل سے پڑھا ہے۔ وہ وکیل نہیں تھا لیکن جس طرح اس نے عدالت کو مخاطب کر کے نہایت سادگی سے مگر جامع انداز میں اپنی بات کہی، وہ دفاع کے لیے کسی بھی تجربہ کار قانون دان کے بہترین دلائل سے کم نہیں تھے۔ اس بیان سے اس کی علیت اور ذہانت صاف چمکتی ہے۔“

یوگن ایرم سے جج نے سوال کیا کہ ”ڈینیل کلارک کی گمشدگی اور ان ڈھانچوں کے ظاہر ہونے کے بعد اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اسے قتل کیا جا چکا ہے۔ وہ غائب ہو کر کہیں خاموش زندگی نہیں گزار رہا بلکہ اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔“

یوگن نے جج کے اس سوال کو مسترد کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”کسی ڈھانچے کے مل جانے سے کہیں پر بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ڈینیل کلارک نامی اس مرد کا ہے جو برسوں پہلے پراسرار طور پر لاپتا ہو گیا تھا۔“ اس نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔ ”ایک ڈھانچا ملا ہے۔ اس ڈھانچے کو دیکھ کر بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی ایسے انسان کا ڈھانچا ہے جسے مرنے کے بعد اسے اس مقام پر دفن کر دیا گیا تھا جہاں سے یہ ملا ہے مگر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مرد کا ڈھانچا ہے۔ کسی انسانی ڈھانچے کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لینا کہ وہ کسی مرد یا عورت کا ہے اور پھر اسے کسی لاپتا مرد یا عورت کا ڈھانچا فرض کر کے اس کی موت تسلیم کر لینا اور اس جرم میں کسی کو گرفتار کر لینا نا انصافی ہے۔“

یوگن کا یہ نکتہ بہت اہم تھا۔ کسی ڈھانچے کو دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ مرد یا عورت کا ہے۔ بیسویں صدی میں طبی

سائنس نے یہ استعداد حاصل کر لی تھی کہ ڈھانچے سے اس جنس کا پتا چلایا جاسکتا ہے مگر اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں اس طرح کی طبی سائنس کا سرے سے ہی کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ یوگن کے اس نکتے کے حامی اکثر قانون دانوں کا ماننا ہے کہ یہ وہ نکتہ ہے جس پر مقدمہ خارج اور یوگن کو بری کیا جاسکتا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ عدالت نے اس نکتے پر توجہ مرکوز نہیں کی۔ وکیل جرج بدستور اس بات پر مصر تھا کہ ڈھانچا لاپتا ڈینیل کا ہی ہے اور یوگن اس کا قاتل..... بس!

آگے کی ساعتوں میں یوگن نے سات یا آٹھ ایسی مثالیں پیش کیں جب سینٹ رابرٹ کی اس عار نما خانقاہ سے انسانی ہڈیوں کے ملنے کے واقعات سامنے آئے تھے۔ یوگن کی دلیل تھی کہ وہ غار ایک راہب کی عمارت تھی، جس کی وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ اگر مرنے کے بعد وہ اس غار میں دفن ہوں گے تو ان کی رگوں کو ابدی سکون حاصل ہوگا۔ ممکن ہے کہ بہت پہلے اس خیال سے کئی لوگ وہاں دفن ہوئے ہیں۔ لوگ جن کے مرنے اور وہاں دفن کیے جانے کے بارے میں آج قصبے کے لوگ لاعلم ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سو برس پہلے کا واقعہ ہو۔ ممکن ہے کہ پچاس سال پہلے۔ ممکن ہے کہ جو ڈھانچہ اس وقت ڈینیل کا قرار دیا جا رہا ہے، وہ وہاں دفن ہونے والے کسی ایسے شخص کا ہو جو سینٹ راہب کا معتقد اور پیروکار تھا۔ ”کوئی بھی بات ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی خیال ناممکن نہیں ہے۔ یہ یوگن کے اس دلائل کا آخری جملہ تھا۔“

اس موقع پر جج نے یوگن سے کہا کہ ”غار سے ملنے والے ڈھانچے کے سر کے عقبی حصے پر شدید چوٹ کا نشان تھا، کہ ہماری چیز کو مار کر اسے قتل کیا گیا تھا۔ جس کا ثبوت کھوپڑی کی ٹوٹی ہوئی ہڈی ہے۔“

”ٹوٹی ہوئی کھوپڑی سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کیا گیا تھا۔“ یوگن نے یہ نکتہ بھی مسترد کر دیا تھا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کی وضاحت کرنے کے لیے ایک نظیر پیش کی۔ ”1683ء میں یارک شائر کے آرچ بشپ کی میت کو دوسرے مقام پر بوجھ دفن کیا جا رہا تھا۔ ان تابوت بدھن کے بد توں بعد قبر سے باہر نکال کر کھولا گیا تو ان کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی پائی گئی تھیں مگر انہیں تو تشدد کر کے قتل نہیں کیا گیا تھا پھر ہڈیاں کیسے ٹوٹی تھیں؟“

یوگن نے وکیل کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ وکیل نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے اپنا دفاع خود کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جج کا ایسا کوئی ریمارکس یا سوال نہیں تھا جس کا

۱۱۔ میں جواب نہ دیتا ہوں۔ سب کو اندازہ تھا کہ یوگن ۱۱۔ ام سے بری ہو جائے گا لیکن لندن کی اشرافیہ کا ایک لہا تھا جسے اس کی رہائی پسند نہ تھی۔ وہ ہر حال میں اسے اوارہ لینا چاہتے تھے۔ البتہ سنجیدہ لوگوں کا ایک طبقہ ایسا تھا لیکن تھا کہ اگر انصاف کے تقاضے پورے ہوئے تو یوگن ۱۱۔ بری ہو جائے گا۔ مقدمے کی کارروائی کا تفصیلی احوال ۱۱۔ کے اخبارات میں تو اتار سے شہ سرخیوں شائع ہو رہا تھا۔ ۱۱۔ لوگوں کی دلچسپی بھی اس مقدمے میں بڑھ گئی تھی۔ اپنی ۱۱۔ کے لحاظ سے یہ اس دور کا نہایت سنسی خیز مقدمہ سمجھا ۱۱۔ تھا۔

جرج وردفاع کے درمیان سوال و جواب کا ایک طویل ۱۱۔ چلا جس کے بعد آخری بار جج نے یوگن کو کچھ کہنے کا ۱۱۔ دیا۔

”میں ایک سال سے قید میں ہوں اور اب اپنے وقار ۱۱۔ میں آخری بار کچھ کہنے کو کہا گیا ہے۔“ یوگن نے سر دھجے اور ۱۱۔ آواز میں بولنا شروع کیا۔ سب دم بخود بیٹھے ہوئے ۱۱۔ میں نے خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب ۱۱۔ میرے مستقبل کا فیصلہ کرے گی..... میرے مستقبل کا فیصلہ ۱۱۔ الٹ، جیوری کے ارکان کو کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرٹے ۱۱۔ الٹ میں بیٹھے لوگوں کی طرف مڑا۔ ”میرے ہم وطنو..... ۱۱۔ پر لگائے گئے الزام کا ایک فیصلہ عدالت اور جیوری کرے گی۔ دوسرا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ عدالت کے فیصلہ سنائے ۱۱۔ ہانے کے بعد آپ میرے مقدمے کی جیوری ہیں۔“ یہ کہہ کر ۱۱۔ خاموش ہوا اور پھر کچھ دیر بعد کہنے لگا۔ ”آپ یا آپ کی ۱۱۔ والی نسل فیصلہ کرے گی کہ میں مجرم تھا یا بے قصور۔“ یہ ۱۱۔ مشہور مقدمے کے مرکزی ملزم یوگن ایرم کے آخری الفاظ ۱۱۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ یوگن کے الفاظ تاثیر سے بھرپور، اپنے ۱۱۔ میں دیے گئے دلائل ٹھوس اور لہجہ بے گناہ انسان کا تھا مگر ۱۱۔ وقت جج اور جیوری کے ارکان نے اس پر ذرا بھی دھیان ۱۱۔ نہیں دیا۔

وکیل جرج ڈسریل فیس۔ ڈیل فیس نے طرح طرح کے ۱۱۔ بدلے۔ وہ ہر ممکن طور پر جج اور جیوری کو یہ باور ۱۱۔ دے کر دے میں لگا رہا کہ وہ اپنی علیت، ذہانت اور چرب زبانی ۱۱۔ باعث عدالت کا وقت خراب کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں ۱۱۔ لی ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ جیوری کے ارکان کو ۱۱۔ گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا ”قتل اسی نے کیا تھا اور اب ۱۱۔ کے لیے وکیل کو ہتھیار بنا کر خود کو بچا رہا ہے۔“

”کیا آپ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم نہیں ۱۱۔ ہوتی کہ بھارت کے بعض اخبار جو پاکستان کا نام ۱۱۔ سننا بھی گوارا نہیں کرتے، زبان کے سوال پر آپ ۱۱۔ کے حقوق کے خود ساختہ محافظ بن گئے ہیں۔ کیا یہ ۱۱۔ بات معنی خیز نہیں ہے کہ وہی لوگ جو قیام پاکستان ۱۱۔ کے خلاف لڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کے بنیادی حق ۱۱۔ خود ارادیت کی مخالفت کرتے رہے ہیں، یکا یک ۱۱۔ آپ کے حقوق کے حامی بن گئے ہیں اور آپ ۱۱۔ لوگوں کو زبان کے سوال پر حکومت سے ٹکر لینے کا ۱۱۔ مشورہ دے رہے ہیں۔ میں آپ لوگوں کو اس ۱۱۔ پانچویں کالم سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ۱۱۔ ساتھ ہی پاکستان کی سرکاری زبان کے سوال پر ۱۱۔ اپنے خیالات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ جہاں تک ۱۱۔ صوبے کی سرکاری زبان کا تعلق ہے صوبے کے ۱۱۔ لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار ۱۱۔ حاصل ہے۔ یہ فیصلہ اس صوبے کے نمائندوں کے ۱۱۔ اور صرف ان کے منشا کے مطابق ٹھنڈے دل سے ۱۱۔ غور اور سوچ بچار کے بعد کیا جائے گا۔ لیکن پورے ۱۱۔ ملک کے لیے سرکاری زبان یعنی وہ زبان جو مختلف ۱۱۔ صوبوں کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ بن سکے۔ ۱۱۔ ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو کے علاوہ کوئی اور ۱۱۔ نہیں ہو سکتی لہذا پاکستان کی سرکاری زبان اردو ۱۱۔ ہوگی۔ یہی وہ زبان ہے جسے اس برصغیر کے اس ۱۱۔ کروڑ مسلمانوں نے پالا ہوا ہے جو ہر ۱۱۔ پاکستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس کی خاص ۱۱۔ اہمیت یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کے اہل علموں کی ۱۱۔ زبانوں کے بہت قریب ہے اور اسی زبان میں ۱۱۔ اسلامی کلمہ اور روایات کا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے جو ۱۱۔ لوگ زبان کے سوال پر ایجنیٹیشن پیدا کرنے کی ۱۱۔ کوشش کر رہے ہیں انہیں یہ تمام بنیادی معلوم لیکن ۱۱۔ ان کا مقصد اس ملک کے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ۱۱۔ کرنا اور غیر یکجہلی مسلمانوں کے خلاف نفرت اور ۱۱۔ تعصب کی آگ بھڑکانا ہے۔

اقتباس: قائد اعظم کی معرکتہ الّا تقریر، ۱۱۔ 24 مارچ 1948ء۔ ڈھاکا کنونشن ۱۱۔ مرسلہ: فریڈ چیکیزی، کوئٹہ ۱۱۔

برطانوی قانون دانوں نے بہت بعد میں اعتراف کیا کہ یوگن کا دفاع مضبوط تھا۔ وہ خود کو بے قصور ثابت کر چکا تھا۔ اس کے دلائل بہت عمدہ اور موثر تھے لیکن ان سب کے باوجود وہ اُس وقت جج اور جیوری کی رنجی بھر ہمدردی بھی حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

دلائل ختم ہوئے تو جیوری کا صلاح و مشورہ شروع ہو گیا۔ جیوری ارکان بھی طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آخر جج نے فیصلہ دے دیا۔ اسے موت کی سزا سنائی گئی۔ ایک ہفتے بعد اگلے سوموار کو اسے کیوس مار کے جنگل کے برابر والے میدان میں کھلے عام پھانسی دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ جب یہ فیصلہ سنایا گیا، تب وہ ثابت قدمی سے عدالت میں کھڑا تھا۔

سزا سنائے جانے کے بعد دو تین سپاہی آگے بڑھے اور اُس وقت کے مروج برطانوی طریقے کے مطابق اسے کیوس کی بڑی سے چادر میں لپیٹ کر، رسیوں سے اچھی طرح باندھ کر جیل لے گئے۔ موت کی سزا پر عمل درآمد ہونے سے پہلے اسے ایک ہفتہ کال کوٹھڑی میں تنہائی کا عذاب جھیلنا تھا۔

یہ ہفتہ اس نے لکھنے پڑھنے میں گزارا۔ وہ دن رات لکھنے پڑھنے میں مجبور رہتا تھا۔ وہ اس کام میں اتنا منہمک تھا کہ کھانا پینا بھی بھول چکا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے چند قریبی دوستوں کو خط لکھے۔ اس خط میں اس نے یونانی، لاطینی، عبرانی اور کلیتہً زبان میں لکھے گئے فلسفے کے حوالے سے چند وہ اہم اصلاحات و نکات تفصیل سے بیان کیے جو اس کے ذہن رسا کی پیداوار تھے۔ اس کی یہ سرگرمیاں موت سے کچھ دیر پہلے تک جاری رہیں۔

سوموار کی صبح تھی۔ یوگن اپنی کال کوٹھڑی میں بدستور جاگ رہا تھا۔ اسے بھی وقت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کاغذات سنبھال کر ایک تھیلے میں رکھ رہا تھا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کا یہ سارا سامان اس کے مرنے کے بعد لندن میں اُس کے ایک جرمن دوست کو بھیج دیا جائے۔ قانونی طور پر وہ ایسا کرنے کے پابند تھے۔ بعد میں انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد پادری نے کچھ دیر تک اسے بائبل کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ موت اور زندگی پر کچھ باتیں کیں مگر وہ سب سے لاطین بیٹھا رہا۔ آخر میں جیل افسر نے ساتھ آنے والے سرجن کو اس کا طبی معائنہ کرنے کو کہا۔ یوگن نے بنا کچھ کہے فوراً اپنی کلائی اس کی طرف بڑھادی۔ ڈاکٹر نے بغض چپک کی۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے۔“ چند لمحوں بعد ڈاکٹر نے جیل افسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے، یوگن سمجھ گیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں چلنے کو تیار ہوں۔“ اگلے ہی لمحے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ جا رہے تھے۔

یہ 16 اگست 1959ء کی صبح تھی۔ اسے یارک سٹائر ایک گھنٹے جنگل کے سرے پر لکڑی کے لیے ستون پر لٹکا پھانسی دے دی گئی۔ پھندے پر لاش کافی دیر تک جمبھوتی رہی۔ آخر پولیس سرجن کو حکم دیا گیا کہ وہ طبی معائنہ کرے کہ آواز مر چکا ہے یا ابھی زندگی کے آثار باقی ہیں۔

”کسی پتھری طرح بے جان اور سرد۔“ سرجن نے لاش کے معائنے کے بعد کہا اور سپاہی لاش کو پھندے پر چھوڑ کر چل دیے۔

جج نے حکم دیا تھا کہ پھانسی کے بعد لاش کی تدفین نہ ہوگی بلکہ وہ پھندے پر اُس وقت تک جمبھوتی رہے گی، جب تک اس کا جسم سڑک کر ہڈیوں کے منجر میں تبدیل نہیں ہو جائے اور یہ ہڈیاں بھی ایک ایک کر کے اس کے جسم سے علیحدہ زمین پر نہ آ کر تھیں۔

قانونی طور پر اس کی لاش، باقیات یا تدفین کو جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ اس لیے لوگوں نے یارک سٹائر کے اس جنگل کے قریب سے بھی گزرتا چھوڑ دیا جہاں پھندے یوگن کی کھتی سڑتی لاش لٹک رہی تھی۔

تیس سال گزر گئے۔ یوگن کی لاش بدستور پھندے ہڈیوں کا ڈھانچا بنی جمبھوتی رہی۔ کہتے ہیں کہ کسی کو ہمت نہ تھی کہ اس بات پر احتجاج کرے البتہ یوگن کی سب سے جمبھوتی دوسروں سے بہت مختلف تھی۔ بیس سال میں وہ جوان ہو چکی تھی۔ وہ چوری جیسے ایک دو ہفتے بعد اُس طرف جاتی تھی۔ لاش پھندے سے لٹک رہی تھی۔ وہ نیچے گرنے والی ہڈیوں سے رومال پر رکھ کر بڑی احتیاط سے قبرستان لا کر دفن کر رہی۔ آخر ایک دن کھوپڑی بھی زمین پر آ گئی۔ پھندا ہو گیا اور کھوپڑی قبرستان کے اسی گڑھے میں ایک نئے رومال میں لپیٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹی میں مل گئی، جہاں اس سب سے جمبھوتی اور جیتی بیٹی نے باپ کی دیگر باقیات دفن کر رکھی تھیں۔

☆☆☆

رجرڈ تو یوگن ایرم کے خلاف سلطانی گواہ بن گیا تھا۔ اس لیے اس کی جاں بخشی ہو گئی۔ ہنری ٹیری کو عدالت نے کر دیا تھا۔ فرانسز بھی رہا ہو گیا تھا۔ جس دن یوگن کو پھانسی گئی، اس دن کیرس بوروگ کے مشتعل باشندوں نے اس کے گھر اور شراب خانے پر دھاوا بول دیا۔ اس کے گھر اور شراب خانے کو نذر آتش کر دیا۔ رجرڈ اور فرانسز لوگوں کے خوف

لکھ رہے ہوں ہو گئے تھے۔ کئی روز تک مشتعل ہجوم انہیں تلاش کرتا رہا مگر وہ ہتھے نہ پڑے۔ ہفتوں بعد لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہلے۔ پھر وہیں قصبے کو لوٹے۔ رجرڈ ہاؤس میں 1777ء کو اٹھال کر گیا۔ اس خوف سے اس کی میت قصبے کے قبرستان میں لکھس دفنائی گئی کہ کہیں اس سے نفرت کرنے والے مرنے کے بعد اس کی لاش قبر سے نکال کر اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ اسے کہاں دفن کیا گیا تھا؟ یہ بات قصبے کے صرف اُن چند معتبرین کو ہی معلوم تھی جو معتدل مزاج اور تشدد کو ناپسند کرنے والے تھے۔

☆☆☆

جیل میں سرانجام دیا گیا یوگن کا علمی کام بظاہر دوسرے کے لیے مشقت لاحق رہی ہوگی لیکن اس کا یہ علمی کام اس کے ایک دوست کے ذریعے دنیا تک پہنچ گیا۔ وہ کہتا تھا کہ میں ایک اسکالر ہوں مگر اس کی یہ بات کسی نے نہ مانی مگر 1784ء میں اس کا ایک مفصل سوانحی خاکہ شائع ہوا۔ یہ فرمنی سے شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا Kippis's Biographica Britannica جس میں اعتراف کیا گیا تھا کہ ”یوگن ایرم یونانی، عبرانی، لاطینی اور کلیتہً زبانوں کے قدیم فلسفے کا ایک بہترین اسکالر تھا۔ ایسا اسکالر جس کا ہم عصر اُس وقت تک شاید ہی پورے برطانیہ میں کوئی ہو۔“ یہ ایک بہت بڑا اور پہلا اعتراف تھا اس کی علمی خدمات کا۔ کرائے عدالت میں یوگن کے آخری الفاظ تھے: ”آپ یا آپ کی آنے والی نسل فیصلہ کرے گی کہ میں مجرم تھا یا بے قصور۔“ فیصلہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

برطانیہ کے عہد و کنوریہ کی تاریخ، عمومی دستاویزات ادب اور شاعری میں یوگن ایرم پر بہت کچھ لکھا ہوا ملتا ہے لیکن اس کی موت کے بعد بھی کئی سوالات ایسے ہیں جن کے جوابات اب تک کسی کو نہیں مل پائے اور نہ ہی توقع ہے کہ ان سوالوں کی تشنگی کبھی دور ہو سکے گی۔

کیا یوگن نے قتل کیا تھا؟

کہنے والے کہتے ہیں کہ اس کے دلائل گواہ تھے کہ وہ قاتل نہیں تھا۔ یہ درست ہے تو جیوری نے اسے کن وجوہات کی بنا پر قاتل قرار دیا تھا۔

جیوری اشرافیہ پر مشتعل تھی۔ وکنوریہ عہد کی سرکاری داداشتوں میں درج ہے کہ لندن میں، اس کی شاگردوں میں وہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ایک مالدار شخص کی حسین دھیل اور نازک اندام جو اس سال بیٹی بھی شامل تھی۔ جس پر وہ

ہم میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو احساس کمتری کے ذریعے اشتعالی زبان کے استعمال میں شرم اور ہشک محسوس کرتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو بڑے خود، اردوئے معلیٰ کا وارث بنا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ ”اردوئے معلیٰ“ کا زمانہ ہے۔ خود ہم سے بسا اوقات اس ضمن میں حماقت سرزد ہو جاتی ہے۔ دو چار روز پہلے کی بات ہے۔ ہم صبح اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلے اور سڑک پر ایک ٹیکسی رکوائی۔

”کہاں جانا ہے؟“

ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔ ہم نے بتایا ”بلدیہ عظمیٰ“ حیرت سے ہمیں گھورتے ہوئے بولا ”کراچی میں ہے؟“ ہم نے جھنجھلا کر کہا ”نہیں، گھونگی میں ہے۔“

کہنے لگا ”صاحب! کیوں مذاق کرتے ہو، صبح بتاؤ کہاں جانا ہے؟“ ہم نے کہا ”اور کس طرح بتائیں میرے بھائی! بندر روڈ پر لائٹ ہاؤس سنیمیا کے پاس ہی تو ہے۔“ سرج پتھر سے تعمیر شدہ بلدیہ عظمیٰ کی عمارت۔“

دروازہ کھول کر ہمیں اندر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا ”سیدھی ساوی اردو میں نہیں کہیے، کے ایم سی بلڈنگ“

آپ نے دلاور ڈھاکہ کا یہ قطعہ شہر دیکھا ہوگا:

اک یونیورسٹی میں کسی سوٹ پوش سے میں نے کہا کہ آپ ہیں کیا کوئی سارجنٹ کہنے لگے کہ آپ سے مسلک ہوگی آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈیپارٹمنٹ

(ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کے مضمون سے اقتباس) مرسلہ: عثمان قریشی، گھونگی

عقل مند

سید احتشام

وہ جرائم کی بیخ کنی کے لیے بلوایا گیا تھا کیونکہ اس شہر کے محکمہ پولیس میں جتنے بھی اہل کار تھے سب کے سب نا اہل تھے، اس نے اپنی آمد کا اعلان عجب انداز میں کیا، ہائی وے پر پولیس موبائل کو روکا اور پستول تان لیا مگر جب ٹریگر دبایا تو پانی کی پھوار سپاہی کے چہرے کو بھگو گئی۔ اس کے اقدام عجیب و غریب ہوتے مگر جب نتیجہ سامنے آتا تو اس سے نفرت کرنے والے بھی موم ہو جاتے۔



ایک ایسے شہر کا قصہ جہاں محکمہ پولیس نا کارہ تھا

نقطوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ اتنا حسین شہر لا قانونیت اور طوائف الملوکی کا شکار ہوگا لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ ڈان کے یہاں آنے کا سبب یہی تھا۔ اس کی عمر 38 سال تھی اور وہ اب تک بے شمار مشکلات اور ہنگاموں پر قابو پا چکا تھا۔ ہر چند کہ اس کے بالوں میں چاندی کے تار جھلکنے لگے تھے تاہم وہ حیرت انگیز طور پر تندرست اور صحت مند تھا۔ وہ درمیانہ قد اور ٹھوس جسم کا مالک تھا۔ اس کا منہ جس میں ہر وقت ایک بچھا ہوا سگار دھار ہوتا، توانائی کا سرچشمہ لگتا تھا۔ آنکھوں سے نری

سپر ہائی وے کے اس پار، ایک تختی نصب تھی جس پر یہ مہارت درج تھی ”راکی بیچ۔ ایک میل!“ ڈان نے اپنی سیڈان لہر کر اسی جانب موڑ دی اور ایک لمبے لمبے کے بعد اسے شہر کی پہلی جھلک دکھائی دی۔ مکانات کی رنگ برنگ کی چھتیں، صبح کی نو دمیدہ کرنوں میں چمک رہی تھیں اور ان کے سروں پر پوکپوکش کے لاتعداد بلند و بالا اشجار مہم صبح کا ہی میں شرابیوں کی مانند ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ اس کے پس منظر میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس غبار میں جا بجا کشتیوں کے سفید بادبانوں کے مثلث اُن گنت

ہری طرح فریفت ہو گیا تھا مگر یہ بات کہیں پر بھی لکھی ہوئی نہیں ملتی کہ اس مالدار شخص کا نام کیا تھا، اس لڑکی کا نام کیا تھا اور کیا اس عشق میں لڑکی بھی شریک تھی یا یہ یک طرفہ عشق تھا۔ آخر اس عشق کا انجام کیا ہوا تھا۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یوگن کو عبرت کی مثال بنانے میں طبقہ اشرافیہ کے اس گناہم شخص کا ہاتھ تھا جو ایک غریب استاد کو اپنی بیٹی سے عشق کے جرم کی سزا دینا چاہتا تھا۔ دیے جیوری بھی طبقہ اشرافیہ پر مشتمل تھی۔ جیوری نے یوگن کے موثر دلائل کو کس کی ایما پر اہمیت نہیں دی تھی..... یہ سب حقائق کسی تاریک سرنگ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ایک سوال یہ بھی ہے..... اگر یوگن بے قصور تھا تو اس کی بیوی اینا نے مجسٹریٹ کے سامنے اپنا بیان طعنی کیوں دیا تھا؟ کیا وہ حقیقت جانتی تھی یا پھر اسے وہ موقع ملا تھا کہ جب اپنے لاپتہ شوہر سے انتقام لے سکتی۔

شادی سے پہلے ڈینیل نے اس سے قریبی روابط قائم کر رکھے تھے۔ کیا اُس کی شادی کے بعد بھی اینا سے اس کے یہ تعلقات برقرار تھے۔

کیا وہ اپنے شوہر کی موت سے ڈینیل کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

کیا اینا جانتی تھی کہ یوگن زندہ ہے اور کبھی بھی لوٹ کر آسکتا ہے۔ کیا وہ چاہتی تھی کہ یوگن کبھی نہ لوٹے۔

وہ شدید جذباتی عورت تھی۔ کیا اس نے ڈینیل کی بے وفائی اور شوہر کی گمشدگی کے باعث رچرڈ، ہنری یا فرانسز میں سے کسی ایک سے یا پھر ان تینوں سے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ اگر یوگن لوٹ آتا تو یہ تعلقات برقرار نہ رہ پاتے.....

تو کیا اس وجہ سے اینا نے اپنے شوہر کا کاٹھاراہ سے صاف کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔

ایک اور اہم سوال یہ بھی ہے.....

مجسٹریٹ کے سامنے اینا نے ایک ڈھانچے کو ڈینیل کے بجائے اپنے لاپتہ شوہر کا قرار دیا تھا مگر مجسٹریٹ نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے دو سپاہی یوگن کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجے اور وہ کچھ روز میں ہی اسے گرفتار کر کے لے آئے تھے۔ اس وقت یوگن نارفاک کے علاقے کننگز لائن میں مقیم تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا مجسٹریٹ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ وہ اُس وقت کہاں ہے یا اگر وہ نہیں جانتا تھا تو پھر اسے کس نے بتایا کہ وہ کہاں رہ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے سپاہیوں کو ٹھیک اُس مقام پر اسے پکڑنے کے لیے بھیجا جہاں وہ مقیم

تھا۔ سینٹ رامبرٹ کی غار سے ملنے والے دو ڈھانچوں میں سے ایک کو تو ڈینیل کا قرار دیا گیا مگر وہ دوسرا کس کا تھا۔ جس ڈھانچے کو ڈینیل کا قرار دیا گیا تھا، اس کی حقیقت کبھی سامنے نہ آسکی کہ آیا یہ واقعی ڈینیل کا ڈھانچا تھا۔

ڈینیل کلاؤک غریب جو تاساز تھا۔ یوگن کی بیوی نے جذباتی تشنگی دور کرنے کے لیے اس کا سہارا لیا اور پھر یہ قصہ شروع ہوا جو برطانیہ کی تاریخ، قانون، علم اور ادب کا ایک اہم باب بن گیا مگر نہ تو کبھی ڈینیل کا کچھ پتا چلا، نہ وہ کبھی لوٹا اور نہ وہ سامان مل سکا جو اس نے ہتھ لیا تھا۔

رچرڈ یوگن کے خلاف سلطانی گواہ بنا مگر نہ تو اس نے نہ ہی فرانسز اور نہ ہی ہنری نے یہ بتایا کہ اُس مال کا کیا ہوا جو ڈینیل کے پاس تھا۔

لا تعداد تشہ سوالوں کی موجودگی کے باوجود جدید برطانیہ کے ابتدائی ایام کے ایک فلسفی اور استاد کو عبرت ناک سزائے موت دے کر یقیناً کچھ لوگوں کی تشنگی ہوگئی ہوگی مگر انصاف کے پردے میں ہونے والی نا انصافی کی یہ عبرت ناک مثال ڈیڑھ صدی تک برطانیہ کے لوگوں کے لیے شدید شرمندگی کا باعث بنی رہی تھی۔ آج بھی برطانیہ کی عدالتی تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ موجود ہے۔

ایک برطانوی قانون داں ہنری ایڈورڈ کہتا ہے: ”ہم عدالت کے فیصلوں میں نظیر تلاش کرتے ہیں مگر یوگن کیس کے فیصلے کی نظیر کبھی کسی نے، کسی بھی عدالت کے سامنے پیش نہیں کی۔ سب اسے بُرا اور سوچی سمجھی سازش پر مبنی فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ یوگن کیس کے فیصلے کا درجہ بھرا احترام نہیں مگر یوگن کے دیے ہوئے بیان کو برطانوی قانون کی تاریخ کے طالب علم نہ صرف اہم سبق کے طور پر پڑھتے ہیں بلکہ اسے کلاسیکی درجہ حاصل ہو چکا ہے۔“

یوگن ایرم جب عظیم اول تک برطانیہ کی افسانوی ہستی سمجھا جاتا تھا۔ اکیسویں صدی میں یہ برطانیہ کی کلاسیکی شخصیت کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اسے ایک ہیرو کا درجہ دیا جاتا ہے۔ موت کے ڈیڑھ صدی بعد تک وہ اپنے ملک میں شہرت کی بلند یوں پر موجود تھا۔ اسے علم و ادب اور فنون لطیفہ کے ذریعے ہیرو کا درجہ دیا گیا۔ اس کی بے گناہی ثابت کر دی گئی مگر بے گناہ کے قتل کے پیچھے پوشیدہ اسرار بدستور گہری اور طویل تاریک سرنگ کا حصہ ہیں۔ جو راز دو، سو اور سو سال میں منکشف نہ ہو سکے۔ اب ان کے ظاہر ہونے کی امید بھی باقی نہیں رہی۔

لیکن ساتھ ہی اضطراب اور غیر مصالحتہ تاثرات جھلکتے تھے۔ وہ پچھلے سترہ سال محکمہ پولیس سے وابستہ تھا اور سخت گیر تصور کیا جاتا تھا۔

معاں اس کی نگاہ ایک اور تختی پر پڑی جس پر درج تھا۔ "رفقاری حد 35 میل فی گھنٹہ" اس کے عقب میں ایک پولیس کار خراماں خراماں شہر کی جانب رواں تھی۔ یہ پچھلے پہر کی کشتی کار تھی اور اب اپنے آخری گشت کے بعد واپس جا رہی تھی۔ ان دونوں کاروں کے سوا سڑک بالکل سناں تھی۔

"یہ انہیں آزمانے کا ایک اچھا موقع ہے۔" ڈان نے سوچا اور اپنی بغلی سیٹ پر رکھا ہوا ایک پستول اٹھالیا، جو ایسے ہی موقعوں کے لیے تھا۔ اس نے پستول کو ڈیش بورڈ پر رکھا اور کار کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ کار پچاس میل کی رفتار سے اس کشتی کار کے قریب سے گزر گئی۔ کشتی کار کی سرخ بتیاں فوراً روشن ہو گئیں اور وہ اس کا تعاقب کرنے لگی۔ ڈان نے انہیں چند لمحوں تک تعاقب کرنے کا موقع دیا اور پھر اپنی کار روک لی۔ کشتی کار بھی رک گئی اور اس سے ایک پولیس آفیسر اتر کر اس کے قریب آیا۔

"اتنی جلدت کا ہے کی ہے دوست!" اس نے پوچھا۔ ڈان نے پلک جھپکتے اپنا وہ پستول اٹھالیا اور سیدھا کر کے ٹریگر دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول کی نال سے پانی کا فوارہ ایک لکیر کی صورت میں نکل کر پولیس آفیسر کو تر کر گیا۔ آفیسر اس غیر متوقع افتاد سے گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے ترچھے پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ..... کیا..... تم.....!" اس کے منہ سے بے ربط جملہ نکلا اور پھر اس کی نگاہ ڈان کے متہم چہرے اور ہاتھ میں موجود پستول پر پڑی اور اس کا چہرہ غصے سے تھما اٹھا لیکن اس کیفیت میں انہیں کے تاثرات بھی شامل تھے۔

"میں ڈان ہوں۔" ڈان نے کہا "راکی سچ کا نیا پولیس چیف۔ آج سے چارج سنبھال رہا ہوں اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے..... اگر میرے پاس سچ سچ کا پستول ہوتا تو ٹھنڈے پانی کے بجائے تمہارا چہرہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔" اس نے اپنا پرس نکال کر اس سپاہی کے ہاتھ میں دے دیا "یہ رہا میرا ڈرائیونگ لائسنس۔"

سپاہی نے پرس لے لیا۔ ڈان نے اس سے پرس چھین لیا "کوئی مشکوک پرس کبھی مت لیا کرو۔" وہ بولا "خود اسے اپنے پرس میں سے لائسنس نکال کر تمہارے حوالے کرنے دو

اور اپنے ساتھی کو بلاؤ۔ ایسے موقعوں پر کسی سپاہی کو تنہا نہیں ہونا چاہیے۔"

چند ہی سیکنڈ کے بعد اس سپاہی کا ساتھی اس کے پاس آکھڑا ہوا۔ یہ دونوں نوجوان اور ناتجربہ کار تھے۔ ڈان انہیں بری طرح لتاڑنے لگا۔ "ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والی کار کی جانب بڑھتے ہوئے بھی ہمیشہ محتاط رہو۔ بہت ممکن ہے، وہ کوئی لیئر اہو اور کسی پیٹرول پمپ کو لوٹ کر فرار ہو رہا ہو۔ وہ سمجھے گا کہ تم اسے وہ واردات کرنے کی بنا پر روک رہے ہو، لہذا بھی ایسی حماقت مت کرنا۔"

دونوں خاموشی سے سنتے رہے لیکن ان کی آنکھوں سے برہمی جھلک رہی تھی۔ اس میں ان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ڈان کی پانی کے پستول والی حرکت خاصی گھٹیا تھی لیکن یہ پیشہ ہی گھٹیا تھا۔ یہ حرکت پولیس ٹریننگ کا ایک بہت ہی پرانا حربہ بھی ممکن ہے وہ سپاہی جس کا نام بٹلر تھا، اس سے نفرت کرنے لگتا لیکن آئندہ کے لیے اسے ایک اچھا سبق مل گیا تھا۔

"اچھا بچو!" ڈان نے کہا "میں تمہارے ساتھ پولیس اسٹیشن چل رہا ہوں۔"

صاف و شفاف اور خوبصورت سڑک پر ان کے ساتھ بڑھتے ہوئے ڈان کو شفی فورس کے کیپٹن لوگان کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ "ڈان، راکی سچ کی پولیس فورس کے ایک بھی جوان نے اکیڈمی کی شکل نہیں دیکھی ہے۔" اس نے آگاہ کیا تھا "وہ تو بس، کسی کوچ اور ریوالور تھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جاؤ، شہر کو کنٹرول کرو۔ آج سے دو ہفتے قبل چند شریر نوجوانوں نے ایک کشتی سپاہی کو بری طرح زد و کوب کیا اور پولیس چیف نے دباؤ میں آ کر استعفیٰ دے دیا۔ لیفٹیننٹ اسمتھ وہاں کا جونیئر آفیسر تھا اور کوریا کی جنگ کا ہیرو تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان فورس میں تھا۔ جنگ سے واپس آ کر اس نے بینک کے صدر کی بیٹی سے شادی کر لی، اسے پولیس چیف کا عہدہ چاہیے تھا۔ آدمی اچھا تھا اس کے بے شمار دوست احباب تھے لیکن اسے صرف ایک شے کی کمی تھی اور وہ تھی پولیس کا دس سالہ تجربہ۔ اس نے بہت سے کونسلرز کو خرید لیا لیکن خوش قسمتی سے وہاں کے کمشنر ہارپر نے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور اس بات پر آمادہ کر لیا کہ باہر سے مدد طلب کرنی چاہیے۔ ہم نے تمہاری سفارش کی ہے۔ وہ لوگ تین ماہ کے لیے تمہیں مستعار لینا چاہتے ہیں۔"

"تین ماہ!" ڈان نے کہا "اس مدت میں تو بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ بہتر ہے، مجھے قبول ہے۔"

"ہاں خوش اسلوبی سے اپنا فرض نبھانا اور لوگوں کو اپنا مدد ملانا۔" لوگان نے کہا "تمہاری زندگی بن جائے گی۔"

"میں کوشش کروں گا۔" اس نے جواب دیا تھا لیکن وہ ہانا تھا کہ خوش اسلوبی سے فرض نبھانا اور ساتھ ہی لوگوں کو اپنا مدد ملنا تقریباً ناممکن تھا۔

اس خیال کے آتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک پھکی ٹراہٹ رینگ گئی۔ اس نے ان دونوں سپاہیوں بٹلر اور ایک کو دوست کے بجائے دشمن بتالیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی کار پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ یہ ہارپر کے شہروں کے پولیس اسٹیشنوں جیسا ایک عام سا پولیس اسٹیشن تھا۔ وہ کار سے اتر کر ان کے ساتھ چلتا ہوا ایک بغلی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ یہاں ایک کاؤنٹر تھا جس کے عقب میں ڈیٹک سارجنٹ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طرف سلاخوں والا دروازہ تھا جو جیل کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔ دوسرا دروازہ اکوڑا روم اور تیسرا فوٹو اور پرنٹ لیبارٹری میں کھلتا تھا۔ ڈائٹری دوسری طرف آفس تھے جن پر ایک کے آگے چیف اور دوسرے کے آگے وائچ آفیسر کی تختی لگی ہوئی تھی۔

ڈان نے سارجنٹ سے اپنا تعارف کرایا۔ سارجنٹ نے اس سے مصافحہ کیا اور مخاطب ہوا "چیف، ہم آپ کے انتظار تھے۔ کیا میں مب لڑکوں کو بلاؤں؟"

ڈان نے اثبات میں سر ہلایا۔ سارجنٹ نے گھنٹی کا بٹن دھاپا۔ فوراً بٹلر اور فرینک، اسکوڈ روم سے برآمد ہوئے۔ ان کے پیچھے چار سچ سپاہی تھے۔ پھر وائچ آفیسر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لیفٹیننٹ نمودار ہوا۔ ڈان، ڈیٹک سے ٹک لگا کر ان کا جائزہ لینے لگا اور وہ سب اسے تجسس نظروں سے گھورنے لگے۔ پھر خورید جوان العمر لیفٹیننٹ آگے آگیا۔ وہ لگ بھگ تیس سال کا تھا۔ اس کے بال سنہرے تھے۔ "ڈان گار یو؟" اس نے استغیا مہ لہجے میں پوچھا۔ اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔

ڈان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، اپنا کارڈ اس کے حوالے کر دیا۔ لیفٹیننٹ نے کارڈ پڑھا۔ پھر مصافحہ کیا "مجھے اسمتھ کہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "یہ لڑکے.....!"

"ایک منٹ، لیفٹیننٹ!" ڈان نے اسے روک دیا "میں بے شک ان لڑکوں سے ملنا چاہتا ہوں لیکن پہلے میں یہ ہانتا ہوں کہ امیر جنسی گاڑی کا رخ باہر کی سمت کر دیا جائے۔ اہلہ میں انہیں عمارت کے رخ کھڑی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

اعضا کی تبدیلی (ٹرائل پلانٹ) کا ہر سیکل کے بعد زعمہ انسانوں میں اپنے اعضا فروخت کرنے کی رسم کا آغاز ہوا۔ اس وقت سے سائنس اداں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طریقے سے انسانی اعضا تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک تصور یہ بھی پیدا ہوا کہ کیوں نہ جانوروں کے اندر اس طرح کی تبدیلی کی جائے کہ ان کے کچھ مطلوبہ اعضا انسانی جسم سے مطابقت پیدا کر لیں۔

سائنس دانوں نے پہلی مرتبہ جینیاتی عمل کے ذریعے بھیڑ اور انسان کی پونہ کاری کر کے ایک ایسا جانور تیار کیا جس کا جسم تو بھیڑ کی طرح کا ہے لیکن اس کے کئی اندرونی اعضا کافی حد تک انسانی اعضا کی مانند ہیں۔ اس مسئلے کو لے کر دنیا بھر میں ایک اور بحث بھی چھڑ گئی، کچھ لوگ اس کام کو غلط قرار دے رہے ہیں، ان کا موقف ہے کہ یہ انسان کی توہین ہے۔ جبکہ دوسرے قرار دیتے والوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ انسانوں کی بھلائی کے لیے کیا جا رہا ہے اور اس عمل سے مستقبل میں انسانی زندگیوں کو بچایا جاسکے گا۔

اقتباس: سائنس کے کرشمے از عاطف عزیز
مرسلہ: نہال احمد، کوٹ ادو

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر کئی سپاہیوں کے قدم دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپسی آ کر بڑے ہی فیروستانہ انداز میں دلوں کے پاس اکٹھا ہو گئے۔ ڈان نے لیفٹیننٹ اسمتھ کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

"شکریہ، دوستو!" ڈان نے کہا اور آگے بڑھ کر ہر فرد سے ہاتھ ملانے لگا لیکن ان لوگوں کے چہرے سے سرد مہری ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے یقیناً اسے ناپسند کیا تھا لیکن اتنا نہیں جتنا کرنا چاہیے تھا۔ یہ محض ناپسندیدگی کی ابتدا تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

پچھلے پہر کے کشتی سپاہی گھر چلے گئے اور دن والے اپنی

ڈیوٹی پر آگئے۔ ”اپنا کام معمولی کے مطابق جاری رکھو۔“ ڈان نے لیفٹیننٹ اسمتھ سے کہا ”لیکن سب سے پہلے فائلیں کھول لو۔“

☆☆☆

نئے دفتر میں دن کا بیشتر حصہ ریکارڈ کی چھان بین میں گزر گیا۔ صورت حال کیپٹن لوگان کے بیان سے کہیں بدتر تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا، وہاں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں ہسپتال تک پہنچنا نہیں آتا تھا۔ لہذا اگر کونسل شکر ہوگئی تھی تو اس میں انجیبے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس پرسکون شہر کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگ مختلف جگہوں سے آکر وہاں آباد ہو رہے تھے لہذا اسے جلد از جلد اس جگہ کو اچھی شکل و صورت میں لانا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔

دن کے دو بجے چھریرے جسم اور سنہرے بالوں کا مالک کمشنر ہارپر، جو ایک بہت بڑے ہارڈ ویئر اسٹور کا مالک بھی تھا، تین افراد کے ساتھ وارد ہوا۔ ان میں سے ایک میئر تھا اور دو کونسل کے ممبر تھے۔ ہارپر ایک خوش مزاج شخص تھا۔ ڈان کو وہ پہلی ہی نگاہ میں پسند آیا۔ کونسل کے ممبران نے تجویز پیش کی کہ اس موقع پر ایک گروپ نوٹو آتو دایا جائے تاکہ اخبار میں شائع کیا جاسکے لہذا وہ سب لان میں چلے گئے۔ وہاں تصویر آتو والی اور پھر ڈان اپنے دفتر میں واپس آکر فائلوں میں کھو گیا۔

تین بجے وہ آٹھ کر بس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کی بیوی جینیٹ پہنچنے والی تھی۔ وہ سیماں باندھنے کے لیے شہر میں رک گئی تھی۔ وہ دمہ کی مریض تھی۔ حال ہی میں اس پردے کے شدید حملے ہو چکے تھے۔ ڈان اس کی صحت کی طرف سے بے حد متشکر اور پریشان رہتا تھا۔ جب وہ بس سے اُتری تو ڈان اس کی شوخ بھوری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھ کر رنجیدہ ہو گیا۔ انہوں نے وہیں ایک ریسٹوران میں کافی پی اور پھر اپارٹمنٹ کی تلاش میں نکل پڑے۔

”کتنا حسین شہر ہے۔“ جینیٹ نے پُرسرت لہجے میں تبصرہ کیا ”اور ہوا کتنی صاف اور لطیف ہے۔ مجھے یہ جگہ بے حد پسند آتی۔“

”لیکن تمہیں زیادہ تر تہار ہوتا پڑے گا۔“ ڈان نے نرمی سے اس کا بازو چھو کر کہا ”لہذا آؤ سمندر کے کنارے کسی خوبصورت مقام پر اپارٹمنٹ تلاش کرتے ہیں۔“

”جہاں سے سمندر ٹھانیں مارتا ہوا نظر آتا ہو۔“ وہ خوش ہو کر بیچ ہی میں بول پڑی لیکن دوسرے ہی لمحے افسردہ

ہوگئی ”مجھے ڈان! اس کا کرایہ بہت ہوگا۔“ ”فکرت کرو۔“ ڈان نے اصرار کیا اور دونوں نے ساحل پر ایک اچھا سا اپارٹمنٹ ڈھونڈ نکالا۔ پھر اس کے مالک سے کرایہ ملے کیا اور اسی وقت اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے۔ جینیٹ کھانا تیار کرنے لگی اور وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔

☆☆☆

اگلی صبح، اس نے اپنے سارے ماتحتوں کو اکٹھا کر کے اعلان کیا ”ہم کل شام کے سات بجے سے کلاسیں شروع کر رہے ہیں۔ یہ کلاسیں ہفتے میں دو دن ہوا کریں گی۔ اپنے فرائض سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ کلاسیں بے حد اہم ہیں۔“

مجمع میں بہت سوں کے حلق سے غراہٹ نکل گئی لیکن انے مطلق توجہ نہیں دی ”ہمارے قریب ہی چاند ماری کا میدان ہے۔ ہم اسے استعمال کریں گے۔ اب سب لوگ اپنا ہسپتال دکھائیں۔“

فضا میں کھٹ کھٹ کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ ڈان ان کے درمیان ٹھہرتا ہوا، ہر ایک کے ہسپتال کا معائنہ کرنے لگا ”اس کی صفائی کرو اور اس میں تیل ڈالو۔“ اس نے ایک سپاہی کے ہاتھ میں موجود اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کی جانب اشارہ کیا ”یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے اگلے سے کہا۔ ایک پچیس سالہ سپاہی کے سامنے رک گیا۔ اس کا نام ایڈی تھا۔ ”ایڈی!“ وہ مخاطب ہوا ”کیا اس ریوالور سے کبھی گولی چلی ہے؟“

”کیوں..... نہیں سر!“ ایڈی نے جواب دیا۔ ”ہوں.....“ اس نے ہنکاری بھری ”کیا تم نے کبھی گولی چلائی بھی ہے؟“

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر مجمع میں سے کسی نے فقرہ چست کیا ”ایڈی ایک عاشق ہے، قاتل نہیں۔“

لوگ منہ دبا کر ہنسنے لگے۔ ایڈی کا چہرہ خفت سے گلابی ہو گیا ”نہیں، سر!“ اس نے بالا خر جواب دیا۔

”کیا تمہیں اس کا اندازہ ہے کہ اگر کسی لڑائی میں تمہارے گھراؤ کسی نشانہ باز مجرم سے ہو گیا تو کیا ہوگا؟“ اس نے برہمی سے پوچھا ”اس سے پہلے کہ تم یہ فیصلہ کر سکو کہ ہسپتال کس ہاتھ میں چڑنا چاہیے، وہ تمہاری انتڑیاں نکال دے گا آج رات میدان میں پہنچ جاؤ اور چاند ماری شروع کر دو۔“ وہ آگے بڑھ گیا اور پھر ایک پستہ قامت اور ٹھوس کے مالک سپاہی کے پاس رک گیا ”کار تو س؟“

”ہی ہاں جناب!“

”ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم واحد سپاہی ہو جو ایک پولس وصول کر رہے ہو۔ تم نے نشانہ بازی کہاں سے سیکھی ہے؟“

”سر، میں میرین میں تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بہت خوب۔ کیا تم ان لڑکوں کو نشانہ بازی سکھانا دیکھو گے؟“

”ہاں، کیوں نہیں سر! اگر یہ مجھ سے سیکھنا چاہیں تو ضرور لے آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے، آج تم ایڈی کو اپنے ساتھ شوٹنگ کے لیے لے جاؤ۔“ اس نے ہدایت کی اور اس کے ساتھ ہی مجلس فرماست کر کے اپنے چیمبر میں چلا گیا اور شینے رپورٹوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ ایک رپورٹ نقب زنی کی تھی۔ دو ٹریفک حادثات کی اور ایک نو جوانوں کی دہشت گردی کی۔ اس نے یہ رپورٹیں فائل میں رکھیں اور کمشنر ہارپر سے ملنے اس کے اسٹور پہنچ گیا۔ ہارپر نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔

”کمشنر!“ وہ گویا ہوا ”مجھے 22 کلیمبر کی چھ یا آٹھ ہتلیں اور ڈیڑھ ساری گولیاں چاہئیں۔ لیکن میرے پاس بچے نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مقامی تجارتل کر سب کچھ (اہم گردیں)۔“

”یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔“ کمشنر ہارپر نے کہا ”تم ان کا کیا کرو گے؟“

”اس سے پہلے کہ وہ اپنے ریوالور سے خودکشی کر لیں، میں اپنے جوانوں کو بائیس بور کی رائفل چلانا سکھانا چاہتا ہوں اور جیسے ہی وہ سیکھ جائیں گے، ہم ہر اسکول کے ان لاکھوں کو مفت نشانہ بازی کی کلاس میں شمولیت کی دعوت دیں گے جو نشانہ بازی سیکھنا چاہیں گے۔“

”میرے خدا!“ ہارپر بولا ”کیا تم انہیں لوگوں کو ہلاک کرنا سکھانا چاہتے ہو؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“ ڈان نے جواب دیا ”آج کل کے لڑکے بے حد کابل ہو گئے ہیں کیونکہ انہیں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ حالانکہ وہ جسمانی اعتبار سے بالکل جوان ہوتے ہیں۔ انہیں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ نشانہ بازی ان کی کابلی اور کر کے انہیں چاق و چوبند کر دے گی۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ اگر یہ لڑکے ایک بار میرے جوانوں سے محل مل گئے تو ان کے والوں میں پولیس والوں کے خلاف جو نفرت ہے وہ ختم ہو جائے گی اور وہ ایک دوسرے کا احترام کرنے لگیں گے۔“

ہارپر کچھ دیر اس کی باتیں سن کر سوچتا رہا اور پھر گویا ہوا

”چیف، یہ بھل مشکل ہی سے منڈھے چڑھے گی، تاہم میں جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔“

وہاں سے دفتر واپس آکر اس نے ایک حکم نامہ تحریر کر کے اسکو آڈروم کی دیوار پر چسپاں کر دیا۔ ”اب ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کو میئر کی جانب سے سمن جاری کیے جائیں گے، کوئی بعت وصول نہیں کیا جائے گا۔“

یہ خاصا سخت حکم تھا لیکن اس کی بہت ضرورت تھی۔ اس نے سوچا، شاید اس سے دوستوں میں اضافہ نہ ہو۔ اس شام کلاس لیتے ہوئے، وہ حاضری کے رجسٹر سے باری باری سب کا نام پکار رہا تھا۔ وہاں سولہ پولیس والے منہ بنائے بیٹھے تھے اور جواب دے رہے تھے۔ جب اس نے اسٹین کا نام پکارا تو نیم دلی سے جواب ملا ”حاضر ہوں۔“

ڈان نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ”کیا اسٹین حاضر ہے؟“ ”نہیں۔“ دو تین آوازوں میں جواب آیا ”حاضر نہیں ہے۔“

ڈان نے اس شخص کی جانب دیکھا، جس نے اسٹین کے بدلے جواب دیا تھا۔ اس کا نام فلن تھا۔ ڈان نے اس کا نام پکارا۔

”حاضر ہوں۔“ یہ وہی آواز تھی۔ ڈان نے کلاس کے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر مسکراتے لگا۔

”میں تمہاری وفاداری کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ وہ بولا ”لیکن اسٹین سے ملاقات ہو تو کہنا کہ تم نے کوشش کی تھی۔“

بے اختیار سب لوگ ہنس پڑے اور فلن کھینا سا نظر آنے لگا۔ ڈان نے ایک نیا سگارا اپنے دانتوں میں دالیا اور تختہ سیاہ کی جانب مڑ کر یہ بتانے لگا کہ کسی مطرور مجرم کی کار کا تعاقب کیسے کرنا چاہیے، کسی تاریک ملاقات میں روٹی کے بغیر کس طرح داخل ہونا چاہیے۔ ریوالور اور لیلیٹ کس طرح سنبھالنا چاہیے اور کس قسم میں داخل ہو کر تاریکی میں گھات لگائے ہوئے نقب زن کو کس طرح دبوچنا چاہیے، وغیرہ۔ دیرے دیرے لوگوں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی، بجز، اسمتھ کے۔ وہ سب سے پچھلی قطار میں بیٹھا خاموشی اور توجہ سے اس کی باتیں سنتا اور نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ جب سب لوگ رخصت ہونے لگے تو ڈان نے کارلوں سے پوچھا ”ایڈی چاند ماری میں کیسا رہا؟“

کارلوں خفیف سا مسکرایا ”اس نے کافی دلچسپی لی۔“ ”یہ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ وہ ٹرکیر دباتے وقت اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے، وہ دلچسپی لے رہا ہے۔“

”بہتر ہے، اسے سکھاتے رہو۔ اسے ہر قیمت پر سیکھنا ہے۔“ ڈان نے کہا۔

☆☆☆

اگلے روز ڈان کی کار میں پولیس ریسیور نصب کر دیا گیا اور رات کے کھانے کے فوراً بعد وہ سونے چلا گیا لیکن دو بجے اٹھ گیا۔ ایک کپ کافی پی اور ڈرائیو کرتا ہوا شہر کی سمت روانہ ہو گیا۔ ایک جگہ درختوں کی چھاؤں میں کار روکی، اپنا ریڈیو آن کیا اور ایک نیا سگار دانوں میں دبا کر، گشتی کاروں کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگا۔ رات کے تین بجے اچانک اس کا ریڈیو آن ہو گیا اور آواز آئی ”کار کا نمبر 4۔ تین تین دو۔۔۔ مار پیس لین۔۔۔ پتھر۔ وہاں شکار موجود ہے۔“

کار نمبر 4 سے فلن اور اشین نے جواب دیا۔ وہ پتا وہاں سے دو بلاک کے فاصلے پر مغرب کی سمت تھا۔ ڈان نے گیسر بدلا اور اسی لمحے ایک گشتی کار کے سائرن کی آواز ہائی وے پر مغرب کی سمت بڑھتی ہوئی سنائی دی۔ ڈان نے جھٹکا کر اپنا سگار پھینک دیا۔ وہ دو گھنٹے تک کلاس میں یہ لیکچر دیتا رہا تھا کہ کسی شکار تک پہنچ کر اسے دیو چنا چاہیے۔ لیکن یہ کار نمبر 4 سائرن بجاتی چلی جا رہی تھی اور اس کی سرخ بتی بھی روشن تھی۔ اس طرح وہ گویا مجرم کو خبردار کر رہی تھی۔ ڈان نے مار پیس لین پتھر کر کار کا انجن بند کر دیا اور روشنیاں بھی گل کر دیں۔ ایک بلاک دور، اسے پولیس کار کی سرخ بتی نظر آئی اور پھر ستانے میں بریک لگانے کی اتنی تیز اور سبک خراش آواز ابھری کہ وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ شکار اب تک یقیناً ان سے میلوں دور پہنچ چکا ہوگا۔ وہ خاموشی سے آکر گشتی کار تک پہنچا۔ فلن اور اشین کار کی چابی احتیشت میں لگی چھوڑ کر مکان کے اندر جا چکے تھے ڈان نے چابی نکالی اور جیب میں رکھ کر اپنی سیڈان میں آ بیٹھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فلن اور اشین ناکام و نامراد مکان سے باہر آئے۔ اس نے اپنی سیڈان اشارت کی اور روانہ ہو گیا۔ اس کے پانچ ہی منٹ کے بعد اس نے پولیس اسٹیشن پہنچ کر ڈیٹیک سارجنٹ کو حیرت زدہ کر دیا جو اپنی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ وہ یکبارگی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور احمقوں کی طرح میز پر بکھرے ہوئے کاغذات سینٹے لگا۔

”بہت جلد کچھ لوگ مجھ سے ملنے آنے والے ہیں۔“ ڈان نے کاٹ دار لہجے میں کہا ”میں اپنے دفتر میں ہوں۔“ اپنی میز پر پہنچ کر اس نے اشین کی فائل نکالی اور از سر نو اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہ ایک مایوس کن ریکارڈ تھا۔ کئی باتوں کے علاوہ شہریوں کی جانب سے ملنے والی تین شکایتیں

بھی تھیں کہ انہوں نے اس کی سانس میں شراب کی بو محسوس کی تھی، لہذا اسے اب تک ملازمت سے برخاست کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کا جواب اس کی ملازمت کی درخواست میں مل گیا یہ کہ وہ مقامی سیاست دان اور کونسل کے ایک ممبر فوربس کا سالہ تھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے بغلی دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور پھر سارجنٹ کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سبک برگوش ہوئی ”ہائیں، یہ کیا ہوا؟“

”تمہارے پاس کار نمبر 4 کی دوسری چابی ہے؟“ آواز میں سختی اور برہمی تھی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ ”تمہارے پاس جو تھی، وہ کیا ہوئی؟“ سارجنٹ نے پوچھا۔

”اس کی فکر مت کرو۔ دوسری چابی دو۔“ جنجیلا کہا گیا۔

ڈان ٹھہلتا ہوا ہال میں آ نکلا۔ اور اس نے چابی کاؤنٹر کی جانب اُچھال دی۔ وہ اشین تھا۔ اس نے چابی دیکھتے پہچان لی اور غصے سے ڈان کی جانب مڑا۔ وہ ایک قد آور تھا ”مجھے شبہ تھا کہ یہ کسی ایسے شخص کی حرکت ہوگی جس نے ہم پر پانی کے پستول جیسی ادھی حرکت آزمائی تھی۔“ وہ بر سے بولا اور ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے آ کھڑا، ”سنو ڈان! آئندہ میری تحویل میں موجود کسی بھی شے کے ساتھ بندروں والی حرکت مت کرنا، سمجھ گئے؟“

ڈان نے اس کی برہم آنکھوں میں اپنی آہستہ کر دیں ”اگر تم کلاس میں حاضر ہوئے ہوتے تو چاب احتیشت میں نہ بھولتے جہاں سے کوئی بھی مجرم فرار کے لیے خود تمہاری کار استعمال کر سکتا تھا۔ اگلی کلاس جمعرات کو ہوگی تمہیں حاضر ہونا ہے۔ سمجھ گئے؟ اور ہاں، اس لمحے سے تم خود کو آزمائشی مدت میں تصور کرو۔ اگر کوئی معمولی سے معمولی غلطی بھی کی تو تمہاری شامت آ جائے گی۔“ وہ مڑ کر آ بڑھ گیا۔ پھر رک کر پلٹا ”ایک اور بات بھی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم ابھی سے ایک دوسرے کو جان لیں۔ اگر تم میرے سامنے بھی ہوتے تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے چیمبر میں داخل ہو گیا۔

اب اس نے سٹی کونسل میں ایک دشمن بنالیا تھا۔ عجیب بات ہے، آپ پولیس فورس میں رہ کر جب بھی کوئی قدم اٹھائیں گے، ایک دشمن بنالیں گے۔ لوگان نے کہا تھا ”تمہیں صرف اور صرف یہ کرنا ہے کہ لوگوں کو اپنا دو بنانا ہے، اس طرح تمہاری زندگی سنور جائے گی۔“ وہ اس

بات سوچتے ہوئے اپنے سگار کو گھورنے لگا اور پھر اسے پیچ کر گھر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز اس نے ایک اور دوست گنوادیہ کونسل کے ایک ممبر بکنر نے اس کے پاس آ کر اس سے ریوالور کا پرمٹ طلب کیا۔ لیکن ڈان کے پوچھنے پر وہ اس کے استعمال کی کوئی نقل بخش وجہ بیان نہ کر سکا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس طرح خود کو محفوظ تصور کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ کونسل کا ممبر ہونے کی بنا پر ڈان اسے پرمٹ دے دے گا۔

”ایک ریوالور رکھ کر تم محفوظ ہونے کے بجائے زیادہ غیر محفوظ ہو جاؤ گے۔“ ڈان نے جواب دیا۔

بکنر غصے سے تہمتا تے ہوئے چہرے کے ساتھ چلا گیا۔ ڈان نے گویا اس کی سخت توہین کی تھی۔ جمعرات کی شام، اشین تاخیر سے کلاس میں حاضر ہوا لیکن ہوا ضرور۔ اسی روز ان نے کسی مکان پر چھاپہ مارنے کی فلم دکھائی۔ اس سے اگلی بار بلوے برقا بولنے، شہریوں کو گرفتار کرنے، خطرات پر قابو پانے اور گھر بلبو جھگڑے سے نمٹنے سے متعلق فلمیں دکھائیں۔ پھر چاندنی راتوں میں انہیں باہر لے جا کر میدانی حربے سکھائے۔ ہر منگل کو پوری کلاس نشانہ بازی کرتی۔ اس طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ اس دوران وہ اپنے آدمیوں کی صلاحیتوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اور اسے ان کی صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافہ نظر آیا۔ اب وہ پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ خود اعتمادی سے چل پھر سکتے تھے اور گفتگو کر سکتے تھے اور ان میں ایک طرح کا رکھ رکھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اسے پسند کرتے تھے، خاص کر اسمتھ تو اسے سخت پسند کرتا تھا لیکن اس کی محنت کا نتیجہ سامنے آ رہا تھا۔

اپنی داپسی سے دس روز قبل اس نے جرائم کے ریکارڈ کا معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر اسے گہرا اطمینان حاصل ہوا کہ جرائم میں خاصی کمی آگئی تھی۔ مزید یہ کہ اس کے جوانوں نے پہلے کی بہ نسبت بائیس بور کی رائفل سے چاند باری میں کہیں زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ یہ ریکارڈ اتنا شاندار تھا کہ وہ ٹوٹ جہی میں جھٹلا ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے سوچا کہ اگر معاملہ اتنی ہی خوبی سے چلتا رہا تو یہ ایک کارنامہ ہوگا۔ لیکن اگلے ہی روز ایک گڑبڑ ہو گئی۔

ایک سبزی فروش کلائنٹ، جس کی دکان ہائی وے پر واقع تھی، اس کے پاس آیا اور اس نے ایک آفسر کو درخواست کرنے کی درخواست کی جس نے اس کے بیٹے کو لمبی طرح زدوکوب کیا تھا۔ ”میرے لڑکے نے ٹریفک کے

قوانین کی خلاف ورزی ضرور کی تھی لیکن اس آٹو سے شراب کی بو آ رہی تھی اور اس نے میری بی بی لے ما اتنی بڑی بڑی گالیاں دیں جنہیں میں یہاں ڈہراتے ہوں۔“

بھی شرم محسوس کر رہا ہوں۔“

”اگر اس نے تمہاری بیوی کے سامنے گالیاں دی تھیں تو تم وہ گالیاں میرے سامنے ڈہرا سکتے ہو۔“ ڈان نے کہا ”اس نے کیا کہا تھا؟“

کلائنٹ نے ایک ایک گالی اس کے سامنے ڈہرا دی۔ ڈان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کلائنٹ ایسا آدمی نہیں تھا جو غلط بیانی سے کام لیتا۔ ڈان، ایسی گالیاں دینے والے کو فوراً ہی پہچان گیا۔ وہ اشین کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

کلائنٹ کے جانے کے بعد اس نے اشین کو فون پر طلب کیا ”ایک گھنٹے کے اندر اندر حاضر ہو جاؤ اور اپنا ریوالور اور بیج بھی لیتے آؤ۔“

تھوڑی دیر کے بعد اشین حاضر ہو گیا ”تمہیں ڈیوٹی پر شراب پینے اور انتہائی ناروا سلوک کرنے کی بنا پر ملازمت سے برخاست کیا جاتا ہے۔“ ڈان نے سیاٹ لہجے میں کہا۔

اشین کا چہرہ راکھ رنگ ہو گیا اور حلق خشک ہو گیا۔ تاہم اس نے ان الزامات کی تردید نہیں کی۔ ساتھ ہی ڈان کو یہ احساس دلایا کہ اس کا بہنوئی، ملازمت سے برخاست کیے جانے کو پسند نہیں کرے گا۔

”بہت ممکن ہے۔“ ڈان نے عام سے لہجے میں کہا ”لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

اشین رخصت ہو گیا۔ اس کے پندرہ منٹ کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے بولنے والا اشین کا بہنوئی، کونسل کا ممبر فوربس تھا ”صبح بخیر ڈان! وہ بلا، اس کے لہجے سے گہری دوستانہ گرم جوشی بھٹک رہی تھی۔ اس نے لہجے کی ساری گرم جوشی یہ بتانے میں صرف کمری کہہ دیا۔ وہ ڈان کو اچھی طرح جانتا ہے اور یہ کہ اس کے سالے کو شاید اس کی جانب سے تھوڑی بہت غلط فہمی ہو گئی ہے۔ چنانچہ معاملے کو رفع دفع کر دیا جائے۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ ڈان نے جواب دیا ”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ لوگ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک آفسر ڈیوٹی پر شراب پیے اور گندی گالیاں دے۔“

”میں اس سلسلے میں اس سے گفتگو کروں گا۔“ فوربس نے وعدہ کیا ”اور اسے صاف صاف بتا دوں گا کہ۔۔۔۔۔“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ ڈان نے بات کاٹ کر کہا ”اسے یاد آ گیا کہ لوگ پہلے بھی اس کی شکایتیں کر چکے

تھے۔ ”جب تک میں یہاں ہوں، ہم اسے استعمال نہیں کر سکتے۔“

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر ایک طویل وقفے کے بعد فوربس کی آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے ڈان! جب تک تم چیف ہو، اس وقت تک سہی.....!“

اس کے ایک گھنٹے کے بعد ہاربر کا فون آ گیا ”خدا کی پناہ!..... ڈان!“ وہ بولا ”کیا تم اسے محض معطل نہیں کر سکتے؟ فوربس بے حد با اثر آدمی ہے۔ مجھے ڈر ہے، کہیں تمہارا ریکارڈ خراب نہ ہو جائے۔“

”مجھے احمق کہہ لو۔ میں تسلیم کر لوں گا لیکن اگر تم یہ چاہے ہو کہ پولیس چیف ہوتے ہوئے میں ایسے شخص کو برداشت کر لوں تو اس سے پہلے ہی استعفیٰ دینا پسند کروں گا۔“

ہاربر پر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ ”ڈان! اگر میں پہلے تمہارے ساتھ نہیں تھا، تو اب ہوں۔“ وہ بولا ”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے اپنے پیروں پر کھڑی ماری ہے۔ تمہیں ضمانت پر رہا کرانے کے لیے مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا، میں کروں گا۔“

ڈان نے ریسور رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ کاش وہ یہ کام قدرے ذہانت سے انجام دیتا۔ کچھ اسی طرح کے دشمن بھی اس کے دوست بن جاتے۔ اسے اپنی ملازمت کی پروا نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی ملازمت حاصل کر سکتا تھا یا بھوکا رہ سکتا تھا لیکن اس کی بیوی جینیٹ..... وہ پہلے سے کہیں خوش اور تندرست نظر آ رہی تھی۔ وہ کئی سال کے بعد اس کے چہرے پر رونق دکھ رہا تھا۔ راکي بیچ کی آب و ہوا اسے بے حد اس آئی تھی۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہو جاتی تو اس کے لیے کئی مسائل کھڑے ہو جاتے۔

☆☆☆

بنتے کی صبح وہ واج آفسر کے فرائض انجام دے رہا تھا اور اسمتھ، اسٹین کی جگہ ایڈی کے ساتھ گشتی کار نمبر ایک میں سوار گشت کر رہا تھا۔ جنوری کا مہینا تھا اور ڈان، جینیٹ کے ساتھ شام کو ساحل پر چہل قدمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انہیں غروب آفتاب کے وقت ساحل کی سخت ریت پر چہل قدمی کرنا بے حد پسند تھا۔ اچانک ڈیک سارجنٹ کے ریڈیو سے آواز آئی ”کار نمبر ایک..... آفسر کو مدد کی فوری ضرورت ہے۔“

اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی مقام پر آفسر کو مقابلے میں شکست ہو رہی تھی۔ ڈان اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ریڈیو سے

مسلح آواز آرہی تھی اور یہ اسمتھ کی آواز تھی ”چار مسلح ڈاکو بینک لوٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

ڈان بے تحاشا دروازے کی طرف بھاگا اور ایک ہی لمحے کے بعد اس کی سیڈان مرکزی شاہراہ پر آڑی جا رہی تھی اور اس کے سائرن کی آواز سے ٹریفک کافی کی طرح چھٹنا چلا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا ”میرے خدا! ایڈی ڈاکوؤں سے دو بدو بڑ رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جو تین باہ پہلے پستول تھا مٹا نہیں جاتا تھا، جس کی ایک بیوی اور تین بچے تھے۔“

بینک کے پاس پہنچ کر وہ ریوالور بدست کار سے کود گیا۔ سڑک حیرت انگیز طور پر دیران تھی، چار سو ایک ہیٹ ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوتے ہی ہر شہری نے کہیں نہ کہیں پناہ لے لی تھی۔ ایک طرف گشتی کار کھڑی تھی۔ معاً اس نے دو آدمیوں کو فٹ پاتھ پر بھاگتے اور ایڈی کو بڑی مہارت سے اپنے ریوالور میں دوبارہ گولیاں بھرتے دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت کفن کی مانند سفید ہو رہی تھی۔

”میں ان دونوں کو سنبھال لوں گا۔“ اس نے چیخ کر ڈان سے کہا ”تم اسمتھ کی خبر لو۔ اسے گولی لگی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے بھاگتے ہوئے ایک ڈاکو کا نشانہ باندھ کر گولی چلا دی اور ڈاکو کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا۔

دوسرے ڈاکو نے بھاگتے بھاگتے جھک کر اپنے ساتھی کے قریب پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا لیکن ایڈی اس سے پہلے ہی اسے اپنی زد میں لے چکا تھا۔ ڈان اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر اسمتھ کی جانب بھاگا، جو گشتی کار کی اسٹیرنگ سیٹ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بائیں ران پر خون کا ایک بڑا سا دھبہ تھا۔

”دو ڈاکو ایک نیلی سیڈان میں فرار ہو گئے ہیں۔“ وہ اپنا سر ڈرسا اٹھا کر بھاری آواز میں بولا ”کوسٹ ہائی دے سے شمال کی طرف..... میں نے فریک اور بٹلر کو ان کے تعاقب میں روانہ کر دیا ہے۔ میں..... میں نے ایمبولینس بھی طلب کر لی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔

وہ سڑک جو ایک منٹ پہلے دہشت ناک ویرانی میں ملفوف تھی، یکایک پُر شور ہو گئی۔ کار نمبر 3 جنوب سے نمودار ہوئی اور بینک کے سامنے پہنچتے ہی اس کے بائیں بڑی طرح چیخ اُٹھے۔ اس کے پیچھے ہائی وے پیٹرول کار آ کر رکی۔ بینک کے صدر جیمز فشر نے انتہائی رُجوش انداز میں ڈان سے مطالبہ کیا کہ وہ مفرد ڈاکوؤں کی گرفتاری کے سلسلے میں فوری کوئی اقدام کرے۔ ڈان نے اپنے جوانوں کی اب تک کی کارکردگی کا جائزہ لیتا آواز سے فریٹنگ اور بٹلر نے اپنی

ڈاکو اور پانی کے پستول والی حرکت یاد آ گئی۔ ”ڈاکو فرار نہیں ہو سکتے۔“ بالآخر اس نے کہا ”میں دس الکر کی شرط لگانے کو تیار ہوں، وہ اب تک گرفتار ہو چکے ہیں۔“ ہائی وے پیٹرول کار، بٹلر اور فریک کی مدد سے اسی وقت ہوا ہو گئی اور اس سے قبل کہ وہ ٹکڑ ٹکڑ پہنچتی، بٹلر کی آواز آئی پر ابھری ”کار نمبر 2..... ڈاکوؤں کی نیلی سیڈان 17 نمبر کوسٹ ہائی وے پر جا رہی ہے۔“

زخمی اسمتھ اور ہلاک ہونے والے ڈاکو کی لاش اب پولیس میں ڈال کر روانہ کر دی گئی۔ ڈان نے ایک نیا سگار ساگیا اور بینک کے صدر جیمز کے ساتھ بینک کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ کوئی اور کونسل ہوتی تو اتنے سارے معاملات میں ٹانگ اڑانے پر اس کی چھٹی کر دی جاتی لیکن وہ لوگ اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے تھے کہ اس نے ٹکڑ ٹکڑ پولیس کو بے حد موثر بنادیا تھا۔ سہ پہر کے تین بجے تک سارے شہر میں رپورٹر صاحبان چھا گئے۔ ڈاکوؤں کی وہ ٹولی..... ڈکن ٹولی کے نام سے مشہور تھی اور چھ ریاستوں کو عبور کر کے یہاں واردات کرنے آئی تھی۔ ایک مقامی اخبار کے رپورٹر ٹیل نے بے حد رُجوش لہجے میں ڈان کو مخاطب کیا ”ڈان، ہمارے پاس ایک دھماکا خیز خبر ہے۔ مقامی ناکارہ پولیس نے بدنام ترین ڈکن ٹولی کو دبوا دیا۔ کو، کیسی رہی؟“

ڈان نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی اور سگار کا ایک گہرا کش لے کر سوچا ”انہیں یہ خبر شائع کرنے دو۔“ اور اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔ ”ٹیل، بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ کاش کہ کیا ہوتا۔ لیکن اب میں جائے واردات پر پہنچا تو دو ڈاکو فٹ پاتھ پر بھاگ رہے تھے اور بقیہ دو کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے جا چکے تھے۔ حتیٰ کہ ایمبولینس بھی طلب کی جا چکی تھی۔ اگر تم میرے ملنا چاہتے ہو تو جاؤ، جا کر اسمتھ سے ملو۔ یہ کارنامہ اسی نے سرانجام دیا ہے اور اس کے عوض اس کی بائیں ٹانگ میں اعشاریہ چار پانچ کی گولی پیوست ہو گئی ہے۔“

☆☆☆

اگلے بدھ کی شام، کونسل کو اپنی آخری رپورٹ پیش کرنے اور ان کا فیصلہ سننے سے ایک گھنٹا قبل، سارجنٹ ہف نے اسے فون کیا ”کیا آپ اسی وقت آ سکتے ہیں؟“

جب وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ فریک اور بٹلر، فلن اور ایڈی پر پڑی جو ایک گوشے میں کھڑے تھے۔ اس نے نظریں گھما کر ہال کا جائزہ لیا۔ وہاں سب کے سب موجود تھے۔ حتیٰ کہ پچھلی پہرے کے گشتی سپاہی بھی

جن کی آنکھوں میں خند کا لہار تھا اور جو ہار ہار ہار ہاں رہے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ ان سے کچھ پوچھتا، بٹلر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مخاطب ہوا ”چیف..... ام..... ام سب کو آپ پر بے حد فخر ہے..... ہم نے..... آپ کے لیے ایک حقیر سا تحفہ خریدا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ڈان کو سبز رنگ کے کاغذ میں لپیٹا ہوا ایک پیکٹ دے دیا۔

ڈان نے پیکٹ کو ہلکے سے دبایا اور سمجھ گیا کہ اس میں سگار ہیں۔ اس نے مسکرا کر وہ پیکٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا اور کہا ”کل صبح میں پہلے اس پیکٹ کو ہم لیبارٹری کے ماہرین کے سپرد کر دوں گا۔ اس کے بعد ہی اسے کھولوں گا۔“

سب لوگ ہنس پڑے اور پھر سب نے فردا فردا آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ نو بجے اس نے تحفے میں ملنے والے کئی سگار اپنی جیب میں رکھے اور کونسل جیمز کا رُخ کیا۔ جیمز لوگوں سے کچھ بچا ہوا تھا۔ بیشتر چہرے اجنبی تھے لیکن چند ایک کو وہ پہچان گیا۔ کونسل کا چیئر مین، رپورٹ کے کاغذات اُلٹنے پلٹنے لگا اور اسی دوران ڈان نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔

چند ہی لمحوں کے بعد چیئر مین نے کونسل کی قرارداد پڑھ کر سنائی اور اسے یہ یقین کرنے میں پورا ایک منٹ لگ گیا کہ وہ لوگ اسے معاہدے کی پیشکش کر رہے تھے..... نعرۂ تحسین بلند ہونے لگے۔ ایسے میں کمشنر ہاربر، اس کی بغل میں آ بیٹھا ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم نے یہ سب کچھ کیسے کیا، ہاربر پر ایسے تمہارا شکر یہ۔“ ڈان بولا۔

”یہ تو بہت ہی آسان ثابت ہوا، ڈان!“ ہاربر نے جواب دیا ”تم نے اس شہر میں بے شمار دوست بنا لیے ہیں۔ میں نے صرف اتنا ہی کیا کہ انہیں یہاں مدعو کر کے تمہاری حمایت کرنے کو کہا۔ لہذا یہ لوگ آئے اور تمہاری زبردست حمایت کی۔ حتیٰ کہ فوربس بھی تمہارے خلاف ووٹ دینے کی جسارت نہ کر سکا۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ”لگتا ہے کہ لوگ اس وقت تک کسی پولیس آفسر کی سخت گیری کو نا پسند نہیں کرتے جب تک وہ دیانت دار اور فرض شناس نہ ہو۔“

”لیکن لیفٹیننٹ اسمتھ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”اس نے اسپتال سے فون کر کے تمہیں مبارک باد دی ہے۔“ ہاربر نے جواب دیا ”تم رپورٹروں کو بے وقوف بنا سکتے ہو لیکن اسمتھ کو نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اصل ہیرو کون ہے؟ وہ تم سے مزید تربیت لینا چاہتا ہے۔“

جون 2012

اسے شکست دینے کے لیے سمندر کی موجیں تھیں ، ہوائے تند کے تھپڑے تھے ، دھوپ کی تیزی تھی ، پیاس کی شدت تھی اور بھوک کی اذیت تھی مگر اس نے ہر ایک کو شکست دے دی ۔ یہ ثابت کر دکھایا کہ گر حوصلے کا ساتھ ہو تو کوئی بھی مشکل ، مشکل نہیں رہتی ۔

میراثہ کی تلاش

میراثہ نام اسٹیون کیلاہن ہے۔ میراجنم 1952ء میں نیویارک سٹی میں ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ میں نے فلسفے میں ماسٹر کیا لیکن میری دلچسپی کا محور و مرکز سمندر تھا۔ اسکول کے زمانے سے ہی مجھے یوٹ ڈیزائننگ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد میں سیلنگ کے شعبے سے وابستہ ہو گیا۔ 1975ء میں، میں نے سنگل ہینڈ ڈیجانی کشتیوں (Yacht) کے متعدد ڈیزائن تیار کیے۔ کشتی رانی سے متعلق میرے تحقیقی مضامین نیویارک سے نکلنے والے میگزین سیر اور سیلنگ میں شائع ہوئے اور مجھے نول آرکیٹیکٹ کے طور پر شہرت ملی۔ 1979ء میں میری شادی ہوئی جو ناکام ثابت ہوئی۔ دراصل میری بیوی کو میرے شوق سے چڑھی۔ انہی دنوں میں نے اخبارات میں یورپ سے امریکا تک سنگل ہینڈ یاکٹ ریس کے بارے میں پڑھا۔ بین الاقوامی یاکٹ بونین کے تحت ہونے والے اس مقابلے میں ایک فرد کی گنجائش والی چھوٹی کشتیاں حصہ لے سکتی تھیں۔ یہ ریس 1981ء کی گرمیوں میں منعقد ہونا تھی۔ میں اس سے پہلے شمال مغربی کینیڈا کے بریٹلے سمندروں میں کشتی رانی کے جوہر دکھا چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس ریس میں حصہ لینے سے نہ صرف یہ کہ مجھے ماضی کی تلخ یادوں سے بچھا چھڑانے میں مدد ملے گی بلکہ مجھے اپنی صلاحیتوں کے اعتبار کا بھی بھرپور موقع ملے گا۔ میرے پاس سفید رنگ کی نیپولین سولو (Napoleon Solo) نام کی ایک مضبوط کشتی پہلے سے موجود تھی۔ سنگل انجن والی اس کشتی کی لمبائی 6.5 میٹر درمیان سے چوڑائی چار میٹر اور وزن لگ بھگ 100 کلوگرام تھا۔ توازن برقرار رکھنے کے اس پر دو چھوٹے یاد بان نصب تھے۔ درمیانی حصے میں دو افراد کی گنجائش والا کیمین بنا ہوا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ کشتی کو میں نے خود ڈیزائن کیا تھا۔

تمام تیار یوں کے بعد میں جنوری 1981ء امریکی ریاست رینڈ آئی لینڈ کی بندرگاہ نیو پورٹ سے روا ہوا۔

☆☆☆

مئی 1981ء کی شروعات میں جنوبی انگلینڈ کی گاہ پلے ماؤتھ سے ریس کا آغاز ہوا۔ اس ریس میں درجن سے زیادہ کشتیاں شریک تھیں اور ان سب کی منزل جزائر غرب الہند (West Indies) میں واقع اینٹی گواڈا باربوڈا (Antigua & Barbuda) کے خوبصورت جزائر تھے۔ ریس کے پہلے مرحلے میں تمام کشتیوں کو شاہ بحر اوقیانوس میں واقع پرتگالی جزائر میڈیرا (Madeira) پہنچنا تھا۔ وہاں سب کشتیوں کی جانچ پڑتال ہوتی اور پھر مقابلے میں حصہ لینے کے اہل اپنی حتمی منزل اینٹی گواڈا کی طرف روانہ ہو جاتے۔ بد قسمتی سے ریس کا آغاز اچھا نہیں رہا۔ بسکے کے طوفانی سمندر نے ریس کو تھس نہیں کر دیا۔ قریب سب ہی کشتیاں سفر کے قابل نہ رہیں۔ منتظرین طرف سے ریس ملتوی ہونے کے بعد کچھ کشتیاں مرمت لیے فرانس اور کچھ اسپین روانہ ہو گئیں۔

میں نیپولین سولو کو لے کر اسپین پہنچا۔ میں نے وہاں ماہ کے طویل قیام کے دوران کشتی کی مرمت کی اور خوب سپاہ کیا۔ ہسپانوی ساحلوں پر دھوپ سینکتے ہوئے میں طے کیا کہ میں اپنی نامکمل ریس کو تین تہا پورا کروں گا۔ میں اپنے ایڈوکیٹر کی شروعات کے لیے شمالی بحر اوقیانوس میں وا کیٹارے (Canary) کے ہسپانوی جزائر کا انتخاب ضروری تیار یوں کے بعد میں جولائی کی شروعات میں اسے روانہ ہوا۔

یہ 29 جنوری 1982ء کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ میں نے کیٹارے کی حدود میں واقع ایل ہیرو (I Hierro)

جزیرے سے اپنے سمندری سفر کی شروعات کی۔ میں نے آئی کارن جنوب مغرب کی طرف رکھا اور اندھیرا ہونے سے پہلے بحر اوقیانوس کے کھلے سمندر میں رسائی حاصل کر لی۔ میں اپنے سفر کی پہلی رات میں بہت پرجوش تھا۔ جنوبی امریکا اور یورپ کے درمیان بین الاقوامی سمندری شاہراہ پر سفر کرنے کی وجہ سے فی الحال میں سمندر میں اکیلا نہیں تھا۔ تھوڑے فاصلے وقفے سے مجھے برازیل کی طرف سے آرہے ہوئے آئل ٹینکرز اور کنٹینرز شپ دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر کی منزل بحیرہ روم یا پھر فرانس اور برطانیہ تھے۔

چاروں طرف کا نظارہ کیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ سینکڑوں کلو میٹر کے وسیع علاقے میں میرے سوا اور کوئی ذی روح نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لیے میں بھول گیا کہ میں کون تھا؟ میں نے خود کو سمندری مخلوق تصور کیا اور خوشی سے گلا پھاڑ کر مختلف آوازیں نکالنے لگا۔ کچھ دیر کی جھج بکار کے بعد میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور ڈنر کے انتظام میں لگ گیا۔

تین فروری کی صبح میری کشتی 25 ڈگری شمال اور 26 ڈگری مغرب کے خط پر سفر کر رہی تھی۔ اس مقام سے قریب ترین سرزمین کیپ ورڈے کے پرتگالی جزائر 900



فہر ہری رات جہازوں کی رنگ پرنگی روشنیوں کے درمیان فرکنا رہا۔ صبح کے قریب میں نے کشتی کو آٹو پائلٹ پر سیٹ کیا اور گریڈ می کرنے کیمین میں چلا گیا۔ میں سارا دن گھومنے پھرنے لگا اور جب میری آنکھ کھلی تو دن ڈھل رہا تھا۔ میں نے کشتی کے ایک سے سورج غروب ہونے کا شاندار منظر دیکھا۔ میں نے اپنے پارٹس اور آلات کا جائزہ لیا۔ اس وقت میں خط 27 ڈگری شمال اور 20 ڈگری مغرب میں سفر کر رہا تھا۔ موسم خوشگوار تھا اور برازیل کی طرف چلنے والی تجارتی ہوائیں مہموری کشتی کو 2.7 ناٹ (5 کلو میٹر فی گھنٹہ) کی رفتار سے اگے بڑھنے میں مدد دے رہی تھیں۔ میں نے دور بین سے

کلو میٹر: 1100 اور میٹر: 1100 کلو میٹر مشرق میں واقع تھے۔ میری کشتی آٹھ سو کلو میٹر کے قریب فاصلے طے کر چکی تھی۔ اس کے تمام کل پرزے سبھی سلامت تھے اور وہ 3 ناٹ (5.5 کلو میٹر) کی رفتار سے جزائر غرب الہند کی طرف گامزن تھی۔ اس دن ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ریڈیو پر موسم کا حال سنا۔

”بحر اوقیانوس میں 25 ڈگری شمال اور 27 ڈگری مغرب کے خط پر سفر کرنے والے ہوشیار رہیں۔“۔ لڑہن ریڈیو کی نشریات میں ایک مخصوص علاقے میں اچانک بننے والے سائیکلون (Cyclone) سے خبردار کیا جا رہا تھا۔ میں

نے نقشہ سامنے رکھا اور طوفانی علاقے کا تعین کیا۔ میں نے پایا کہ سمندری طوفان خط سرطان پر 100 کلومیٹر کے دائرے کو گھیرے ہوئے تھا۔ ریڈیو کے مطابق طوفان کا نشانہ برازیل کا شمالی ساحل تھا۔ پریشانی یہ تھی میں طوفانی علاقے کی عین سرحد پر تھا۔ میں غرب الہند جانے کے لیے اپنی سمت تبدیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اگر میں شمال مغرب کی طرف سے ایک لمبا چکر کاٹ کر جنوب مغرب کی طرف جاتا تو میرا ایک ہفتہ ضائع ہو سکتا تھا۔ ایک راستہ یہ تھا کہ میں کشتی کا رخ جنوب میں کیپ ورڈے کے پرنگالی جزائر کی طرف موڑ دیتا اور موسم بہتر ہونے پر دوبارہ سفر کرتا۔ میں نے کچھ دیر تک موجودہ حالات پر غور کرنے کے بعد سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ بحراوقیانوس کے اس حصے میں درمیانے درجے کے سمندری طوفانوں کا جنم لینا ایک معمول تھا۔ حقیقت یہ تھی میں اس سے پہلے گرینڈ بینکس (Grand Banks) کے طوفانی سمندر کا مقابلہ کر چکا تھا۔ میں نے دو سال پہلے کینیڈا کے جزیرے نیوفاؤنڈ لینڈ کے جنوب میں واقع گرینڈ بینکس کے برقی طوفان کو اسی کشتی کے سہارے تنہا شکست دی تھی۔ مجھے اپنی کشتی پر بھروسہ تھا کہ وہ سمندر کے اس معتدل حصے سے بھی بغیر و خوبی نٹ لے گی۔ تاہم آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے بحراوقیانوس کے مزاج کو سمجھنے میں کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔

میں نے ریڈیو لے جا کر نیچے کیبن میں رکھا۔ واپس ڈیک پر پہنچا اور ہر کھلی چیز کو سینے لگا۔ بادبان نیچے گرایا، کشتی کی رفتار دہشت کی اور انجن کو آٹو پائلٹ پر سیٹ کر دیا۔ لائف رافٹ کو ڈیک پر موجود قابل رسائی جگہ پر رکھا۔ کسی بھی ایمر جنسی کی صورت میں لائف رافٹ میرا واحد سہارا تھی۔ اس کے سرے پر بندھی ڈوری کھینچنے سے اس میں آنا فانا ہوا بھر جاتی اور یہ پانچ فٹ قطر کی ایک گول کڑھائی نما کشتی میں تبدیل ہو جاتی۔ اپنے ضروری کاغذات کو دائرہ پروف تھلی میں رکھ کر کمر کے ساتھ باندھ لیا۔ خوراک اور دیگر ضروری سامان پر مشتمل ایمر جنسی کٹ اور لائف جیکٹ کو کیبن کے اندر مخصوص جگہ پر رکھا۔ اب میں طوفان کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سہ پہر ہوتے ہوئے سمندر کا مزاج برہم ہونے لگا۔ کالی سیاہ گھاؤں نے آسمان کو گھیر لیا اور ہوا کی رفتار تیز ہونے لگی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کل شام تک سمندر کے پرسکون حصے تک رسائی حاصل کر لوں گا۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے طوفان کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی اور میں اسے بھی اپنے ایڈ ونچر کا ایک حصہ ہی سمجھ رہا تھا۔ اگلے

ایک گھنٹے کے دوران طوفانی ہواؤں کی رفتار 60 کلومیٹر گھنٹہ تک پہنچ چکی تھی۔ لہروں کی اچھل پھل خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی۔ اس دوران تیز بارش بھی شروع ہو گئی۔ میں نے خود کو دائرہ پروف کیبن میں بند کر لیا۔ میں پائلٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور سامنے کے شیشے سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ فائبرس اور ہلکے لوہے سے بنی اس کشتی کا ڈیزائن کچھ اس تھا کہ اگر کیبن کو مکمل لاک کر دیا جاتا تو باہری حصے میں پانی بھرنے کے باوجود کشتی ڈوب نہیں سکتی تھی۔ کشتی کو خطرہ صر ایک بات سے تھا اور وہ تھے لہروں کے خطرناک پھیڑے۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ طوفان ایک حد سے ز خطرناک رخ اختیار نہیں کرے گا۔ اب دن ڈھل رہا تھا۔ طوفان کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ رات گھرنے بھی سمندر کا مزاج برہم ہی رہا۔ میں نے ایک سینڈوچ کر کھایا اور ریڈیو آن کر لیا۔ ٹربن ریڈیو ہر دس منٹ طوفان کی تازہ خبر نشر کر رہا تھا۔ میرا اندازہ سبکی تھا سمندر طوفان درمیانے درجے کا تھا اور ایک محدود علاقے پر تھا۔ ریڈیو کے مطابق بڑے بحری جہازوں اور فٹ ٹرا طوفان سے کوئی خاص خطرہ نہیں تھا، تاہم مانی کیروں چھوٹی کشتیوں خاص کر سیاحوں کو خبردار کیا جا رہا تھا کہ وہ یاٹ جلد از جلد خشکی کے قریب لے جائیں۔

میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے فریڈکسی کو میوزک چینل پر سیٹ کر دیا۔ آدھی رات تک صورت حال کی توں رہی۔ میں نے سونے سے پہلے کشتی کا جائزہ فیصلہ کیا اور کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ جہاں پا کے پھیڑوں اور چٹکھارٹی ہواؤں نے میرا استقبال کیا۔ خطرناک حد تک بلند لہریں کشتی کو اٹھا چک رہی۔ میں نے ڈیک کی ریلنگ پکڑ کر اپنا توازن قائم رکھا اور سری انداز میں ادھر ادھر گھوم پھر کر دیکھا۔ بدظاہر سب ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ میں نے خود کو سلی دی اور واپس کیبن چلا آیا۔ باہر کے مقابلے میں کیبن کے اندر کا ماحول قدر بہتر تھا، تاہم لہروں کے ٹکرانے کے باعث کشتی مسلسل رہی تھی اور اسے زبردست جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں پینل سے جڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور صورت حال کا تجزیہ کرنے میرا دماغ مسلسل کام کر رہا تھا۔ کیا میں نے ساحل کی طرف جا کر غلطی کی تھی؟ میں نے سر جھٹکا اور خود کو پرسکون رکھ کر کوشش کی۔ گرینڈ بینکس کے مقابلے میں یہ طوفان نہیں تھا، مجھے قوی امید تھی کہ کشتی کو کچھ نہیں ہوگا اور وہ کو جھیل جائے گی۔ میں نے سونے کا فیصلہ کیا با ریڈ

الہ دہلی میں بند کر کے ایمر جنسی کٹ میں رکھا اور اپنی لہروں میں گنگناٹے ہوئے بیڈ پر لیٹ گیا۔ بُری طرح الٹی کشتی میں نیند کا کوئی سوال نہیں تھا، لیکن میں پھر بھی اٹ پر کمرٹ بدلتا رہا۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ ہانگ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ میں اچھل کر بیڈ سے نیچے گر آیا۔ ابھی میں صورت حال کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ کیبن کے پچھلے حصے سے پانی کا سیلاب اٹھ پڑا۔ غالباً اس کا پینڈا پھٹ گیا تھا۔ میرے پاس سوچنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ کشتی ڈوب چکی تھی اور مجھے فوری طور پر باہر نکلنا تھا۔ میرے ضروری کاغذات اور کچھ رقم کمر سے بندھی بیٹ کے ساتھ محفوظ تھے۔ میں نے بدحواسی میں ایمر جنسی کٹ اور لائف جیکٹ کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ میرا توازن بگڑ گیا اور میں کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ کیبن میں جیسے بھونچال سا آگیا تھا۔ چندی لمحوں میں پانی میری کمر تک پہنچ گیا۔ میں نے ان کو چھوڑا اور کیبن کے دروازے کی طرف لپکا۔ اس ان پانی میں تیرتے خشک خوراک کے کچھ ٹن اور پانی کی بوتلیں تھیں۔ میں نے بدحواسی میں کچھ ٹن اور دو ہاتھ لے کر بیان میں شرٹ کے اندر ٹھونس لیں۔ میں کیبن کے اندر اٹھ کھول کر باہر نکلا۔ جہاں طوفان پوری شدت کے ساتھ لانا ہوا تھا۔ میں نے لپک کر لائف رافٹ اٹھا لی اور کھولنے کے لیے ڈوری کو کھینچا۔ میرے اندر خوف کی لہر سراپت کر گئی۔ ری کھینچنے کے باوجود رافٹ نہیں نکلا۔ میں نے بدحواس ہو کر رافٹ کو ادھر ادھر سے دھپایا۔ رافٹ نہ نکلی اور ایک جھٹکے سے ہوا رافٹ میں داخل ہو گئی۔ میں نے رافٹ سمندر میں اچھالی اور خود بھی اس کے پیچھے پانی میں کود گیا۔ پانی قدرے ٹھنڈا تھا۔ میں نے ہاتھ پیر مارے۔ لائف پر چڑھ گیا۔ ایک بلند لہر نے میری رافٹ کو کشتی کے دوری پر اچھال دیا۔ میں نے گریبان سے پانی کی بوتلی اور خوراک کے ٹن نکال کر رافٹ میں ڈھیر کر دیے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس قلیل سامان کے ساتھ میں چند دن بھی نہیں گزار سکتا تھا۔ مجھے ڈوبتی کشتی کا اندازہ کم از کم اپنی ایمر جنسی کٹ کو تو لائف رافٹ تک نہیں تھا۔ میں واپس سمندر میں کودا اور کشتی کی طرف بڑھا۔ لہروں میں تیرنا آسان نہیں تھا، سمندر پوری طرح بھرا ہوا اور اندھیرے میں کچھ واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہواؤں مارنا کشتی کے قریب پہنچا جو ایک رخ پر تھی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں کیبن کی طرف لپکا۔ کچھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وہاں کا

بچپن میں میری محنت خراب رہتی تھی چنانچہ والدین کو جہاں کسی "تجربہ ہدف" قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بوڑھیاں، ملایا مزار کی خبر ملی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کر دی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پے ہوں گے۔ مزارات پر حاضری دی ہوگی جتنی میں نے۔ آسیب سے نجات پانے کے لیے انار کے درختوں میں کسی کے لیے اتنے نقوش سلیمانی نہیں ٹھونکے گئے ہوں گے جتنے میرے لیے۔

اقتباس: خورشید احمد صدیقی
مرسلہ: نعمان صدیقی، لاہور

زیادہ حصہ پانی میں ادب پکا تھا کیبن کے اندر گھر اندھیرے میں بے شمار چیزیں میری نظر میں ان میں زیادہ تر میرے کام کی نہیں تھیں۔ کشتی کے الپ ریل پر چل جانے سے کیبن والی دیوار جہاں ایمر جنسی کٹ بندھی تھی، کشتی کا فرش بن چکی تھی۔ میں نے سانس پھینچی اور پانی میں غوطہ لگایا۔ میں سیدھا فرش کی طرف بڑھا۔ مجھے لائف جیکٹ تو نہ ملی البتہ ایمر جنسی کٹ قریب ہی ایک بک میں پھنسی مل گئی۔ میں نے کٹ کو دوپوچا اور پھرتی سے اوپر اٹھا۔ کشتی بُری طرح چمرائی اور اس کا پینڈا اوپر کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس دوران تیز جھٹکا لگا اور کیبن کا دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ میں نے لپک کر دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے جب کیبن کے دروازے نے کھلنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنا پورا زور لگا کر دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا، لیکن نتیجہ صفر رہا۔ میں بدحواس ہو گیا۔ مجھے لگا میری کہانی ختم ہو گئی۔ اب شاید میں کبھی باہر نہ نکل سکوں۔ میں جنوبی انداز میں دروازے پر زور آزمائی کرنے لگا۔ اچانک کشتی الٹ گئی اور پانی میرے سر سے اونچا ہو گیا۔ میں نے سانس روک لیا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے پیچھے ہندوؤں کا پورا زور لگاتے ہوئے دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا۔ میں بے دم ہو چکا تھا کہ ایک بڑی لہر کشتی سے ٹکرائی۔ زوردار جھٹکا لگا اور قدرت مجھ پر مہربان ہو گئی۔ کیبن کا دروازہ کھلا اور میں پانی کی اس قبر سے باہر نکل آیا۔ میں تیزی سے اوپر اٹھا اور تازہ ہوا محسوس کرتے ہی ایک گہری سانس لی۔ رافٹ کی طرف تیرتے

ہوئے گدے کا ایک کٹن مجھ سے ٹکرایا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کسی نہ کسی طرح لائف رافٹ تک پہنچ گیا۔ میں نے اپنی سانسیں درست کیں اور ڈوبتی کشتی کے ہیولے کو دیکھا۔ مجھے لگا جیسے میرے خواب ڈوب رہے ہوں۔ میں نے ایمر جنسی کٹ رافٹ پر رکھی اور سوچا کہ کیا میں ایک اور کوشش کر سکتا تھا؟ حالات میرے خلاف تھے لیکن زندہ رہنے کی امنگ مجھے کچھ کر دکھانے پر اکسارہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کچھ چیزیں کشتی کے قریب ہی تیر رہی ہوں گی۔ میں ایک بار پھر سمندر میں کودا۔ مجھے یاد ہے میں چار مرتبہ تیر کر کشتی تک گیا اور کچھ مزید سامان جمع کرنے میں کامیاب رہا۔ اس دوران چمکتی بجلی میں میری نظر سمندر کی سطح سے بلند ہوتے پانی کے فوارے پر پڑی۔ میں سمجھ گیا وہاں ایک بڑی دھیل تھی۔ فوری طور پر مجھے حادثے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اسی دھیل کے ٹکرانے کی وجہ سے میری کشتی کے پینڈے میں سوراخ ہوا تھا۔ میں نے طویل سانس لی اور کلائی پر بندھی واٹر پروف گھڑی میں دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ طوفان اب بھی پورے جوبن پر تھا۔ بارش مسلسل برس رہی تھی اور خطرناک حد تک بلند پُرشور لہروں لائف رافٹ کو کسی تینکے کی طرح اچھال رہیں تھیں۔ میری کشتی ڈوب چکی تھی اور میں لہروں کے رحم و کرم پر تھا۔ گوکہ میں سمندر کے معتدل حصے میں تھا لیکن بحراوقیانوس کی مکلی فضاؤں میں یہ ایک ٹھنڈی رات تھی۔ چنگھاڑتی ہوئی سرد ہوا اور ٹھنڈے پانی کی بو چھارے سے بچنے کے لیے میرے پاس کوئی ڈھال کوئی چھت نہیں تھی۔ میں نے کاشن کی پینٹ اور ہاف بازو کی شرٹ پہن رکھی تھی جبکہ جوتا پہننے کا موقع مجھے نہیں مل سکا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے گدے کا گیلیا کٹن کھول کر اسے سلیپنگ بیک کی شکل دی اور اس میں گھس گیا۔ میں مکمل طور پر بیجا ہوا تھا اور رافٹ کے ایک کونے میں دبکا سردی سے کانپ رہا تھا۔ رافٹ کو زبردست جھکے لگ رہے تھے اور میرے لیے کسی ایک جگہ ٹکا رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ میرا دماغ مجھے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک شاندار میر کا ایسا بھیانک انجام میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں نے رافٹ کے دونوں کناروں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ادھر ادھر بکھرے سامان کو ایک کونے میں سمیٹا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھٹاؤپ اندھیرے میں ڈوبے اٹھل پھٹل سمندر کو دیکھنے لگا۔ میں بال بال طوفان قہقہے کی دعا کے سوا اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

☆☆☆

دور مشرقی افریقہ پر سرسئی سفیدی چھانے لگی تھی۔ یہ فردری کی چار تاریخ تھی اور لائف رافٹ میں میرے پہلے دن کی شروعات ہو رہی تھی۔ مجھے یہ محسوس کر کے سکون ملا کہ طوفان کی شدت میں بتدریج کمی ہو رہی تھی۔ بارش کا زور ٹوٹ رہا تھا اور آسمان پر تے گہرے سرسئی بادلوں کا گھبرا کزور پڑتا دکھائی دینے لگا تھا۔ قریب دو گھنٹے بعد بارش ہلکی بوند باندی میں تبدیل ہو گئی۔ اس وقت دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ سمندر کو کسی حد تک قرار آیا تو میں موجودہ حالات پر غور کیا۔ میری حالت خراب تھی اور جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ موٹے ریڈ سے بنی میری لائف رافٹ محفوظ لیکن مکمل طور پر لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔ میں رافٹ اپنی مرضی سے کنٹرول نہیں کر سکتا تھا اور قسمت کے بھروسے تھا۔ میری پریشانی کی اصل وجہ خوراک تھی۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ میں کتنے عرصے کھلے سمندر میں رہتا۔ یہ مدد ایک دن بھی ہو سکتی تھی اور ایک ماہ بھی..... میں نے رافٹ میں بکھرے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ میرے پاس دو لیٹر وا پانی کی پانچ بوتلیں اور آدھا کلو گرام والے خشک خوراک کے چھ ٹن تھے۔ خوراک کو کتنی جلد سے استعمال کیا جاتا تو وہ دو تک چل سکتی تھی لیکن گرم مرطوب موسم میں پانی کے مو۔ ذخیرے کے ساتھ ایک ہفتے سے زیادہ ٹکا لانا محال دکھائی د رہا تھا۔ میری ایمر جنسی کٹ میں مزید کچھ چیزیں محفوظ تھیں جن میں ریڈیو، واٹر پروف ٹارچ اور سمندر کے کھارے کو پروسس کر کے قابل استعمال بنانے والی چار سولر (Solar Stills) نمایاں تھیں۔ کرشل اور پلاسٹک بنی چھ انچ قطر کی پیالہ نما اسٹیلز کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا کہ ایک مخصوص طریقہ اختیار کرنے کے بعد یہ سورج کی روشنی سے اپنے اندر محفوظ پانی کو تین سے چار گھنٹوں میں اپنے قابل بنادیتی تھیں۔ ہر ایک اسٹیلز ایک وقت میں ایک پانی کو پروسس کر کے چوتھائی لیٹر سے کچھ کم پانی تازہ کر کے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ پرانے ماڈل کی سولر اسٹیلز تھیں جنہیں دوسری جنگ عظیم کے دوران مصیبت میں پائلس کی مدد کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس میں میرے لیے سولر اسٹیلز کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی اور بد قسمتی یہ تھی کہ مجھے انہیں استعمال کرنے کا صحیح طریقہ معلوم نہیں تھا۔ تاہم وہ جو کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ہے۔ سو اب مجھے انہیں استعمال کرنے کا طریقہ کم تھا۔ میرے پاس چند اور چھوٹی موٹی چیزیں بھی تھیں جن بحراوقیانوس کا نقشہ، کلائی پر بندھی واٹر پروف

رافٹ لمبی ایک چھتری، سمندر میں بچے رہنے سے مل میرے پسندیدہ مصنف کی کتاب اور ایک پینسل آئی گی۔

میں اپنے موجودہ مقام کے بارے میں کوئی حتمی رائے دے نہیں کر سکتا تھا، تاہم میرا اندازہ تھا کہ میں شمالی اٹلانٹک میں 24 ڈگری شمال اور 28 ڈگری مغرب کے پاس تیر رہا تھا۔ یوں میں کیپ ورڈے اور افریقا کی ساحلی پٹی سے قریب بارہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر کیپ ورڈے میرے جنوب اور افریقا مشرق میں تھا۔ اندازہ لگایا کہ میری رافٹ مغربی تجارتی ہواؤں کے اثر کی طرف تیر رہی تھی۔ اگر میری یہ رفتار برقرار رہتی تو کم از کم تین ماہ سے پہلے جزائر غرب الہند نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت پر مبنی ایک خوفناک اندازہ تھا۔ افریقا میرے سامنے تھا لیکن میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں چھو کر استعمال کر کے واپس مشرق کی طرف پلٹ جاتا۔ یہ حال میں میرے لیے امید کی واحد کرن کسی تجارتی یا بحری جہاز کی جھلک تھی۔ میں ایک ایسے علاقے میں تھا کا شمار ہوا تھا جو یورپ، جنوبی امریکا اور جزائر غرب وسط درمیان بین الاقوامی سمندری راستوں کا جکشن تھا۔ اس کا امکان موجود تھا کہ مجھے کوئی نہ کوئی بحری جہاز ملتا رہے جائے گا۔ اس کے علاوہ مدد کی ایک اور صورت یہ تھی کہ کسی طرح خشکی پر میرے حادثے کی خبر پہنچ جاتی۔ میں امریکی ٹکٹ سے ریڈیو باہر نکالا اور اس کی فریکوئنسی کو اسکلز پر ایڈجسٹ کرنے لگا۔ میں نے مختلف چینلوں اور اپنے حادثے کا مقام بتاتے ہوئے مدد طلب میں بار بار اپنی لوکیشن سے متعلق الفاظ دہرائے۔ میں امید پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ کسی بحری جہاز یا پھر کنٹرول لے میری مدد کی پکار کو سنا ہو۔ میں نے بیٹری بجانے کی کوشش کی۔ ایک بار ٹارچ کا بٹن دبا کر دیکھا وہ ٹھیک ٹھاکہ نہیں چلتی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مجھے الٹا ملنے تک ٹھانیں مارتے سمندر کے سوا اور کچھ نہ ملتا۔

میں نے قریب بارش رک گئی اور بادل چھٹتے دکھائی دیے۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور بوتل منہ سے لگا کر پانی حلق سے اتارا۔ پانی معدے میں جاتے ہی احساس ہوا۔ میں نے ٹن سے خشک گوشت کا ٹکڑا اسے منہ میں رکھ کر دیر دیر سے چبانے

لگا۔ بے دھیانی میں میرا ہاتھ دوسرے قتلے کی طرف بڑھا، لیکن بھوکا ہونے کے باوجود میں نے خود کو مزید قتلے کھانے سے روک دیا۔ میں معمولی سی عیاشی کا بھی تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے صورتحال بہتر ہونے تک صرف زندہ رہنے کے لیے ہی کھانا تھا۔ درجہ حرارت بڑھتا ہوا محسوس ہوا تو میں سب کچھ بھول بھال کر سولر اسٹیلز کو قابل استعمال بنانے میں جٹ گیا۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ سورج کی گرمی سے کھارے پانی میں موجود نمک اُڑ جاتا ہے۔ لیکن سولر اسٹیلز پر یہ گرمی کس طرح اثر انداز ہوتی ہے یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے سمندر میں بچے رہنے سے متعلق کتاب کھولی اور اس کے درجہ حرارت کے بارے میں لکھا۔ ایک صفحے پر مختلف ڈیزائن کی سولر اسٹیلز کی تصاویر دکھائی دیں۔ بد قسمتی سے وہ سب بے مال کی اسٹیلز تھیں۔ وہاں آدھی صدی پہلے استعمال ہونے والی کسی اسٹیلز کی تصویر نہیں تھی جسے ایک کر میں کچھ سمجھ پاتا۔ بہر حال میں نے کافی دیر تک اسٹیلز سے متعلق باب کا مطالعہ کیا اور پھر اپنی چاروں اسٹیلز کو کھارے پانی سے بھر دیا۔ ایک ڈوری اور بک سے پھیڑ جھاڑ کی اور انہیں محلی جگہ پر رکھ دیا۔ اب میرے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ مجھے بچپن میں سنی وہ کہانیاں یاد آ رہی تھیں جن میں حادثے کا شکار ہوا انسان اچانک کسی حسین جزیرے پر پہنچ جاتا ہے۔ میں بھی خود کو ایسی ہی کسی کہانی کا کردار محسوس کر رہا تھا۔ تاہم میں اندر سے خوف زدہ تھا۔ میری نظروں کے سامنے نیویارک کی بندرگاہ میں آویزاں گم شدہ مائی کیروں کی وہ فہرستیں بھی گھوم رہی تھیں جن پر درج سیکڑوں نام بحراوقیانوس کی وسعت میں کہیں کھو گئے تھے۔ میں نے سر جھٹک کر مجھے خیالات کو دور بھگایا اور سولر اسٹیلز کا جائزہ لیا۔ میں نے پانی کا ذائقہ چکھا۔ وہ تاحال کھارا تھا۔ میں سارا دن سولر اسٹیلز سے اُبلے ہوئے پانی کو پینا رہا۔ استعمال کرنے کا طریقہ دریافت نہ کر پایا۔ مجھے خود پر فہمہ آنے لگا۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کسی ملاح کے لیے سولر اسٹیلز کا استعمال سیکھنا کس قدر اہمیت کا حامل تھا۔

سہ پہر کے وقت اچھی خاصی گرمی محسوس ہونے لگی، تاہم میں نے شدید پیاس کے باوجود چند گھونٹ سے زیادہ پانی نہیں پیا۔ سورج غروب ہوتے ہوتے موسم نے نئی انگڑائی لی اور درجہ حرارت تیزی سے گرنے لگا۔ حادثے کے بعد کھلے آسمان تلے سمندر میں یہ میری دوسری رات تھی۔ میں نے گوشت کا ایک قسطا کھایا، دو گھونٹ پانی پیا اور رات گزارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں

دور تھی اور دماغ اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ سمندر میں سکون کی تلاش مجھے موت کی دہلیز تک لے آئی تھی۔ میں نے وقت گزاری کے لیے ڈوگل روڈسٹ سن کی کتاب اٹھائی اور اس کے ایک خالی صفحے پر پینسل سے اپنی وصیت لکھی۔

”میرا نام اسٹیون کیلاہن ہے۔ شمالی بحر اوقیانوس میں میری کشتی حادثے کا شکار ہوئی ہے اور میں چھ لوگوں کے لیے نئی ایک لائف رافت میں لہروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں کب تک سمندر سے مقابلہ کر پاؤں گا۔ میں اپنی مٹی پاپا سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ان سے بہت پیار کرتا ہوں۔“

پوری رات سردی سے کپکپاتے سوتے جاگتے گزر گئی۔ کبھی اچانک آنکھ کھل جاتی تو میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بحری جہاز دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اس رات خواب میں بھی میں نے اپنے قریب سے گزرتے ایک بہت بڑے بحری جہاز کو دیکھا۔

بحر اوقیانوس میں لائف رافت پر میرے دوسرے دن کی شروعات ہو رہی تھی۔ میں سورج طلوع ہونے کے بعد بھی رافت کے کنارے کو تکیہ بنائے دیر تک لیٹا رہا۔ دراصل میں ناشتے کا وقت گزرا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ دن اچھا خاصا نکل آئے تو میں بجائے ناشتے کی عیاشی کے تھوڑا بہت کھانا کھاؤں۔ میری نظریں سمندر میں دور دور تک بھٹک رہی تھیں۔ میرے چاروں طرف سیاہی مائل نیلگوں پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ چند گھنٹے مزید گزر گئے۔ اسی دوران مجھے البڑوس کا ایک غول دکھائی دیا۔ پرندے ہوا میں تیرتے میری لائف رافت کے قریب آ گئے۔ وہ کھانا ملنے کی آس میں کچھ دیر تک میرے اوپر ہوا بازی کرتے رہے اور پھر جنوب کی طرف پرواز کر گئے۔ پرندے دکھائی دینے پر ایک فوری خیال میرے دماغ میں آیا۔ میں ایک اچھا تیراک تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو اپنے کھانے کے لیے پھلی یا پھر کیکڑا وغیرہ پکڑ سکتا تھا۔ اس طرح میرے پاس موجود خوراک کی بچت ممکن تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سطح سمندر کو غور سے دیکھنے لگا۔ کیوں نہ پہلی کوشش ابھی اور اسی وقت کی جائے۔ اس وقت آسمان صاف اور سمندر پرسکون تھا۔ میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا اور لکڑی کی چار فٹ لمبی اسٹک اٹھالی۔ میں نے اس کے ایک سرے کو دانٹوں سے کتر کر چٹکھا کیا اور سمندر میں کود گیا۔ میں اپنے گزارے لائق نیزے کو سنبھالے رافت کے ارد گرد تیرتا رہا لیکن مجھے کھانے کے قابل کوئی سمندری مخلوق دکھائی نہیں دی۔ شاید مچھلیاں زیادہ گہرائی میں تھیں اور جہاں تک غوطہ لگانا خطرناک تھا۔ میں واپس رافت پر آ گیا۔

نے گوشت کا ایک قسطا کھایا اور سورسٹلس سے جوں جوں سورج اوپر اٹھتا رہا، موسم گرم اور جس زدہ چلا گیا۔ میں خود کو مصروف رکھے ہوئے تھا لیکن میرا حلق سوج کر کاٹا ہو گیا تھا اور مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ میں ہاتھ بڑھا کر سمندری پانی کو پھیلی پر لیا اور منہ میں ڈال لیا پانی بے حد کھارہا تھا۔ میں نے اسے نگلنے کی بجائے کچھ دیر تک منہ میں رکھا اور پھر کلی کر دی۔ ایسا میں نے کئی بار کیا۔ پیاس کیا بجھتی تھی اُنکا میرا منہ کڑوا کیلا ہو گیا۔ میں اس بھی سورسٹلس کو قابل استعمال بنانے کا طریقہ نہ ڈھونڈ پا رہا تھا۔

شام کے قریب میں نے بوتل کو منہ سے لگایا اور پانی کے گھونٹ حلق سے اُتارے۔ تھوڑا سا کھانا کھایا اور سستا کے لیے لیٹ گیا۔

جب تک میرے پاس قابل استعمال پانی اور خوراک رہی حالات ایک جیسے رہے۔ یہ کھلے سمندر میں بے یار و مددگار تیرتے ہوئے میرا ساتواں دن تھا اور مجھے اب تک بحری جہاز کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ موسم کے مزاج نے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری لائف رافت خطہ سلطان کے آس پاس تھی اور مسلسل مغرب کی طرف تیر رہی تھی۔ سمندر کے آگے جسے میں دن کے وقت مری اور رات میں اچھی خاصی غور ہو جایا کرتی تھی۔ میں دن کے بیشتر حصے میں اپنی شرٹ کو کی طرح لپیٹے رہتا اور رات ہونے پر مکمل کپڑے پہن لیتا۔ گدے کا کٹن میرے لیے ناکافی ثابت ہو رہا تھا اس لیے میں نے سردی سے بچنے کے لیے پلاسٹک سے بنی ایمر کٹ کو پھاڑ کر ایک کام چلاؤ جیکٹ تیار کر لی تھی۔ یہ جبکہ رات کے وقت میرے اوپری جسم کو کسی حد تک حرارت کرتی تھی۔

سفر کے آٹھویں دن میرے پاس خشک جھینگے کے دو ٹکڑے اور قریب ڈیڑھ لیٹر پانی ہی باقی بچا تھا۔ بھوک، پیاس، جھارے اور میں اپنے مستقبل کو لے کر خوف زدہ تھا۔ میرے ہونٹ خشک تھے اور حلق میں کانٹے چھب رہے تھے۔ یہ بد قسمتی تھی کہ میرے چاروں طرف اریوں کیلین پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جسے میں صرف چھوٹی چھوٹی مچھلی چھندوں کے دوران صرف ایک رات معمولی بوند باندی ہوئی تھی۔ تاہم اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں اپنی خالی بوتلیں بھر پاتا۔ میں ہر دو گدے کے لیے ریڈیو پر مختلف چھندو آزماتا۔ بول بول کر میرا درد کرنے لگتا لیکن مجھے کہیں سے کوئی رد عمل سنائی نہ دیتا۔ لگ رہا تھا جیسے دنیاؤب بھٹکی تھی اور میں بلا کہوں کلیم پھر

سمندر میں تیرتا واحد زندہ انسان تھا۔ ایک بے رحم کا احسا

لی شدت کے ساتھ مجھ پر حاوی تھا۔ میں نے اپنی مٹی بھر لے کر دیکھا اور سوچا کہ میں اس خوراک کے سہارے زیادہ دن زیادہ دو یا پھر تین دن ہی مزید نکال سکتا تھا۔ اب میری امیدیں سورسٹلس کے قابل استعمال ہونے سے ہٹ چکی تھیں۔ اتنا تو میں جان گیا تھا کہ سورسٹلس ناکارہ ہرگز نہیں تھیں، البتہ میں انہیں قابل استعمال بنانے کے طریقے تلاش کر رہا تھا۔ میں نے ایک اسٹلس کو ہاتھ میں لیا اور اسے ہلٹ کر دیکھا۔ میں نے دماغ ٹھنڈا رکھتے ہوئے سوچنا شروع کر دیا کہ آخر میں غلطی کہاں کر رہا تھا؟ بہت سوچ سمجھ کر میں نے ایک تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہ جاننے کے لیے کہ سورسٹلس میں پینے کے لائق مینھا پانی کیسے پیدا ہوتا ہے؟ چار میں سے تین اسٹلس کی چیر بھاڑ کا فیصلہ کیا۔ جی ہاں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بنا سوچے مجھے بار بار ایک عمل اہرانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے اسٹلس کو کھول کر ان کے ایک ایک پرزے کی بناوٹ پر غور کرنا تھا۔ شاید اس طریقے سے میں جان پاتا کہ اسٹلس کو کیسے قابل عمل بنایا جاتا تھا؟ گو کہ اس تجربے سے میں تین اسٹلس سے ہاتھ دھو لیا لیکن کامیابی کی صورت میں میری واحد کارآمد اسٹلس شروع کر دیتی۔ میں ایک طرح سے جوا کھیل رہا تھا۔

مجھے زندگی کے قریبے جاتی اور ہار موت کے منہ میں۔ پہلی سورسٹلس کے ایک ایک پرزے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے حاصل نتیجہ کو دوسری اسٹلس پر آزمایا، لیکن وہ پانی پیدا نہ ہوا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر دوسری اسٹلس کو کھولا اور زیادہ بار یک جہتی سے پرزوں کی بناوٹ پر غور کیا۔ قریب دو گھنٹے تک ہر ہر پرزے کی الگ الگ چھان بین کی۔ اس وقت تک دوپہر ہو چکی تھی پیاس سے میرا برا حال تھا۔ میں نے پانی کی آخری بوتل کو منہ سے لگایا اور دو گھنٹے بھرے۔ کچھ دیر مزید اسٹلس کے پرزوں کا جائزہ لیا۔ ایک طویل سانس لے کر تیسری اسٹلس کو اٹھالیا۔ میں نے ایک حاصل شدہ تجربے کی بنیاد پر ایک مخصوص طریقہ اپنا کر دیا۔ میں نے اسٹلس کو کھارے پانی سے بھر اور اسے ایک طرف کے فرش پر رکھ دیا۔ میں نے چوتھی اسٹلس میں پانی ڈالا۔ وقت قدرے مختلف طریقہ اپنایا۔ میں خشکی لگائے اس کے اوپری حصے میں بے گدے کو دیکھنے لگا، جہاں سے لہر پانی ایک جالی دار کپڑے میں سے ہوتا ہوا نیچے گرا رہا تھا۔ قریب دو گھنٹے بعد میں نے ایک اسٹلس کو کھول کر اس میں جمع چند چچ پانی چمکا۔ خوشی سے میری آنکھیں پانی پینے کے قابل تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو

گھسٹا۔ مجھے سرگزشت

بہہ نکلے۔ سچ یہ ہے کہ اس خوفناک حادثے سے پہلے میں مذہب کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں آخری بار چرچ کب گیا تھا؟ تاہم موت اور زندگی کے اس کھیل میں، میں نے پہلی بار خدا کو اپنے وجود سے قریب تر محسوس کیا۔ خدا کی مرضی تھی کہ میں زندہ رہوں۔ اب مجھے اپنا حوصلہ جواں رکھتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس دن شام کے وقت میں نے دونوں سورسٹلس میں جمع شدہ آدھے کپ جتنا تازہ پانی حاصل کیا۔ پانی مکمل مینھا نہیں تھا، تاہم اس میں سے بیشتر نمکیات اُڑ چکے تھے اور وہ پینے کے قابل تھا۔ پیاس بجھنے کے بعد میں نے ایک نئی اسٹنگ کے ساتھ سطح سمندر کو دیکھا۔ اب میرے پاس پینے کے لیے پانی موجود تھا۔ خالی معدے میں پانی جاتے ہی مجھے شدت سے بھوک محسوس ہوئی۔ میں نے جھینگے کا ٹن کھول کر چند لقمے لیے۔ اس دن بھی لائف رافت کے قریب تیرتے ہوئے میں نے پھلی پکڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

آنے والے دنوں میں حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ میرے پاس جمع شدہ خوراک ختم ہو گئی۔ میں ایک پھلی بھی شکار نہیں کر پایا اور بھوک سے بے حال ہو گیا۔ میری پسلیاں نکل آئیں، پیٹ کمر سے لگ گیا اور آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ بھوک کی وجہ سے کمزوری اس قدر تھی کہ مجھے دونوں سورسٹلس میں پانی جمع کرنا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ یہ لائف رافت پر میرے سفر کا پندرہواں دن تھا۔ میں سارا دن کسی معجزے کے انتظار میں بے بس پڑا رہا۔ سہ پہر کے قریب بادل چھا گئے اور کچھ ہی دیر میں بوند باندی شروع ہو گئی۔ میں نے لینے لینے منہ کھول کر چند بوندیں ملنے میں اتاریں اور ادھر ادھر دیکھا۔ اچانک مجھے رخ کے قریب میری رنگ برنگی ٹریڈ مارک (logooiln) کا ٹول دکھائی دیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی ہڈی مٹی خالق مٹی کی اور سمندر میں کود گیا۔ قسمت نے میرا ساتھ دیا اور میں ایک گھنٹے کی تھکا دینے والی حیراکی کے بعد دو چھوٹی مچھلیاں ڈکار کر لے میں کامیاب رہا۔ میں نے پھلی کا پیٹ صاف کیا۔ اس کے ٹکڑے کیے اور کچے گوشت کے ایک قسطے کو خوب چبانے کے بعد نگل گیا۔ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پوری پھلی چبا کر کھائی اور کسی حد تک توانائی محسوس کی۔ میں نے دوسری پھلی کے قسطے کاٹ کر اسے محفوظ کر لیا۔ قدرت نے پینے کے ساتھ ساتھ میرے کھانے کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ اب اگر میری لائف رافت ساتھ دیتی تو میں کچھ دن مزید زندہ رہ سکتا تھا۔ چیت بھرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا

ماہنامہ سرگزشت

اسی قسم کی چیزیں ہی لگیں۔ میں نے اپنی نارنج کو کارآمد بنانے کی بھی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس میں زندگی کی کوئی رقم پیدا نہیں ہوئی۔

نارنج کے وسط میں، میری لائف رافٹ سمندر کے استوائی حصے میں داخل ہوئی۔ گرم مرطوب موسم اپنا اثر دکھانے لگا۔ میں ہر وقت پسینے میں شرابور رہنے لگا جس سے میرے اندر پانی کی طلب کی گنا بڑھ گئی۔ مجھے ہر لمحہ یہ احساس ہوتا جیسے میں اُچلتے ہوئے کھارے پانی کے کڑا ہے میں سفر کر رہا تھا۔ گرم مرطوب موسم میں نمی زیادہ ہونے کی وجہ سے پسینا زیادہ آتا ہے اور یہاں ایک آدمی کو چاق و چوبند رہنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کے دوران کم از کم سات سے دس لیٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موسم میں بنا کھائے دو ہفتے تک زندہ رہا جاسکتا ہے لیکن بغیر پانی کے دو دن بھی نہیں۔ تاہم صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میں ان حالات میں اپنی اکلوتی سولر اسٹولس کے ذریعے ایک دن میں صرف آدھ لیٹر کے قریب تازہ پانی ہی حاصل کر پا رہا تھا۔ لگ بھگ ہر دو دو پہر کے شدید جس کے بعد پہلے نماشا ہو رہا تھا کہ جنوب کی طرف سے اٹنی سرمئی گھٹائی آسمان پر چھا جاتیں۔ میں پیاس سے بڑھ چلا امید بھری نظروں سے آسمان کو تکتا رہتا۔ بادل خوب زور و شور سے گرتے لیکن سوائے ہلکی بوند باندی کے کچھ نہیں ہوتا۔ گہرے بادل برسنے سے پہلے ہی منتشر ہو جاتے اور میری امیدیں دم توڑ جاتیں۔ آسمان سے گرتی ایک ایک بوند میرے لیے امرت دھارا سے کم نہیں تھی۔ میری واحد سولر اسٹولس پینے کے لائق پانی تیار نہیں کر پا رہی تھی۔ میں اسٹولس میں پانی بھر کر پھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہتا۔ یہ سمندر میں میری کڑی آزمائش کے دن تھے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی مجھ سے کہتا کہ پانی کی ایک بوند کے بدلے اپنا ہاتھ دے دو تو میں بتا سوچے سمجھے اپنا ہاتھ کاٹ کر دے دیتا۔ اس دوران میں بحری جہازوں کی جھلک پانے کے لیے مسلسل ارد گرد نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں راتوں کو بھی کم سو رہا تھا۔ جب آنکھ کھلتی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑا دھرا دھرا دیکھنا شروع کر دیتا۔ نیند کی کمی سے میں چڑچڑا ہو گیا تھا اور مجھ پر تھکاوٹ غالب رہنے لگی تھی۔ میرے لیے ہر صبح کا سورج امید کی نئی روشنی لے کر طلوع ہوتا اور پھر جیسے جیسے دن ڈھلتا مایوسی مجھ پر حاوی ہوتی جاتی۔

نارنج کے تیسرے عشرے کے دوران میرے اعصاب کی کڑی آزمائش شروع ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ لگاتار

پانچ دن تک کوئی بھی دن ایسا نہ گزرا جب مجھے مختلف سمتوں میں جاتے کسی بحری جہاز کی جھلک دکھائی نہ دی ہو۔ میری نیندیں حرام ہو گئیں۔ بحری جہازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی میری ہر کوشش ناکام رہی۔ حیرت انگیز طور پر پیشہ بحری جہاز مجھے دن میں دکھائی دے لیکن ان میں سے کوئی میرے لیے نہ رکا۔ میں وسیع و عریض سمندر میں اپنی قسمت ماتم کرتا رہا۔ لائف رافٹ پر 48 ویں دن میں نے ایک کھانے کے وقفے سے دو بحری جہاز دیکھے۔ پہلی جہاز ایک کشتی اور وہ اپنے راستے پر چلتے رہے۔ وہ پہلا موقع تھا جب میرا زور و تقارر دیا۔ مجھے اپنی زندگی پوری طرح سے خطروں میں گھری اور خالی خالی سی دکھائی دی۔ ایک کڑوا سچ اب میرے سامنے تھا۔ بحری جہازوں کا رکنا محال دکھائی دے رہا تھا۔ اب میرے بچنے کی واحد امید کسی جزیرے تک رسائی تھی۔ تو اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہوا میں میری رافٹ کو مغرب کی طرف دھکیل دیں گے۔ میں نے اپنی رفتار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندازہ لگایا کہ اگر میں فی دن تیس کلومیٹر کی رفتار سے تیرتا رہا تو پھر اب تک پندرہ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری رافٹ خط سرطان پر 45 ڈگری مغرب کے آس پاس تھی۔ اگر میری موجودہ رفتار برقرار رہتی تو مجھے جزائر غرب الہند تک رسائی کے لیے ایک سے ڈیڑھ ماہ درکار تھا۔ جبکہ میری حالت یہ تھی کہ میں گزرتے لمحے خود کو موت سے قریب ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ میں اس سے زیادہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے پاس محفوظ شمائی بجراقیاتوں کے نقشے کو سامنے رکھا اور غرب الہند سے پہلے سے جزائر تلاش کرنے لگا۔ یہ خود کو تسلی دینے والی بات تھی۔ میں نقشہ دیکھے بغیر بھی بتا سکتا تھا کہ وہاں ہزار کلومیٹر کے وسیع دائرے میں سوائے خالی سمندر کے کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ کی ناامیدی سے غم گمانی زیادہ بہتر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میرے قریب و جوار بہت ہی چھوٹے کچھ ایسے جزائر ہوں جنہیں اب دریافت نہ کیا جاسکا ہو۔

نارنج کے آخری ایام میں بارشوں کے ایک سلسلے نے مجھے سہارا دیا۔ اب میرے پاس ہر وقت کم از کم آدمی کی تازہ پانی محفوظ رہنے لگا۔ تاہم ایک مصیبت کم ہوئی تو دوسری اٹھانے لگی۔ برساتی موسم میں پھیلیاں زیادہ گہرائی میں گئیں اور میری شکار کی اوسط کم ہونے لگی۔ میں ہمت کر پانی میں اُترتا لیکن زیادہ تر میرے ہاتھ خالی ہی رہتے۔ دوران میں لائف رافٹ پر موجود چھپائے ہوئے آلات ہر چیز کا

میری پینٹ کی چڑے سے نئی بیلٹ اور اپنے پسندیدہ صف کی کتاب کا دو تہائی حصہ میرے پیٹ میں تھا۔ کٹری پند کٹری، امیر جنسی کٹ کا کچھ حصہ اور دونوں ناکارہ ہارٹلس کے پرزے میری خوراک بن چکے تھے لیکن بھوک کی گنتی ہی نہیں تھی۔ غیر متوازن غذا کھانے سے میری طبیعت کی ڈور تو بندھی رہی لیکن معدہ خراب رہنے لگا۔ مجھے ہر لمحہ ہلکی، چکر اور سر درد کی شکایت رہنے لگی۔ میں اپنا کئی کلو ام وزن کھو چکا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں سوکھ کر کاٹا ہوا رہے تھے۔ ناخن، سر اور داڑھی کے بال بڑھ چکے تھے۔ ہمارنگ کھارے پانی کی مار سہ سہ کر پھیلا زرد ہو چکا تھا۔ ہمارنگ تھا اور خود کو ایک کمزور بوڑھے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ بھوک نے مجھے بے صبر بنا دیا تھا۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ اپنی خود کو بھی نوچ کھاؤں۔ ایک دن نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنے ہاتھوں کے بوڑھے ناخن اور اس کے گرد پھولا گوشت کتر ڈالا۔ ایک ہاتھ کے ناخن کھانے کے بعد میں نے وہیں نظروں سے دوسرے ہاتھ کو دیکھا، لیکن فوراً ہی رک گیا۔ اتنی بھی بے صبری ٹھیک نہیں تھی۔ اپنا ہاتھ تھا، کہیں بھاگا اگلے جا رہا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کے ناخن کو کل سے لیے بچا لیا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بھوک پیاس ملکر مجھے اس مقام تک لے آئے تھے جہاں میں چبانے لائق ہر شے کھانے پر تیار ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف ایک خالی پن لایا بھرا نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ خشکی پر گزری میری لگی ایک خواب تھی۔ دراصل میں سمندر ہی میں پیدا ہوا تھا وہ اب اس کی گہرائیاں ہی میرا مقدر تھیں۔

اپریل کی شروعات تھی اور لائف رافٹ پر میرا 66 واں دن تھا۔ میں نے رافٹ پر بیٹھے بیٹھے سولر سمندر کے ایک جزیرے پر اپنی تیز نما چھڑی کا دار کیا۔ چھڑی اس کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ تاہم پھل اس زور سے لڑنے لگا کہ میری چھڑی کا اوپری نوک دار سر اٹھ گیا۔ چھڑی کے نوک کو چھڑاتے ہی پھل میری رافٹ کے کنارے سے گرا۔ اچانک ایک تیز سیٹی کی آواز نکلی اور رافٹ کے اوپر سولر سمندر سے پانی کے بلبلے نکلنے لگے۔ میرا دل اچھل اچھل مچ گیا۔ نامراد پھل نے میری رافٹ میں سوراخ ڈالا تھا۔ میں بدحواس ہو گیا۔ رافٹ ایک سائینڈ سے بچکنے کی ندری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کروں؟ میں نے ہمت بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ زندہ رہنے کی میری تمام امیدیں لائف رافٹ کے وجود سے وابستہ تھیں۔ رافٹ کا توازن بگڑتے ہی میں اس پر سے وزن کم

کرنے کے لیے سمندر میں کود گیا۔ میں نے سولر سمندر سے چند انچ نیچے رافٹ کے کنارے کو ٹھٹھا۔ میری انگلیاں ایک انچ لمبے ایک سوراخ سے ٹکرائیں۔ میں نے فوری طور پر سوراخ والے ربڑ کے کمزور حصے کو اپنی منگی میں دبایا۔ ہوا خارج ہوئی بند ہو گئی۔ مجھے کچھ سکون ملا۔ اب مجھے اس مسئلے کا مستقل حل نکالنا تھا۔ لائف رافٹ کے کنارے سے جڑا میرا پورا دھڑ پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور میں نے ایک ہاتھ کی مدد سے اپنی کشتی میں ہونے والے سوراخ کو بند کر رکھا تھا۔ مجھے ایک مضبوط دھاگے اور سوئی کی ضرورت تھی۔ مجھے ہنسی آگئی۔ یہاں کھانے کے لالے پڑے تھے اور میں سوئی دھاگا تلاش کر رہا تھا۔ میں نے سر ادنچا کر کے رافٹ کے فرش پر ڈھیر اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ وہاں بہت سی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں ایک ایک شے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ تاہم بدحواسی اور بھلت میں مجھے کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ کو ٹھنڈا کیا اور پھر نئے سیرے سے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ میں نے سورج کی روشنی کو کسی چمکدار چیز سے منعکس ہوتے دیکھا۔ میرے دماغ میں ایک جھماکا ہوا۔ میری پینٹ کی بیلٹ کا کچھ حصہ قریب ہی پڑا تھا اور اس سے خشک اسٹیل کا ہلکے سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ہلکے اٹھایا اور کھینچ کھانچ کر اس میں لگی ڈیڑھ انچ لمبی پن باہر نکال لی۔ پن کو منہ میں زبان کے نیچے محفوظ کیا اور دھاگے کی تلاش شروع کی۔ میں نے اپنی شرٹ کا ایک سرا پھاڑ کر پتلی لمبی رتی بتائی۔ اسے پن سے خشک کیا اور اپنے کام میں جٹ گیا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کی کڑی مشقت کے بعد میں رافٹ کے سوراخ کو کالی مٹی سے بند کرنے میں کامیاب رہا۔ گوکہ رافٹ کا ایک ہزار کچھ بھگ گیا تھا۔ تاہم وہ اب بھی میرے لیے کافی تھی۔ کام مکمل کر لے کے بعد میں رافٹ کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ قہقہوں کی منت لے مجھے ممکن سے چور کر دیا تھا۔ اس دن میں نے ہر گھنٹے بعد سوراخ کا جائزہ لیا۔ تاہم یہ دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی کہ سوراخ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔

اگلے دو دن خیریت سے گزرے، تاہم 63 ویں دن میں نے پایا کہ میرا گایا پتھر کمزور پڑ رہا تھا۔ میں نے ہمت جمع کی اور ایک بار پھر پانی میں اُتر گیا۔ میں نے نئے سیرے سے سوراخ کی مرمت کی۔ آخر کب تک میں اس سوراخ کو بند رکھ پاؤں گا؟ اپنی بدستی پر میرے آنسو نکل پڑے۔ مجھے لگا کہ میں ایک ناکام انسان تھا۔ میری بیوی مجھے چھوڑ گئی تھی۔ کوئی قریبی دوست نہیں تھا۔ میں بے یار و مددگار ایک مصیبت

سے لٹکتا تو دوسری میری منتظر ہوتی۔ کیا زندگی اتنی چھوٹی بھی ہو سکتی ہے یہ میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے وہ قیدی یاد آئے جنہیں جیل میں قید تنہائی میں رکھا جاتا ہے۔ شاید وہ قیدی مجھ سے بہتر محسوس کرتے ہوں۔ کم از کم انہیں کھانا پانی تو ضرور ملتا ہوگا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں ہر لمحہ کسی قبر میں اُترنے کا دھڑکا تو نہیں لگا رہتا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا کے سمندر میں ہزاروں ایسے جزائر بکھرے ہوئے تھے جہاں اب تک انسانی قدم پہنچ نہیں پائے تھے۔ آخر کہاں گئے وہ جزائر؟ بحرا و قیانوس کی حد تک غیر دریافت شدہ جزائر کا مفروضہ کتنا غلط تھا، یہ مجھ سے بہتر اور کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ اس حادثے سے پہلے میں اپنی زندگی کا ایک عشرہ سمندر میں گزار چکا تھا اور اسے ہمیشہ اپنے اوپر مہربان ہی پایا تھا۔ میں نے پانی کے سامنے کبھی ہار نہیں مانی تھی، تاہم اب لگتا تھا کہ میرے بُرے دن شروع ہو چکے تھے۔ سمندر اتنا بے رحم بھی ہو سکتا ہے یہ مجھے اب احساس ہو رہا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے اپنی موت کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا۔ کیا میں مرنے کے بعد پھیلیوں کی خوراک بن جاؤں گا؟ کیا دنیا کو کبھی پتا چل جائے گا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟ اب تو یہ امید ہی ختم ہو چکی تھی کہ ریڈیو پر میری مدد کا پیغام کسی نے سنا ہوگا۔

ہمت کی اور سولہ اسطیس کی طرف کھٹتا ہوا گیا۔ اس میں دو کے قریب پانی جمع تھا۔ میں نے بے مبری سے اس کا کورہ اور کرشل کے پیالے کو منہ سے لگا لیا۔ میں نے تھوک نکالا پیالے کو چاٹنے لگا۔ کچھ نمی میرے جسم میں گئی تو سکون احساس ہوا۔ میں نے اسطیس کو دوبارہ پانی سے بھر اور ڈرا رو برٹ سن کی ادھ کھائی کتاب کو اٹھالیا۔ میں نے کتاب دو گیلے ورق پھاڑے، انہیں تہ کر کے نوالا بنایا اور منہ ملا ڈال کر چبانے لگا۔ کاغذ چباتے ہوئے ایک انوکھا خیال میرے دماغ میں آیا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب وہ آگیا تھا کہ میں سانس کی ڈور کو بحال رکھنے کے لیے کچھ پسندیدہ طریقے اختیار کرتا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے اپنے جسم میں محفوظ پانی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ انسانی پیشاب میں 95 فیصد پانی اور باقی نمکیات ہوتے ہیں۔ جان بچانے کے لیے اس کا تازہ استعمال ہوتا ہے۔ اگر اسے کچھ دیر تک یونہی جمع رکھا جائے تو پھر میں مہلک جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جو کسی کمزور انسان کی بھی لے سکتے ہیں۔ جب جان برہنی ہو تو زندہ رہنے کے قدرتی طریقے اپنانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھانی چاہیے۔ رابرٹ سن کی کتاب کے الفاظ میرے دماغ گردش کرنے لگے۔ میں نے اس دن بہت مجبور ہو کر پیشاب جمع کیا۔ بدبودار پیلے مخلول کو دیکھ کر مجھے شکر اہیت محسوس ہوئی تاہم میں نے خود کو سمجھایا اور نہ جانے بھی اسے استعمال کر ڈالا۔ کچھ نمی میرے جسم میں چپٹی، تاہم میرا معدہ اسے قبول نہیں کر پایا۔ میرے پیٹ شدید مروڑاٹھنے لگے اور پھر مجھے جیٹش لگ گئی۔ اگلے چار گھنٹے کے اندر اندر میری حالت خراب ہو گئی اور میں ہاتھ چھوڑ بیٹھا۔ بہت ممکن تھا کہ جیٹش کی جان لیوا بیماری میرا تمام کردیتی کہ تب ہی قدرت کو مجھ پر رحم آگیا۔ اس موسلا دھار بارش ہوئی اور مجھے زندگی سے چند لمحوں کا حائل گئے۔

لے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے سوچا اب زیادہ سے
 وہ کیا ہوگا؟ کیا موت سے بڑھ کر بھی کوئی مصیبت ہے؟
 اب ہے میں تیار ہوں، میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور بڑ
 ۱۔ مہرے پاس گزشتہ بارش کا جمع شدہ ایک لیٹر کے
 پانی موجود تھا، تاہم سچ بات تو یہ ہے کہ بنا کسی ٹھوس
 الگ کے صرف پانی کو معدے میں اتارنے سے مجھے
 اب ہونے لگی تھی۔ مجھے آخری بار شکار کیے ہوئے بھی چار
 لکھو تھے۔ کھانے کے نام پر میری لائف رافٹ میں
 ایک پھلیوں کی چند باقیات ہی اُدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔
 بالے انہی کو غنیمت جانا اور کچھ کاٹنے، پُر اور اسی قسم کی
 ان کو اٹھا کر دھیرے دھیرے چبانے لگا۔ انہیں معدے
 اتارنے کے بعد میں نے دو گھونٹ پانی پیا اور پھر کسی
 دل کے انتظار میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

مصلحت سے کام کر رہی تھی۔ تاہم مجھے گھڑی سے چڑھنے لگی تھی۔ دراصل وقت گزرنے کا احساس مجھے موت کی یاد دل رہا تھا۔ 75 ویں دن میں نے کلائی سے بندھی واٹر پروف گھڑی کو اتارا اور اس کی چڑے سے نئی چین کو چبا ڈالا۔ میں نے کھانے کی تلاش میں ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اب رائٹ پر چبانے لائق کوئی چیز باقی نہیں بچی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مجھے ان لوگوں کا خیال بھی آیا جو سمندر میں تنہا جھکتے ہوئے موت کا شکار ہو گئے تھے۔ شاید میں انہی میں سے ایک تھا اور اپنے ارد گرد انہیں محسوس کر رہا تھا۔ میں نے رحم طلب نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے آنکھیں بند کرنا چاہیں تو مجھے پتوں میں درد محسوس ہوا۔ میں ایک ذمہ دار لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میرا جواز جڑو دکھ رہا تھا اور سرسری طرح چکرار رہا تھا۔ گزردی اس قدر تھی کہ میرے لیے ایک انگلی بلانا بھی دو بھر تھا۔ اس دن میں حتی طور پر اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ بالآخر موت میرے سر پر آ پہنچی تھی۔ سولر اسٹلس کے پیالے میں تازے پانی کی جگہ کچھ نمی سی جمع تھی۔ میری بھی ہوئی آنکھوں میں امید کی ایک ہلکی سی کرن چمکی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر قریب رکھی اسٹلس کو قریب کیا۔ اس کا کور ہٹایا اور نمی کو چاٹ لیا۔ زہم کی کے چند لمحے حریص حاصل ہو گئے۔

مکمل

تشریح

باپ کی نفرتوں اور ماں کی بے توجہی کے سایہ میں اس نے پرورش پائی، شہزادی ہو کر بھی آیا کے سہارے بچپن گزارنے پر مجبور کر دی گئی، صرف اس لیے کہ وہ لڑکی تھی، تخت کی وارث نہیں بن سکتی تھی۔ عام سی شکل و صورت کی حامل تھی۔ والدین کو خوف تھا کہ اسے کوئی بھی شہزادہ شریک زندگی نہیں بنائے گا۔ مگر اس نے عقل کا استعمال کیا اور پورے روس کی مطلق العنان ملکہ بن گئی۔ ایک ایسی ملکہ جس کا ذکر کرتے ہوئے روسی تاریخ داں آج بھی شرماتا ہیں، وجہ کیا تھی؟

۵۱ رات کچھ زیادہ ہی سرد تھی... خلیج فن لینڈ غصے سے اٹھا اور طوفانی ہواؤں نے سینٹ پیٹرز برگ میں کھلیلی تھی، جس کی دیواروں سے ٹکرا کر طوفان ہیبت ناک ٹنگناڑ پیدا کر رہا تھا، اپنی تباہ کن طاقت کا اظہار کر رہا تھا۔ محل کے تمام دروازے اور کمرے بند کر دی گئی تھیں، بیشتر بیتیاں بچاوی گئیں تاہم اوپری منزل کی ایک کمرہ کی حالت نکلی تھی، جس کے ہوا سے بچتے پٹ ماحول کی ہولناکی بڑھا



بے ہوش ہو گیا۔

میں نے 29 جنوری 1982ء کے دن کینارے ہسپانوی جزائر سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میری کشتی 4 فروغ حادثے کا شکار ہوئی۔ مکمل سمندر میں لائف رافٹ مغرب طرف بہتی رہی۔ میں نے اپنی مدد آپ کے تحت چار کلومیٹر کے قریب طویل فاصلہ طے کیا اور 76 دن 20 اپریل 1982ء کی صبح جزائر غرب الہند کی حدود میں استواء سے 16 ڈگری شمال اور 61.15 ڈگری مغرب واقع میری گلائٹ (Marie-Galante) کے جم سے جزیرے تک رسائی میں کامیاب رہا۔ یہ جزیرہ فرما جزائر گوڈولپ (Guadeloupe) کا حصہ ہے اور گواڈیلوپار بوڈا کی آزاد مملکت کے 100 کلومیٹر جنوب واقع ہے۔

میری گلائٹ کے مقامی اسپتال میں چوتھے دن ریکو سے آئے چند امریکی اہلکاروں نے مجھ سے ملاقات میری حالت کے پیش نظر مجھے ہیلی کاپٹر کے ذریعے پور کے دارالحکومت سان جوآن منتقل کیا گیا۔ یہاں علا سہولتیں بہت بہتر تھیں۔ میں بیڈ پر سہارے سے لیٹا تھا نے مکمل دروازے سے اپنے پیارے می پاپا کو اندر ہوتے دیکھا۔ والدین کو خود سے قریب یا کر میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اسپتال میں چھ ہفتے گزار بعد میں اپنے والدین کے ساتھ امریکا پہنچ گیا۔ آن نیویارک میں ایک خوش و خرم زندگی گزار رہا ہوں۔ 86 میں نے اپنے ساتھ پیش آئے حالات پر مبنی کتاب Days Lost At Sea لکھی۔ جس کی اش نے مجھے ایک مشہور شخصیت بنا دیا۔ اب بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ میں جب بھی کسی پروجیکٹ جگہ پر جاتا ہوں میری طرف دیکھ کر اشارے کرتے ہیں۔ وہ اس بات حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ آخر وہ کون سی طاقت تھی جس سہارے میں نے ایک طویل عرصے تک سمندر کی ہولنا کا مقابلہ جاری رکھا؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں تو زندہ رہنے کی آس ہی چھوڑا لیکن شاید میرے دماغ کے کسی دور دراز گوشے میں ایک دیار روشن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں والدین سے ضرور ملوں گا۔ شاید اسی یقین نے میری سام ڈور کو تھامے رکھا اور میں اپنی رہی سہی ہمت کے سہارے سمندر کا مقابلہ کر پایا۔

دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر می کو چھونے کی کوشش کی۔ پوری دنیا میں وہی ایک ایسی ہستی تھی جسے میری پروا تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوچا کہ بس دو بوند پانی مل جائے پھر میں اپنی پیاری می کے پاس پہنچ کر ہی دم لوں گا۔ والدین کا خیال آیا تو میں اپنی بچی بچی طاقت کے سہارے اٹھا اور رافٹ کے کنارے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ مجھے اپنے قریب سطح سمندر پر پانی کی خالی بوتلیں، پلاسٹک کے خالی کین، کچرا نما چیزیں اور کچھ اسی قسم کا سامان تیرتا دکھائی دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد دوبارہ دیکھا۔ منظر وہی تھا۔ میری آنکھوں میں چمک آگئی۔ ضرور اس پاس کچھ تھا۔ میں نے چندھیائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ دور مغرب میں بادل کا ایک بہت بڑا ٹکڑا دکھائی دیا..... شاید کوئی جزیرہ..... نہیں بادل کا ٹکڑا..... میں نے غور کیا..... نہیں یہ بادل کا ٹکڑا نہیں بلکہ کہرے میں ڈوبا ایک بہت بڑا جزیرہ تھا۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے سر کو ہلکے سے جھٹکا، ہاتھ میرے ہلائے اور پھر پوری آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ وہ ایک جزیرہ ہی تھا اور میری لائف رافٹ اسی کی جانب بہہ رہی تھی۔ قدرت مجھ پر مہربان ہو گئی تھی۔ خوشی سے میرے آنسو نکل پڑے۔ موت دور کھڑی ہاتھ مل رہی تھی اور میں زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ مجھے جزیرے پر بلند و بالا پہاڑ دکھائی دیے۔ جزیرے کا ساحلی علاقہ کافی لمبی سرسبز عمودی چٹانوں پر مشتمل تھا۔ لگتا تھا قدرت نے جزیرے کے گرد قلعہ نما اونچی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ یہ سمندر میں میرا آخری امتحان تھا۔ مجھے اپنی رافٹ کو قابل رسائی ساحل تک لے جانا تھا۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ لہریں میری رافٹ کو کسی عمودی چٹان پر ٹک دیتیں۔ زندگی کے اس حد تک قریب آ کر میں ہار ماننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی پوری طاقت سے پانی کو ایک طرف دھکیلتا شروع کر دیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ میری سانس پھول گئی لیکن میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ میری محنت رنگ لائی اور کمال ہو گیا۔ ماہی گیروں کی ایک کشتی نے مجھے دیکھ لیا۔ اس میں سوار کچھ لوگ میری طرف اشارہ کر رہے تھے۔ کشتی میرے قریب آئی اور الہاں نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔

”کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ایک مقامی لے لولی پہلی انگریزی میں مجھ سے سوال کیا۔

”اے میرے“ ”میرے“ ”میرے“ پہلا لفظ نکلا اور میں

رہے تھے۔

کھڑکی کی دوسری طرف، نیم تاریک کمرے میں ایک سایہ لرز رہا تھا۔

وہ رات واقعی وحشت ناک تھی، مگر کھڑکی میں کھڑی پائیت کی شکار یوزھی عورت کو اس کا چنداں احساس نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی بے حس وہ حرکت کل کے باہر پھیلی تاریکی پر نظریں گاڑے کھڑی رہی۔ پھر قریب پڑی کرسی پر اپنا پیار، بھاری جسم ڈھیر کر دیا۔ کرسی آرام دہ ضرور تھی، لیکن اب آرام اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ اس کی نظریں دروازے پر تکی تھیں۔ وہ دیر سے دیر سے کچھ بڑبڑاتی تھی، کسی کو پکار رہی تھی اور پھر وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

چند لمحوں بعد ۱۲ سے بھر پھڑکتے دیر پردوں کے درمیان سے ایک ساپ موہوار ۱۲ بج آگئی سے حرکت کرتا ہوا کرسی کے نزدیک آکر ٹھہر گیا، پھر کھڑکی کی جانب بڑھنے لگا۔ "کون... کون ہے؟" نکلے۔ وہ یوزھی عورت کی آنکھ کھول گئی۔

"میں ہوں۔" شعیب امر، بلی رازوں کی امین خادمہ خاص نے اپنی شناخت کروائی "کھڑکی بند کر رہی ہوں، طوفان آنے والا ہے۔"

"ہوں۔" عورت نے "ہمارے آگھیں سوئیں۔" کھڑکی بند کرنے کے بعد یوزھی خادمہ نے مزے کر امراض سے لڑتی اپنی مالکن کی طرف دیکھا جو ایک ملکہ تھی، روئے زمین کی سب سے بڑی قوت ریاست کی حکمران۔ پر آج وہ فکس، ہد حالی کا شکار نظر آتی تھی، بے چہرگی کا الیہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

خادمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے وہ دن یاد تھا، جب 34 برس کل اس کی مالکن کے سر پر تاج رکھا گیا تھا۔ جب وہ انتہائی نازک اعمام اور حشون ہوا کرتی تھی، لیکن آج...! خادمہ نے پانگ سے کبل اٹھا کر ملکہ کے جسم کو ڈھانپ دیا۔ دیر سے اسے مطالب کیا۔ "کبھی تمہارے رومان بھرے گرم دل کی رقص گاہ میں سیکڑوں عاشق رقص کرتے تھے، لیکن اب..." اس نے سرد آہ بھری۔ "وقت... وقت سب کچھ ختم کر دیتا ہے۔"

وہ رات... کچھ زیادہ ہی سرد تھی!

☆☆☆

مورج گہنا گیا۔ مشرقی آفت تاریک ہو گیا اور قہر کا ہولناک سایہ شہر کی جانب بڑھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یوم

حساب آن پہنچا ہے!

شہر کے باسی آنکھوں، میں تجیر اور خوف لیے اس آ اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ان کے اندیشوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ متذبذب تھے کا شہر اپنی طویل تاریخ میں پہلی بار طوفان ریگ و باد کے ز میں آیا تھا۔ وہ اس قسم کے طوفانوں سے نبرد آزما ہوئے تجربے سے لیس نہیں تھے، سو بے بسی کی تصویر بنے، خوف لرزتے ہوئے سیاہ آدمی کو اپنی جانب آتا ہوا دیکھتے رہے یہ لگ بھگ تین صدی پُرانا واقعہ ہے، جب مو پولینڈ کے صوبہ پومیرینا (Pomerania) کے مر شہر شچن (Szczecin) پر ایک افتاد ٹوٹ پڑی تھی جین اس وقت سلطنت پروشیا کا حصہ تھا اور اس پر جرمن شا خاندان کی حکومت تھی۔

مئی 1729ء کی اس پریشان کن صبح جب شہر کے ترین شخص کرشن اگست نے اپنے محل کی کھڑکی سے ر ہادلوں کو اپنی جانب آتا دیکھا تو اس کا اضطراب دو چند ہو وہ پہلے ہی اپنی بیوی جو اپنا اڑبجھ کے لیے پریشان تھا ج لمبے بچگی کے محل سے گزر رہی تھی کہ یہ عذاب نازل ہو گیا اپنے جنگی تجربے کے باعث وہ فوراً ہی سمجھ۔ گرد و غبار کا تاجہ کن طوفان شہر کو اپنی لپیٹ میں لینے کو ہے

نے فوراً حفاظتی اقدامات جاری کر دیے اور اپنے دل کو پل دیتے ہوئے اس کمرے کی جانب بڑھنے لگا جہاں چند لمحوں ایک نئی روح جنم لینے والی تھی۔ ایسی روح جسے قدرت سر زمین روس کی حکمرانی کے لیے چن لیا تھا۔ جس لمحے محل میں معصوم قلعہ داری گونجی، طوفان ریگ پوری قوت سے محل کی کھڑکیوں پر دستک دے رہا تھا۔

☆☆☆

وہ دن کرشن اگست کے لیے کسی طور خوشگوار نہیں بننے کی توقع کر رہا تھا، ایک وارث کی لیکن اس کے گھر بنی ہوئی۔ اس پر مستزاد، بچی کی پیدائش والے روز شہر پر ایک آ افتاد ٹوٹ پڑی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس بچی کو خوشی کی علا تصور کر رہا تھا۔ جب نام رکھنے کی تقریب منعقد ہوئی تو کر نے بادل ناخواستہ اس میں شرکت کی۔ نومو لو د کا نام صوفیہ کیا گیا۔

کرشن اگست کا تعلق جرمنی کے شاعری خاندان سے تھا جو ریاست این ہلٹ کا حکمران تھا۔ وسطی جرمن ریاست پہاڑی سلسلے ہرز اور دریاے الیب کے درمیان

ایہ ریاست جرمنی کا حصہ ہے)

تقریب کے اختتام پر جو بچی تنہائی میسر آئی، پائیت کے طن نے اپنی بیوی کے کان میں سرگوشی کی۔ "میں بیٹے کی لہ ہا تھا!"

"میں بھی!" منموم جواب نے سرد آہ بھری۔

"اس کھولنے سکتے کامیں کیا کروں گا؟ کسی کو اس کی ذتے ۲۰ ہوں، میرے پاس اس کے لیے وقت نہیں!" کرشن نے لی سے کہا۔

"کھونا سکتہ... ہاں تم درست ہو!" جواب دہ بڑبڑائی۔ شوہر طرح اسے بھی یقین تھا کہ اس کی بیٹی کا مستقبل تاریک نام وہ غلط تھے۔

صوفیہ کی ذتے داری ایک شفیق اور تجربے کار گورنس بیٹا ہ گئی۔ اسی کی گود میں نئی صوفیہ نے شعور کی آنکھ کھولی۔ اس کی کل کائنات تھی جو اسے نیک پریوں، حسین

۱۰ ہوں اور جری شہزادوں کی کہانیاں سناتی۔

نئی صوفیہ اس شفیق عورت ہی کو اپنی ماں سمجھتی تھی لیکن از جب شاعری تقریب منعقد ہوئی اور اسے شہر کے قابل ام گورنری لاڈلی بیٹی کہہ کر متعارف کروایا گیا، وہ ششدر رہ لپ۔ احساس واقعی اذیت ناک تھا کہ ماں باپ اسے ایک لہ لہ گورنر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھلا چکے ہیں۔

گوکہ اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا لیکن یہ ایک ایسی صہ مال جس میں تبدیلی اس کے بس میں نہیں تھی سو اس الی قسمت پر صبر کر لیا اور یکساں، بیزار کن ماہ و سال ۱۰ مے ہوئے، نیک فطرت پریوں کی کہانیاں سنتے ہوئے ۱۰ چمکتی رہی۔

اس زمانے میں جرمنی کے شاعری خاندان میں لڑکیوں کی لہ لہ موسمی توجہ دی جاتی تھی۔ جب ایک روز شاعری مشیر نے حلقہ اگست کی توجہ صوفیہ کی تعلیم کی جانب مبذول کروائی، وہ ۱۰ جیسے خواب سے جاگا ہو۔ پہلی بار اسے یہ احساس ہوا ۱۰ مے برسوں سے اپنی بیٹی کو نظر انداز کر رہا ہے۔

"صوفیہ کے لیے بہترین اتالیق کا انتظام کیا جائے۔" ۱۰ خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "اسے شاعری طریق ۱۰ طالع ہب، تاریخ، فرانسیسی اور جرمن زبان اور موسیقی ۱۰ کی جائے!"

۱۰ مے نے سر جھکا کر کرشن کا حکم سنا اور کمرے سے نکل

۱۰ لہ لہ اس لیے خاصا منموم نظر آ رہا تھا۔ شاعری خاندان ۱۰ مے والے اختلافات شدت اختیار کر گئے تھے جس

۱۰ ممبئی میں اردو بولنے والے دوسرے مقام پر ۱۰ روز نامہ ٹائمز آف انڈیا نے حال ہی میں یہ ۱۰ انکشاف کیا ہے کہ بھارت میں ممبئی واحد کو سوبولیشن شہر ۱۰ ہے جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد دوسرے مقام پر ۱۰ ہے نیز یہاں کے پچاس ہزار لوگ ایسے ہیں جو ۱۰ 14 زبانیں بولتے ہیں۔

۱۰ بھارت کے چھ میٹروپولیٹن شہروں یعنی دہلی، ممبئی، ۱۰ کلکتہ، بنگلور، چنئی، احمد آباد اور حیدر آباد کے سروے کے ۱۰ بعد ممبئی کو فیشن اور زبان کے لحاظ سے واحد کو سوبولیشن ۱۰ قرار دیا گیا۔ لیکن جب زبانوں کی فہرست تیار کی گئی تو ۱۰ اس میں اول مقام پر ہندی اور دوسرے نمبر پر اردو ۱۰ زبان بولنے والوں کی تعداد تھی۔

۱۰ اقتباس: اردو بک ریویو، دہلی

۱۰ مرسلہ: شاہد خان، لاہور

۱۰ کی وجہ سے خزانہ تیزی سے خالی ہو رہا تھا۔ گوکہ وہ ایک بار سوخ ۱۰ شہزادہ تھا لیکن معاشی مسائل نے اسے بھی پریشان کرنا شروع ۱۰ کر دیا تھا۔ کالی دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد بالآخر ۱۰ وہ کھڑا ہو گیا اور صوفیہ کے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے ۱۰ سخت دل میں شاید پہلی بار اپنی معصوم بیٹی کے ماتھے پر ہوسہ ۱۰ دینے کی خواہش نے جنم لیا تھا، تاہم کمرے کے دروازے پر ۱۰ پہنچنے کے بعد اس کا ارادہ بدل گیا۔

☆☆☆

۱۰ "بیاری بیٹا، آپ کہتی ہیں کہ میں ایک فہرادی ہوں ۱۰ لیکن میرا بچپن تو فہرادی ہوں ہیسا لگتا ہے، یہ تو بے کلم ہے!" ۱۰ ایک شب معصوم صوفیہ نے اپنی گورنس سے سوال کیا۔

۱۰ یوزھی عورت کے چہرے پر شفیق مسکراہٹ پھیل گئی۔ ۱۰ "شہزادی، آپ کا مستقبل روشن ہے۔ آپ کی روح نیک ہے ۱۰ اور نیک ہی ہمیشہ فلاح رہتی ہے۔" اس نے کبل صوفیہ کے جسم پر ۱۰ ڈالتے ہوئے کہا۔ "آج رات حسین سننے دیکھنا، شب بخیر!" ۱۰ صوفیہ سننے ضرور دیکھتی تھی لیکن ان میں سے کوئی حسین ۱۰ نہیں ہوتا بلکہ وہ تلخ مستقبل کے بے جان رنگوں سے رنگے ۱۰ ہوتے۔

۱۰ اور پھر ایک منحوس پہناج ثابت ہوا۔ اسے ریزہ کی ہڈی ۱۰ کے ایک موذی مرض نے آلیا۔ ہڈی کے مہرے اپنی جگہ سے

کھسک گئے تھے۔

وہ عذاب ناک دن تھے۔ صوفیہ شدید درد میں مبتلا تھی۔ اُس کی چیخیں محل کی راہداریوں میں گونجا کر تھیں جنہوں نے کرسٹن اور جوہانا کو بھی مضطرب کر دیا۔ علاج کے لیے معالجین کی تلاش شروع ہوئی۔ ادویہ تجویز کی گئیں، ٹوٹکے کئے گئے لیکن کوئی افادہ نہیں ہوا۔ بالآخر ریاست این ہلٹ کے شاہی معالج کو سچ چھین آنا پڑا۔

”اے آہنی جیکٹ پہنانی پڑے گی، کئی روز تک!“ تشخیص کے بعد جب اس نے علاج تجویز کیا تو کرسٹن بھونچکا رہ گیا۔

”کیا مطلب؟“ چہرے پر حیرت تھی۔

”یہی علاج ہے۔ اس کے جسم کی مناسبت سے ایک جیکٹ کی تیاری کا انتظام کرو۔ مجھے اب لوٹنا ہوگا۔“ بوڑھے معالج نے اپنا سامان سیٹھتے ہوئے کہا۔

جب معالج کی بجھی نے سچ چھین کی سرحد عبور کی، کرسٹن ایک آہنی جیکٹ کی تیاری کا حکم جاری کر چکا تھا جو اگلے ہی دن تیار ہوئی اور کم سن صوفیہ کو اُس میں قید کر دیا گیا۔

”نہایت، اس عذاب سے مجھے نجات دلاؤ!“ اُن اذیت ناک دنوں میں وہ اکثر اپنی گورنس کو پکارتی، جو اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور زیر لب دعائیں پڑھتی رہی۔

شاید نیک بیٹا کی دعاؤں میں اثر تھا، وقت کے ساتھ ساتھ صوفیہ کے مرض کی شدت میں کمی آتی گئی۔ چند ماہ بعد جب شاہی معالج اُس کا معائنہ کرنے آیا، اُس نے مسکراتے ہوئے صوفیہ کی ڈھارس بندھا کر کہا: ”تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی!“ پھر وہ اس کی ماں کی جانب مڑا۔ ”اب اس کی شادی کا انتظام کرو۔ یہ جوان ہو گئی ہے!“

☆☆☆

سیاسی حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ شاہی اختلافات نے دشمنیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ طاقت کے حصول کے لیے شرم ناک ہتھکنڈے اپنائے جا رہے تھے اور کرسٹن اپنا اقتدار تیزی سے کھو رہا تھا۔ اسے سرمائے کی کمی کا غم بھی کھا رہا تھا۔ اُن حالات میں اس کی شاطر بیوی جوہانا نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔

”ہمارے تمام مسائل کا ایک ہی حل ہے۔“ ایک اُداس دوپہر اُس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”ہمیں کسی بااثر شہزادے سے صوفیہ کا رشتہ طے کر دینا چاہیے۔“

کرسٹن نے چونک کر اپنی بیوی کی جانب دیکھا جس کی

آنکھوں سے اُس کا مضبوط ارادہ جھلک رہا تھا۔

”کیا تم نے صوفیہ کو دیکھا ہے؟“ اُس نے آہ بھری کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”اُس کا سر کس قدر چھوٹا اور ہمارے حالات بھی تیزی سے بگڑ رہے ہیں، ایسے میں ممکن ہے کہ کوئی بااثر شاہی خاندان اس کھوٹے سگے کو قبول لے؟“

”ہاں، میں اس بابت غور کر چکی ہوں۔“ جوہانا آنکھوں میں اُداسی تھی۔ ”لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو بے بیٹھ سکتے، ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا!“

”کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟“ کرسٹن نے سوال کیا۔

”ہاں!“ وہ اپنے شوہر کے پہلو میں آن کھڑی ہو کر ”روس میں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ملکہ الزبتھ طاقت میں اضافہ ہو رہی ہے۔ روس وسعت اختیار کر رہا ہے اسے آسٹریا کو شکست دینے کے لیے نئے اتحادیوں کی ضرورت ہے۔“ وہ یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”میں سن رہا ہوں۔“ کرسٹن نے کہا۔

”الزبتھ کا خارجہ پالیسی کا مشیر کاؤنٹ لیسٹوک معاملے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ پروشا کا بادشاہ فریڈرک بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔“

”کیا تمہاری نظر میں کوئی رومی شہزادہ ہے؟“ کرسٹن نے سوال کیا۔ بے چینی چہرے سے عیاں تھی۔

”ہاں، میں شہزادے پیٹر کے بارے میں سوچ رہی ہوں جو چارلس کا بیٹا ہے!“

”خدا یا پیٹر... وہ ایک نامعقول اور نیم پختہ نوجوان کی حرکات تو بچوں جیسی ہیں۔ کیا تمہیں اس کے کارناموں نہیں؟“

”وہ ملکہ الزبتھ کا بھانجا ہے۔ تخت کا اگلا وارث اس کی بیوی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔“ وہ بادشاہ بن گیا اور ہمارا کھوٹا سگہ کام آگیا تو روس کی ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔“ اُس کے ہونٹوں پر شامسکراہٹ تھی۔

”ٹھیک ہے... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ کرسٹن نے بے تاثر لہجے میں کہا اور جوہانا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اس منصوبے کو بننے میں معروف مفاد پرست سیاں کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ دروازے کے اوٹ میں کھڑی معصوم بیٹی نے اپنے ظالم ماں باپ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا ہے۔

”کھوٹا سگہ...“ اُس نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کا سر نہ دھڑکے۔

☆☆☆

جب صوفیہ کی شاطر ماں نے اُسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا، اُس نے صاف انکار کر دیا کیونکہ اُسے چند برس قبل ملاقات کے حامل پیٹر سے ہونے والی پہلی ملاقات اچھی یاد تھی۔ ”پیٹر تو راجا حق اور بلا کا بادشاہ نوش ہے!“

”تمہارے پاس انکار کی گنجائش نہیں، بہتر ہے اپنا ذہن کھولو۔“ جوہانا نے ددھوک لہجے میں کہا اور اُسے تنہا چھوڑ دیا۔

کچھ گھنٹوں بعد صوفیہ اپنی شفیق گورنس کی گود میں سر رکھے گماں لے رہی تھی۔ ”وہ مجھے خود پر بوجھ سمجھتے ہیں... کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا!“

”نہیں پیاری شہزادی، ایسا نہیں کہتے۔ میں... تم سے محبت کرتی ہوں... بیٹی!“ بیٹھا محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ بھر رہی تھی، اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔

وہ آخری موقع تھا جب عمر دیویوں کی شکار صوفیہ کو نیک بیٹا کی شفیق مہنی چھاؤں میں خواب دیکھنے کا موقع ملا۔ اگلے اس شب محبت سے لبریز وہ عورت، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔

اس سرد صبح غموں کی ماری صوفیہ دھاڑیں مار مار کر روئی۔ ام گئی نے اس کے ساتھ گریہ نہیں کیا۔ کسی نے آنسو نہیں مانا۔ شاہی خاندان کے ارکان کے پاس ایک گورنس کی ہر دھڑکھ کا اظہار کرنے کے لیے قطعی وقت نہیں تھا۔ انہیں محبت بھی بہت ناگوار گزری کہ شہزادی ایک معمولی عورت کی طرح ہوں زار و قطار رو رہی ہے۔

وہ آخری رسومات انتہائی جلد بازی میں ادا کی گئیں۔ تدفین کے وقت سوائے صوفیہ کے قبرستان میں شاہی خاندان کا کوئی فرد موجود نہیں تھا۔

اس شام صوفیہ بہت دیر تک بیٹھا کی قبر کے سرہانے بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ تمام خادم ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ ”اگر تان میں تنہا رہی۔ وہ غم وغصے سے کانپ رہی تھی۔“

”مجھے معاف کرنا پیاری بیٹا...“ بالآخر تاریک قبرستان اس کی آواز گونجی۔ ”شاید میں تمہاری نصیحتوں پر عمل نہ کروں، کیونکہ اس دنیا میں نیک کاروں کے لیے کوئی جگہ مفاد پرستوں کی دنیا ہے... مفاد پرستوں کی!“

اس سرد شام جب وہ قبرستان سے باہر نکلی، اُس کی قلبی آواز اب بھی مٹی، روح نے نیا چولہا پہن لیا تھا۔ وہ نیکی کی باتیں ہمیشہ کے لیے دفن کر چکی تھی۔

عالمگیر اپنے بیٹے کو لکھتا ہے۔

”فرزند عالی جاہ! یہ واقعہ ایک معتبر شیخ کی زبانی ہم تک پہنچا ہے جسے ہم نے قلمبند کیا ہے تاکہ آپ بھی پڑھ لیں۔“

ایک روز اعلیٰ حضرت (یعنی شاہ جہاں) نے علیٰ مردان خاں اور سعادت اللہ خاں کو خلوت خاص میں طلب کیا اور فرمایا کہ ملک اور مال کا بندوبست مقل اور انصاف پر مبنی ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ”بے جوہر“ بادشاہ سلطنت کا مالک ہو جائے۔ نااہل کو وزیر امیر اور مصاحب بنالے تو شہروں کا بندوبست بالکل خراب ہو جائے گی۔ رعایا پریشان ہوگی۔ پیداوار نابود ہو جائے گی۔ ہر طرف دیرانی ہی دیرانی نظر آئے گی۔

تم اللہ کے بندوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے درخواست کر دو کہ وہ پانچوں نمازوں کے بعد دعا کریں کہ اس سلطنت کی رونق کم نہ ہو۔ کوئی شخص برائے زبان پر نہ لائے اور ہمارے بعد ہمارا جو بیٹا بادشاہ ہو اسے خدا نیک توفیق دے۔

اقتباس: اورنگ زیب عالمگیر

مرسلہ: ریاض مظہری، کراچی

☆☆☆

جن دنوں انتقام کا جذبہ صوفیہ کی روح میں کمرہ ہل رہا تھا، نفرت کے جج بول رہا تھا، اس کی ماں غارت کاری کے گر بناتے ہوئے اُس کا رشتہ جوڑنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی لیکن اُسے سخت رکاوٹوں کا سامنا تھا کیونکہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے اور اس کا فیادی جب اس کی منشی شہر تھی۔

دراصل اُس کے مزاج میں بہت شوخی تھی۔ اعلیٰ سامی حلقوں میں اپنے مخالفین کی بابت لطیفے سنانے کی بیجا عادت میں وہ گرفتار تھی اسی کے باعث اس کے مخالفین بڑی تعداد میں تھے کیونکہ درس کے سیاہ و سفید کی مالک ملکہ الزبتھ کو یہ جواب دینا ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو بیٹا شہرت اور اقتدار کی بھونک رہا ہے، اس کی سرشت میں دعا بازی ہے۔ البتہ اُسے صوفیہ اچھی لگتی تھی۔

اور یہ بات صوفیہ کے علم میں تھی جس کے خیالات بیٹا کی موت کے بعد پوری طرح تبدیل ہو چکے تھے۔ اُس کا بچپن کسی طور شہزادیوں والا بچپن نہیں تھا، فقط محرومیاں اس کے حصے

میں آئی تھی لیکن اب اپنی عمر میں سے نجات حاصل کرنے کا
مہرہ ملے اس کے ہاتھ آگیا تھا۔
"پہلے سے شادی کرنے ہی میں میرا بھلا ہے!" اس نے
"حقیقت پسندانہ لیکن تلخ لہجے میں خود کو سمجھایا۔ وہ جانتی تھی کہ
روس کی ملکہ اُس کی ماں کو سخت ناپسند کرتی ہے، سو اس نے
معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔
"میں روس جانا چاہتی ہوں!" بالآخر 1744ء کے
موسم سرما میں پندرہ سالہ صوفیہ نے اپنے باپ کے سامنے اعلان
کر دیا جس کی آنکھوں سے خوشی کے ساتھ حیرت بھی جھلک رہی
تھی۔
"ضرور شہزادی، میری بھی یہی خواہش تھی کہ تم اپنی ماں
کے ساتھ روس جاؤ اور شاہی خاندان میں جگہ بنانے کی کوشش
کرو۔۔۔" کرشین کے لہجے میں معنوی شفقت تھی۔
"میں آپ کی خواہش کی تعمیل کروں گی۔" صوفیہ کے
ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ شطرنج کی بساط پر نئی چالیں
چلنے کا وقت آگیا تھا۔

☆☆☆

"شاہی خاندان میں قبولیت حاصل کرنے کے لیے
مجھے روسی زبان سیکھنی ہوگی!" صوفیہ نے خود سے کہا۔ "ملکہ کو
اپنی مٹھی میں لینے کے لیے یہ از حد ضروری ہے۔"
گوکہ ایک اجنبی زبان پر عبور حاصل کرنا آسان نہیں تھا
لیکن وہ بھی ضد کی پکی تھی۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔
اب وہ گھنٹوں روسی زبان کی مشق کرتی، تلفظ پر عبور حاصل
کرنے کے لیے رات رات بھر جاگتی رہتی۔ اس شب و روز کی
محنت نے اس کی صحت کو بڑی طرح متاثر کیا لیکن وہ جتنی فیصلہ کر
چکی تھی سو نفاہت کے باوجود مشق کا سلسلہ جاری رکھا۔ کبھی کبھار
جب بہت تھک جاتی تو خود سے کہتی۔ "مجھے روس کے تخت پر
بیٹھنا ہے، اس ذلت کی زندگی سے نجات حاصل کرنی ہے اور
اس کے لیے میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گی۔"
چند ماہ بعد وہ روسی زبان پر عبور حاصل کر چکی تھی اور اب
آنکھوں میں سپنے لیے روس کے سفر کی تیاریوں میں مصروف
تھی۔

ایک ایسا سفر تھا جو اس کی زندگی بدلنے والا تھا۔
اگر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ
وہ اس لیے روس کی زمین پر قدم رکھا، اس کی کوئی حیثیت
نہیں تھی۔ وہ اللاس کی ماری ایک جرمن شہزادی تھی جسے اس کے
ماں باپ اپنی راہ کا ہنر سمجھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب صوفیہ
روس پہنچی وہ بے بار بارہ گار تھی لیکن وہ عزم کر چکی تھی تخت کے
صہل کا عزم!

اُس نے اپنے منصوبے کے بارے میں کسی کو نہیں
اور پھر اُس کا پتا تھا بھی کون؟ اُس کی پیاری گورنر تو جہاں
سے کوچ کر چکی تھی۔
جرمن شہزادی کی حیثیت سے روس میں اُس کا
استقبال ہوا۔ طریق کے مطابق قیام و طعام کا انتظام کیا گیا
گوکہ اُس کی ماں روس میں ایک ناپسندیدہ شخصیت
لیکن خوش قسمتی سے صوفیہ کی ملکہ الزبتھ سے ملاقات شان
رہی۔ وہ اپنی ذہانت اور اخلاق سے اُسے متاثر کرنے
کا میاب رہی۔ دربار میں موجود دیگر بااثر افراد کی آنکھوں
بھی اُس کے لیے پسندیدگی تھی۔
"اے محترم ملکہ، کیا آپ مجھے روس کے مخفی اور
سے مخلص باسیوں سے ملاقات کی اجازت عطا فرمائیں گی؟
میں اُن میں کھل مل سکوں؟" ایک روز اس نے الزبتھ
سامنے بڑے سنے تلے الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کیا
"ضرور شہزادی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ اس ریاست
یہاں کے باسیوں میں دلچسپی لے رہی ہیں۔" ملکہ نے مسکراتے
ہوئے کہا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ صوفیہ کا مقصد روس
باسیوں سے گھلانا نہیں، فقط ان کے دل میں جگہ بنانا ہے
چند ہی روز میں صوفیہ نے ملکہ الزبتھ کا اعتماد حاصل
لیا لیکن ابھی ایک مسئلہ باقی تھا جو خاصا کبیر تھا۔
عقائد کے لحاظ سے روسی شاہی خاندان کا تعلق
آرتھوڈکس چرچ سے تھا، جبکہ صوفیہ کا خاندان مارشن
معتقد تھا اور اپنے سخت گیر نظریات کے لیے شہرت رکھتا تھا
صوفیہ کو بخوبی اندازہ تھا کہ لوٹھری عقائد ج کرا تھو
نظریات اپنانے کے فیصلے کی جرمنی میں سخت مخالفت کی
گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جلاوطن قرار دیتے ہوئے اس کی
کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جائیں۔
موسم گرما کی ایک طویل رات صوفیہ نے اس سے
سوچ بچار کرتے ہوئے صرف کی۔ ہر پہلو پر غور کیا۔ ملکہ
کے بابت اندازے لگائے۔ جب سورج کی پہلی کرن
افق پر نمودار ہوئی، وہ فیصلہ کر چکی تھی۔
دوسرے روز جب وہ دربار میں ملکہ الزبتھ کے
میں بیٹھی تھی، اس نے سرگوشی کی۔
"ملکہ عالیہ، آپ کی ریاست، آپ کی زبان اور
کے عوام نے مجھے بہت متاثر کیا، مجھے فخر ہے کہ مجھے یہاں
کا موقع ملا، اس تجربے نے حقیقتاً مجھے بدل دیا ہے۔"
الزبتھ نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ "مجھے خوشی ہے
کہ آپ کے لیے یہ تجربہ شان دار رہا!"
"وراصل ملکہ عالیہ میں یہاں آنے کے بعد ایک

لی سے گزری ہوں اور یہ ہے عقائد کی تبدیلی! میں۔۔۔
لہذا کس عقائد قبول کرنا چاہتی ہوں!"
"کیا؟" ملکہ کی آنکھوں میں خوشی اور حیرت کی ملی جلی
ماہیت تھی۔ حالانکہ وہ ایک جہاں ویدہ عورت تھی لیکن سچ تو یہ
کہ وہ شاطر صوفیہ کو پرکھ نہیں سکی۔ اس کی تجربہ کار آنکھیں یہ
کھنکھیں کہ اس لڑکی کا اصل مقصد اُس تخت کا حصول ہے
اس پر وہ براجمان ہے۔
جب درباریوں کو صوفیہ کے فیصلے کا پتا چلا، ان میں خوشی
کے لہر دوڑ گئی۔ جلد ہی یہ خبر روسی عوام میں گردش کر رہی تھی۔ یوں
علوم ہوتا تھا جیسے روس نے صوفیہ کو اپنی نئی ملکہ کے طور پر قبول کر
لیا ہے۔
چند مورخین کا خیال ہے کہ صوفیہ نے آرتھوڈکس چرچ
کے عقائد اقتدار حاصل کرنے کے لیے قبول نہیں کئے تھے، وہ
فحش ان پر یقین رکھتی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی میں رونما
ہونے والے چند واقعات میں، خصوصاً جب وہ روس پہنچنے کے
بعد شدید بیمار پڑ گئی تھی، یہ اشارہ ملتے ہیں کہ وہ نیچے دل سے
ارٹھوڈکس نظریات پر ایمان لے آئی تھی۔ البتہ محققین کا بڑا
مذاہج بھی اس خیال کا حامی ہے کہ لوٹھری عقائد سے کنارہ
گلی انتظامیاتی معاملہ تھا۔
جب یہ اطلاع جرمنی پہنچی تو کرشن آگ بگولا ہو گیا۔
"کچھ خبر ہے، ہماری شہزادی وہاں کیا گل کھلا رہی
ہے؟" وہ اپنے شیر کے سامنے دھاڑا۔ "وہ اپنے عقائد بدلنے کو
لاہو گئی ہے۔"
اُسی شام کرشن نے اپنی بیٹی کے نام لعن طعن سے بھرا
ایک طویل خط لکھا جس میں اس فیصلے کی مخالفت کرتے ہوئے
فوراً لوٹ آنے کا حکم جاری کیا۔
اس سے قبل کہ وہ خط صوفیہ تک پہنچتا، وہ ہمیشہ ہمیش کے
لہلہ چکی تھی۔
28 جون 1744ء کو جب سورج طلوع ہوا، وہ روسی
لہذا کس چرچ کی رکن بن چکی تھی۔ اس کا نیا نام کیہ ترین
گیا گیا۔
اس رسم کے ادائیگی کے فوراً بعد ملکہ الزبتھ نے اپنے
ہاتھ پیر سے اس کی منگنی کا اعلان کر دیا اور اس امر پر تصدیق
کر لیا کہ وہ روس کی اگلی ملکہ ہوگی۔
جب صوفیہ کو اپنے باپ کا ملامت بھرا خط ملا، اس وقت
"ماں آسمان پر تھی۔ خط کا جواب اُس نے یک سطر تحریر
لیا اور دیا۔
"صوفیہ مر چکی ہے، میں کیہ ترین ہوں۔ پٹیر کی منگیترا!"
وہ الزبتھ کی منظر نظر تھی۔ اُس کے سامنے ایک نئی دنیا

ہماری نپیدائش

ہم 9 محرم الحرام 1262ھ مطابق 8 جنوری
1846ء یوم سہ شنبہ شب شہادت کو بلاتی بیگم کے
کوہے میں پیدا ہوئے۔ وہیں ہمارا نال گڑا۔ اس
وقت تک حافظ بہاء الدین صاحب ایک معزز رئیس
ولازم شاہی کے مکان میں ہمارے والدین سکونت
پذیر تھے۔ چھ سات مہینے بعد شاہ صاحب بخش صاحب
کے باغ میں موتی بیگم زوجہ میر ظہور علی سے ذاتی مکان
خرید کر آن رہے۔ ہمارا شجرہ قلمہ تو صرف حسب
یادداشت یہی ہے۔ جس طرح ہمارے والد مرحوم نے
اپنا جد جہدی حصہ اپنے لواحقین سے نہیں لیا، اسی طرح
ہماری حیات نے بھی لالچ اور ذاتی منفعت سے ہاتھ
کھینچ لیا۔ خدا سلامت رکھے حضور نظام کو جنہوں نے
ہمیں ہماری زندگی تک اور ہمارے فرزند اقبال مند کو
22 فروری 1915ء سے منصب عطا فرما کر نسلاً بعد
نسل کے واسطے بے فکر کر دیا۔ اللہ بس باقی ہوں۔

اقتباس: سید احمد دہلوی، مولف فرہنگ آصفیہ
مرسلہ: شاہد سہیل، جنگ صدر

تھی، ہر آسائش میسر تھی۔ اب محرمیوں کا ازالہ ممکن تھا، وہ اپنے
خواب پورے کر سکتی تھی لیکن اس کی ذہنیت نے متنبہ کیا کہ اُسے
جلد بازی نہیں کرنی چاہیے، معمولی سی غلطی بھی خواہوں کے گل کو
چکنہ چور کر سکتی ہے۔ سو اس نے پیر کے قریب ہونے کی کوشش
نہیں کی اور زیادہ وقت ملکہ کی خوشامد کر لے، اور ہمارے اپنی جگہ
بنانے میں صرف کیا۔ مورخین کے لیے چارہ اہل ہا مش حیرت
ہے کہ الزبتھ جیسی شاطر عورت 10 برس کی ایک لڑکی کی چالوں
میں آگئی۔

☆☆☆

گل دہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے
رنگ و نور کی بارش ہو رہی ہو۔ ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
ملکہ بھی بہت مسرور تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس نے اپنے
تالائق بھانجے کے لیے ایک قابل اور بااخلاق جیون ساتھی
ڈھونڈ نکالا ہے۔

پٹیر بھی آج خاصا معتبر نظر آ رہا تھا۔ شہزادے کے نفیس
جوڑے کی تیاری کا ذمہ فرانسیسی ماہرین کو سونپا گیا تھا۔ اس کے
پھنسیوں سے بھرے چہرے پر پاؤڈر کی دبیز تہ چڑھائی گئی تھی
اور گل کے سب سے تجربے کا راتالیق نے اُسے تقریب کے
آداب کی بابت تربیت دی تھی۔

”تم آج بہت وجہ لگ رہے ہو۔ خدا تمہیں خوش رکھے میرے بچے!“ ملکہ نے پیٹر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دعا دی۔ ایک ایسی دعا جو کبھی قبول نہیں ہوئی! صوفیہ، جو اب کیتھرین بن چکی تھی، بہت خوش تھی۔ اس کے لباس کی تیاری کے لیے بھی بیرون ملک سے ماہرین مدعو کئے گئے تھے۔ اسے خوب سجایا گیا تھا۔

21 اگست 1745ء کو سینٹ پیٹرز برگ میں ادا کی جانے والی شادی کی رسم کے بعد ایک پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ شام کی آمد کے ساتھ ہی رقص و سرور کی محفل کا آغاز ہو گیا، جو رات گئے تک جاری رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جشن کبھی ختم نہیں ہوگا لیکن آدمی رات کے وقت تقریب اختتام کو پہنچ ہی گئی۔

ملکہ خود اسے جملہ عر دی تک چھوڑنے آئی۔ اس نے کیتھرین کا ہاتھ چوم کر اسے دعائیں دی۔ ”تمہارا دامن خوشیوں سے بھر جائے، سر میں تمہاری زندگی کی راہداریوں میں رقص کریں۔“

اب کیتھرین ایک پُر شکوہ شاہی پلنگ پر بیٹھی اپنے شوہر کی منتظر تھی۔ آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے، دل میں کئی خواب تھے۔ اسے یقین تھا کہ جونہی پیٹر اس کے سامنے آئے گا، محرومی کے دن تمام ہو جائیں گے، انتظار ختم ہو جائے گا لیکن وہ غلط تھی کیونکہ اس رات پیٹر کمرے میں آیا ہی نہیں۔ وہ نشے میں اس قدر دھت تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اس کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ جس لمحے کیتھرین کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں، بوڑھا تالیق پیٹر کو سہارا دے کر قریبی کمرے تک لے جا رہا تھا۔

توقع کے عین مطابق کیتھرین کے باپ کرشن اوگست نے تقریب میں شرکت نہیں کی!

☆☆☆

وہ اذیت ناک دن تھے۔ اس کے خوابوں کا نخل ڈھس گیا تھا اور اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔

”کیا بد نصیبی کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی؟ کیا میں اپنے مقدر میں بد نصیبیاں لکھوا کر لائی ہوں؟“ کیتھرین اکثر اپنے دل سے سوال کرتی جو جواب میں خاموش رہتا۔

نئے لوہے جوڑے کے قیام کے لیے سینٹ پیٹرز برگ کے صوبہ میں واقع اور نین بیم نای شاہی محل کا چناؤ کیا گیا تھا جو طبعاً لن لینڈ کے کنارے ایک پُر فضا، سرسبز مقام پر واقع تھا لیکن اس روشن محل کے اندر تاریکی تھی کیونکہ نئے شادی شدہ جوڑے کی زندگی میں محبت اور اعتماد نام کی کوئی شے نہیں تھی۔

وہاں تو شک تھا، نفرت تھی!

میاں بیوی کے درمیان بڑھتی کشیدگی کی بنیادی وجہ عیاں پیٹر تھا۔ وہ نہ صرف ایک نیم پختہ شرابی، پھوہڑو جوان تھا بلکہ کا عاشق مزاج بھی تھا۔

اس نے بھی کیتھرین کی جانب توجہ نہیں دی۔ ہمیشہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ ہر موقع پر اسے نیچا دکھانے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے وہ دل برداشتہ ہو گئی اور جب اسے پتا چلا کہ اس کا نامعلوم شوہر الزبتھ وروٹسووانای ایک شہزادی سے عشق لڑا رہا ہے تو وہ ٹوٹ گئی۔

چند ہی روز میں صورت حال اتنی بگڑ گئی کہ نشے میں دھت پیٹر درباریوں کے سامنے علی الاعلان وروٹسووا سے اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا۔ وہ کیتھرین پر تشدد سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

پیٹر کے ساتھ چند دیگر مسائل بھی تھے۔ چیچک کے داغوں سے بھرے چہرے والا وہ دھان پان سانو جوان طہ درجہ احمق تھا۔ اسے محافل کے آداب کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ وہ جوتے پہنے پہنے بستر میں چلا جاتا۔ اپنے ملازموں کے ساتھ شراب نوشی کی محفل بھاتا اور جب آپے سے باہر ہو جاتا تو چھڑی لے کر اپنے خادموں کو پیٹنے لگتا۔ ان سے تقاضا کرتا کہ جو شراب انہوں نے پی ہے اس کی قیمت ادا کریں۔ اسے گڈے گڑیا سے کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ گھنٹوں غرض پر لینا گڑیوں سے کھیلتا رہتا، جنہیں اس نے سپاہیوں کی وردی پہنائی ہوتیں۔ اگر کیتھرین اسے سمجھانے کی کوشش کرتی، تو وہ اسے بڑی طرح جھڑک دیتا، اسے دھمکیاں دینے لگتا کہ اسے طلاق دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کال کوٹھری میں ڈال دے گا۔

گوکہ پیٹر اپنی بیوی سے نفرت کرتا تھا لیکن وہ اسے طلاق نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ ملکہ الزبتھ سے بہت ڈرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ملکہ اس کی تمام حماقتیں برداشت کر لے گی لیکن کیتھرین کو طلاق دینا برداشت نہیں کرے گی۔ کیتھرین بھی اس امر کا اندازہ تھا۔ سو جب پیٹر کی دشنام طرازی اور عیاںیاں حد سے گزر گئیں، اس کی برداشت جواب دے گئی۔ ”اگر تم مجھے دھوکا دے سکتے ہو، غیر عورتوں کے ساتھ چہرے اڑا سکتے ہو، تو میں بھی ایسا کر سکتی ہوں۔“ ایک روز دھاڑی لیکن پیٹر نے اس کی جانب قطعی توجہ نہیں دی اور قہقہے لگاتا ہوا، منہ چڑاتا ہوا خواب گاہ سے باہر چلا گیا۔

کیتھرین نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر قدم جمانے کے لیے اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ روس کی بااثر شخصیات کی بابت زیادہ نہیں جانتی تھی۔

اس نے اپنے شوہر کی محبوبہ کی چھوٹی بہن، شہزادی اکیٹیرینا کو ہالہ کار بنایا اور بڑی ہی چالاکی سے اسے شے میں اتار لیا۔ اکیٹیرینا نے کیتھرین کی ملاقات چند ایسے افسران سے لڑائی جو پیٹر کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اس ضمن میں خاصے فرمند تھے کہ کل اس جیسا احمق شخص روس کے تخت پر بیٹھ جائے گا۔

”کل کے کلین اور روسی شاہی خاندان کے افراد پیٹر کی ہم سے خاصے پریشان ہیں۔“ ایک روز ایک بااثر فوجی جرنیل اس سے کہا۔

کیتھرین خاموش رہی۔ جرنیل نے بات جاری رکھی۔ ”میں نے سنا ہے کہ وہ ہر معاملے کے خادموں کو سپاہیوں کی وردی پہنا کر جنگی مشقیں کرواتا ہے۔“

”یہ درست ہے۔“ کیتھرین نے اثبات میں جواب دیا۔

”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ شام میں تمام ملازمین آپ کی ادب گاہ میں جمع ہو جاتے ہیں جہاں وہ رات گئے تک پیٹر کے ہمراہ دم بچاتے ہیں۔“

”آپ اس بار بھی درست ہیں محترم جرنیل!“ اس کی طراہٹ میں دکھ تھا۔

”انسوس ناک!“ جرنیل کے لہجے میں حقارت تھی۔

اس جرنیل کے مانند اور بھی کئی افراد پیٹر کی بابت کیتھرین کے سامنے اپنی نفرت کا اظہار کر چکے تھے جن میں ایک کاؤنٹ سرج سائٹی کوف بھی تھا۔ یہ بااثر شخص شاہی طہ (جیمبر لین) کے عہدے پر فائز تھا۔

گوکہ کیتھرین کی شادی نے ایک ایسے کی شکل اختیار کر لی، تاہم اس کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ روس کا طبقہ امراء اس کی ذہانت کا قائل تھا۔ اس کی پختہ عادت کے طفیل وہ معلومات سے لیس تھی۔ لاسی ناول، ڈرامے اور شاعری باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ اسے مزاج رکھنے والی شخصیات سے بھی ایسے روابط تھے۔ اس نے روس میں فرانسیسی انقلاب میں کلیدی کردار ادا کرنے والے ادیبوں کی تحریروں خاصہ مقبول تھیں۔ دربار میں اکثر اور روس کے بارے میں بحث ہوتی جس میں کیتھرین بڑھ کر حصہ لیتی۔ خوب و سائٹی کوف بھی فرانسیسی ادب کا مداح کی معاملہ ابتدائی تعارف کا سبب بنا اور جلد ہی ان کے مابین میں انسیت درآئی۔ اس شخص نے اپنی اخلاقیات اور عوامی طریقوں سے کیتھرین کا دل جیت لیا۔

ماہنامہ سرگزشت

”یہی وہ انسان ہے، جو میرے زخموں پر مرہم رکھ سکتا ہے!“ ڈکھوں کی ماری کیتھرین نے ایک روز خود سے کہا۔ ”مجھے خود کو اس کے سپرد کرنا ہوگا!“

اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ایک روز سائٹی کوف کو پیغام بھجوایا کہ وہ تنہائی میں اس سے ملنا چاہتی ہے۔

سائٹی کوف کا خیال تھا کہ شہزادی شاید فرانسیسی ادب کے موضوع پر اس سے مکالمہ کرنے کی خواہش مند ہے لیکن جب وہ اس تاریک کمرے میں پہنچا جہاں کیتھرین نے اسے مدعو کیا تھا، تو رائی اسے احساس ہو گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

کیتھرین کو اندازہ تھا کہ اگر ایک بار سائٹی کوف نے اس کی خواہش رد کر دی تو اس شخص کو حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا، سو اس نے سائٹی کوف کو سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا، وہ اس سے لپٹ گئی۔ اگلے ہی لمحوں میں کیتھرین کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

سائٹی کوف کے لیے خود کو سنبھالنا ممکن نہیں تھا، پُر کشش کیتھرین کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ خاموش کھڑا رہا جیسے کسی سحر کے زیر اثر ہو۔

بالآخر ہچکچاہٹ کے درمیان کیتھرین کی کرب میں ڈوبی آواز کمرے میں گونجی۔ ”پیارے سائٹی کوف۔ میری زندگی بے رنگ ہے، تاریک ہے اور تم روشنی کی اکھوتی امید ہوں۔ کیا تم اس خوفناک سفر میں میری رہنمائی کرو گے؟“

حسن کے سحر نے سائٹی کوف کو بے بس کر دیا تھا۔ ”ہاں!“ وہ اتنا ہی کہہ سکا اور کیتھرین کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں بھر لیا۔ یوں ایک ایسا حادثہ شروع ہوا، اس نے تاریکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیا!

☆☆☆

شب اٹنی میلہ اپنی محبوبہ کو بالہوں میں لیے شراب کے نشے میں دھت محل کی راہداریوں میں گھوم رہا ہوتا، سائٹی کوف چپکے سے کیتھرین کی خواب گاہ میں داخل ہو جاتا، وہاں کھنڈوں گزارتا۔

1754ء کے اوائل میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ کیتھرین حاملہ ہو گئی ہے۔ عوام کی سطح پر تو اس خبر کو روایتی معنوں ہی میں لیا گیا لیکن شاہی خاندان میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اس وقت یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ پیٹر اور کیتھرین کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ کیتھرین کے سائٹی کوف سے معاشرے کی تفصیلات سے بھی بیش تر درباری آگاہ تھے لیکن اس

معاملے میں سب خاموش رہے۔

جب پیٹر کو کیتھرین کے حاملہ ہونے کی خبر ملی، وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ کیتھرین نے اُسے دھوکا دیا ہے مگر اس ضمن میں وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ملکہ الزبتھ خود اس معاملے میں خصوصی دلچسپی لے رہی تھی۔ اُس نے کیتھرین کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور جشن کی تیاریوں کا حکم جاری کر دیا تھا۔ اکتوبر کے مہینے میں کیتھرین نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام پال رکھا گیا۔ ملکہ نے ملک بھر میں جشن منانے کا اعلان کر دیا جو کئی روز تک جاری رہا۔ محل میں ہر تکلف منیافت کا اہتمام کیا گیا جس میں پال کو پیٹر کا وارث اور اگلے حکمران کے طور پر پیش کیا گیا۔

اس گہما گہمی میں پیٹر کو کیتھرین سے ہاتھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن جو کئی تنہائی میسر آئی اُس نے کف اُڑاتے ہوئے کیتھرین سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں پال میرا بیٹا نہیں!“

”تم درست ہو!“ کیتھرین کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ”وہ واقعی تمہارا بیٹا نہیں ہے اور جو کئی وہ باشعور ہوگا میں اُسے یہ بتا دوں گی کہ پیٹر جیسا احمق شخص تمہارا باپ نہیں۔“

”میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“ پیٹر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”اب تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ کیتھرین تن کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اس لمحے وہ خود کو بہت طاقتور محسوس کر رہی تھی اور اس کا سبب بھی تھا۔ سلطنت روس کو اُس کا اگلا وارث دینے کے بعد یکدم اس کی اہمیت گئی ہوئی تھی۔ پھر اشرافیہ میں بھی اس کا بہت اثر و رسوخ تھا۔

”چڑیل!“ پیٹر بھنکارا۔ ”جب میں زار بن جاؤں گا تو سب سے پہلے تیرے قتل کا حکم جاری کر دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

”ایسا بھی نہیں ہوگا۔“ کیتھرین زہر پرب بڑبڑائی۔

☆☆☆

کیتھرین کو یقین تھا کہ بچپن میں اُس نے جس بہادر و فداکار کے سنے دیکھے تھے، وہ سائلی کوف ہی ہے، تاہم سائلی کوف کے ظلمات مختلف تھے۔ اسے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ کیتھرین کی قربت آنے والے برسوں میں اس کے لیے طاعون بن جائے گی۔ جو کئی بیزار اقدار میں آئے گا، وہ اور اس کا خاندان کھم کھم کر ڈال جائے گا۔

اگر اس نے فیصلہ کیا کہ اب اُسے شہزادی سے کنارہ کشی کرنا چاہیے، جس نام وہ کیتھرین کو یہ خبر سنانے گیا،

عشق سے سرشار شہزادی بڑے جاؤ سے تیار ہوئی تھی۔ اپنے محبوب کے لیے اُس نے ایک انتہائی مہنگا تحفہ بھی خرید رکھا تھا۔ جو کئی سائلی کوف کمرے میں داخل ہوا، کیتھرین دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی، تاہم اُس نے جواباً کسی قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب کیتھرین نے ہیرے کی وہ انگلی سائلی کوف کو پیش کی، جو اُس نے بہت محبت سے خریدی تھی، اُس نے بڑی ہی سرد مہری سے اُسے بتا دیا کہ اب وہ کیتھرین سے مزید ملنا نہیں چاہتا۔

”کیوں؟“ شہزادی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اسی میں ہماری بھلائی ہے۔“ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ ”لیکن میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ کیتھرین رو ہانسی ہوئی۔

”لیکن میں نہیں، آج سے ہمارے مائے جد ہیں۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے، تم مجھے یوں رد نہیں کر سکتے!“ کیتھرین چلائی۔

”میں ایسا کر چکا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا اور کیتھرین خواب گاہ میں تنہا رہ گئی۔

دوسرے روز غموں سے نڈھال کیتھرین کو اطلاع ملی کہ سائلی کوف نے اپنا تاج لٹ کر والیا ہے۔

☆☆☆

وہ دن یاسیت سے بھرپور تھے۔ وہ ٹوٹ چکی تھی، پورنی طرح... اور خود کو سینے سے قاصر پاتی تھی۔ اُس کے اُداس دل میں چار سو دیرانی تھی، محسوس ہوتا تھا جیسے وہ قنوطیت کے سمندر میں کھڑی ہو، محرومیوں کے طوفان میں پھنس چکی ہو۔ اُس نے سائلی کوف سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، کئی خطوط لکھے، جواب نہ دارا!

دوسری جانب پیٹر کو یہ خوبی علم تھا کہ اُس کی بیوی جس سے وہ شدید نفرت کرتا ہے کس کرب سے گزر رہی ہے۔ اور وہ بہت مسرور تھا۔

ایک رات وہ نشے میں دھت، بوتل ہاتھ میں لیے ایک فوجی افسر کے سہارے کیتھرین کی خواب گاہ میں آیا۔

”چڑیل تو خوشیوں سے محروم ہو گئی... تیرا مستقبل تاریک ہے... مجھے دیکھ، میں آج بھی عیاشی کر رہا ہوں... خوش ہوں یہ کہتے ہوئے وہ بُری طرح لڑکھڑایا اور فوجی افسر پر شکل اُسنی پالیا۔ کیتھرین دیکھ سکتی تھی کہ افسر کی آنکھوں میں کے لیے ہمدردی اور اپنے مستقبل کے بادشاہ کے لیے حقارت ہے۔

شراب حلق میں اُٹھیلے ہوئے پیٹر اُسے مسلسل کا

دے رہا تھا۔ بالآخر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس لمحے فوجی افسر نے اُسے ہی کرب کے ساتھ کیتھرین کی جانب دیکھا جو اس پورے کمرے میں خاموش کھڑی رہی تھی۔ آخر وہ افسر پیٹر کو، مستقبل کے زار کو گھسیٹتے ہوئے خواب گاہ سے باہر لے گیا۔

”میری خوشیاں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“ کیتھرین نے خود کو مخاطب کیا۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ پنپ رہا تھا۔

☆☆☆

”شہزادی کیتھرین آپ سے ملنا چاہتی ہیں، تنہائی میں!“ جب یہ پیغام استالین کو ملا وہ حیرت کے سمندر میں اب گم ہوا۔

استالین وہی افسر تھا جس کے سامنے چند روز قبل پیٹر نے شہزادی کی بے عزتی کی تھی اور اب اس کے سامنے کیتھرین کی خادمہ کھڑی تھی۔ استالین کچھ ہفتوں قبل ہی محاذ سے لوٹا تھا۔ اسے سائلی کوف اور شہزادی کے محاشقے کے بارے میں علم نہیں تھا۔ سو پہلا خیال جو اُس کے ذہن میں آیا، وہ یہی تھا کہ شاید شہزادی اُسے کوئی ضروری ذمہ داری سونپنا چاہتی ہے، اس لیے تنہائی میں اُسے مدعو کیا گیا ہے۔

مقرر وقت پر جب وہ محل کے ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا، اُس پر جرمین حسن نے اچانک، پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع اور پُر اثر تھا کہ استالین کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جب اسے ہوش آیا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ شہزادی اُس کی بانہوں میں تھی اور وہ شاہی پتنگ پر دراز تھا۔

اُسے فوراً خطرے کا احساس ہو گیا، وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن اٹھنے سے رک گیا۔ اس کی مضبوط کلائی ایک کمزور لیکن اعلیٰ حسین ہاتھ کی گرفت میں تھی۔ دو جھیل سی گہری اداس آنکھیں اس سے التجا کر رہی تھیں، مت جاؤ!

وہ بت بنا دیں کھڑا رہا، کسی قوت نے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے اور جب کیتھرین نے ایک خطرناک وار کیا، خوبصورت اور بے کاسب سے پُر اثر وار۔ اُس کی آنکھوں میں نئی تیرنے لگی تھی۔

ہر مرد کی طرح استالین بھی ان آنسوؤں کے سامنے موم بن گیا۔ اگلے ہی پہل کیتھرین اس کی بانہوں میں تھی۔

☆☆☆

1750ء میں جب شہزادی کے دوسرے بار حاملہ ہونے کی خبر آئی، ملکہ الزبتھ اس حد تک ضعیف ہو چکی تھی کہ وہ اگر کسی میں جشن کا انتظام نہیں کروا سکتی تھی، سو اس نے اپنے خاص کو اس ضمن میں تیاریوں کا حکم دیا لیکن یہ جشن کبھی نہیں

منایا گیا۔ کیونکہ جب بوڑھا مشیر یہ پیغام لے کر پیٹر کے پاس پہنچا، احمق شہزادے کی چھڑی اُس کی منتظر تھی۔

اُس نے بوڑھے مشیر پر بے درپے کئی وار کئے اور مسلسل چیختا رہا۔ ”کس لیے جشن؟ وہ چڑیل شیطان کے ساتھ ہم بستری کرتی ہے اور تجھے جشن کی پڑی ہے!“

شاید پیٹر اُسے قتل ہی کر دیتا لیکن محل کے چند بااثر درباریوں نے اُسے روک لیا اور بوڑھا مشیر بہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگا۔

جب استالین کو کیتھرین کے حاملہ ہونے کی اطلاع ملی، اُس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اُسے شدت سے یہ احساس ستانے لگا تھا کہ اُسے شہزادی سے دور ہو جانا چاہیے، ورنہ تباہی اس کا مقدر بن جائے گی لیکن کوشش اور خواہش کے باوجود وہ ایسا نہیں کر سکا۔ نہ جانے کیتھرین کی کمزور گرفت میں کیا جادو تھا۔

ہاں، جب چند ماہ بعد جب کیتھرین شاہی محل میں نرنے میں آگئی، استالین کو اپنی لفظی سدھارنے کا موقع مل گیا۔

اس بار قدرت نے کیتھرین کو ایک بیٹی سے نوازا اور وہ مسرت سے بھر گئی۔ اُسے یقین تھا کہ جو محرومیاں اس کا نصیب بنیں، اُس کی بیٹی اُن سے محفوظ رہے گی۔

جب پیٹر کو یہ اطلاع ملی کہ اُس کی بیوی نے ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ ”وہ شیطان کی بچی ہے، میں اُسے قتل کر دوں گا۔“

بچی کا نام اپنا جو بن کیا گیا۔ نام رکھنے کی تقریب والے روز پیٹر نے بیماری کا بہانہ بنا کر شرکت سے معذرت کر لی اور اپنی محبوبہ کے پہلو میں لیٹا، جو ایک مہمہ لی ملازمہ تھی، شراب پیتا رہا۔

پیٹر کو اپنے منسوبے کو ملی جامہ پہنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ پیدائش کے چند ہی ماہ بعد اپنا انتقال ہو گیا۔ اُس سانحے نے شہزادی کو توڑ دیا لیکن سنگدل پیٹر بہت خوش تھا۔ وہ غموں میں ڈوبی کیتھرین کی خواب گاہ میں آیا جو ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور بے ہودہ رقص کرنے لگا۔

”وہ شیطان کی بچی تھی... غم مت سناؤ، وہ اپنے گھر لوٹ چکی ہے، جہنم میں چلی گئی ہے!“

ان جملوں نے دہی ماں کے دل میں چھید کر دیے۔ پیٹر کے لیے اُس کی نفرت انتقام کی خواہش میں بدلنے لگی لیکن وہ بے بس تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی، اس لیے رقص کرتے پیٹر پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے فقط اتنا ہی کہا۔ ”بہت جلد تم بھی

جہنم میں ہو گئے، بہت جلد تم موت کا ڈانقہ چکھو گے!“
”اچھا...“ پیٹر نے قہقہہ لگایا۔ ”لگتا ہے کہ منحوس عورت
تیرا بھائی توازن بگڑ گیا ہے، میں زار بننے والا ہوں۔ پھر میں
تیرے لیے زمین ہی کو دوزخ بنا دوں گا۔“

☆☆☆

اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اُس نے خود کو غم کے پانوں کے
درمیان پھنسا ہوا محسوس کیا۔ ایک بار پھر اُسے دھوکا دیا گیا۔ اُس کا
محبوب جا چکا تھا، دور، بہت دور!

دراصل جن دنوں وہ اپنی بیٹی ایٹا کے غم سے بے حال
تھی، استالین نے خاموشی سے رخت سبز باندھ لیا لیکن وہ
تصور وار نہیں تھا۔ دراصل پیٹر نے اپنے خفیہ سپاہیوں کو یہ حکم
جاری کیا تھا کہ کیتھرین کے تمام عاشقوں کوئی الفور ٹھکانے لگا
دیا جائے۔ واضح رہے کہ اس وقت کیتھرین بیک وقت کئی
مردوں سے عشق لڑا رہی تھی۔

جب پیٹر کے اقدام کی اطلاع استالین کو ملی، اس نے
اپنی جان بچانے کے لیے منظر سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا، البتہ
اس نے کیتھرین کے نام ایک رقعہ ضرور چھوڑا۔

”شہزادی، مجھے معاف کرنا، میں کمزور ہوں، تمہارا
ساتھ نہیں دے سکتا۔“

کیتھرین نے وہ مختصر سی تحریر کی بار پڑھی۔ پھر زربل
پو پڑائی۔ ”ہاں تم کمزور تھے، میرا انتخاب غلط تھا لیکن اب میں
غلطی نہیں کروں گی۔“

غم سے سنبھلنے کے بعد کیتھرین ایک بار پھر شاہی
معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔ اُس نے سماجی و سیاسی
سرگرمیاں تیز کر دیں۔ کئی بااثر افراد سے خفیہ ملاقاتیں کیں۔
ساتھ ساتھ اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنتی رہی۔

دراصل وہ ایک ایسے جرأت مند، بااثر شخص کی تلاش میں
تھی، جس کی پشت پر بڑی خاندانی قوت ہو۔ ایک ایسا خاندان
جو ریاستی سطح پر انتہائی مضبوط ہو۔

بالآخر اس کی نظر انتخاب اور لوف خاندان پر پڑی جو
انہماکی رئیس اور سیاسی طور پر روس کا مضبوط ترین خاندان تھا۔
اس خاندان کے کئی افراد اہم ترین عہدوں پر فائز تھے۔ کیتھرین
کو ان میں سے کسی ایک کو چھٹا تھا اور اُس نے گریگوری اور لوف
کا انتخاب کیا، جو ایک جرأت مند فوجی افسر تھا۔ وہ انتہائی وجہ
خاص تھا۔ اس کے کارناموں کی فہرست طویل تھی۔ وہ معرکہ آرا
”ساتھ سالہ جنگ“ میں روس کا ہیرو تھا۔ کہنے والے کہتے تھے
کہ اس کا جسم یونانی دیوتاؤں جیسا تھا، وہ دس انسانوں جتنا
طاقتور تھا اور اس پر مستزاد وہ پیٹر سے سخت نفرت کرتا تھا۔

جب کیتھرین نے اُسے ملاقات کا پیغام بھجوایا، وہ جری
مرد بلا خوف و خطر سینہ تان کر اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔
شہزادی اُس کا حسن دیکھ کر ششدر رہ گئی۔
”یہی شخص میرے منصوبے کو حقیقت کی شکل دے گا۔“
اُس نے خود سے کہا تاہم وہ جلد بازی میں کوئی غلطی نہیں کرنا
چاہتی تھی۔ اس لیے پہلی ملاقات والے روز عمومی سیاسی
موضوعات پر گفتگو کرتی رہی۔

گریگوری کو رخصت کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ ”محترم
جرنل، مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری دعوت قبول کی۔ مجھے
امید ہے کہ جلد ہماری دوبارہ ملاقات ہوگی۔“

گریگوری کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔
اُس نے براہ راست شہزادی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”یقیناً حسین شہزادی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگلی بار آپ زیادہ
گرم جوشی کا مظاہرہ کریں گی۔“

”یقیناً!“ شہزادی مسکرائی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی
تھیں۔

☆☆☆

بادلوں نے چاند کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ گلیوں
میں پراسرار سائے حرکت کر رہے تھے اور محل کے ایک خاموش
کمرے میں مسرت رقص کر رہی تھی۔ دودل ایک ساتھ دھڑک
رہے تھے، اُن کے سانس ایک دوسرے میں پیوست تھے۔

یہ کیتھرین اور گریگوری کے درمیان ہونے والی دوسری
ملاقات تھی، جو ساری رات جاری رہی اور انہوں نے ایک
دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ہمیشہ
ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

منہ اندھیرے جب وجہہ گریگوری خواب گاہ سے
رخصت ہوا، شہزادی نے اپنا سر پٹنگ کے سرہانے سے نکا دیا
وہ تھک چکی تھی لیکن خوشی سے سرشار تھی۔ اس نے گریگوری کا
انتخاب فقط اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کیا تھا
لیکن گریگوری نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اُسے مکمل کرنے کی بھی
قوت رکھتا ہے۔

درازند، وجاہت کا پیکر گریگوری ایک پُر قوت اور
جاریت پسند انسان تھا، جو محبت کے مخصوص لمحات میں خفا
پر تشدد ہو جاتا لیکن اُس کی ضربیں کیتھرین پر گراں نہیں
گزر تھیں، بلکہ اُسے یوں لگتا جیسے گریگوری کی ہر ضرب اُس کو
کو توڑ رہی ہے جس میں وہ برسوں سے قید تھی۔

محبت سے بھرپور ملاقاتوں میں جب چاند کی را
کھڑکی سے چھن کر آ رہی ہوتی، شہزادی خظروں کے اُ

کھلاڑی کو نیم آنکھوں کے ساتھ، گلوگیر آواز میں اپنے ڈکھوں
سے آگاہ کرتی۔

اور جب شاطر کیتھرین اُس فولادی انسان کی آنکھوں
میں اندر دی دیکھتی تو خاموشی سے ایک منصوبہ اُس کے کانوں
میں اڑھ پڑنے لگتی، ایسا منصوبہ جو روس کو بدلنے والا تھا!!

☆☆☆

5 جنوری 1762ء کی صبح سورج کی کرنیں روس کے
مرزاؤں تک پہنچنے سے قاصر رہیں کہ اس سرزمین پر غم کی
راہ وہیں چاڑھتی تھی۔

عظیم ملکہ الزبتھ کا انتقال ہو چکا تھا۔ روسی قیم ہو گئے
تھے۔ ہر طرف گریہ ہو رہا تھا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رورہے
تھے، البتہ بادہ فوش پیٹر بہت خوش تھا اور اپنی حماقتوں کے
امٹ خوشی چھپانے میں بھی یکسر ناکام نظر آتا تھا، جس کی وجہ
ملکہ کے چاہنے والوں کے دل میں اُس کے لیے نفرت کا جنم
ہوا اڑی بات تھی۔

دوسری جانب کیتھرین کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔
”خدا اس کی لیے ڈھال بھی جس کی موجودگی میں پیٹر اُسے کسی
”مقام نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا لیکن اب وہ دنیائے فانی سے کوچ
کر چکی تھی اور احمق پیٹر نیاز از منتخب ہونے کو تھا جس کا ہر حکم پھر
اگھر ہوتا۔“

جب روس عظیم ملکہ کی تدفین میں مصروف تھا، کیتھرین
لہو گرگوری اپنے منصوبے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے میں
لگے تھے۔

جلدی ہی پیٹر کے سر پر تاج رکھ دیا گیا اور وہ اپنی بیوی کے
ساتھ ہیٹ پیٹرز برگ کے اُس مرکزی محل میں آن بیٹھا جہاں
الزبتھ روس پر حکومت کیا کرتی تھی۔

تاج پوشی کے بعد پیٹر اتنا خوش تھا کہ وہ کیتھرین کو کچھ
کچھ کے لیے بھول گیا۔ سینٹ پیٹرز برگ پہنچ کر جیسے اُس کی
داعی بدل گئی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوتا۔

شاہی ضیافت کے موقع پر کہتا۔ ”خدا یا، یہ سوپ کتنا لذیذ
اور خوب نہایت ہی اعلیٰ ہے... گوشت کا تو جواب نہیں...
... جہاں کی شراب عمدہ ہے!“

لوگوں کو ایک قابل بادشاہ ثابت کرنے کے لیے اُس نے
۱۱۱۱ بجے جاری کئے اور دشمنوں پر اپنے دھاگ بٹھانے
کا فیصلہ کیا۔

”میری جانب کیتھرین روس کی اشرافیہ سے خفیہ ملاقاتیں
کر رہی تھیں اور انھیں انعام و اکرام کا لالچ دے کر اپنے
میں شامل کر رہی تھی۔ گریگوری کی موجودگی اُس کے

لیے کسی رحمت سے کم نہیں تھی۔ بیش تر بااثر افراد اس بات سے
آگاہ تھے کہ کیتھرین کو اور لوف خاندان کی مکمل پشت پناہی
حاصل ہے۔ وہ خود بھی پیٹر کو پسند کرتے تھے اور انھیں یقین تھا
کہ اس شرابی بادشاہ کا مستقبل تاریک ہے۔

جولائی 1762ء میں زار بننے کے فقط چھ ماہ بعد پیٹر
ایک تاریخی حماقت کر بیٹھا جسے مورخین اُس عہد کی فاش ترین
سیاسی غلطی گردانتے ہیں جس کا خلیازہ شاہ کو بھگتنا پڑا۔ دراصل
اُس نے جوا حکامات جاری کیے تھے، اُن کی رو سے اداروں کے
دائرہ اختیار میں چند بنیادی تبدیلیاں آگئی تھیں جن کا براہ
راست اثر شاہ اور اُس کے وفاداروں کے اختیارات پر پڑ رہا تھا
اور اُن کی کمزوریاں عیاں ہو گئی تھیں۔

پھر چند اہم معاملات کو نمٹانے کا اعلان کرتے ہوئے وہ
کیتھرین کو سینٹ پیٹرز برگ میں چھوڑ کر چند وفاداروں کے
ساتھ مغرب میں اور نیم ہم کے شاہی محل کی جاہ چل دیا
جہاں وہ شدید بیمار پڑ گیا۔

یہ کیتھرین کے لیے ایک سہری موقع تھا۔

8 جولائی کو گریگوری کی قیادت میں شاہی محافظ دستوں
نے جوتارخ میں Leib Guard کے نام سے معروف ہیں،
پیٹر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اشرافیہ کے بڑے طبقے
نے بغاوت کی حمایت کی۔ پیٹر کو معزول کر دیا گیا، کیتھرین کو
نئے حکمران کی حیثیت سے تخت پر بٹھا دیا گیا اور محل میں موجود
زار کے حامیوں کو جن جن کر قتل کر دیا گیا۔

جب روہشا کے شاہی محل میں قیم، کسی نہ اسرار مرض
میں مبتلا پیٹر کو بغاوت کی اطلاع ملی، اس کے سروں تلے سے
زمین نکل گئی۔ وہ جلد از جلد ہیٹ پیٹرز برگ پہنچا تاہم
لیکن بیماری کے باعث اُس کے لیے سفر ممکن نہیں تھا۔ وہ طبی طور
پر چند وفادار خادموں اور معالجین کے رحم و کرم پر تھا۔

بغاوت کے دوسرے روز اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ اُسے
زہر دیا گیا ہے، ایسا زہر جس نے اُس کے اندرونی اعضا کو کاٹ
ڈالا ہے۔ یہ زہر اُسے شراب میں ملا کر دیا گیا تھا۔

دوسری جانب سینٹ پیٹرز برگ میں جشن کا سماں تھا۔
کیتھرین کے سر پر تاج رکھا جا چکا تھا، اسے ملکہ کی حیثیت سے
قبول کر لیا گیا تھا۔ جو خواب آنکھوں میں سجائے مفلوک الحال
جرمن شہزادی نے روس کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، وہ سچ ہو چکا تھا
لیکن وہ متذبذب تھی، پیٹر تاحال زندہ تھا۔ وہ احمق توقع سے
زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا۔

بالآخر گریگوری نے یہ ذمہ داری اپنے چھوٹے بھائی
ایلیکس اور لوف کو سونپی، جو اپنے محافظوں کے ساتھ روہشا کے

انہیں مل گیا۔ اس نے بڑے ہی بہانہ طریقے سے ریشی مال و بیڑی گردن پر لپیٹا اور اس وقت تک مل دیتا رہا، جب تک اس نے دم نہیں توڑ دیا۔

پیر شاہی خاندان کا وہ اکیلا فرد نہیں تھا جو اس بغاوت کا فکارتا۔ ایسے کئی شہزادے جو مستقبل میں تاج پر اپنا حق جتا سکتے تھے، بڑی ہی خاموشی اور اسرار انداز میں قتل کر دیے گئے۔ مورخین کا ایک طبقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ پیر اور دیگر شہزادوں کے قتل میں کیتھرین براؤ راست ملوث نہیں تھی، یہ گریگوری کا منصوبہ تھا، جو ممکنہ بغاوت کو کچل کر اپنی محبوبہ کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔

حقیقت جو بھی ہو کیتھرین تخت پر بیٹھ چکی تھی، تاج اس کے سر پر رکھا جا چکا تھا اور اب وہی روس کے سیاہ و سفید کی مالک تھی!

برسر اقتدار آنے کے بعد جو پہلا حکم کیتھرین نے جاری کیا، وہ اپنے محبوب گریگوری کی ترقی سے متعلق تھا۔ رومی فوج کا اعلیٰ ترین عہدہ اُسے سونپ دیا گیا تھا۔

اُسی زمانے میں اُس نے ایک بیٹے الیسی کو جنم دیا جو کیتھرین اور گریگوری کی محبت کا نتیجہ تھا۔ اس لڑکے نے اپنی زندگی بھر کی نامی ایک گاؤں میں گزاری اور کبھی رومی سیاست میں بڑا کردار ادا نہیں کر سکا۔

☆☆☆

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ روس کی سرحدیں پھیل رہی تھیں۔ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں روس میں شامل ہو چکی تھیں۔ پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ پر تابو توڑ حملہ کئے جا رہے تھے۔ نئے دوستوں کی تلاش بھی زوروں پر تھی۔ برطانیہ اور روس کے رابطے بڑھ رہے تھے۔ نئی ملکہ کی معاشی پالیسیوں کے طفیل خزانے میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔

جہاں تک کیتھرین اور گریگوری کے عشق کا تعلق تھا، اب وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ پورا روس اس سے واقف تھا۔ کئی تو یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس رشتے میں شدت آتی جا رہی تھی۔ جاذبِ نظر گریگوری نے کیتھرین کو پوری طرح اپنے سر میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے خاندان پر نوازشات کی بارش ہو رہی تھی۔ خاصہ پالیسی میں بھی اُس کی مداخلت بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کے باوجود مرام کیتھرین سے مطمئن تھے، جس کا وہ اس کی ہر بات پر عمل کرتا تھا۔ رومی فوج کئی محاذوں پر کام کر رہی تھی، بحری بیڑوں کے ذریعہ روسی بحری بیڑوں کے خلاف کارروائیاں جاری تھیں۔

کیتھرین مسرور تھی، تاہم ایک شخص اُس کی خوشیوں کو برباد کرنے کے درپے تھا۔ اور یہ تھا ایشین سولو پوڈسکی جو اُس کے پُرانے عاشقوں میں سے ایک تھا اور اب اُسے پریشان کرنے لگا تھا۔ باثر پوڈسکی سے اس کی ملاقات 1755ء میں ہوئی تھی۔ چند مورخین کا خیال ہے کہ کیتھرین کے بطن سے پیدا ہونے والی ایثار حقیقت پوڈسکی ہی کی ناجائز اولاد تھی۔

کبھی یہ شخص کیتھرین کا منظور نظر تھا لیکن اب گریگوری اُس کا چہرہ بن گیا تھا۔ حسد کا مارا پوڈسکی خواہش مند تھا کہ ملکہ اُسے ماضی کی طرح ایک بار پھر اپنے قرب سے نوازے، اس انعامات کی بارش کر دے۔

”ملکہ آپ کا خادم حاضر ہے۔ وہ آپ کے دل کی خوشیوں سے بھر دے گا!“ وہ اکثر کیتھرین سے کہتا جو اُسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی لیکن وہ باز نہیں آتا۔

انگلی بار جب دونوں کا سامنا ہوتا، وہ پھر اُسے یاد دلایا کہ کبھی وہ ایک دوسرے سے محبت کیا کرتے تھے۔ ”کیا آپ کو حسین لہجہ یاد نہیں ملتا؟“

کیتھرین کو یہ خبر بھی مل چکی تھی کہ پوڈسکی کیتھرین اور اپنے معاشقے کی زوداد ہر دوسرے شخص کو سنا تا پھر رہا ہے خصوصاً بیرون ملک سے آنے والے مہمانوں اور سفار کا رد کو وہ یہ قصہ خوب مریج سالانہ لگا کر سنا تا جس میں وہ کو ایک محبت کی بھوکی اور جنسی خواہشات کی اسیر عورت روپ میں پیش کرتا۔

پوڈسکی رومی اشرافیہ کا اہم ستون تھا، ملکہ کے لیے راہ سے بٹھانا خاصا مشکل تھا لیکن اُس کے بڑھتے ہوئے تقاضوں نے کیتھرین کو پریشان کر دیا تھا۔ بالآخر حالات رُخ بدلا۔ پولینڈ کے خطے پر روس کی حکومت قائم ہونے امرکانات پیدا ہونے لگے اور تب کیتھرین کو اس ناخوار جان چھڑانے کا موقع مل گیا۔

1764ء میں اس نے پوڈسکی کو پولینڈ کا حکمران مقرر دیا۔ گوکہ وہ پولینڈ کے تخت پر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن حکم ہو چکا تھا جس کی رومی اشرافیہ نے حمایت کر دی تھی۔ اس میں گریگوری کی چال بازیوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

یہ ایک طرح کی ملک بدری تھی۔ اُسے سینٹ پیٹرز سے دُور کر کے کیتھرین نے اُس کے احمقانہ تقاضوں سے چھڑائی۔

جس روز پوڈسکی آخری بار ملکہ سے ملنے آیا، اُس پر غم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ”میں آپ کے قرب کا آپ کی کامیابی تھا لیکن آپ مجھے خود سے دُور بھیجتا چاہتی ہیں،

...جیسا آپ کا حکم۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“

”یہ تو میرے احسانات کی ابتدا ہے محترم پوڈسکی، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!“ ملکہ کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

آنے والے برسوں میں کیتھرین نے اپنے اس عاشق کو ہر ت کا نشان بنا دیا۔ پولینڈ کے حکمران کی حیثیت سے اُس نے اپنے انتہائی مشکل حالات پیدا کر دیے گئے۔ بالآخر کیتھرین کے انتقام نے اُسے تباہ و برباد کر دیا۔ 1795ء میں اُسے عزل کر کے سینٹ پیٹرز برگ بلوایا گیا جہاں اس نے اپنے اہلِ ایمان انتہائی کسپری میں گزارے۔ اسے جو وظیفہ ملا کرتا تھا وہ انتہائی کمزور تھا۔ پولینڈ کے فرماں رواں کی حیثیت سے اس نے ایک طلائی تخت تیار کروایا تھا، اُسے معزول کرنے کے بعد کیتھرین نے یہ تخت روس منگوایا اور اپنے غسل خانے میں لٹا دیا جس پر بیٹھ کر وہ غسل کیا کرتی تھی۔

اپنی حالتوں سے اپنے لیے تباہی کا سامان کرنے والا یہ شخص بالآخر قرضوں کے بوجھ تلے، امراض سے لڑتے ہوئے لاپرواہ گزر کر دم توڑ گیا۔

☆☆☆

ملکہ کیتھرین نے تخت سنبھالنے کے بعد جو پالیسیاں جاری کیں، انہوں نے روس کو یکسر بدل دیا۔ باغیوں کو نیست و نابود کیا، پوڈسکی جیسے احمق سے بھی وہ جان چھڑا چکی تھی اور وہ اہلِ امر پر بہت خوش تھی تاہم اسے اندازہ نہیں تھا کہ روس کے اہلِ اس کا محبوب گریگوری بھی تیزی سے بدل رہا ہے۔

وہ خاصا جارح ہو گیا تھا۔ رومانوی راتوں میں وہ ملکہ پر حملے اور لڑائی کی بارش کر دیتا جنہیں ملکہ گریگوری کی محبت کا یہ انداز سمجھتی۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اب یہ جبجو اس سے ملتا گیا ہے۔ اُس کا دل ادھیڑ عمر کیتھرین سے بھر گیا ہے۔

پھر ایک اُداس صبح جب کیتھرین بستر پر پڑی کراہ رہی تھی، خادمہ فاس دست بستہ سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں ملکہ عالیہ؟“

”ہلو، کیا کہنا چاہتی ہو؟“ وہ مسکرائی۔

”...“ خادمہ تذبذب کا شکار تھی۔ ”ملکہ مجھے معاف کرنا، میں اب چپ نہیں رہ سکتی۔ وہ گریگوری آپ کو دھوکا دے گا۔“

”...“ ملکہ اچھل پڑی۔ ”... کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”...“ ملکہ عالیہ! جن دنوں آپ بستر پر دراز اُن زخموں

کے منہل ہونے کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں، جو یہ ظالم شخص محبت کے نام پر آپ کو عطا کرتا ہے، وہ کل کی حسین خادماؤں کے ساتھ گل چھترے اُڑا رہا ہوتا ہے۔ اُسے آپ کی عزت کا ذرا پاس نہیں۔ اُس کی عیاشیاں حد سے تجاوز کر چکی ہیں لیکن وہ اتنا بااثر ہے کہ کوئی اُس کے خلاف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔“

خادمہ نے جو کچھ کیتھرین کو بتایا، اُس نے اُسے توڑ دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اُس کا محبوب، اس کا پیارا گریگوری اسے دھوکا دے رہا ہے۔ وہ کرب ناک لمحات تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے اپنے ایک مشیر کو گریگوری کی جاسوسی پر مامور کیا جس نے دوسرے ہی دن اُس کا کچا چٹھا کھول دیا۔

”اُسے فوراً میرے سامنے حاضر کیا جائے!“ ملکہ نے حکم جاری کیا۔

دوسری جانب گریگوری کو بھی اطلاع مل چکی تھی کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ جب بلاوا آیا تو اس نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور ملکہ کی خواب گاہ کی جانب چل دیا۔

چند لمحات بعد ملکہ کی خادماؤں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دروازہ، خور و اور طاقت کا پہاڑ گریگوری کیتھرین کے قدموں میں بیٹھا رو رہا تھا، اپنی غلطیوں کی معافی مانگ رہا تھا اور اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ فقط اسی سے محبت کرتا ہے۔

کیتھرین واقعی گریگوری پر فریفتہ تھی، اُس نے اُس دعا باز کو معاف کر دیا، کھڑا کیا اور سینے سے لگالیا۔ اور اُس لمحے گریگوری مسکرایا۔ اُس کی چال کامیاب رہی تھی۔ وہ ملکہ کے کمزوریوں سے واقف تھا، اُس نے چند آنسو بہا کر اُس کے دل کو نرم کر دیا تھا۔ اُس رات اس نے کیتھرین پر بھرپور انداز میں اپنی محبت نچھاور دی۔

”میں آج بھی انتقام سے محبت کرتا ہوں!“ نیند کی وادی میں اُترنے سے قبل اُس شاعرِ نفس نے ملکہ کے کان میں سرگوشی کی۔

☆☆☆

ملکہ سلطنت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکی تھی اور اب وہ سنجیدگی سے اپنے محبوب گریگوری اور لوف سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس نے اس ضمن میں اپنے ذہین مشیر نکیتا پینین سے مشورہ کیا، جس نے اُس پر واضح کر دیا کہ یہ اقدام تباہ کن ثابت ہوگا۔

”آپ ایک عظیم ملکہ ہیں۔ ہم سب آپ کے خادم ہیں اور ہمہ وقت آپ کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ شوہر کا بیوی پر

قانونی حق ہوتا ہے، بہتر ہے کہ آپ یہ حق کسی کو نہ دیں۔ ویسے آخری فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کو ہے لیکن میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ خود مختار زندگی گزاریں۔“

کلکتہ تین درست تھا۔ بے شک گریگوری روس کا سب سے بااثر اور مال دار شخص تھا، ملکہ اُس پر مہربان تھی، اُس کی اشرافیہ پر بھی گرفت مضبوط تھی لیکن بڑھتی ہوئی عیاشیاں اُسے تباہی کی جانب دھکیل رہی تھیں۔

ملکہ کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے بعد، چند ماہ تک تو ذہین گریگوری اُس پر بھرپور توجہ دیتا رہا لیکن جلد ہی وہ اپنی جون میں لوٹ آیا۔ پھر درشت ہو گیا، ملکہ پر تشدد کرنے لگا اور ایک بار میسر محل کی ایک معمولی کنیر کے ساتھ عشق لڑاتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

ملکہ کا دل جیتنے کے لیے اُس نے ایک بار پھر وہی طریقہ اپنایا۔ قدموں میں بیٹھ گیا، معافی مانگی، آنسو بہائے۔ ملکہ کا دل پھر پھل گیا۔ اُسے معاف کر دیا گیا۔

چند ماہ بعد پھر یہ عمل دہرایا گیا۔ ایک بار پھر وہ ملکہ کے سامنے زار و قطار رو رہا تھا۔

کیترین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ گریگوری اب اُس سے اُوب چکا ہے، اُس پر اعتبار کرنا خطرناک ثابت ہوگا۔ تیسری بار رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد ملکہ نے اُسے معاف تو کر دیا تھا لیکن اُسے اپنی التفات سے محروم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس شام کیترین نے اپنے مشیر کلکتہ سے کہا۔ ”تم درست تھے ذہین بزرگ۔ جب ہم اپنی خوشیاں دوسروں سے وابستہ کر لیتے ہیں تو نتیجے میں فقط ہمیں غم ہی ملتے ہیں۔ اب گریگوری ہمارے دل سے اُتر چکا ہے۔“

بوڑھے کلکتہ تین کا خیال تھا کہ یہ جملے ایک شکستہ دل عورت نے ادا کئے ہیں لیکن اُس کا اندازہ غلط تھا۔ کیترین واقعی گریگوری سے اُوب چکی تھی۔ اب وہ نئے شکار کی تلاش میں تھی اور شکاری کی نظر ایک فوجی جرنیل الیگزینڈر واسل چیکوف پر ٹھہری۔

اب وہ ایک کھاگ کھلاڑی تھی، جلد ہی اُس نے نوجوان الیگزینڈر کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ جس حسین رات الیگزینڈر نے اس شاطرہ عاشق مزاج ملکہ پر اپنی محبت نچا داری، وہ زیر لب بولتا تھا۔ ”گریگوری جہنم میں جاؤ۔ مجھے تمہارا متبادل مل گیا ہے۔“

اسکے ہی ماہ الیگزینڈر کی ترقی ہوئی، ملکہ کی التفات نے اُسے ایک بااثر فوجی افسر بنا دیا تھا۔

1771ء کا سال گریگوری کے لیے قاتل ثابت ہوا۔

اسے روس سے برسرِ پیکار قوتوں سے مذاکرات کے لیے رومانیہ کے شہر فوکسائی بھیجا گیا تھا لیکن وہ عثمانیوں کی ضد اور اپنی اشتعال انگیزی کی وجہ سے ناکام رہا اور یہ ناکامی اُس کے زوال کے ثبوت کی آخری کیل ثابت ہوئی۔

وہ ملکہ سے اجازت لیے بغیر جب سینٹ پیٹرز برگ پہنچا تو یہ جان کر بھونچکا رہ گیا کہ اُسے معزول کر دیا گیا ہے اور اب پوٹسڈم روس کی فوج کا نیا، بااختیار سربراہ ہے۔

اس ذلت نے اُسے آگ بگولا کر دیا لیکن وہ بے بس تھا۔

اپنے عہدے اور اختیارات کا دوبارہ حصول فقط ایک صورت میں ممکن تھا کہ وہ ملکہ کا دل جیت لے لیکن یہ کسی طور آسان نہیں تھا۔ کیترین کا دل جیتنے کے لیے اُس نے ملکہ کو تاریخی اہمیت کا حامل ہیرا جو تاریخ میں اور لوہ ہیرا کے نام سے معروف ہے، بہ طور تحفہ پیش کیا۔ ملکہ نے تحفہ تو قبول کر لیا لیکن عہدے کی واپسی کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

چند روز بعد رونما ہونے والے ایک واقعے نے گریگوری کو یہ یقین دلادیا کہ کھیل اُس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

اُس شام محل میں فوجی افسران کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں گریگوری کی پیش کردہ تجاویز پر سخت تنقید کی گئی۔ الیگزینڈر جیسے نوجوان افسر نے بھی جواب ملکہ کا چیتا تھا اُسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔

فوج کا نیا سپہ سالار پوٹسڈم جو کل تک گریگوری کے اشاروں پر چلا کرتا تھا، اجلاس کے دوران خاموش رہا تھا۔ آخر میں جب اُس کے بولنے کی باری آئی، اُس نے بھی گریگوری کی تجاویز کو رد کرتے ہوئے الیگزینڈر کی حمایت کر دی۔

اُس شام عظیم گریگوری، سات سالہ جنگ کا ہیرو ٹوٹ گیا۔ اس واقعے کے بعد اُس نے کثرت سے شراب نوشی شروع کر دی۔ ملکہ نے بھی اُس کی جانب توجہ نہیں دی۔ پھر فرخ آئی کہ وہ ایک معمولی لڑکی کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔

جب کیترین کو یہ اطلاع ملی، اس کے چہرے پر استہزاء سے مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”تم بھاگ سکتے ہو لیکن جیسے نہیں سکتے!“ یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے نئے عاشق الیگزینڈر کو اشارہ کیا جو اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

چند روز بعد خبر ملی کہ گریگوری اپنا ذاتی توازن کھو بیٹھا ہے۔ شراب کی لت نے اُسے تباہ کر دیا ہے اور وہ قرضوں سے بوجھ تلے دب چکا ہے۔ بالآخر 1783ء میں وہ ماسکو میں دم توڑ گیا۔

جس صبح اُس کی موت کی اطلاع نے روس کے ہمسایوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

کے دروازوں پر دستک دی، ملکہ نے شاہی محل سے منسلک ادویہ کے اُس ماہر کو بیش قیمت اشرافیوں سے نوازا جو ہر کے استعمال پر یہ طوطی رکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆
الیگزینڈر ملکہ کا منظور نظر تھا لیکن وہ جلد ہی رنگین مزاج کیترین کے دل سے اُتر گیا کیونکہ اُسے نیا شکار مل گیا تھا۔ ایک ایسا شخص جو حقیقی معنوں میں اُس کی خواہشات پوری کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ اور یہ تھا، فوج کا نیا سربراہ اور روس کا اہل ترین شخص پوٹسڈم!

وہ ایک دیو قامت شخص تھا۔ گوکہ کیترین کے پُرانے ماشتوں کی طرح وجہ نہیں تھا لیکن وہ توانائیوں سے بھرپور تھا۔ دراصل اس تعلق کا آغاز 1772ء ہی میں ہو گیا تھا جب کیترین نے گریگوری کو اپنے دل کے مکان سے بے دخل کیا تھا لیکن ملکہ کے محبوب کی اسامی الیگزینڈر نے فوراً ہی بھر دی۔

1773ء میں پوٹسڈم محاذ پر چلا گیا۔ یہی وہ موقع تھا جب ملکہ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ دیو پھل پوٹسڈم کی یاد اکثر باتوں کو اُسے ستاتی ہے۔ جنوری 1774ء میں جب وہ ایک مٹی ہیرو کی حیثیت سے سینٹ پیٹرز برگ لوٹا تو سیدھا ملکہ کی لہوں میں چلا گیا کیونکہ اُس وقت تک عاشق بدلنے کی شوقین کیترین الیگزینڈر سے اکتا چکی تھی۔

اُسے بے شمار اعزازات سے نوازا گیا، نوازشات کی دھن کر دی گئی، جس سے روس کی اشرافیہ میں بے چینی پھیل گئی کیونکہ وہ نوجوان پوٹسڈم کی صلاحیتوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے لیکن جلد ہی اُس کی سیاسی چالوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کھاگ کھلاڑی ہے۔

کیترین نے اپنا دل بہلانے کے لیے اور بھی عاشق تلاش کئے تھے لیکن پوٹسڈم کو یہ برداشت نہیں تھا۔ اُس نے ایک لڑکی کے تمام عاشقوں کی چٹنی کروادی۔ جلد ہی روس کے مٹی لوگوں میں اس عشق کے چرچے ہونے لگے۔ یہ افواہیں بھی گردش کر رہی تھیں کہ دونوں نے شادی کر لی ہے۔ مٹی مواقع پر گھرین نے اُسے اپنے شوہر کی حیثیت سے متعارف کروایا، لیکن اس رشتے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ دراصل پوٹسڈم یہ سمجھ چکی تھی کہ خود مختار رہنے ہی میں اُس کی بہتری ہے۔

لیکن ایک دلچسپ شخص تھا۔ گوکہ وہ روس کی تاریخ کا بہترین جرنیل تھا اور اُس نے کئی جنگیں جیتیں لیکن تو بھی چلنے والے آدمی سے وہ خوفزدہ ہو کر ہر قدم پر گھبراہٹ لگتا تھا۔ وہ اپنے عالی مل میں ساہو چل پھرتا تھا۔ اُس کے بال ہمیشہ

معاذ اللہ یہ گزشتہ

بکھرے رہتے۔ وہ جنگیوں کی طرح کھانا کھاتا۔ لباس کا بھی خاص خیال نہیں رکھتا، الغرض وہ کسی طور ملکہ کے قابل نہیں تھا لیکن وہ ایک پُر قوت انسان تھا جس کی قربت ملکہ کو خوشی سے سرشار کر دیتی، اسے مسرت سے بھر دیتی۔ یہی سبب ہے کہ اُس نے پوٹسڈم کو اس کی تمام تر خامیوں کے ساتھ قبول کر لیا۔

☆ ☆ ☆
پوٹسڈم، روس کا مرد آہن، ریاست کا سب سے طاقتور آدمی غصے اور رقابت کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا، اپنے رقیب کو نیست و نابود کروانا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اُسے ملکہ کی آشیر باد حاصل تھی۔ پوٹسڈم جس عذاب کا شکار تھا، اس کا سبب پوٹسڈم کی تھا، جو اب ملکہ کا نیا چہوتا تھا اور پوٹسڈم کو دودھ میں سے کھٹی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا تھا۔

ملکہ یودو کی کی محبت میں اس حد تک اندھی ہو چکی تھی کہ اُس نے نہ صرف پوٹسڈم کو اپنے دل کے مکان سے بے دخل کیا بلکہ عہدے سے بھی معزول کر دیا۔ یہ عہدہ اب زیودو کی کے پاس تھا۔

پوٹسڈم دلیرانہ تھا لیکن اُس نے ہار مارنے کے بجائے کیترین کو جیتنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

زیودو کی اور ملکہ کا معاشرہ فقط ایک برس جاری رہا۔ بااثر اشرافیہ اور شیروں کے مشورے پر بالآخر اُس نے 1776ء میں اس نوجوان سے اپنا رشتہ ختم کر لیا۔

مورخین کے مطابق اگرچہ بعد میں کیترین نے زیودو کی سے دوبارہ رشتہ بحال کرنے کی کوشش کی، تاہم چند وجوہات کے وجہ سے وہ بھروسہ نہیں کر سکی۔

جہاں تک پوٹسڈم کا تعلق ہے، وہ فوجی قسمت رہا کہ ملکہ کے دیگر ملہاق کی طرح اس کا اسلام، دھاک نہیں ہوا۔ معاشرہ مٹنے ہونے کے بعد ہی ملکہ اور اس کے درمیان دوستانہ روابط رہے اور پوٹسڈم اپنی زندگی کے آخری برسوں تک اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔

☆ ☆ ☆
گوکہ کیترین ایک عاشق مزاج عورت تھی لیکن روس پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ تعلیم اور صحت کے میدانوں میں اُس کے اصطلاحات نے روس کو ایک نئے عہد میں داخل کر دیا تھا۔ معیشت بھی تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ مذہب کے ساتھ اُس نے فلسفے اور منطق کے میدان پر بھی خصوصی توجہ دی۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی رومان پسند طبیعت کے باوجود ملکہ کی شہرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

البتہ کامیابیوں کے اُس زمانے میں کیتھرین کو صحت کے مسائل نے پریشان رکھا۔ بچپن میں اُس کا سر بہت چھوٹا تھا لیکن جب وہ چھبیس برس کی ہوئی، اُس کی کھوپڑی اچانک بڑھنے لگی۔ کئی آپریشن ہوئے، متعدد معالجین نے اُس کا علاج کیا لیکن سو فیصد افاقہ نہیں ہوا۔ اکثر اُسے دردِ سر کی شکایت رہتی تھی۔ دورے بھی پڑتے تھے۔ وہ زور دینے نہیں سکتی تھی۔ اچھی جس مزاج رکھتی تھی لیکن ایک معاملے میں وہ خاصی سخت تھی، اگر کوئی شخص اُس کی انا کو نہیں پہنچاتا تو وہ اُسے تباہ کر دیتی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کا وزن بھی بڑھ رہا تھا۔ گوکہ وہ کھانے کے معاملے میں بہت احتیاط برتی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی میں شراب کا ایک قطرہ بھی حلق سے نہیں اُتارا۔ وہ تو پہلوں کا رس پیا کرتی تھی، ہادی غذا سے دُور رہتی تھی لیکن وزن تھا کہ بڑھے ہی جا رہا تھا۔

وہ ہر صبح بیدار ہونے کے بعد کافی کی پانچ پیالیاں پیا کرتی تھیں، معالجین نے اُسے یہ عادت ترک کرنے کا کئی بار مشورہ دیا، لیکن کیتھرین نے اس معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ وہ تمباکو چبانے کی عادت میں بھی مبتلا تھی، جو اُس کے لباس پر بکھرا رہتا تھا۔

زندگی کے آخری برسوں میں تو بڑھتا وزن کیتھرین کے لیے عذاب بن گیا۔ نقاہت کے دنوں میں وہ اپنے بوجھ کو اُٹھانے سے خود کو قاصر پاتی۔ اکثر دھیل چیر پر نظر آتی۔ اس صورتِ حال نے اُسے چڑچڑایا دیا۔ وہ اپنے بیٹے پال کے ساتھ سختی برتتے تھے۔ اپنے پوتے پوتیوں کو بھی جھڑک دیتی۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری کرنے سے انکار کر دیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ آخر کے برسوں میں اُس نے ایک آمر کا روپ اختیار کر لیا تھا۔

ان سب کے باوجود اُس نے عشق لڑانے کی عادت ترک نہیں کی۔ ہر سال وہ اپنے عاشق بدلتی۔ انتہائی کم عمر نوجوان اس کے پہلو میں نظر آتے، جنہیں وہ بڑے بڑے عہدوں سے، انعامات سے نوازتی۔ خوشامدیوں پر وہ پیسا پانی کی طرح بہاتی۔ کیتھرین کی متنازعہ شخصیت اور عاشقوں کی طویل فہرست نے اُس کی بابت عجیب و غریب، انتہائی بیہودہ ہنسی قہقہے مشہور کر دیے تھے، تاہم اُس دل پھینک عورت کو ان باتوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

جن دنوں ساٹھ سالہ رچمن مزاج ملکہ لمبوسات کی طرح ماضی بدل رہی تھی، ایک 22 سالہ، شرمیلے نوجوان نے اُس کے دل کے دروازے پر دستک دی۔ انتہائی فریب، تمباکو چبانے والی ملکہ نے دل کا دروازہ کھولا، وہ نوجوان مسکراتے ہوئے

اندرا داخل ہو گیا اور روس کا سب سے بارسوخ شخص بن گیا۔ یہ نوجوان پلوٹون زیرِ قہر تھا جو عمر میں اُس سے 38 برس چھوٹا تھا لیکن ملکہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ گوکہ مخلص خیرد نے اسے سمجھایا کہ ریاست پر اُس کی گرفت کمزور ہو رہی ہے، ان حالات میں وہ ایک اور معاشرے کی محنت نہیں ہو سکتی لیکن بااخلاق، تہذیب یافتہ پلوٹون زبیر کے سامنے وہ ڈھیر ہو گئی جو تحقیق کے مطابق اُس کا آخری محبوب تھا۔

پلوٹون کا تعلق ایک بااثر سیاسی و کاروباری خاندان سے تھا۔ اُس کے رشتے دار اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، ان ہی کی توسیع سے اُس نے ملکہ تک رسائی حاصل کی، جس کے بعد اُس کی قسمت چمک اُٹھی۔

پلوٹون سے ملاقات کے بعد اگست 1789ء میں کیتھرین نے اپنے پُرانے عاشق پوٹسکن کو ایک خط لکھا جس میں اس نے ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”میں مایوس کن اور سردنوں کے بعد بالآخر زندگی جانب لوٹ آئی ہوں۔ میں تیار ہوں اور میرا ایک ننھا لیکو وجہ دوست بھی ہے۔ وہ بہت ہی پیارا ہے۔ جب میں اُسے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی، تو وہ رونے لگتا ہے۔“

تاریخ بتاتی ہے کہ پوٹسکن نے اس خط کا جواب نہ دیا۔ روس کے دیگر باسیوں کی طرح اُسے بھی ساٹھ سالہ ملکہ ایک نیم پختہ نوجوان سے عشق لڑنے کا خیال احمقانہ لگا۔ ”شاید بوڑھی اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔“ اُس نے سے کہا۔ ”جلد ہی وہ اس سے ادب جائے گی!“

لیکن وہ غلط تھا۔ یہ نوجوان اگلے چھ برس تک کیتھرین کے دل کو گرماتا رہا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیرتا لیکن وقت بہت ظالم شے ہے، وہ سب کچھ بدل دیتا ہے۔

1795ء کے اواخر میں معاملات تیزی سے بد گئے۔ کیتھرین کی صحت گر رہی تھی۔ ادویہ کے مسلسل استعمال نے اُس کے اعصاب کو بوجھل کر دیا، اُسے زور دینے بنا دیا، گوکہ وہ خود کو معروف رکھنے کی کوشش کرتی، چاق و چوبند کرنے کے جتن کرتی، لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ اُس کی رہنمائی وقت قریب آ رہا ہے۔

اُن ہی دنوں وہ تواتر کے ساتھ، طہریہ پیرائے میں خاص و عام کے سامنے یہ بات دہرانے لگی کہ اُس کا بیٹا پٹیر کا نہیں بلکہ اُس کے پہلے محبوب سائٹی کوف کا بیٹا ہے۔ بات نے مستقبل کے بادشاہ کو اپنی ماں سے متنفر کر دیا۔ اضطراب کے ابتدائی زمانے میں تو نوجوان پلوٹو

اُم گسار بن رہا لیکن پھر وہ اپنی مصروفیات میں الجھ گیا۔ دوسری جانب کیتھرین کو یہ خیال ستانے لگا کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے، جبکہ اس کا محبوب جوان اور طاقتور ہے، وہ ضرور اسے دھوکا دے گا۔

کچھ عرصے بعد یہ خیال راسخ ہو گیا۔ ایک بار تو وہ اتنی اگ بگولا ہو گئی کہ خادموں سے پلوٹون کو دھکے دے کر خواب گاہ سے نکلوا دیا۔ اُسے معزول کرنے کی بلکہ قتل کرنے کی بھی فکر دے ڈالی۔

اس واقعے نے پلوٹون کو متنفر کر دیا۔ گوکہ بعد میں ملکہ نے اس سے معافی مانگ لی، لیکن اب وہ شاہِ شاذ ہی اُس کی خواب گاہ میں آتا۔ اُس کی محبت کے جواب میں کسی خاص گرم جوشی کا ظاہر نہ کر سکتا۔ آنے والے چند ماہ میں وہ کیتھرین سے ٹکرانے لگا۔ جب وہ اُسے بلواتی، وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔

کیتھرین کو یقین ہو گیا کہ پلوٹون بے وفائی کا مرکب ہے۔ وہ اُسے سخت سزا دینا چاہتی تھی لیکن اب وہ ذہنی و جسمانی طور پر اتنی بکھر چکی تھی کہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتی۔

ایک روز اُس نے پلوٹون کو پیغام بھجوایا کہ وہ شدید بیمار ہے اور خواہش مند ہے کہ ششکشی کے اس زمانے میں پلوٹون اُسے قہرے رکھے!

اس شام پلوٹون آیا ضرور لیکن فقط چند لمحات کے لیے... وہی ادویہ کے زیرِ اثر بوڑھی ملکہ غنودگی میں گئی، وہ خواب گاہ میں لے لی گئی۔

چند محققین کا خیال ہے کہ نوجوان پلوٹون ملکہ سے مخلص تھا، وہ اسے دھوکا نہیں دے رہا تھا، دراصل مستقبل کے بادشاہ نے اسے بڑی چالاکی سے اُسے ریاستی معاملات میں الجھا دیا تھا۔

بہرِ جو بھی رہی ہو، سچ تو یہ ہے کہ دھیرے دھیرے عظیم کامیابیت کا شکار ہوئی گئی۔ اندر ہی اندر ٹوٹتی گئی۔

پھر پورے دہائی زندگی گزارنے والی کیتھرین کی زندگی کے اگلے چھ برس بکھے تھے۔ اُس کی خواب گاہ میں ستارے ٹپکنے لگے، خاموشی گشت کرنے لگی تھی۔ گوکہ محافل میں وہ خود کو ماحول میں لگتی لیکن تنہائی میں مایوسی اُسے گرفت میں لے لیتی تھی۔ غروب ہونے کے بعد وہ خواب گاہ میں بیٹھ کر اپنے گہوارے میں رہتی۔

ان ہی اُداس شاموں میں سے ایک شام شدید طوفان اُٹھا، دروازے پر دستک دی۔ ملکہ پر غنودگی نے یلغار کر لی، اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ پلوٹون کو پکارنے لگی کہ اُس کو پکارنے لگی۔ پھر اُس نے الیکٹریٹر کا نام لیا،

پھر وہ سائٹی کوف کو یاد کرنے لگی۔ گرگوری کا نام لے کر سسکیاں لینے لگی!

اُس وحشت ناک رات کیتھرین نے خواب میں ہر اُس مرد کو دیکھا جس نے کبھی اُسے اپنی بانہوں میں بھرا تھا، اُس کا پہلو گرم کیا تھا مگر صرف خوشنودی کے لیے، عہدے اور طاقت کے حصول کے لیے... اُن میں کوئی اُس سے محبت نہیں کرتا تھا!

☆☆☆

16 نومبر 1796ء اُس معتمد صبح کیتھرین نے معمول کے مطابق کافی کے کئی کپ حلق میں اُنڈیلے اور پھر کاغذات سنبھالنے اسٹڈی میں جا بیٹھی۔

جب خادمہ خاص، ماریا نے اُس سے گزشتہ رات کی بابت پوچھا، تنہائی کی شکار ملکہ نے بڑے ہی اُداس لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے سکون سے سوئے برسوں بیت گئے ہیں۔ شاید میری نیند بھگن گئی ہے!“

صبح کو بچے وہ لباس تبدیل کرنے کے ارادے سے غسل خانے میں داخل ہوئی۔ جب کافی دیر تک نہیں لوٹی، تو پریشان خادمہ نے غسل خانے میں جھانکا۔ روس کی عظیم ملکہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ چہرے پر شکستہ کے سائے تھے، بغض و دُوب رہی تھی اور جسم پیلا پڑ گیا تھا۔

ملازمین نے اُسے اُٹھا کر بنگ پر لٹا دیا۔ ایک گھنٹے بعد شاہی معالج اُس کی خواب گاہ میں داخل ہوا جس نے ابتدائی تشخیص کے بعد اعلان کر دیا کہ اُسے دل کا دورہ پڑا ہے۔

معالجین کی بھرپور کوشش کے باوجود وہ کوما میں چلی گئی جہاں کیتھرین دی گریٹ کو تاریکی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لگ لیا۔ 17 نومبر کی صبح دس بجے اُسے مردہ قرار دے دیا گیا۔ وصیت کے مطابق اُس کے مردہ جسم کو سلیدرنگ کا ثابانہ لباس پہنایا گیا۔ سر پر سلیدر تاج رکھا گیا۔ 23 نومبر کو اس کے ہسدخان کی کو انتہائی قیمتی تابوت میں لٹایا گیا اور اسے سینٹ پیٹرز برگ کے شاہی قبرستان میں سابق زار اور اس کی شوہر پٹیر کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

تدفین کی تقریب میں اُس کے کسی عاشق نے شرکت نہیں کی، کیونکہ اُن میں بیشتر پہلے ہی قبر میں اتر چکے تھے۔ اور جو زندہ تھے، اب انھیں مردہ کیتھرین میں کوئی دلچسپی نہیں تھی!!

☆☆☆

ماخذات:

ویکی پیڈیا، ہسٹری چینل، Little Known Facts، About Well Known People، انڈیل کارنگ

فلمی افیقہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
مہرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے ناد رورنگار حال حال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف
صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل
ہوں اور اپنے روزاں کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی
پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کہیں تھکن کا شکار نظر
آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں وہ جس شعبہ سے بھی وابستہ رہے اپنی نمایاں حیثیت کی
دلیان اس کی پختائی پر فائدہ بردے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے
وابستگی کے دوراں میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت
سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید
اور عمل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طوفاں اور بہت زیادہ قابل
رہنمائی ہے۔ آہستہ بہ آہستہ ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج
جواب معلوم ہو رہا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان در داستان سرگزشت

غالب نے کہا تھا:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیماردار
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاساں کوئی نہ ہو
حیرت ہے کہ دو سو سال پہلے حضرت غالب کو کیسے معلوم
ہو گیا تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے۔ آج کل افرا
کا دور ہے۔ خاندانی نظام ختم ہو چکا ہے۔ سب اکیلے ہو گئے
تو پھر بیمار داری کون کرے؟ قریب ترین عزیزوں کے پاس

ماری کی فرصت نہیں ہے۔ معروقات، فاصلے اور دیگر
بہانے ہونے لگے ہیں کہ انسان بیماروں کے لیے بھی وقت نہیں
پاس کیونکہ بیماری پر تو انسان کا بس نہیں چلتا۔ البتہ بیمار داری
لی ضرورت آج بھی ہے۔ اب تو ایسا زمانہ آ گیا ہے جب
ہر ملازم رکھنے پڑے ہیں یا بیمار داروں کے ادارے قائم
کئے ہیں جنہیں اینڈنٹ یا میل نرس کہتے ہیں، نرسنگ
ہاؤس ادارے بن گئے ہیں۔ کرائے پر ان کی خدمات
مل کی جاتی ہیں۔ وہ آ کر آپ کی بیمار داری کرتے ہیں۔

جیسے یورپ، امریکا میں ہوتا ہے کہ کفن و دفن کا بندوبست بڑے
بڑے ادارے کرتے ہیں۔ غم خواری میں بھی کرائے داری کام
آتے ہیں غرضیکہ ہر کام کرائے پر ہو جاتا ہے۔ یہ جدید زمانے
کی ترقی کی برکتیں ہیں۔

بچھلے دلوں ہم بیمار پڑے (زیادہ اور دیر تک) تو معلوم
ہوا کہ بچپن میں جوسنا کرتے تھے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے، وہ
کتنا درست تھا۔ اس وقت تندرستی کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔
جوں جوں عمر بڑھتی ہے آپ کا احساس شدید ہو جاتا ہے کہ



واقعی تندرستی ہزار نعمت ہے۔

دوسرے ملکوں کا ذکر چھوڑے مگر اپنے ملک میں بیمار پڑنا سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اگر کوئی غریب ہے تو اس کو مناسب دوا اور دوا بھی میسر نہیں۔ نہ دوائیوں کے لیے پیسے، نہ ڈاکٹروں کے لیے فیس۔ آج کل ہر اسپیشلسٹ ایک بار معائنے کے لیے ایک ہزار روپے وصول کرتا ہے اور صبح سے شام تک کم از کم پچاس مریض ضرور بھگتا دیتا ہے۔ اور صبح سے شام تک لاکھوں کی کمائی ہے۔ مگر شاید انکم ٹیکس والوں کو اس کا علم نہیں ہے یا پھر وہ بہ وقت ضرورت استعمال کے لیے صرف نظر کرتے ہیں۔ غریب یہ رقم کہاں سے لائے بھی اس کا مقدر ہے۔

اسپیشلسٹ کتنا ہی معروف اور بڑا کیوں نہ ہو، ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل ہمارے ہاں زیادہ تر ڈاکٹروں کی ڈاکٹری "شاید" کے اصول پر چل رہی ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر کے پاس جائیں۔ وہ آپ سے فیس لے لے گا مگر نسخے کے بجائے ایک ٹیسٹ یا کئی ٹیسٹ کرانے کا کاغذ آپ کے ہاتھ میں تمھارے گا۔ آج کے ڈاکٹروں کو دیکھ کر پُرانے زمانے کے ڈاکٹر بہت یاد آتے ہیں جو اسپیشلسٹ تو نہ تھے مگر ہر مرض کا علاج کر دیتے تھے۔ ٹیسٹ نے ڈاکٹروں کا کام آسان کر دیا ہے۔

ہم نے پرچی دیکھ کر کہا "ڈاکٹر صاحب، مگر مجھے یہ لگتی فیس تو نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "ہزاروں مرض انسان کے جسم کے اندر چھپے ہوتے ہیں اس لیے سب ٹیسٹ ضروری ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب ہمیں تو کبھی یہ شکایت ہی نہیں ہوئی۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "ڈاکٹر میں ہوں یا آپ؟ پاکستان میں اٹھارہ کروڑ ڈاکٹر ہیں۔ ہر شخص خود کو ماہر ڈاکٹر سمجھتا ہے۔ آپ ٹیسٹ تو کرائیے پھر دیکھیں گے۔"

ٹیسٹ، ایکس رے اور الٹراساؤنڈ۔ آج کل کے ڈاکٹروں کے ہتھیار ہیں جنہیں وہ مریضوں پر آزما رہے ہیں اور جس طرح میڈیکل کی ابتدائی تعلیم میں چوہوں اور مینڈکوں پر تجربے کیے جاتے ہیں، اس طرح آج کل کے ڈاکٹر اپنے مریضوں پر تجربے کرتے رہتے ہیں۔ دیکھیے کیا اچھا کام ہے، تجربہ کا تجربہ اور آمدنی کی آمدنی۔

ذہیر سارے ٹیسٹ کرانے کے بعد ان کی رپورٹیں لے کر ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے۔ دراصل رپورٹوں میں جو لکھا تھا، کوشش کے باوجود وہ اصطلاحیں ہماری سمجھ میں نہیں

آئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام رپورٹیں دیکھیں اور کہا "مبارک ہو، تمام رپورٹس کلیئر ہیں۔ آپ کو ان میں سے کوئی بیماری نہیں ہے۔ مگر بہتر ہو کہ آپ فلاں اسپیشلسٹ کے پاس بھی چلے جائیں تو اور بھی اطمینان ہو جائے گا یا مرض کا علم ہو جائے گا۔"

ہم فلاں اسپیشلسٹ کے پاس گئے۔ وہ بہت خوش مزاج اور فیس کھتے تھے۔ انہوں نے ہماری بات سن کر فوراً چار ٹیسٹ لکھ دیے اور کہا کہ یہ بہت ضروری ہیں۔ ان میں بعض بہت

جب رپورٹس لے کر ان کے پاس گئے تو وہ مسکرائے اور کہا "مبارک ہو، آپ کو وہ شکایات نہیں ہیں جن کا خطرہ تو لیکن بہتر ہو کہ احتیاطاً آپ ایک چھوٹا سا آپریشن کرائیں یا پھر زیادہ عرصے تک دوائیں کھائیں، اب جو آپ پسند کریں۔"

ہم نے سوچا کہ طویل عرصے دوا کی استعمال کرنے کے بجائے دو تین دن کا آپریشن کرائیں۔ جب ہماری بچیوں کو علم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب، جب آپریشن کے بغیر ہی کام چل سکتا ہے تو آپ آپریشن کیوں کرتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب بولے "یہ تو ان کی اپنی مرضی ہے۔ میں نے تو دوا پشنز بتائے تھے۔"

انہوں نے ہمیں دوائیاں لکھ دیں مگر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ فلاں فلاں ڈاکٹر سے بھی مل لیں تو مزید اطمینان ہو جائے گا۔

یہ ٹیسٹ اور الٹراساؤنڈ ہمیں دوسری لیبارٹری کے کرانے تھے۔ مجبوراً کرائے مگر ڈاکٹر صاحب سے شکوہ نہ کیا کہ ہمارے جسم میں اتنا کم خون ہے، وہ بھی آپ ڈاکٹر حضرات اتنی فراخ دلی سے نکلوار ہے ہیں۔

انہوں نے ہمیں پھر دیا کہ انسان کے جسم میں کتنے خون ہوتا ہے اور جب ٹیسٹ کے لیے خون نکالا جاتا ہے قدرت فوراً اس کی کمی پوری کر دیتی ہے۔

یہ سب رپورٹس بھی کلیئر تھیں۔ درجنوں ٹیسٹ ہو جانے کے بعد بھی مرض کا سبب اور اصلی مرض سمجھ میں نہیں آیا تھا اس لیے انہوں نے ہمیں ایک اور ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ ہماری سمجھ میں تو یہ آیا کہ ڈاکٹروں اور لیبارٹری والوں ایک یونین ہے جنہیں مریض نما انسانوں کو بے وقوف بنا کا گرا تا ہے۔ وہ سب مل کر مریضوں کے ساتھ تجربہ مذاق کرتے رہتے ہیں، جب تک ٹیسٹ ملل ہوتے، یہ بخود اللہ کی قدرت سے تندرست ہونے لگے تھے۔

لوہوں کی ایکس قدرت نے ناکام بنا دی تھی۔

پرائیویٹ ڈاکٹر ایک زمانے میں خاص مخلوق سمجھی جاتی تھی، جہاں مقررہ وقت پر آپ کا معائنہ ہو جاتا تھا مگر اب ہزار روپے فیس دینے کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے آپ مال ہیں اور ڈاکٹر آپ کے مالک۔ گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے پرائیویٹ ڈاکٹر کے کلینک پر ایک جنرل اسپتال کا لہان گزرتا ہے۔ ہر طرف مریض ہی مریض۔ لگتا ہے سارا اس مرض میں مبتلا ہے۔ کئی گھنٹے انتظار کرانے کے بعد کی باری آتی ہے اور ڈاکٹر گھنٹوں میں چند سطریں لکھ کر کو فارغ کر دیتا ہے۔

ڈاکٹروں کی ایک مخصوص پنڈ رائٹنگ ہوتی ہے جسے وہ لکھ سکتے ہیں۔ یعنی وہی شخص ہے کہ لکھیں موسیٰ اور خدا۔ شاید اس لیے تاکہ انہوں نے جو لکھا ہے اس کی ہاں کوئی نہ نکال سکے۔

ایم ایچ کے ایک ڈاکٹر کو جب ہم نے خوش خط لکھتے تھا تو دل خوش ہو گیا۔ ہم نے بہت تعریف کی اور کہا کہ جیسے میں سختی لکھی جاتی تھی کہ خوشخط لکھا جائے اس طرح لکھنا شاید انگریزی کی سختی لکھی ہے۔

اے یہ سن کر بہت خوش ہے اور اس کے بعد ہم سے بے لگبی ہو گئے۔ ان کا نسخہ اتنا صاف اور خوش خط تھا کہ ڈاکٹر والے دوسرے ڈاکٹر اس میں غلطیاں نکالتے تھے کہ یہ لکھا تو غیر ضروری ہے لیکن یاد رکھیے کہ جب تک آپ کسی کا علاج کر رہے ہیں، اس کو زمین پر اللہ کا خلیفہ جاننے کی ہر ہدایت پر عمل کیجئے۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ اللہ کی ہدایات کی طرح ہم سب اللہ اور قرآن کی کی پابندی بھی اسی طرح کرنے لگیں تو کتنا اچھا ہو۔

نہرس بخاری نے سالہا سال پہلے ایک مضمون لکھا تھا "ماہر کا عنوان تھا" مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ، اگر وہ زندہ ہوتے تو اس عنوان سے ضرور مضمون لکھتے کہ ان ڈاکٹروں سے بچاؤ۔"

مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ امریکا کے صدر اوباما اور ان کا زمانہ ہے۔ ان کی بات نہ مان کر ہم خطرہ کیسے لے سکتے ہیں؟

☆☆☆

ایک بھوکہ پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔

امام پاکستان کے بعد جن دو عظیم گلوکاروں نے پاکستان کی تاریخ کی ان میں ایک تو بڑے غلام علی خاں تھے ان کا تون گلوکارہ روشن آرا بیگم تھیں۔ پاکستان آتا

ان دونوں کو اس نہ آیا کیونکہ قیام پاکستان کے بعد کی جہاں اور افراتفری میں ماحول موسیقی۔۔۔ گلوکاروں کے لیے سازگار نہ تھا۔ نہ تو موسیقی کی سرپرستی کرنے والے لوگ تھے اور نہ ہی لئے پھنے لوگوں کو اتنی فرصت اور استطاعت تھی کہ موسیقی کی محفلیں سجا سکتے۔ صرف ریڈیو پاکستان ہی ایک ادارہ تھا جہاں سے فن کاروں کو برائے نام معاوضہ ملا کرتا تھا اور بیوروکریٹس موسیقی اور فنون لطیفہ کے قدر رواں بھی نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ جب ریڈیو نے ہفتے میں استاد بڑے غلام علی خاں کے گانوں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے انکار کر دیا تو وہ بددل ہو کر ہندوستان چلے گئے جہاں ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور انہیں مال و زر سے نوازا گیا۔

دوسری عظیم گلوکارہ جنہوں نے پاکستان آنے کو ترجیح دی تھی اگرچہ قدر روانی تو ان کی شان کے شایان یہاں بھی نہیں کی گئی مگر انہوں نے ہر صورت میں پاکستان رہنے کو ترجیح دی اور ساری زندگی یہیں گزار دی۔ روشن آرا بیگم نے مستقل رہائش لالہ موسیٰ میں اختیار کی۔ پروگراموں کے لیے وہ لاہور آتی رہتی تھیں۔

روشن آرا بیگم کے آبا و اجداد کافی عرصہ تک پٹنہ میں رہے۔ خاندان کا ایک حصہ کلکتہ میں آباد ہوا۔ روشن آرا بیگم وہیں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا اصلی نام وحید النساء تھا۔

موسیقی کا انہیں ابتدائی سے شوق تھا۔ ابتدائی موسیقی کی تربیت انہوں نے استاد ممتاز حسین لدن خاں سے حاصل کی تھی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے چند فلموں میں بھی کام کیا تھا اور فلموں کے لیے گلوکاری بھی کی تھی۔

فلموں میں اداکاری اور گلوکاری انہوں اس وقت ترک کی جب انہوں نے استاد عہد الکریم کی شاگردی اختیار کی جنہیں شکیست رحن کا لقب دیا گیا تھا۔ استاد عہد الکریم مسلمان لڑکیوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کے حق میں نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان لڑکیاں شادی کرنے کے بعد موسیقی سے کنارہ کش ہو جاتی تھیں۔

روشن آرا بیگم نے انہیں یقین دلایا کہ وہ کبھی موسیقی اور گلوکاری نہیں چھوڑیں گی۔ اس وعدے پر استاد نے انہیں شاگرد بنانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

کلاسیکی گلوکارہ کے طور پر انہوں نے کئی استادوں سے سیکھا۔ ایک پولیس افسر احمد خاں نے ان سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ موسیقی نہ چھوڑنے کی شرط پر روشن آرا بیگم نے یہ شادی کی تھی۔ احمد خاں کا انتقال جولائی 1977ء میں ہوا۔ اس وقت تک انہوں نے اپنے وعدے کو نبھایا۔



فلم "لاکھوں میں ایک" کا پوسٹر

انہوں نے طویل زندگی نہیں پائی، قلموں سے وہ پندرہ سال تک وابستہ رہے۔ بولتی قلموں کے تو آغاز ہی سے ان کی آواز نے دھوم مچادی تھی۔ انہوں نے صرف 42 سال عمر پائی لیکن اس مختصر عرصے میں بھی لافانی شہرت حاصل کی۔ برصغیر کے گلوکاروں میں سہگل کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

یوں تو برصغیر میں بہت ماہر اور نای گرای گلوکار پیدا ہوئے لیکن جو سوز و گداز اور درد سہگل کی آواز میں تھا، وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

سہگل جموں میں پیدا ہوئے تھے، ہالندہ مر میں، اس مارے میں اختلاف ہے۔ انہیں بھیم ہا سے بھگن گالے کا شوق تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ مندروں میں جا کر بھجن گا کر کرتے تھے۔ ان کے والد تحصیل دار تھے اور انہوں نے صوفی سلیمان یوسف کے آستانے میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہیں انہیں موسیقی کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ سہگل بڑے ہوئے تو ریلوے میں ٹائم کیپر کے طور پر کام کرنے لگے۔ انہوں نے آشارانی نائی لڑکی سے شادی کی۔ یہ نوکری چھوڑ کر وہ کلکتہ چلے گئے جہاں وہ نیو تھیٹر کے بانی سے ملے۔ لیکن اس سے پہلے وہ 80 روپے ماہوار پرسنلزمین کے طور پر ریمٹنٹس کمپنی کے لیے کام کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں ان کی ملاقات بی این سرکار نے ہوئی جنہوں نے انہیں اپنی کمپنی میں

اول کام ہے۔ لاہور میں نتھو خان اور پایا بنا ڈھولکی بنانے لے ماہر ہیں۔ دور دور سے شوقین ان سے ڈھولکی بنوانے کے لیے آتے ہیں اور ہنگے داموں خریدتے ہیں۔ بے خاں اور ماں امام دین بھی ماہر ڈھولکی ساز ہیں۔

ڈھولکی بنانے والوں کا مرکز لاہور کی ہیرا منڈی ہے۔ اس کے گرد و نواح میں بھی ساز بنانے والے پائے جاتے ہیں۔ سازندے جن گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں بڑے فخر سے ناؤ ذکر کرتے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ڈھولکی ڈھائی پونے تین سو سال پہلے ایجاد ہوئی تھی اور مخصوص خاندان تک محدود ہے۔ ڈھولکی بنانے والے خاندان اپنے خاندان کے لوگوں کے علاوہ کسی کو نہیں سکھاتے۔ کچھ لوگ نال، ڈھولک، ہارمونیم بنانے میں ماہرانی ماہر ہیں۔

آج کل کلاسیکی موسیقی کا رواج کم ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ خاص آمدنی کماتے ہیں۔ ڈھولکی اور طبلہ یورپ امریکا بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ خریدار کی مرضی کے مطابق ساز بنا دیتے ہیں۔ اختر حسین اور بشیر احمد اس فن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ طبلہ یا ڈھولکی بنانے کے لیے خاص قسم کی ہلدی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ برساہیرس چلتی ہے، ہر طبلہ ساز اپنے فن کی وجہ سے الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ جب تک طبلے کی آواز میٹھی اور سریلی نہ ہو اس کی داد نہیں دی جاتی۔ شہروں میں اداکار کا رو بار کرنے کے ساتھ ساتھ طبلہ ساز اپنے آبائی گاؤں کو نہیں بھولے، جس پر انہیں فخر ہے۔

طبلے کے اندر مخصوص جگہ پر سیاہی لگانا بھی ایک فن ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی آواز میں جدت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک قسم کی آوازیں اس کے ذریعے پیدا کی جاسکتی ہیں۔ چھ موسیقی میں بھی طبلے کی آواز شامل کر کے اسے آرکسٹرا کا حصہ بنالیا گیا ہے۔ حاجی اختر علی کی دکان اس سلسلے میں بہت مشہور رہتی ہے۔ بشیر احمد وغیرہ باقاعدگی سے اس شخص کی قبر پر ہار گزرا جتے ہیں ادا کرتے ہیں جس نے ان کے بڑوں کو سکھایا تھا۔ یہ جگہ ڈھولکل کہلاتی ہے جہاں ہر طبلہ ساز اس کے لیے جاتا ہے۔ پنجاب گمرانے کے میاں نبی علی لاپار والے ان کا نام ہے۔ انہیں سب اپنا گرو سمجھتے ہیں ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔

☆☆☆

ہر سال جنوری میں معروف گلوکار، اداکار اور پہلے بیک کے ایل (کنڈن لائن) سہگل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

فنون لطیفہ کے مرکز کو چھوڑ کر انہوں نے لالہ موسیٰ کے چھوٹے سے قصبے میں کیوں سکونت اختیار کی تھی۔ لالہ موسیٰ میں رہ بھی تمام بڑے شہر کے فنی مراکز سے ان کے رابطے تھے جب انہیں مدعو کیا جاتا تھا تو وہ پاکستان کے ہر شہر میں جا کر موسیقی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے معیار کے مطابق مجالس میں ہی شریک ہوتی تھیں۔

ان کا معمول یہ تھا کہ علی الصباح اٹھتی تھیں اور نماز پڑھ کر اپنے پالتو پرندوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتی تھیں۔ وہ ان خوش قسمت فن کاروں میں شامل ہیں جنہیں زندگی میں ہی عروج اور القاب سے نوازا گیا۔ سب سے پہلے ان ہی کو پرائڈ آف پرفارمنس ملا تھا۔ وہ پاکستانی ثقافتی وفد کے ساتھ بیرونی ملکوں میں بھی جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ انہوں نے کئی بار افغانستان اور بھارت کے دورے کیے اور میوزک کانفرنسوں میں شرکت کی۔ معلومات محمد اطہر مسعود نے یکجا کی ہیں۔ ہر میوزک کانفرنس میں انہیں سب سے زیادہ داد ملتی تھی اور ہر فن کار ان کی عظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ درحقیقت ملکہ موسیقار کے خطاب کی حق دار تھیں۔ بڑے سے بڑے موسیقار، گلوکار ان کے پرستار تھے۔ ملکہ ترنم نور جہاں بھی ان کی عظمت کا قائل تھیں۔

افسوس کہ اب یہ لوگ رہے اور نہ ہی موسیقی اور فنون لطیفہ کی قدر دانی۔ جدید ترقی نے پرانی تہذیب و ثقافت روایات کو فراموش کر دیا ہے اور فن کاروں کے مراکز ایک ایک کر کے ختم ہو رہے ہیں۔

☆☆☆

موسیقی کی بات چلی ہے تو کچھ سازوں کی بھی بات ہو جائے۔ مشرقی موسیقی میں طبلے کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ طبلے کے بغیر ہماری موسیقی نامکمل ہے تو درست ہوگا۔ کلاسیکی اور اب جدید موسیقی کے ساتھ بھی طبلے استعمال کیا جاتا ہے۔

طبلہ دراصل دو الگ الگ حصوں پر مشتمل ہے، ان دو میں سے ایک کو دایاں اور دوسرے کو بائیں کہتے ہیں۔ مقبولیت اور پسندیدگی کی ایک وجہ اس کی آواز ہے، آواز کو مختلف آوازوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ڈھولکی بھی ایک ایسی قسم کا ساز ہے، اچھی ڈھولکی خریدنا



دلپ کمار

احمد خاں بذات خود موسیقی کے قدردان اور دلدادہ تھے۔ انہوں نے ملکہ موسیقی کی سوانح حیات کے نام سے روشن آرا بیگم کی سوانح عمری بھی لکھی۔۔۔۔۔ وہ اپنی بیوی سے عشق کی حد تک پیار کرتے تھے۔ یہ کتاب دو بار شائع ہوئی۔ دوسری اشاعت کے موقع پر اس کے کچھ حصے حذف کر دیے گئے جن میں ان کی ذات کے حوالے سے واقعات بیان کیے گئے تھے۔۔۔ ریڈیو پاکستان کے پاس روشن آرا بیگم کے تمام نعمات محفوظ ہیں۔

روشن آرا بیگم کو مختلف راگ راگنیوں پر عبور حاصل تھا لیکن وہ عموماً مندرجہ ذیل راگوں میں گاتی تھیں۔

1۔ بسنت، کیدار اور ملہار، مارو بہاگ، سدھ کلیان۔ یہ ان کے پسندیدہ راگ تھے۔

پیامن آدت ناہیں چین ان کا پسندیدہ راگ تھا اور ہر محفل میں وہ یہ ضرور سناتی تھیں۔ یہ ان کا بہترین راگ تھا۔ ان کے استاد عبدالکریم خاں نے انہیں بہت شوق سے یہ راگ سکھایا تھا جو زندگی بھر ان کا بھی دل پسند راگ رہا۔

روشن آرا بیگم کلاسیکی موسیقی کی عاشق تھیں۔ وہ آل پاکستان میوزک کانفرنس کی بنیادی رکن تھیں۔ وہ فنون لطیفہ کے ہر شعبہ اور فن کاروں کے حق میں آواز اٹھاتی رہیں۔

اداکار اور گلوکار کے طور پر سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ اس زمانے میں نیو تھیٹر میں بی سی بورل، تمر بن اور سچ ملک جیسے موسیقار کام کر رہے تھے۔

سہگل استاد فیاض خاں سے موسیقی اور گلوکاری سیکھنا چاہتے تھے۔ استاد نے انہیں بتایا کہ وہ پہلے ہی اتنا جانتے ہیں کہ شاگردی کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری آواز میں قدرتی ردھم ہے۔ بہتر ہے کہ تم کسی پیشہ ور استاد سے نہ سیکھو۔ یہ حقیقت ہے کہ قدرتی طور پر سہگل کو سُر اور تال سے واقفیت تھی بلکہ وہ ان پر عبور رکھتے تھے۔

اس زمانے میں آرکسٹرا چند سازوں پر مشتمل تھا۔ سازندے کہا کرتے تھے کہ سہگل کی آواز میں اس قدر محاس اور دلکشی ہے کہ سننے والا استماعی رہ جاتا ہے۔

سہگل نے گیت، غزل اور فلمی گانے گائے۔ غالب کی غزلیں جو انہوں نے گائی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کا گایا ہوا ہر گانا ہٹ ہو جاتا تھا اور اسٹریٹ سائیک بن جاتا تھا۔ جو غزلیں انہوں نے گائیں، ان میں یہ شامل ہیں۔

1۔ بقدر شوق اقرار دیا کیا۔

2۔ عشق خود مائل حجاب ہے آج

3۔ پھر مجھے دیدار تریا دیا (غالب)

4۔ میں انہیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں (غالب)

کاش وہ سے بچے ہوتے

5۔ وہ آ کے خواب میں..... (غالب)

6۔ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی (غالب)

7۔ لالی حیات آئے، قضا لے چلی چلے

اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے (غالب)

8۔ کون دیرانے میں دیکھے گا بہار (امیرینائی)

وہ ہمیشہ معروف اور مستند شعرا کی غزلیں ہی گاتے تھے۔

اداکار کی حیثیت سے سہگل کی پہلی فلم ”محبت کے آنسو“

تھی۔ اس کے بعد انہوں نے زندہ لاش، اور صبح کا ستارہ میں

کام کیا۔ انہوں نے ناپینا گلوکار کے سی ڈے کے ساتھ کام کیا

اور شہرت پائی۔

انہوں نے جن فلموں میں کام کیا، ان میں چند یہ ہیں۔

1۔ یہودی کی لڑکی

2۔ راج رانی میرا

مگر اصل شہرت انہیں فلم ”دودا“ سے ملی۔

پرفیٹ، دھوپ، چھاؤں، بنجارن، زندگی، شربت، شکر،

دھن، لگن، کاروانِ حیات، ہائی، پروانہ، تان سین بھی ان کی

یادگار میں شامل ہیں۔ میری بہن میں ان کے گانے ناقابل

فراموش ہیں۔ شراب نوشی کی کثرت نے ان کے پیچھے بے کار کر دیے تھے۔ آخری زمانے میں تو وہ دن رات پیتے تھے جس کی وجہ سے وہ 42 سال کی عمر میں وفا پا گئے۔ ان کی آخری فلم ”شا جہاں“ ہے جس کا ہر گانا تھا، خصوصاً

یہ نہ جانا، ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ

زمانے سے ان کی شکایت ہے جا ہے کیونکہ زمانے

تو انہیں دولت، شہرت، مقبولیت، سب کچھ دیا تھا مگر شہ

خانہ خراب نے انہیں بہت خراب کیا اور کہیں کا نہ چھوڑا۔ ا

کی جیسی آواز پھر کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اگرچہ مکیش،

کلیم اور سی ایچ آغا نے ان کی نقل کرنے کی کوشش کی مگر

کر سکے لہذا انہوں نے سہگل کا انداز چھوڑ دیا۔ اس کے

کسی نے سہگل کی آواز اور گائیکی کے انداز کی نقل کرنے

جرات نہیں کی۔ سہگل کو خدا داد آواز اور گائیکی کی صلاحیت

تھیں۔ کوئی دوسرا ان جیسا پیدا ہوا نہ شاید ہوگا۔

آواز کے سوز کے علاوہ ان کی اداکاری میں بھی ا

اور رنج و غم کا غلبہ تھا۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہی ایک دم انسانا

خیال آتا تھا۔ اس پر ان کی غم زدہ آواز۔ وہ اداکاری

کریں تو ان کے چہرے کے درد بھرے تاثرات اور شخصہ

کی اداسی ہی بہت کافی تھی۔

سہگل کے بارے میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے لیکن ا

یاد تازہ رکھنے کے لیے اس عظیم اداکار اور گلوکار کو نئی نسل

متعارف کرانا بھی ضروری ہے۔

☆☆☆

وقت بھی کس قدر خاموشی مگر تیزی سے گزرتا

اداکارہ رانی کی وفات کل کی بات معلوم ہوتی ہے لیکن ا

وفات کو انیس سال گزر چکے ہیں۔

رانی کی اداکاری کی کہانی بھی عجیب ہے۔ عام طور

پہلی فلم فلاپ ہو جانے کے بعد دوسرا چانس نہیں ملتا

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابتدائی فلمیں فلاپ ہو جانے

باوجود رانی فلموں میں ہیر دکن کی حیثیت سے کام کرتی رہ

دراصل ان کی شخصیت اور صلاحیتوں کے باعث وہ فلم

بے درے ناکامیوں کے باوجود معروف رہیں یہاں

دنیا کو ان کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنا پڑا اور وہ ایک محدود

کامیاب ہیر دکن بن گئیں۔ انہیں ایک آسانی یہ بھی کہ وہ

اچھی رقاصہ بھی تھیں اور کئی فلموں میں انہوں نے،

رقص کا مظاہرہ کیا تھا۔ آج پاکستان کی کامیاب، مقبول اور یادگار فلم

فلم ”شبیم“ کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک کامیاب

فلم اور بہت پسند کی گئی تھی۔ مقصد یہ ہے کہ نئی نسل بھی پرانی

فلم کے کاموں سے واقف ہو سکے۔ فلم ”شبیم“ کا نام ہیر دکن

نام پر تھا کیونکہ فلم میں ہیر دکن کا نام بھی ”شبیم“ تھا۔ یہ فلم کا

لاوی کردار تھا جس میں رانی نے بہت اچھی اداکاری کا

ظاہر کیا تھا۔ یہ فلم 1965ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ محمد علی اس

فلم میں ہیر دکن کے کردار میں تھے۔ یہ دونوں ہی بہت اچھے اور

صلاحیت فنکار تھے جس کی وجہ سے فلم میں اداکاری کے

حصہ کار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ فلم ہے جس سے رانی کی

ایماؤں کا آغاز ہوا تھا۔

اس فلم کے ہدایت کار ایس اے حافظ اور موسیقار اے

فلم تھے جن کے فلمائے ہوئے گانے بہت مقبول ہوئے

۔ اس فلم کی کاسٹ میں زیبا اور کمال بھی تھے۔ فلم میں

امپڈی پیدا کرنے کے لیے کمال اور زیبا کی جوڑی نے

بہت اچھا تاثر پیدا کیا تھا۔ ”شبیم“ میں ہندوستان کے نامور

ہر پرانے اداکار کمار نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ کمار

عالم نے محبوب کی فلم ”الہلال“ میں مرکزی کردار ادا کیا

اور اپنے زمانے کے بہت مقبول ہیر دکن تھے۔ وہ ہدایت کار

ایس اے حافظ کے والد تھے۔

اس فلم کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ اداکار لہری جو اس

فلم میں بہت معروف کامیڈین تھے، اس فلم میں انہوں

نے گریکٹر ایکٹر کا کردار نبھایا تھا۔ فلم کے آخری حصے میں

انہوں نے دن کی حیثیت سے کام کیا تھا اور بہت اچھی

اداری کی تھی۔ فلم ”شبیم“ 1965ء کے آخر میں نمائش کے

لپٹوں کی گئی تھی اور بہت کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ فلم ”شبیم

“ سی ڈی میں دستیاب ہے، اس کو بھی ٹی وی پر بھی پیش

کرا گیا۔

شبیم ایک غریب لڑکی کی کہانی ہے۔ یہ دو دوستوں کی

اہلی سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ وہ اپنی ماں (زینت) کے

ماہر رہتی ہے۔ بچپن میں اس کا رشتہ کمال (کھلیل) کے

ماہر ہو چکا تھا۔ ”شبیم“ اس ناتے سے کمال سے بہت محبت

لی تھی۔ کھلیل اب شہر میں رہتا ہے اور ایک صحافی ہے

یہاں اس کی ملاقات اخبار کے مالک (کمار) کی بیٹی فریدہ

ماہر سے ہوتی ہے اور وہ زیبا کی محبت میں گرفتار ہو کر یہ

میں کمار صاحب کو بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔

محمد علی کمال کا دوست ہے اور ایک مشہور سرجن بھی ہے۔

ایک بار وہ آپریشن کرنے را دلپنڈی جاتا ہے۔ ”شبیم“ کی ماں

کھلیل کو یاد دلاتی ہے کہ ”شبیم“ اس کی منگیتر ہے اور اب ان

دونوں کی شادی ہو جانی چاہیے۔ کھلیل اس کو بتاتا ہے کہ وہ شہر

میں کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہے اس لیے ”شبیم“ سے شادی

نہیں کر سکتا۔ یہ باتیں ”شبیم“ بھی سن لیتی ہے اور مایوس ہو کر گھر

سے نکل کر دریا میں کود جاتی ہے جہاں اسلم اس کو بچا لیتا ہے۔

”شبیم“ کو اسلم سہارا دیتا ہے۔ یہاں ”شبیم“ کو معلوم ہوتا ہے کہ کھلیل

اگر کما گھر دوست ہے ایک دن اسلم موقع پا کر فریدہ سے اظہار

محبت کرتا ہے مگر وہ انکار کر دیتی ہے اور ”شبیم“ کو بتاتی ہے کہ وہ

دراصل کھلیل کو پسند کرتی ہے۔ اور کمال (حبیب اللہ) کو ”شبیم

“ کے خلاف بھڑکانا ہے۔ مگر وہ اس کی بات پر یقین نہیں کرتے۔

انور انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور حبیب اللہ فار

کرتا ہے تو کھلیل درمیان میں آ جاتا ہے۔ کھلیل کی زندگی بچانے

کے لیے اسلم اس کا آپریشن کرتا ہے مگر انور اپنی شیطانی سے پھر

بھی باز نہیں آتا اور عین آپریشن کے وقت آپریشن روم کا سوچ

آف کر دیتا ہے۔ ”شبیم“ یہ دیکھ لیتی ہے اور سوچ آن کرنے کی

کوشش کرتی ہے تو انور اس کو بھی گولی مار دیتا ہے۔ اس کشمکش

میں انور اس پہاڑی سے گر کر ہلاک ہو جاتا ہے جس پر اسپتال

ہے۔ ”شبیم“ کا بھی آپریشن ہوتا ہے اور کھلیل کا آپریشن بھی

کامیاب ہوتا ہے۔ اسلم کی کوششوں سے کھلیل اور ”شبیم“ کی شادی

ملے ہو جاتی ہے۔

اس فلم کی موسیقی اے محمد لے ہائی تھی، جس کے ہند

گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ مثلاً

1۔ جن لہا میں لے چھیں مارا جہاں رہے ا

بیاد نہ کرنا یہ دل کہتا رہا کہ ا

2۔ کیا فخر تھی تم نے تو زندگی مل جا۔ ا

زندگی کو زندگی کا ازداں رہنے دیا

3۔ لے ڈو باز زندگی کو طوفان زندگی کا

4۔ اوم، حیرت یاد میں ہم یوں ہی مریں گے تیری قسم۔

5۔ جو کسی کے قریب ہوتے ہیں

وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

6۔ ہم جس پہ مرے ہیں وہ قاتل تم ہی تو ہو۔

اس فلم میں ملکہ ترنم نور جہاں، سلیم رضا، منیر حسین اور

احمد رشیدی نے گلوکاری کی تھی۔ فیاض ہاشمی اس کے مکالمہ نگار

تھے۔ فلم کی کہانی قلم ساز راشد مختار نے لکھی تھی۔ جو کہانی تحریر

کی گئی ہے۔ وہ دراصل کہانی کا مختصر خلاصہ ہے۔ سچ تو یہ ہے



لکشمی مینشن

پانس تھیں جن کا اس طرف گزر کم ہوتا تھا، لوگ سائیکلوں کو دہن کی طرح سجا کر دلی خوش کر لیتے تھے۔ باغ کشادہ تھا اس کے درمیان ایک نہر تھی اور ساتھ ایک خوبصورت چھوٹی سڑک تھی۔ نہر کا لنگ بڑی نہر کے ساتھ تھا جو مہاں مہر گھر کے نام سے مشہور تھی۔ نہر میں صاف شفاف پانی بہتا تھا، لوگ اس نہر پر نہاتے تھے۔ بچے پانی میں چھالیں لگاتے تھے۔ دوپہر میں قرب و جوار کی غریب عورتیں اس نہر پر کپڑے دھوئی تھیں۔ جب عورتوں کے کپڑے دھونے کا وقت ہوتا تو لوگ اس طرف سے کم گزرتے، مرد چھوٹی سڑک سے آتے جاتے، باغ کے بڑے بڑے درخت، ٹھنڈی چھاؤں، پھولوں سے لدے ہوئے پودے، روشوں پر سے گزرنے والوں کے سادہ دماغوں اور شفاف دلوں کو مہکاتے تھے۔ نیچے باغ میں کھیلتے، بوڑھے صبح آٹھ نو بجے صفیں اور دریاں بچھا کر محفل آراستہ کر لیتے اور پھر ایک پڑھا لکھا بزرگ ہاتھ میں گل بکاؤلی، ہیر، یوسف زلیخا اور دیگر منظوم داستانیں لے کر آ جاتا، خوشی کی ایک لہر اور بھنبھناہٹ سی مسرتوں کی صدا میں اُٹھتی، وہ بیٹھتا تو ساری محفل ہمہ تن گوش ہو جاتی اور پھر اسے بتایا جاتا کہ کل وہاں کہانی ختم ہوئی تھی جہاں ہمالہ دیوٹی نے خنزیرادے اور گل بکاؤلی سے ملاپ کیا تھا۔ بات وہیں سے شروع ہو جاتی، ایک سناٹا چھا جاتا، نزدیک نیچے آ کر شور مچاتے تو انہیں سختی کے ساتھ وہاں سے بھگا دیا جاتا، کوئی دردناک مقام آتا تو ساری محفل رونے لگتی، ایک مرتبہ ساری محفل رو رہی تھی، ناک بہہ رہے تھے، ہلکی ہلکی چیخیں نکل رہی تھیں۔ ایک اجنبی گزرا تو وہ بے چارہ یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کیا ہوا؟ ایک بزرگ نے رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا کہ ”گل بکاؤلی کو جنوں نے سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر جیل میں بند کر دیا ہے۔“ جہاں یہ محفل جمتی اس کے

کی قصص۔ پیراماؤنٹ سینما کے ساتھ ایک چھوٹی سی مہر تھی۔ اس سے آگے بکرمندی تھی۔ جہاں صبح و شام لہراں فروخت ہوتی تھیں۔ دوسری جانب بھی شاہ کا لہ۔ جو سارا سال ہی اسی جگہ رہتا، بڑے بڑے میلوں پر ۲۲ اور پھر اسی جگہ آ کر خیمے لگ جاتے۔۔۔۔۔ سامنے ل اور لاہوری تانگوں کا اڈا تھا جہاں سے ٹھیکس ساندہ، لوالوں کوٹ اور دوسرے چھوٹے موٹے دیہاتوں کو لے کر آتے تھے۔ سرکلر روڈ پر ریلوے اسٹیشن، دہلی دروازہ لہرے موٹے دیہات تھے جو لہلہاتے کھیتوں کے



آگے زمرین ایکسپریس لاہور ریلوے اسٹیشن پر

ما آہاد تھے۔ البتہ باغبانپورہ شالیمار باغ کے باعث ما شہر تھا اور سیلہ چراغاں کی دھوم پورے برصغیر میں امرتسر سے دہلی تک کے لوگ کاروبار کے لیے آتے تھے۔ انہیں سجاتے تھے۔ ایک حسین باغ، نہر اور باولیاں تو گرد گول دائرے کی شکل میں تھیں، اڑھائی لاکھ کی لہر اس وقت بھی باغات کا شہر کہلاتا تھا، بھائی کے باہر کا ماحول اور حسن بے پناہ تھا، اس کے جوڑے ہیں، بہت کم چوڑی تھیں، صرف تانگے مولو کار میں سادے شہر میں صرف چند لوگوں کے

”بھائی دروازہ“ اپنے کمال و جمال میں منفرد حیثیت ہے، اسے چیلیسی کا نام دینے والوں نے حسن کھیل کے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اس دروازے کی فضیل کے علماء، بادشاہ، شاعر، فنکار، موسیقار اور دانش مند عظیموں کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ میں نے اسی دروازے کے اندر آنکھ کھولی، اس وقت گرد و پیش کی فضا، ماحول وقوع، آج کل سے بالکل مختلف تھا، تحصیل بازار دروازے تک گلیاں، بازار، محلے، کوچے، مین بانو صدیوں سے ایک ہی منظر پیش کر رہے ہیں، محلہ سیماں ستھاں، محلہ جلوئیاں، میدان بھائیاں، محلہ نیاریاں، ولیداراں، چوالہ، محلہ بڑنگاں، بازار کھساں، اوچی نور محلہ، محلہ جوگیاں، محضی ملاحاں وغیرہ تو بچی تنگ دتا گلیوں کے ساتھ مدتوں سے اپنی بے پناہ رونقوں کے آباد ہیں۔ مگر کہیں کہیں عمارتوں کے کے ناک نقشے بدل ہیں۔ البتہ بھائی دروازے کے باہر کا حسن آبادی کی بھیر میں کھو گیا ہے۔ جب میرے بچپن کے قہقہے دروازے کی گلیوں کے درود یوار سے ٹکرانے کے دروازے کے باہر رتوں اور خوشبوؤں کی پھوار میں کہ اور حسن کے احساس کی فضا، نفسی کے موتی بکھیرتی دروازے کے باہر صرف ایک سینما تھا جسے میلا رام کا کہتے تھے۔ اس سے آگے حضرت علی ہجویری کا آستانہ، ذکر و فکر کی مدہم صداؤں میں دن رات روحانیت کی بکھیرتا تھا۔ دوسری جانب میلا رام کا کپڑے کا کارخانہ اس وسیع و عریض کارخانے کے ساتھ لال کوٹھی تھی۔ یہ لال کنال پر پھیلی ہوئی تھی، جدید طرز تعمیر کا خوبصورت نمونہ اب وہاں کتب فروشوں کی دکانیں اور حزب الحفاف کا ایک مسجد اور مولانا ابوالبرکات کا مدفن ہے۔ کپڑے کا کارخانے کی جگہ بلند عمارتیں، کاروباری مرکز اور بینک ہیں۔ لال کوٹھی کا کچھ حصہ سڑک میں شامل کر لیا گیا ہے۔ عمارتوں کی جگہ گھوڑوں اور تانگوں کے اصطبل تھے اب بوسیدہ عمارتیں تھیں۔ بعد میں یہاں ولکنڈن ٹا۔ پیراماؤنٹ ٹائیکز کے نام سے دو سینما بن گئے۔ جنہیں پھر لوگ آج تک منڈوے ہی کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر طفیل حسین بخاری مرحوم کی رہائش گاہ اور کلینک اور دوسری نئی عمارتیں بن گئیں، اب یہ ساٹھ ستر سال ایک خوبصورت عمارتوں کی بستی ہے۔

دروازے کے باہر سڑک کے دونوں طرف مین کی چھتوں والی دکانیں تھیں۔ جن میں زیادہ تر



بھائی دروازہ 1946 میں

کہ یہ ایک موثر اور کامیاب فلم تھی۔ سبھی اداکاروں نے اپنے کردار بہت خوبی سے نبھائے تھے۔ ایک اُبھی ہوئی کہانی کو مناسب اسکرین پلے کی مدد سے ایک کامیاب فلم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک اجتماعی کوشش تھی جس میں ہر فرد نے اپنا حصہ ادا کیا تھا۔

☆☆☆

معروف افسانہ نگار اے حمید (مرحوم) کو پھولوں، درختوں اور قدرتی مناظر کے علاوہ امرتسر اور لاہور سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ انہوں نے ان دونوں شہروں کی پرانی یادوں کو اپنے حافظے، مشاہدے اور دوسروں سے حاصل کردہ معلومات کی بنا پر زندہ جاوید کر دیا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے ان کی پرانی تہذیب و ثقافت کی تاریخ رقم کر دی ہے۔

وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے دوسرے پرانے اور باخبر لوگوں سے بھی مدد لیا کرتے تھے۔ ظاہر لاہوری لاہور کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں۔ اب اے حمید نے ان سے معلومات حاصل کرنی چاہیں تو انہوں نے زبانی بتانے کے بجائے تحریری طور پر یہ دیکھنا اور معلوماتی داستان لکھ کر دی ہے جس میں حیرت انگیز واقعات اور معلومات کے علاوہ ایسی کہانیاں بھی ہیں جو شاید آپ نے پہلے نہ سنی ہوں۔ یقین نہ آئے تو مندرجہ ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

لاہور دنیا کے ان خوش نصیب شہروں میں شمار ہوتا ہے جن پر علم و ادب، عقل و دانش، درس و تدریس، فنکاری، ہنرمندی اور روحانی فیوض و برکات کے انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اس شہر کے کوچہ و بازار میں گلاب جیسے چہروں کی مہکتی سانسوں کے جھونکے زندگی میں تازگی کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اس شہر کی بستیوں، محلوں اور دروازوں میں

سامنے باجے گھدو شاہ کا مزار ہے۔ جہاں گاما پہلوان رستم
زماں کا اکھاڑہ تھا جواب بھی ہے، صبح و شام بڑے بڑے نامی
گمراہ پہلوان وہاں زور کرتے۔ شام سے پہلے کشادہ باغ
میں نوجوان کبڈی کھیلتے، صبح کا ذب کے وقت نوجوان یہاں
آ کر کسرت کرتے، ڈنڈ بیٹھک لگاتے، جان بنانے کا،
پہلوانی کا جسم کو خوبصورت بنانے کا شوق انتہا درجہ پر تھا۔

بھائی دروازے کے باہر باغات میں مولسری کے
درخت عام تھے۔ دورویہ مولسری کے درختوں کی قطار تھی۔
اس وقت شہر کے لوگ صبح بہت جلدی اٹھنے کے عادی تھے۔ سحر
کی سپیدی کے تسلط سے بہت پہلے مسلمان دریا پر جانے کے
عادی تھے۔ مزدور منڈیوں کو جاتے تھے، لوگ اپنے اپنے
عقیدوں کے مطابق کلمہ پڑھتے گزرتے، مگر ایک صدا
مشترک تھی۔ جو صبح کے انوار کی بارش میں اُٹتی "سب کا بھلا،
سب کی خیر، سب کا بھلا، سب کی خیر" ہر سمت خوشبوؤں کے
گل کھاتے ہوئے ہولے اڑتے تھے۔ بازار حکیماں میں، گلی
کاغذیاں میں، میں نے ہوش سنالا، ایک دن بڑا شور و غول
پڑا تھا، میں پہلی مرتبہ گلی سے باہر نکل کر بازار کی رونق دیکھنے گیا یہ
امام بخش پہلوان کا جلوس تھا۔ ایک اڑدھام تھا، یہ گونگا پہلوان اور
امام بخش پہلوان کی دوسری کشتی تھی، اس سے پہلے گونگا
پہلوان نے امام بخش پہلوان کو پچھاڑ دیا تھا۔ گونگا اس وقت
عین عالم شباب میں تھا اور امام بخش پہلوان کی عمر کچھ زیادہ
تھی، بڑا شہ زور، طاقتور پہلوان تھا۔

گلیوں میں میوہل کمیٹی کی جانب سے لکڑی کے پول گاڑ
کر لیسپ جلائے جاتے تھے۔ کمیٹی کا عملہ ہر شام لیسپ میں تیل
ڈال کر لیسپ جلا جاتا، لیسپ نہ چوری ہوتا تھا نہ پولوں کو کوئی
نقصان پہنچاتا تھا۔ چور تو ہر دور میں ہوتے ہیں۔ مگر اسے باغ
نظر چور نہیں تھے۔ بڑے بازاروں میں بڑے بلند لکڑی کے
پول نصب ہوتے تھے۔ بچوں کی پہنچ سے بلند ایک پنڈل اور
گمراہی ایک لوہے کی تار سے منسلک ہوتی تھی۔ شام کمیٹی کا
عملہ آتا اور پنڈل کو کھما کر لیسپ نیچے لے آتے تیل ڈال کر
اور چلا کر پھر گمراہی کھما کر اوپر کر دیتے۔ رات بھر لیسپ جلتے
محرم پر سبیلیں لگتیں، سبیلوں کی آرائش اور شروبات کے
مقابلے ہوتے۔ ہندو بھی سبیلیں لگاتے تھے۔ نذر و نیاز کا
سلسلہ بہت زیادہ تھا۔ کچیاں، ٹھوٹھیاں، بچوں میں تقسیم ہوتی
تھیں۔ گلیوں میں شروب، ٹھوٹھوں میں میٹھے چاول یا کھیر
ہوتی تھی۔ بچے سارا دن گلیوں میں بھاگتے دوڑتے پھرتے
اور گلی ٹھوس کھاتے پیتے رہتے۔

مسلک ہر اماں، پامرس حضرت ماحولال حسین مسلمانوں
کے اہم ترین جہازوں میں ہوتا تھا۔ کئی ہفتے پہلے تیاریاں شروع
ماہنامہ سرگزشت

ہو جاتی تھیں۔ گھروں کی صفائی، سفیدی، نئے لباس
شروع ہو جاتی۔ میلہ قریباً ہفتہ بھر رہتا، ویسے تو تین
تھے۔ مگر دو دن پہلے ہی شروع ہو جاتا اور تین دن بعد
روفتی رہتی۔ باغ کے اندر باہر دکانوں، خیموں، نم
بولیوں کا ہنگامہ اور خلق خدا کا اڑدھام ہوتا تھا۔

امر تھر سے مٹھائی کی جو دکانیں آتی تھیں، ان پر بے
ہوتا تھا۔ میلے پر خلق خدا سارے برصغیر سے آتی تھی
ایک دو ہفتہ کے لیے بہت زیادہ پر رونق ہو جاتا تھا۔
دوسرے کو تھکے تحائف اور مٹھائیاں بھیجتے تھے۔ میلہ
سامنے بھی پوری شان و شوکت سے لگتا تھا۔ جب میں
مرتبہ میلہ دیکھا، دس آنے خرچ کرنے کے لیے ملے۔
تین آنے میں گھر واپس لے آیا۔ باغ کے سامنے
مرمر کا حوض تھا، نورہ تھا اور پانی سردک کے نیچے سے بہ
کے اندر آ جاتا تھا۔ کھنڈرات سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ
ساتھ پردے لگے۔ اس کے بعد درمیان میں سردک
حصے سمار کر دیے گئے۔ مگر باغ کی بیرونی فصیل کے
آج بھی پائے جاتے ہیں۔ اب بھی میلہ لگتا ہے۔ مگر
ہوتا ہے۔ باغ کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔
ہوتا ہے مگر میلے کی صرف رسم پوری ہوتی ہے۔ اس دور میں
بہت سستی تھیں۔ کوڑیاں (گوڈیاں) بھی سٹکے کے
استعمال ہوتی تھیں۔ مزاروں پر کوڑیوں کے چڑ
چڑھائے جاتے تھے۔ داتا دربار کی دکانوں پر عام طور پر
کچی تھیں اور مزار کے اندر اکثر کوڑیاں بکھری رہتی تھیں
کوڑیوں کا ایک گھنڈا ہوتا تھا۔ میں چناری کی دکان پر
کوڑیاں دے کر کھانے کی کوئی چیز خرید لیتا تھا۔ لیکن یہ
ہوش سنبھالنے کے دور میں ہی کوڑیوں کا لین دین ختم ہو
کوڑیوں کے ہار بھی بننے لگے تھے جنہیں کوکلیرے کہتے تھے
پیسے کے دو دھیلے، چار دھریاں اور تین پائیاں ہوتی تھیں
دو پیسے کا ایک ٹکہ ہوتا تھا۔ چار پیسے کا آٹھ ہوتا تھا۔ دولہ، پچ
آٹھنی اور روپیہ یہ خالص چاندی کے سٹکے ہوتے تھے۔ ان
پونڈ بھی عام لوگوں کے پاس ہوتا تھا۔

یہ سونے کا ہوتا تھا۔ آٹا ایک روپے کا بائیس سیر
پچیس سیر تک بکتا تھا۔ سونے کی قیمت سترہ اٹھارہ روپے
تھی۔ اسی تناسب سے باقی تمام اشیاء اور اجناس کی
ہوتی تھی۔ اس دور میں تانگے اور سائیکلوں کے چالان ہو
تھے تانگے کا کرایہ بھائی دروازے سے بڑے ریلوے اسٹیشن
تک ایک دو پیسے ہوتا تھا۔ تین سواریاں بٹھانے کی اجازت
تھی۔ چوتھا نوجوان ہوتا تھا۔ بہت کم لوگ قانون شکنی کر

ماہر پر حق نہ ہونے، وردی نہ پہنے ہونے،
ہوتا تھا۔ کوچوان کی وردی میوہل کمیٹی
لاکھی گلی، خاکی کوٹ نما تھیں اور شلوار پگڑی
میں لال کی مفتی پر کوچوان کا رجسٹرڈ نمبر ہوتا تھا۔
لاکھس ہوتا تھا۔ رسمی تانگے بھی بہت تھے،
اسا کے پاس ہوتی تھیں۔ جن کے آگے دو
ماہر گھوڑے جتے ہوتے تھے۔ سائیکل کا چالان
ہو، رات میں لیسپ نہ ہونے اور دو آدی بیٹھنے
ساتھ پمپ نہ ہونے پر ہوتا تھا۔

لی اور، ریش کا شوق بہت زیادہ تھا۔ کہتے تھے جس
کی مٹی نہیں لگی وہ بھائی دروازے کا رہنے والا ہی
ہم زماں کا اکھاڑہ مشہور تھا۔ صبح و شام زور کرنے
کاش بنیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان دنوں گاما
امام بخش پہلوان، چھوٹے جوڑوں میں گاما پہلوان کا
کی الدین، جیجا کھینے والا، کچی ٹوٹی، حسینا دفتری،
کون مین، بالا تھمبور اور بیسیوں چھوٹے موٹے
ہوتے تھے۔ دنفل ہر ہفتے ہوتے تھے۔ بڑے دنفل منٹو
ہوتے تھے۔ کھیلوں میں کشتی کو اولیت کا درجہ حاصل
ہو دوسرے نمبر پر تھی۔ گلی ڈنڈے کے میچ اور چنگ
سہاروں کی لڑائی، بیروں کی لڑائی، مینڈھوں کی ٹکریں،
میں جوت کر گھوڑوں کی دوڑ کے میچ اسی طرح ہوتے
تھے آج کل کرکٹ اور ہاکی کے میچ۔ حصہ لینے والوں کی
گھاد بھائی دروازے سے تعلق رکھتی تھی۔ بھائی
کے ہر گلی میں اپنے دور کے معروف پہلوان ہوتے
درویش اور جتی ستی لوگ تھے۔ ان کا یقین تھا کہ
مال کا راز پاکیزگی میں ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ناپاک
ہے اکھاڑے میں اترنے والے کو چوٹ لگ جاتی ہے۔
بھائی دروازہ عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی بستی تھی۔
مالہ میں بازار حکیماں میں فقیر خانہ سے منفرد صاحب علم
ہوتے رہے۔ محلہ جوگیاں کے قریب میاں شہباز کی
مکتبہ، اہل علم و فن کی آماج گاہ تھی۔ ادبی، علمی اور شعری
محفل اسی بیٹھک پر منعقد ہوتی تھیں۔ یہ میرے بچپن کا دور
ہو ا آنے جانے والوں کو دیکھتے ضرور تھے مکران کی
مہار اور علم و فضل سے بے خبر تھے۔ شمس العلماء مفتی محمد
اللہ لوکی محلہ میاں میں رہتے تھے۔ ان کی حویلی آج بھی
ہو ہے۔ مفتی صاحب اور نیشل کالج لاہور کے شعبہ
ماہر عرب کے ہیڈ تھے۔ ان کے فتاویٰ کئی جلدوں میں طبع
ہے۔ ہائیکورٹ کے جج فقہی مسائل میں ان سے مشورہ

ماہنامہ سرگزشت

لیتے تھے پھر وہ یہاں سے ریٹائرڈ ہو کر کلکتہ یونیورسٹی چلے
گئے۔ ادبی، علمی اور شعری محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ
وہی دور تھا جب علامہ اقبال، حکیم احمد شجاع، احتیاج علی تاج اور
دیگر شاعر اور ادیب، علم و ادب کی شمع روشن رکھے ہوئے تھے
اور محفلیں اسی بازار حکیماں میں منعقد ہوتی تھیں۔ بعد میں
حکیم احمد شجاع نے مفتی صاحب پر ایک جامع مضمون بھی
لکھا۔ مفتی صاحب کے بیٹے مفتی انوار الحق ریاست بھوپال
میں وزیر مالیات تھے۔ دیوان غالب کا نسخہ حیدر انہوں نے
ہی مرتب کیا تھا جو آج تک والٹی بھوپال کے محل میں محفوظ
ہے۔ پاکستان کے نامور افسانہ نگار اور ڈراما نویس رحمان
مذنب مفتی صاحب کے خاندان سے ہیں، فقیر خانہ سے تعلق
رکھنے والوں میں فقیر وحید الدین نے روزگار فقیر کے عنوان
سے علامہ اقبال پر دو جلدوں پر جو مواد پیش کیا ہے، وہ غیر
معمولی ہے۔ منفرد ہے اور نادر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔
اسی خاندان میں جناب امجد علی بھی ہیں جو پاکستان کے
وزیر خزانہ بھی رہے اور امریکا میں پاکستان کے سفیر رہے۔
علاوہ یورپ کے سفر میں وہ علامہ اقبال کے ہم سفر تھے۔ مشہور
فلمی شاعر تنویر نقوی بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔
ایام بارگاہ مبارک حکیم مشہور ہے۔ یہ سر مراتب علی کی اہلیہ
تھیں۔ فقیر خانہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مشہور رائٹر آغا
اشرف کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے اور بھی بہت سے
ادیب اور شاعر اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ برصغیر کے
معروف افسانہ نگار اور صحراورد کے خطوط کے خالق جناب
دلادر حسین، مرزا ادیب کا تعلق بھائی دروازے سے ہے۔
اسی طرح ہر گلی ہر بازار کی مسجد میں ملا، اور مشائخ بھی موجود
تھے۔ مگر ادبی مسجد کے معروف مہتمم مولانا غلام مرشد نے
اس علاقے میں رشد و ہدایت کی جامع روشن کر رکھی تھی، اس کا
جواب نہیں تھا۔ بعد میں وہ شاعری مسجد کے مہتمم بھی رہے۔
مگر بھائی دروازے کے لوگوں میں دینی اور ملی جذبہ روشن
رکھنے میں ان کی ذات گمراہی کا نام زندہ رہے گا۔

ایک نامور وکیل شیخ گلاب دین تھے۔ مسلمانوں کے
سامانی اور سیاسی معاملات کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے
تھے۔ یہ سر محمد شفیع، سر فضل حسین، علامہ سر محمد اقبال کے ہم عصر
تھے۔ اس دور کی معروف شخصیت تھے۔ اس دور میں موری مہبری
(میوہل کمیٹی کے ایکشن) کا بڑا چرچا تھا۔ بڑی بھاگ دوڑ ہوئی
اور بھائی دروازہ کے اندر پہلوانوں کی بیٹھکوں پر باداموں کی
پوریاں پہنچ جاتی تھیں۔ موری مہبری میں بہت سے ناموں کے
ساتھ خواجہ فیروز الدین وکیل کا بڑا نام مشہور تھا۔ یہ معروف

پراسرار بندے

عائشہ جونجو

خدا کی خدائی میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ کیسی کیسی پراسرار ہستیاں موجود ہیں کس کو پتا۔ ایسی پراسرار شخصیتیں خال خال ہی نظر آتی ہیں مگر ان کی چھاپ دل پر مہر ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ۔



عائشہ جونجو کے حوالہ افراد کا قصہ

باوجود اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون تھا۔ اس کا ظہور دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ میں ہوا تھا۔ فرس کے چند طالب علم ایک پارک میں بیٹھے فرس کے کسی فارمولے میں الجھے ہوئے تھے کہ ایک دبلا پتلا لیکن روشن آنکھوں والا بوڑھا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہی چوچانی تھا۔

"میرے بچو! تم لوگ کس مسئلے میں الجھے ہوئے ہو۔"

اس نے دریافت کیا۔

"بڑے میاں، ہم ایک مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں جو تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔" ایک لڑکے نے کہا۔

دنیا کی تاریخ پراسرار لوگوں کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے۔ لوگ اپنے زمانے میں بھی پراسرار تھے اور برسوں پہلے کے باوجود ان کا اسرار ابھی تک واضح نہیں ہے۔ ان کے کارنامے عام انسانوں سے مختلف تھے۔ ان کے انداز مختلف تھے اور ان کی زندگی مختلف تھی۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن کی شناخت بھی نہیں ہو سکی۔ ان چند پراسرار لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

Monsieur Chouchan

ایک حیرت انگیز کردار تھا۔ اس کی موت 1968ء کی ہے۔ یعنی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ اس کے

ہے۔ انہوں نے ساٹھ سال فلمی دنیا میں گزارے، فلموں میں کام کیا، مرتے دم تک شہرت کے آسمان پر چڑھا رہے۔ مشہور ڈراما نگار اور اسکرین رائٹر لکھنے کے باہر، یہ کے مشہور فلم ڈائریکٹر بابو صادق بھی اسی ٹیم سے آئے تھے۔ درد کے ہیرو نصرت کاردار بھی مشہور تھے۔ عمرا خان جو ایم اسماعیل کے شاگرد تھے، ساٹھ سال فلم انڈیا میں شہرت کی بلندیوں پر رہے اور ظہور راجا اس دور کی فلم مرزا صاحبان کے ہیرو بھی بھائی دروازے کے تھے کے حوالے سے اتنے نام ہیں کہ اگر صرف نام ہی لکھ جائیں تو کئی صفحے درکار ہوں۔

مشہور گلوکار محمد رفیع جو بین الاقوامی شہرت رکھتے وہ بھائی گیٹ کے اندر اونچی مسجد کے قریب گلی کے کاروبار کرتے تھے۔ اس دکان کے اندر پیچھے ایک لگا رکھا تھا اس پردے کے پیچھے ایک ہارمونیم رکھا رہتا تھا سے فارغ ہو کر باجے کی سُر ہمیشہ چھڑی رہتی تھی، بڑا باکیزہ اور نیک لڑکا تھا، ایک مرتبہ گلا خراب ہو گیا، ہر ایک محفلے کا علاج پوچھتا تھا۔ ایک دوست نے شرارت سے کہ یار گلے پر سوچی کا پراٹھا پکا کر باندھو۔ سوچی لا کر انے گوشتا شروع کر دیا۔ جب اسے تنور والے کے پاس لے گیا تو تنور والا بہت ہنسا اور کہا کہ تمہیں اتنا بھی پتا نہیں سوچی کا پراٹھا نہیں پک سکتا۔ چلو بھاگو۔۔۔۔۔ یہ اس کی تھی اور اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا کرم کہ اسے زمین سے آسمان پہنچا دیا۔ ایسا گلوکار صدیوں میں پیدا نہ ہوگا۔ اس وقت عمر بھی محمد رفیع کے برابر تھی۔ میرے اچھے دوستوں میں تھا۔ بچپن میں جب کچھ شعور بیدار ہوا تو اس وقت گائیک تو کل خاں محلہ جوٹیاں کے آغاز میں ایک۔۔۔۔۔ کرائے پر رہے۔ جب ہم باجے کی آواز سنتے تو دنگو سیر حیاں چڑھ کر انہیں دیکھنے جاتے تو وہ گارہے ہوتے ایک نام اور مشہور تھا تاجی۔۔۔۔۔ یہ استاد منظور کہا گیا کر لوگوں پر جادو کرتا تھا، اس کے بعد اس کے شاہنشاہ ظہور نے گلوکاری کے حوالے سے برصغیر میں نا کیا۔ محمد شفیع ناگی کا نام بھی ان دنوں مشہور تھا۔ ریڈیو آر نظام دین بھی بھائی گیٹ میں کچھ دیر رہے۔ مشہور موسیقار فاروقی بھی بھائی گیٹ کے تھے اور اس طرح اگر گیٹ کی پوری ہستیوں کا ذکر کیا جائے تو ایک کتاب ہو سکتی ہے۔ ابھی کرکٹ میں حفیظ کاردار اور امتیاز د ذکر نہیں ہوا۔

موسیقار خواجہ خورشید انور کے والد تھے۔ میاں بشیر فیلا دار، میاں مبارک علی خیمہ سازاں کا نام بھی مشہور تھا۔ سیاست دانوں میں حنیف رائے بھائی گیٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ معروف ماہر اقتصادیات ڈاکٹر محبوب الحق کے بزرگ بھی اسی دروازے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد مسلم ماڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس طرح سیکڑوں سماجی اور سیاسی شخصیتیں بھائی گیٹ کی مٹی کے خیر سے ابھرتی اور ڈوبتی رہیں۔

جس دور میں، میں نے ہوش سنبھالا، خاموش فلموں کا دور تھا، زیادہ انگریزی فلمیں لگتیں جو مار دھاڑ سے بھر پور ہوتی تھیں۔ اکثر پچیس پارٹ کی طویل فلمیں ہوتی تھیں۔ ٹارزن، پیڈرو بہادر، کے نام جنگل فلموں کے حوالے سے عام تھے۔ برصغیر میں بھی سیریل فلمیں بنتی تھیں۔ ان میں حاتم طائی مشہور تھی۔ یہ ایسی فلمیں ہوتی تھیں کہ لوگ شام کا کھانا کھا کر سنیما ہال میں داخل ہو جاتے اور صبح کی اذان کے بعد فلم دیکھ کر باہر آتے، ٹکٹ دو آنے کا ہوتا تھا۔ اکثر پردہ کی رات گزارنے کے لیے سنیما میں داخل ہوتے اور رات اندر ہی بھی ہو جاتے اور کبھی اٹھ کر فلم دیکھنا شروع کر دیتے۔ صبح اٹھتے، ہاتھ منہ دھو کر کام پر چلے جاتے۔ میاں رشید کاردار جو بھائی گیٹ کی مشہور شخصیت اور فلمی دنیا کی قابل قدر ہستی تھی۔ لاہور میں فلموں کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔ چند خاموش فلمیں بھی بنائیں اور بعد میں بہت سی دوسری فلمیں بنائیں۔ ان میں باغی سپاہی بہت مشہور تھی۔ اس کے ہیرو گل حمید تھے جو اس دور کے خوبصورت ہیرو تھے۔ اس نے بمبئی اور کلکتے کی کئی فلموں میں بھی ہیرو کا پارٹ ادا کیا۔ گل حمید کی آخری مشہور فلم خیر پاس تھی۔ یہ اتنا بہادر ہیرو تھا کہ فائنٹ اور ایکشن نیچرل طور پر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ قلعہ شاہی کے نزدیک شوٹنگ ہو رہی تھی۔ گھوڑے کو سر پٹ دوڑا کر آتا تھا اور گھوڑے سے چھلانگ لگانی تھی۔ وہ مضبوط اور ماہر شہسوار تھا اور گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آیا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے سے پکی سڑک پر چھلانگ لگا دی، وہاں موجود عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ مردوں کے رنگ اڑ گئے۔ گل حمید مسکرا رہا تھا، سڑک پر پھسلنے سے اس کی چپل کے آدھے آدھے ٹکڑے اڑ چکے تھے۔ گل حمید گلے کی بیماری میں مبتلا ہوا اور پشاور کے قریب اپنے گاؤں چلا گیا۔ اس کی ہیروئن کو برکوجدائی کا بڑا دکھ ہوا۔ وہ بمبئی سے پشاور اس کے گاؤں پہنچ گئی مگر جب کوپر گاؤں کے اندر داخل ہو رہی تھی تو گل حمید کا جنازہ گاؤں سے باہر آ رہا تھا۔

میاں کاردار نے لاہور میں فلموں کا آغاز کیا تو بہت سے اداکار اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے پردہ اسکرین پر اُبھرے، ان میں خاص اہمیت ایم اسماعیل مرحوم کو حاصل

ایک دن جبکہ مولانا جلال الدین رومی تشریف لے رہے تھے، غصہ تھریٹ نے مولانا سے سربراہ دریافت کیا کہ مجاہدہ اور ریاضت کا کیا مقصد ہے؟

مولانا نے فرمایا "اجتناب شریعت۔" غصہ تھریٹ نے کہا "یہ تو سب ہی جانتے ہیں لیکن اصل مقصد علم و مجاہدہ کا ہے کہ وہ انسان کو منزل تک پہنچا دے اور پھر حکیم ستائی کا یہ شعر پڑھا

علم کز تو ترانہ بستاند

جہل از آں علم بہ بود بسیار

(ترجمہ: جو علم تجھے تھمے سے نہ لے لے، اس علم سے جہالت بہتر ہے) ان جملوں سے مولانا اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً غصہ تھریٹ کے ہاتھ پر بیت ہو گئے۔

(ماخوذ از مشنوی مولانا روم)

تلاش: نبیلہ ظہیر، کراچی

اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے اس اجنبی کا تذکرہ کرتے کرتے بتاتا ہے کہ "میرا خیال ہے کہ وہ اجنبی انیسویں تاریخ ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس لیے جب وہ پچھلی بار دکھائی دیا تھا تو انیس جنوری" بوڑھے نے بتایا "پھر وہ انیس فروری کو دکھائی دیا۔" "کیا دوسری بار بھی وہ شراب کی بوتل اپنے ساتھ لایا دوست نے پوچھا۔

"ہاں، دوسری بار بھی۔" بوڑھے نے بتایا۔

"چلو، تو پھر انیس مارچ کی صبح میں بھی تمہارے ساتھ ان چلوں گا۔" اس کے دوست نے کہا۔

انیس مارچ کی صبح دونوں بوڑھے قبرستان میں تھے۔ گھر آلود شخص نے صبح کو وہ اجنبی پھر دکھائی دے گیا۔ اس کا حلیہ تھا۔ فلیٹ ہیٹ، اور کوٹ اور ہاتھ میں شراب کی

اوکسی پر دھیان دیے بغیر سیدھے پوکی قبر کے پاس گیا۔

ان کے گھر سے ہو کر اس نے آدمی بوتل شراب پی اور بقیہ بچی شراب کی بوتل پوکی قبر کے پاس رکھ کر قبرستان کے گیت باہر چلا گیا۔

دونوں دوست حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"خدا جانے یہ کیا سلسلہ ہے؟" بوڑھے کے دوست نے کہا، "چلو، ایک مقررہ تاریخ پر قبر پر آنا تو سمجھ میں آتا ہے

"شراب کی بوتل کیوں رکھ کر چلا جاتا ہے؟"

"اور آدمی شراب پی کر بقیہ آدمی کیوں چھوڑ جاتا ہے؟"

"کیوں نہ اگلی انیس کو اس کے پاس چل کر اس سے پوچھا جائے؟" دوست نے مشورہ دیا۔

پھر اپریل کی انیس تاریخ آگئی۔ موسم اب بھی سرد تھا لیکن قابل برداشت تھا۔ اس بار آدمی کو دیکھنے کے لیے بوڑھے اور اس کے دوست کے

گھر آئے اور بھی تھے جو ایک پراسرار شخصیت کو دیکھنے کے لیے چلے آئے تھے۔

پراسرار اجنبی معمول کے مطابق اپنے وقت پر نمودار ہوئے۔ اس کا وہی لباس تھا۔ وہی انداز، وہی حلیہ۔ وہ تاریخ آہستہ آہستہ پوکی قبر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

ل کے مطابق اس نے بوتل سے شراب پی اور جب

اس طرح اس پراسرار شخص کی آمدنی کے ذرائع بھی کو معلوم نہیں ہو سکے تھے۔ اس کی موت کا سال لوگوں کو طرح یاد رہ گیا تھا کہ اس کی لاش اسی پارک میں پڑی ہو تھی جہاں وہ پہلی بار فرزکس کے طالب علموں کے سامنے نمودار ہوا تھا۔

Poetoaster

جنوری کی سردی، بالٹی مور میری لینڈ کا قبرستان۔ قبر۔ ہر طرف گہری دھند چھائی ہوئی۔ 19 جنوری 949 قبرستان کے گیت سے ایک آدمی آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبر کے پاس آتا ہے۔

اس آدمی کا حلیہ بھی عجیب ہے۔ اس نے ایک فلیٹ ہیٹ پہن رکھا ہے۔ سیاہ

ایک لانا سا اور کوٹ اس کے جسم پر ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کی ایک بوتل ہے۔

اس پراسرار آدمی کو دیکھنے والا ایک بوڑھا ہے جو اپنی بیوی کی قبر پر پھول چھانے کے لیے آتا ہے۔

بوڑھے کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اور اس کا قبرستان کے پاس ہی ہے۔

اسی لیے اسے قبرستان آنے میں کوئی پریشانی ہوتی۔ وہ بوڑھا اس پراسرار اجنبی کو حیرت سے دیکھتا ہے

اجنبی کو اس بات کی پروا نہیں ہے کہ کون اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ پوکی قبر کے پاس آ کر کھڑا ہوتا ہے۔ شراب کی

بوتل کھولتا ہے۔ تھوڑی سی شراب پی کر بقیہ بوتل وہیں قبر کے پاس رکھ دیتا ہے۔

کچھ دیر تک گردن جھکائے کھڑا رہتا ہے۔ پھر آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے باہر چلا جاتا ہے۔

بوڑھے کے لیے یہ سب کچھ بہت حیرت انگیز ہے۔ وہ گھر آ کر اپنے بیٹوں کو بتاتا ہے لیکن کوئی نہ

دھیان نہیں دیتا۔ اس قسم کے واقعات ہوتے ہی رہتے، ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

بوڑھے کو وہ آدمی کئی دنوں تک دکھائی نہیں دے سکتا۔ حالانکہ بوڑھا اپنی عادت کے مطابق روزانہ قبرستان جایا

ہے اور ایک صبح ایسے ہی سرد موسم میں وہ پراسرار اجنبی دکھائی دے جاتا ہے۔

وہ فردی کی انیس تاریخ ہے۔ بوڑھے کو یہ تاریخ اس لیے یاد رہی کہ اس کی شاد

ساگرہ کا دن تھا۔ وہ گھر آ کر پھر اس پراسرار اجنبی کا ذکر ہے۔ اس بار اس کے بیٹے کسی حد تک اس معاملے میں

"چلو کم از کم بتائی دو۔" لڑکوں نے اس پراسرار شخص کو وہ پراسرار بتادی۔ اس نے ذرا سی دیر میں وہ مسئلہ حل کر دیا۔ فرزکس کے وہ سارے طالب علم حیران رہ گئے تھے۔

"آپ کون ہیں جناب؟" اب لڑکوں نے بہت احترام سے دریافت کیا۔

"چو چانی؟" اس نے اپنا نام بتایا "کل تم لوگ پھر مل جانا، میں تمہیں فرزکس پر حادی کروں گا۔"

پھر وہ پارک کے گیت سے باہر نکل گیا۔ دوسرے دن وہ طالب علم پھر اسی پارک میں جمع ہو گئے۔ چو چانی اپنے وقت پر نمودار ہوا اور اس نے فرزکس کے کچھ اور مسائل سمجھا دیے۔

اس بار ایک لڑکے نے اس سے کہا "جناب، آپ اپنا ایڈریس بتا دیں تاکہ آپ کو آنے کی زحمت نہ ہو، ہم خود آپ کے پاس پہنچ جایا کریں۔"

"میرا کوئی ایڈریس نہیں ہے۔" چو چانی نے مسکرا کر کہا "اب میں دونوں کے بعد آؤں گا۔"

اتفاق سے دونوں کے بعد فلسفے کا ایک طالب علم بھی فرزکس کے طلباء کے ساتھ چلا آیا تھا۔ جب اس نے چو چانی کو بتایا کہ وہ فلسفے کا طالب علم ہے تو چو چانی نے اسے بھی فلسفے پر ایک پتھر دے دیا۔

اور اس وقت پتا چلا کہ یہ شخص تو فرزکس کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی جانتا ہے۔

چو چانی پورے تین برسوں تک طالب علموں کو فرزکس، فلسفہ، نفسیات، لٹریچر اور تاریخ پڑھاتا رہا تھا۔ اس سے پڑھنے والوں میں اس وقت کے مشہور ترین لوگ بھی تھے۔

لیکن کمال یہ ہے کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے؟

کئی بار اس کا تعاقب کر کے اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ہر کوشش ناکام رہی۔ وہ تعاقب کرنے والوں کو غیچہ دے کر غائب ہو جاتا تھا۔

کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا خاندان کہاں ہے؟ آہا وہ دنیا میں اکیلا ہے یا اس کے گھر والے بھی ہیں۔ اگر ہیں تو وہ کون لوگ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ چو چانی کے ہزاروں شاگرد تھے اور ہر علم میں اسے دسترس حاصل تھی۔ وہ کسی سے ایک پائی بھی

عامیہ کے طور پر نہیں لیتا تھا۔

142

ہوئی تھی کہ اس کا راستہ روک سکے یا اس سے کچھ پوچھ سکے۔ البتہ کچھ لوگوں نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن وہ اس کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ وہ قبرستان کے گیٹ سے باہر نکل کر اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔

چونکہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ لوگ اس کے نام سے بھی واقف تھے اس لیے شناخت کے لیے Poe Toaster کہا جانے لگا تھا۔

وہ برسوں تک اسی طرح پوکی قبر پر ہر انیس تاریخ کی ضخ شراب کی بوتل ہاتھ میں لیے آتا ہوا دکھائی دیتا رہا۔ اس کے بعد وہ اچانک غائب ہو گیا۔

کہاں گیا، کیوں گیا، کوئی نہیں جانتا۔ یہ بھی ایک ایسا ہیرو ہے جس کے بارے میں آج تک کچھ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔

Babushka Lady

یہ ذکر ہے ایک ایسی خاتون کا، جس کی شناخت بھی نہیں ہو سکی تھی لیکن اسے بابوشکا لیڈی کا نام دے دیا گیا تھا۔ بابوشکا دراصل خواتین کا ایک ہیٹ ہوتا ہے جیسے روسی خواتین استعمال کرتی ہیں۔

چونکہ اس خاتون نے ویسا ہی ہیٹ پہن رکھا تھا اسی لیے اسے بابوشکا لیڈی کے نام سے یاد کیا جاتا رہا تھا۔ یہ واقعہ 1963ء کا ہے۔

دنیا کے سب سے طاقتور ملک امریکا کا سب سے طاقت ور شخص یعنی صدر امریکا کینیڈی کی سواری گزر رہی ہے۔ اچانک ایک طرف سے گولی چلتی ہے اور کینیڈی کا قتل ہو جاتا ہے۔

یہ ایک خوفناک واردات تھی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ کسی کو اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔ اسی عالم میں یہ عورت اپنے ہاتھ میں گیسرالیے دکھائی دیتی ہے۔

اس کے سر پر وہی بابوشکا ہیٹ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس بھگدڑ اور خوف و ہراس کے باوجود اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بہت سکون کے ساتھ تصویریں کھینچ رہی ہے۔

گازیاں دوڑ رہی ہیں۔ پولیس والے بھاگتے پھر رہے ہیں صدر کینیڈی کو اسپتال لے جایا گیا ہے لیکن وہ عورت اسی جگہ ٹھہر رہی ہے۔

اس کی اسی تصویریں کیمروں میں آ جاتی ہیں لیکن اس کا پھر اس سے کچھ نہیں چلتا کہ وہ چہرہ ہیٹ میں چھپا ہوا ہے۔

بعد میں جب انتظامیہ کو ہوش آتا ہے تو اس عورت کی تلاش شروع ہوتی ہے لیکن وہ اب کہیں غائب ہو چکی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس عورت کے پاس اس قتل ثبوت موجود ہے کیونکہ اس نے تصویریں اتاری ہیں۔ اسے کہاں اور کیسے تلاش کیا جائے؟

پورے امریکا میں اس عورت کی تلاش کا کام شروع کر دیا گیا۔ اشتہارات دیے گئے۔ اسے انعام کی پیشکش مگنی کہ وہ بس ایک بار سامنے آ جائے لیکن وہ تو گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہو چکی تھی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سی کہاں سے آئی تھی تصویریں کھینچنے کا کیا مقصد تھا؟ یہ تصویریں اس نے کہا استعمال کی ہوں گی۔

پھر برسوں گزر گئے۔

اور ایک دن اچانک اسی قسم کا ہیٹ پہنے ایک عورت حکام کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ وہی عورت ہے۔ وہ اس دن اتفاق سے اسی سڑک سے گزر رہی وقت یہ حادثہ ہوا۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ اتنی دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ اس بھاگا بھی نہیں جا رہا تھا اسی لیے وہ ایک ہی جگہ جم کر رہ گئی۔ جب اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ اس نے جو قصو اتاری تھیں، وہ کہاں ہیں۔

تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کو کوئی کیمرہ نہیں تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھی، بعد میں پتا چلا ایک فراڈ عورت تھی اور صرف شہرت کی خاطر اس نے آپ کو پیش کیا تھا۔

بہر حال بابوشکا لیڈی اتنے برس گزر جانے کے بعد ایک راز ہی رہیں۔ جواباً۔

یہ ایک عجیب نام ہے اور کردار بھی بہت عجیب حب الوطنی کے جذبے سے سرشار۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہے کون؟

یہ کہانی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہ نام اس وقت آیا جب امریکا نے عراق میں اپنی فوجیں اتاریں۔ جو نتیجہ ہوا، وہ تو پوری دنیا کے سامنے ہے لیکن ایک فوجی کے پراسرار طور پر مارے جانے کے بعد جو با کے شہرت پورے عراق میں پھیل گئی۔

اس امریکن فوجی کو جو بانے مارا تھا۔ امریکی حکام یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ اس فوجی کو اسی نے مارا ہے۔

اس واقعے کے بعد اس کی تلاش شروع ہوئی لیکن جو با کا نام نہیں لگ سکا۔ اسی دوران دو اور امریکن فوجی مار دیے اور ان کی ذمے داری بھی جو بانے قبول کر لی۔

اب تو اس کی تلاش کی ہم اور تیز ہو گئی۔ امریکن فوجیوں نے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ کوئی اس طرح ان مافیوں کو ہلاک کرتا چلا جائے۔

دور اور قتل ہو گئے۔ یہ قتل بھی جو بانے کیے تھے۔ پھر ان کے ایک قبے سے ایک آدمی کو جو با ہونے کے الزام گرفتار کر لیا گیا۔

اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ وہی جو با ہے۔ اسے سزا سنائی گئی لیکن سزا سنانے کے دو ہفتوں بعد اور فوجی مار دیے گئے اور یہ قتل بھی جو بانے کیے تھے۔

اب تو ایک ہنگامہ مچ گیا کہ جس کو سزا دی گئی ہے، اگر وہ ہے تو پھر یہ کون ہے جو امریکن فوجیوں کو مار رہا ہے۔ ایک بار پھر جو با کی تلاش شروع ہوئی۔ اس بار یہ تلاش

دور شور سے ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ جاسوس مقرر کر دیے گئے۔ عراق کے کئی آدمیوں کو لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ حکام کو جو با کا سراغ لگا کر دیں۔

بالآخر ایک اور جو با پکڑا گیا۔ اس نے بھی اعتراف کر لیا کہ وہی جو با ہے اور اس نے بتایا کہ اس نے کہاں کہاں اور کون کون مقامات پر امریکی فوجیوں کا خون کیا ہے۔

اس جو با کی گرفتاری کے بعد امریکن فوجیوں نے ابھی یہاں کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ دو اور امریکن مار دیے گئے۔ اس بار بھی یہ کارروائی جو با کی تھی۔

اب ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی۔ کون ہے یہ جو با! جواب مل رہا تھا ستر امریکی فوجیوں کو مار چکا ہے اور ہر گرفتار ہونے والا اپنے آپ کو جو با ہی ظاہر کرتا ہے۔

فریکوں؟ کیا جو با ایک کردار ہے یا امریکی فوجیوں کے خلاف ایک تحریک۔ اگر کردار ہے تو شاید کبھی ہاتھ آ جائے، شاید کبھی اس کی سزا مل جائے۔

لیکن اگر وہ ایک تحریک ہے تو پھر تحریکیں اتنی آسانی سے نہیں ہوتیں۔ D.B. Cooper

لوگ نہیں جانتے کہ یہ اس کا نام بھی تھا یا نہیں یا صرف اس کے طور پر اسے ڈی بی کوپر کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ہراساں انسان تھا۔

والدہ 24 نومبر 1971ء کا ہے۔

طیارہ اپنی منزل کی طرف محو پرواز تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ موسم کی رپورٹ بھی اچھی تھی۔ طیارے کے مسافر گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کہیں بھی ایسے آثار نہیں تھے جن سے یہ اندازہ ہو سکے کہ جہاز میں کسی قسم کی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ جہاز کی آڑ ہوٹیس مسافروں کی گرم جوشیوں کا جواب اپنی مسکراہٹوں سے دے رہی تھیں کہ اچانک ایک آدمی کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔

”سب میری طرف متوجہ ہوں۔“ اس نے آواز لگائی ”میرا نام جی بی کوپر ہے۔“

اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اسی لیے سب کو اس کی طرف متوجہ ہونا ہی تھا۔ اس زمانے میں معاشرے میں تشدد کا اتنا رواج نہیں ہوا تھا۔ چاہے وہ مشرقی معاشرہ ہو یا مغربی۔

اور جہاز میں سفر کرنے والے جس طبقے کے لوگ ہوتے ہیں، وہ عام طور پر لڑائی بھڑائی سے پرہیز ہی کیا کرتے ہیں اسی لیے جب انہوں نے اچانک ایک مسافر کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا تو سب بری طرح خوف زدہ ہو گئے۔

”معاف کیجئے خواتین و حضرات!“ کوپر نے کہا ”میں آپ لوگوں کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔“ اس کا لہجہ بھی بہت شائستہ اور سلجھا ہوا تھا۔

”کیا تم جہاز کو اغوا کرنا چاہتے ہو؟“ ایک مسافر نے اس کے نرم لہجے سے ہمت پا کر سوال کیا۔

”ارے نہیں۔“ کوپر مسکرا دیا ”وہ بڑے لوگوں کے کام ہیں۔ میں بے چارہ تو ایک غریب، معمولی سا انسان ہوں۔“

”تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”جیسے۔“ کوپر نے کہا ”آپ طرحت اور لواٹمن اپنی ساری رقم اکال کر میرے اس قبیلے میں ال ال ہیں۔“ اس نے اپنی جب سے ہلاٹک کا ایک بڑا سا بیک لٹال لڑا ایک نو فز وہ آڑ ہوٹیس کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

وہ آڑ ہوٹیس سبھی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ ”گھبراؤ نہیں۔“ کوپر نے کہا ”میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ تم یہ بیک لو اور لوگوں سے رقم لے لے کر اس میں رکھنا شروع کر دو۔ جس طرح چرچ کے چندے لیے جاتے ہیں، شاباش!“

”اور اگر کوئی نہ دے تو؟“ آڑ ہوٹیس نے پوچھا۔

”پھر تو مجبوری ہے۔“ کوپر کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ اب جو بولا تو اس کی آواز میں بے رحمی شامل تھی ”میں انکار کرنے والے کو یہیں ڈھیر کر دوں گا۔ کیونکہ میں صرف شوقیہ طور پر

جہاز میں بیٹھ کر لوٹ مار نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر یہاں تک آیا ہوں۔“

اس کے لہجے کی سختی نے لوگوں کو مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔

ائر ہوٹیس ہر ایک سے رقم اکٹھا کرتی جا رہی تھی کہ اچانک ایک آدمی نے ایر ہوٹیس کو پکڑ لیا۔

اس نے بڑی پھرتی سے ایر ہوٹیس کو ڈھال بتا لیا تھا۔

”کوہر! اپنا ریوالور پھینک دو۔“ اس آدمی نے کہا ”ورنہ میں ایر ہوٹیس کی گردن توڑ دوں گا۔“

”توڑ دو۔“ کوہر بے رحمی سے بولا ”تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ ایر ہوٹیس میری بیوی یا محبوبہ ہے کہ میں اس کا خیال کروں گا لیکن پھر یہ سوچ لو کہ اس کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟“

اس آدمی کے پاس اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ ایر ہوٹیس کو چھوڑ دے۔ اس نے ایر ہوٹیس کو چھوڑ دیا۔

ائر ہوٹیس نے خوفزدہ ہو کر پھر سے اپنا کام شروع کر دیا۔

پھر اچانک کوہر کے ریوالور سے ایک گولی نکلی اور اس آدمی کے بازو میں پھنسی ہو گئی جس نے ایر ہوٹیس کو پکڑا تھا۔ وہ آدمی بری طرح چیخ رہا تھا۔

”بس خاموش رہو۔“ کوہر غرایا ”یہی گولی میں تمہارے سینے میں بھی مار سکتا تھا لیکن صرف تھوڑی سی سزا دی ہے۔ اگر یہاں کوئی ڈاکٹر ہے تو اس کی مرہم پٹی کر دے۔“

اتفاق سے ایک سرجن اپنے اوزاروں کے ساتھ اسی طیارے میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس زخمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ تم ایر پورٹ اتر کر فنگ جاؤ گے؟“ ایک عورت نے کوہر سے پوچھا۔

”نہیں میڈم! میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کسی ایر پورٹ پر اترنے کی حماقت کروں۔“ کوہر نے کہا۔

”پھر کیا کرو گے تم؟“

”میڈم، یہ آپ کا درد نہیں ہے۔“ کوہر نے کہا ”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟“

بے چارہ زخمی اپنی مرہم پٹی کروا کے ایک طرف ہو گیا تھا۔

ائر ہوٹیس نے سارے مسافروں سے حاصل کردہ رقم قبلی میں بھر کر کوہر کے حوالے کر دیے۔ کوہر نے قبلی کو دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا ”اچھا دوستو، میں نے آپ لوگوں کو صحت دی۔ اب میرے چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

سب اس سر پھرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اس نے ایر ہوٹیس سے پیراشوٹ طلب کیا۔

پیراشوٹ ہانڈ ہاوارڈ اڑتے ہوئے طیارے سے کود گیا۔ یہ تو

ایک پہلو ہوا، دوسرا پہلو اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے کوہر طیارے سے کود تو گیا لیکن وہ زمین پر نہیں۔

بے تاحیرت کی بات۔

اتفاق ہے کہ اس نے جہاں طیارے سے چھ لگائی، وہ فوجی علاقہ تھا، یہ چونکہ دن کا وقت تھا، اس لیے پیراشوٹ کو اترتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔

سب ہی حیران ہو رہے تھے کہ یہ کون شخص ہے؟

طرح پیراشوٹ سے نیچے آ رہا ہے۔ اس کو دور بینوں ذریعے آہر روکیا جانے لگا۔

پیراشوٹ سیدھے فوجی چھاؤنی کی طرف آ رہا تھا۔

لے فوجی بڑے اطمینان سے اس کے اترنے کا انتظار کرتے تھے۔

لیکن اچانک ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا اور پیراشوٹ قریبی جنگل کی طرف اترنے لگا۔ فوری طور پر فوجیوں کی طرف دوڑایا گیا لیکن اترنے والے کا کوئی پتا نہیں چلا۔

کوئی سراغ نہیں ملا، پورے جنگل کے پتے پتے تلاشی لے لی گئی لیکن نہ تو پیراشوٹ سے اترنے والے کا اور نہ ہی اس کے پیراشوٹ کا۔

آس پاس کی آبادیوں کی بھی تلاشی لے لی گئی لیکن کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ دوسری طرف ایر پورٹ مسافروں نے جب کوہر کے بارے میں بتایا تو سب حیران رہ گئے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ مسافروں کی فہرست میں نام ہی نہیں تھا یعنی اس نام کا کوئی مسافر طیارے میں نہیں ہوا تھا۔

اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاز میں مسافر سوار ہوئے تھے۔ ان کی کتنی مکمل بھی یعنی جتنے ہوئے تھے، اتنے ہی اتر بھی گئے تو پھر یہ کوہر کون تھا، نہ آیا تھا؟

یہ معما بھی ابھی تک لاغیل ہے۔

Man in Iron Mask

یہ دنیا کے سب سے پراسرار اور سب سے بد نصیب انسان کا نام ہے۔ نام کہاں ہے اس کی اس شخص پر نہ جانے کتنی بار لکھا جا چکا ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے اس پر روشنی ڈالنے کی ہے لیکن یہ راز ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ

وہ شخص اپنی زندگی میں بھی پراسرار رہا اور اپنی موت کے بعد بھی پراسرار ہے۔

یہ کہانی دنیا کے بد نصیب ترین شخص کی کہانی ہے۔ یہ واقعہ ہے سولہویں اور سترہویں صدی کے درمیان کا۔ کیونکہ اس کی موت نومبر 1703ء میں ہوئی تھی۔

فرانس میں اس وقت کنگ لوئس کی حکومت تھی۔ فرانس کی ایک جیل میں ایک ایسے قیدی کو لایا گیا جس کے چہرے پر لہو کی نقاب چڑھی ہوئی تھی اور صرف اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

اس قیدی کو بادشاہ کے حکم پر دہاں لایا گیا تھا۔ معمول کے مطابق جب اندراج کرنے کے لیے اس کا نام اور شناخت وغیرہ پوچھی گئی تو لانے والوں نے جواب دیا ”نہیں، اس کی کوئی شناخت نہیں ہے۔ بادشاہ کے حکم پر اسے الگ کٹھری میں رکھا جائے گا۔ کوئی شخص اس کے قریب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ صرف کھانا اور پانی اس کے کمرے میں پہنچا کر واپس آ جائے۔“

یہ تھا بادشاہ کا حکم اور ایک ایسا قیدی جس کے چہرے پر لہو کی ایسی نقاب تھی جو کسی صورت اتر نہیں سکتی تھی۔ اس شخص کو فرانس کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔

اور ہر جگہ اس کے ساتھ یہی صورت حال ہوتی تھی۔ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ خود وہ بھی بالکل خاموش رہتا تھا۔

کسی نے اسے بولتے ہوئے نہیں سنا۔

یا تو وہ گونگا تھا، یا پھر وہ خود ہی کسی بے بات نہیں کرتا ہوتا تھا۔

بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ شاید وہ حکومت کا کوئی اہم عہدے دار ہے، جسے کسی قسم کی سزا سنائی گئی ہے لیکن ایسا کوئی اہم عہدے دار عائب بھی نہیں ہوا تھا، سب اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔

اس کے بارے میں بے تحاشا قیاس آرائیاں کی گئیں۔

گون تھا وہ، بادشاہ نے اسے قید کیوں کر دیا تھا۔ اس کی شناخت کیوں چھپائی گئی تھی؟

کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بادشاہ سے اس کے بارے میں سوال کر سکتا۔ ایک طرف تو یہ صورت حال تھی، لی طرف یہ بھی تھا کہ بادشاہ اس کی صحت کی طرف سے متوجہ رہتا تھا۔

اب ایک بار وہ شخص بیمار پڑا تو بادشاہ نے اپنے خاص طبیب سے اس کا علاج کروایا تھا لیکن اس طبیب کو بھی معلوم

نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا سر بیض کون ہے؟

کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ شاید وہ شخص کسی بہت بڑے راز سے واقف ہے اور بادشاہ اس سے وہ راز اگلوانا چاہتا ہے، اس لیے اسے قید میں رکھا ہوا ہے۔

لیکن وہ شخص راز اپنے سینے میں دفن کر چکا ہے۔ وہ بادشاہ کو بتانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ خیال اس لیے ناقابل قبول ہوا کہ اگر بادشاہ کا کوئی راز اس کے پاس ہوتا تو بادشاہ اسے قید میں رکھنے کا جھنجٹ نہیں پالتا۔ ویسے ہی اس کو ہلاک کر دیتا، کون پوچھنے والا تھا۔

تو پھر یہ کون تھا؟

وہ شخص برسوں تک فرانس کی مختلف جیلوں میں قید رہا اور کوئی بھی اس کی صورت دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ بالآخر نومبر 1703ء میں اس آہنی نقاب پوش کی موت واقع ہو گئی۔

اب اس حوالے سے ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی موت کے بعد بادشاہ نے اس کے استعمال میں رہنے والی ہر چیز یا تو دفن کر دئی یا جلاد دی۔

انتہا یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ سارا کام خود اپنی نگرانی میں کر دیا تھا۔ اور آخر کار خود اس آدمی کی لاش بھی جلادی گئی تھی۔

اور وہ بے چارہ اپنی آہنی نقاب سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک پراسرار کردار بن کر رہ گیا کہ وہ کون تھا؟ اس کردار کو سامنے رکھ کر نہ جانے کتنی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔

کتنی فلمیں بن چکی ہیں لیکن ”مما“ ابھی تک حل نہیں ہو پایا ہے اور شاید کبھی حل بھی نہ ہو۔

Green Children of Woolpit

یہ کہانی بارہاں صدی کی ہے۔ لیکن تاریخی کتب والوں نے اسے ۱۱۰۰ء تک لکھا ہے۔

اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کی ہیں۔

ولپٹ برطانیہ کا ایک قصبہ ہے۔ اس زمانے میں یہ ایک صاف ستھرا علاقہ تھا۔ لوگ بھیتی باڑی کیا کرتے یا اور دیگر کام کرتے۔

زندگی مشینی اور تیز رفتار نہیں ہوئی تھی۔ سب ایک دوسرے کو جانتے بھی تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک رہا کرتے۔

یہ واقعہ اسی قصبے کا ہے۔

ایک صبح جب لوگ گھروں سے اپنے اپنے کام کے لیے نکلے تو انہوں نے دو بچوں کو دیکھا۔ دونوں گیارہ اور بارہ برس

شہریوں کا شہر

ایس جی یزدانی

سفر وسیلہ ظفر ہی نہیں وسیلہ معلومات بھی ہے۔ اس شہر کا سفر کر کے معلومات کا خزانہ ہاتھ آیا۔ لوگ کس طرح قانون کا احترام کرتے ہیں اور احترام قوانین کیسے زندگی کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔ اس کا ادراک ہوا۔ وہ ملک جہاں پانی ضائع کرنا قابل دست اندازی پولیس ہے۔ جہاں اگر بجلی چلی جائے تو حکومت ہرجانہ ادا کرتی ہے۔ جہاں پہنچ کر مسلمانوں نے عظیم الشان مساجد کی تعمیر کی، جہاں کا نظام قابل تعریف ہے مگر اس دیس میں وباں کے اصل باشندوں کو ہی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

مجھے سفراتے ہوئے کے شہریوں کی ملامت

آسٹریلیا میں ساٹھ ہزار سالوں سے آباد ایب اور یجن قوم پر لکھی گئی کتابوں کے بھی درشن ہوئے یہ شروع شروع میں ان کتابوں کا سرسری سا جائزہ لیتا رہا پھر تجسس نے سر اُبھارا تو اس قوم کی تاریخ کا دلچسپی سے مطالعہ شروع کیا۔ ابتدا میں صرف اس قوم کی تاریخ سے دلچسپی رہی لیکن جب مطالعہ کچھ وسیع ہوا تو میں ایب اور یجن کی کہانی سے بھی آگے

آسٹریلیا پر مضمون لکھنے کا شوق مجھے ملبورن پہنچ کر ہوا۔ ملبورن اپنے فرزند عزیز راحیل کے پاس اہلیہ کے ساتھ ہم ماہ کے وزٹ ویزا پر اگست 2005ء میں گیا تھا۔ وہاں میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ گھومنا پھرنا مطالعہ اور مشاہدہ کچھ کرنے کو تھا۔ کتابیں پڑھنے کا شوق لائبریری کی سمت لے جاتا۔ سارا سارا وقت مطالعے میں گزار دیتا۔ وہیں مجھے



بات کیسے کی جائے؟ کیونکہ جو کچھ وہ بولتے تھے، وہ قصبے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور جو قصبے والے بولتے تھے، وہ ان بچوں کے سروں سے گزر جاتا تھا۔ بالآخر قصبے کے ایک آدمی نے ان دونوں کو انگریزی سکھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

چونکہ وہ بچے کچھ زیادہ عمر کے ہو چکے تھے اسی لیے انہیں کوئی نئی زبان سکھانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے باوجود اس آدمی نے ہمت نہیں ہاری اور ان دونوں کو انگریزی سکھاتا رہا۔

پانچ سال گزر گئے۔

ان پانچ برسوں میں قصبے والوں نے انہیں اپنی اولاد کی طرح قبول کر لیا تھا۔ قصبے کے ہر گھر میں ان کا آنا جانا تھا۔ دونوں انتہائی خوبصورت تھے اور قصبے والوں کا یہ خیال صحیح نکلا تھا کہ دونوں بھائی بہن تھے۔ انگریزی سیکھ جانے کے بعد انہوں نے یہی بتایا تھا۔

اپنے بارے میں انہوں نے یہ بتایا کہ ان کا تعلق ایک ایسی سرزمین سے ہے جو زمین کے نیچے ہے اور اندھیروں کی دنیا کہلاتی ہے۔

وہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہوتا اسی لیے ان دونوں کی جلدیں اتنے گہرے سبز رنگ کی ہیں۔ ان دونوں نے یہ بھی بتایا کہ دونوں بھائی بہن گھر سے کھیلنے کے لیے نکلتے تھے کہ نہ جانے کیسے یہاں آ گئے۔

انہیں اپنے والدین اچھی طرح یاد تھے۔ انہیں یاد کرتے کرتے وہ اداس ہو جایا کرتے۔

قصبے والوں کا یہ خیال تھا کہ شاید ان دونوں کی زندگی اسی قصبے میں گزرے گی لیکن ایک دن وہ دونوں اچانک غائب ہو گئے۔

ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔ جس طرح وہ آئے تھے۔ اسی طرح واپس چلے گئے۔ شاید اپنی اسی زمین دوز دنیا میں، جہاں سورج کا گزر نہیں ہوتا۔

نہ جانے کیسے کیسے بھید یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ کیسے کیسے لوگ ہمارے اطراف میں ہیں۔ ایسے پراسرار لوگ جن کے لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون ہیں۔ اور ان کی زندگی کیا ہے؟

یہ بات تو یقینی ہے کہ ابھی بھی اُن گنت بھید ہیں جن تک انسانی اذہان کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔



سے زیادہ کے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ ان دونوں کی شبائیں ایک جیسی تھیں جو یہ بتا رہی تھیں کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اس طرح رو رہے تھے جس طرح والدین سے پھٹ جاتے والے بچے رویا کرتے ہیں۔

یہاں تک تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ دونوں کی جلد انتہائی گہرے سبز رنگ کی تھی۔ جیسے پورے جسم پر گہرے سبز رنگ کا پینٹ کر دیا گیا ہو۔

یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔

گہرے سبز رنگ کی جلد ایک انہونی سی بات تھی۔ پورے قصبے کو اس کی خبر ہو گئی۔ پورا قصبہ ہی ان دونوں کو دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو گیا۔

پھر جب ان سے بات کی گئی تو پتا چلا کہ وہ انگریزی نہیں جانتے۔ بلکہ وہ ایک ایسی زبان بول رہے تھے، جو قصبے والوں کی سمجھ سے بالکل باہر تھی۔

وہ جس معصوم نگاہوں سے قصبے والوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور روئے جا رہے تھے، قصبے والوں کو ان پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے یہ بے چارے کون تھے، کہاں سے آئے تھے؟

انہیں جب کھانے کے لیے دیا گیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر مقامی چرچ کے پادری نے قصبے والوں سے کہا ”دیکھو، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں بچے کسی اور سیارے سے آئے ہیں۔ انہیں خدا کا تحفہ سمجھو۔ ان کی قدر کرو، ان کا خیال رکھو اور یہ جان لو کہ خدا ہم سے خوش ہے اسی لیے اس نے ان دونوں کی پرورش کے لیے ہمارے قصبے کا انتخاب کیا ہے۔“

ان دونوں کے لیے اسی وقت قصبے کا ایک گھر مخصوص کر دیا گیا۔ ان دونوں کو وہاں لے جایا گیا اور قصبے کے کچھ مردوں اور عورتوں نے اب بچوں کی پرورش کی ذمہ داری قبول کر لی۔

ایک مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں کو جو کچھ کھانے کے لیے دیا جاتا، وہ کھانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یقیناً ان کی خوراک مائلک ہو سکتی تھی۔

لیکن کہا تھی، قصبے والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کئی دنوں کے بعد جب ایک عورت نے ان بچوں کے سامنے ۱۱۱ کے گلاس رکھے تو انہوں نے دودھ پی لیا تھا۔

ایک مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ان سے

آسٹریلیا کی سرزمین تو ازل سے ہی قائم تھی مگر انسان نہ تھے، انسانی قدم انڈونیشیا کے جزائر سے اس طرف بڑھے اور یہی یہاں کے قدیم باشندے قرار پائے۔ بعد میں انہیں ایب اور نیجن قوم کہا گیا۔ ان لوگوں کی آمد تب شروع ہوئی جب آکس اٹج کا زمانہ باقی تھا۔ پوری دنیا برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔

یاد رہے کہ آئس ایچ کو ختم ہوئے بھی 15 ہزار سال ہو چکے ہیں مگر یہ سرزمین باقی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ یہ دورانیہ تقریباً ساڑھے چار سو سال پر محیط ہے۔ ویسے جنوب میں کسی طلسمانی جزیرے کا ذکر قصبے کہانیوں میں موجود تھا۔ چین، ہندوستان اور عرب میں ایک عجیب و غریب سرزمین کی کہانی سنائی جاتی رہی تھیں کہ اس طلسمانی جزیرے کی مٹی سونے کی ہے۔ وہاں پریاں رہتی ہیں، بھوت پریت اور چڑیلیں ہیں۔ وہاں جابر عورتیں حکومت کرتی ہیں۔

آسٹریلیا جنوب کے پانیوں میں تن تنہا ہے سب سے چھوٹا براعظم اور سب سے بڑا جزیرہ ہے اس کی زمینی سرحد کسی بھی ملک سے نہیں ملتی۔ اس کا سب سے قریبی ہمسایہ ملک شمال میں تیمور ہے جبکہ مغرب میں براعظم افریقا ہے اسی لیے اسے لونلی پلانٹ بھی کہتے ہیں۔

ڈھونڈنے والوں نے اس سرزمین کو سولہویں صدی میں تلاش کیا۔ جب اس تلاش کی خبر یورپی ممالک میں پھیلی تو دو دفعے دو دفعے سے جہاز راں یہاں آنے لگے لیکن وہ ٹھہرتے نہیں، واپس چلے جاتے تا آنکہ اٹھارویں صدی کی آخری دہائی سے کچھ قبل برطانوی جہاز راں جیمس کک یہاں پہنچا تو برطانیہ کی لائبریری نکل آئی۔ برطانیہ کو ان دنوں اپنے مجرموں کے ٹرانسپورٹیشن میں مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اب تک وہ اپنے جرائم پیشہ اور سزایافتہ مجرموں کو امریکا بھیجا کرتا تھا۔ لیکن امریکا آزاد ہو گیا تھا اور اس نے برطانوی مجرموں کو اپنے یہاں رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ آسٹریلیا کی صورت میں برطانیہ کو متبادل جگہ مل گئی۔ چنانچہ 80 سالوں تک وہ مجرموں کو یہاں بھیجتا رہا۔ یہاں مجرموں اور قیدیوں کے لیے کالونیاں بنائی گئیں اور دیکھ بھال و انتظامی امور کے لیے عملہ اور گورنروں کو مقرر کیا گیا۔

انہوں نے صدی کے نصف میں یہاں بے تحاشا سونے کی کانیں دریافت ہوئیں اور 50 سالوں کے اندر اندر ہزاروں کمزور اور بیمار لوگوں کی دریافت کا سن کر لوگوں کا

یہاں تاحقاً بندھ گیا۔ چنانچہ لاکھوں کی تعداد میں طالع آزما یہاں آچنچے اور یوں ایک غیر آباد بستی آباد ہوتی چلی گئی۔ 1945ء سے 1980ء تک 52 لاکھ سے زیادہ لوگ یہاں آئے ان میں اکثریت برطانیہ، اٹلی، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک کی ہے۔ ان کے علاوہ بھی 140 مختلف ممالک سے لوگ آکر آباد ہوئے۔

1850ء میں کراچی کی بندرگاہ سے 13 اونٹ اور چند پنجان بھی یہاں لائے گئے۔ ان کی جفاکشی دیکھ کر قید حار اور بلوچستان سے مزید اونٹ اور پنجان منگوائے گئے۔ چونکہ آسٹریلیا کا وسطی اور جنوب مغرب کا ایک بڑا حصہ خشک ریگستانی اور چٹیل ہے، ان اونٹوں کے کارواں کو سواری، سامان بردار اور بار برداری کے لیے ضروری سمجھا گیا اور ایک کالونی سے دوسری کالونی تک سامان لانے لے جانے کا کام انہیں سونپا گیا۔ یہ لوگ افغان سے غان کہلانے لگے۔ آدھی صدی سے زیادہ عرصہ وہ اپنے کام سے لگے رہے اور جب ٹرین کی آمد ہوئی تو انہی کے ٹریک پر لائنیں ڈالی گئیں اور ٹرین کا نام غان ٹرین رکھا گیا جو 1980ء تک قائم رہا۔ یہ پنجان جن جگہوں پر رہے وہاں بھی مسجدیں بھی بنائیں۔

آسٹریلیا میں سب سے پہلی مسجد ریاست جنوبی آسٹریلیا میں Marree کے مقام پر تعمیر ہوئی۔ یہ 1861ء کا زمانہ تھا، ایک مسجد 1890ء میں جنوبی آسٹریلیا کے صدر مقام ایڈیلیڈ میں تعمیر ہوئی، یہ مسجد اب شاندار مچی مسجد ہے۔ ایک مسجد Marree سے شمال مشرقی ریاست جنوبی آسٹریلیا کے Broken Hill میں 1891ء میں بنائی گئی۔ گویا ڈیڑھ صدی قبل اس ملک میں ہمارے بھائی بند پہنچ کر اپنا مقام بنا چکے تھے اس لیے اس ملک کو ایک نظر دیکھنے کا شوق عرصے سے تھا یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی موقع ملا، اس سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ سفر کتنا پر لطف تھا، گئے ہاتھوں اس کا ذکر بھی کرنا چلوں۔

وہ دن 14 اگست 2005ء کا تھا جب ہماری صبح
ملبورن ایئر پورٹ پر ہوئی۔ 12 اگست کی شب کراچی سے
اہلیہ کے ساتھ ہم ملبورن کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ جہاز نے
ہمیں دوسرے دن صبح بنگاک پہنچایا۔ وہاں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا
رکنے کے بعد دوپہر کو ہانگ کانگ پہنچے۔

جہاز سے اتر کر لاؤنج پر جانا تھا جو اوپر کی منزل پر تھا۔ یہاں بھی بخشا نہیں گیا۔ بہر حال نام کے لیے ہی باڈی سرچ اور آئرن بار کے دروازے سے گزر کر کھڑا ہوا تو ارشاد ہوا کہ اوپر لاؤنج پر تشریف لے جائیں۔ ہنڈ کیری بیگ

گندھے سے لٹکایا اور دوسرے گندھے پر اہلیہ کا بیک لیا اور ہم
وگ خود کار سیر می کے ذریعہ اوپر پہنچے۔ اوپر پہنچے تو لاؤنج
ہال کھلا کھلا سا لگا۔ انٹرپورٹ پر ہوائی جہازوں
کو پرواز کرتے اور اترتے دیکھ سکتے تھے۔ لاؤنج کی چوڑائی
دادہ نہیں تھی، لیکن لمبائی کہ بس دیکھتے رہ جائیں۔ ایک
لہا سیدھا پلیٹ فارم تھا اور بہت آگے جا کر سیدھے ہاتھ
کوڑتا تھا۔ پلیٹ فارم کے درمیان میں خود کار نے تھے
ہاں تو قدموں سے جل کر جائیں، چاہیں تو بغیر ہاتھ پاؤں
لانے راستہ ملے کریں۔

لاؤنج کے پلیٹ فارم میں جگہ جگہ پر کرسیوں کی افادیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ ڈیرہ جمایا اور اطمینان کا سانس لیا۔ ہر تھوڑی تھوڑی دوری پر ٹائلٹ بنے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے تازہ دم ہو کر سوچا کہ پہلے کچھ کھاپی لایا جائے۔ اہلیہ نے بتایا کہ دوپراٹھے اور بھنا گوشت ٹھن گریٹر میں ہے بس پینے کے لیے پانی لے آئیں۔ میں نے اُدھے لاءونج کا چکر لگایا لیکن پینے کے پانی کا کوئی ٹلکایا کوئی اور بندوبست نظر نہیں آیا۔ عجیب گوشت ہوئی۔ چند سے پوچھا تو گورا جواب ملا ”معلوم نہیں۔“ دل کہتا تھا کہ اب ایسا بھی کیا ہے کہ اتنے بڑے لاءونج میں پینے کے لیے پانی کا بندوبست نہ ہو لیکن دیکھتی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ سوچا کہ یہاں بوتل کے پانی سے کام چلتا ہے۔ چلتے چلتے ایک طرف کو گیا چند دکانیں تھیں۔ ایک دکان میں چینی گڑیا سے پوچھا تو اس نے مٹ سے ایک جھوٹی بوتل نکالی اور کاؤنٹر پر رکھ دی۔ ”ہما کتنے پیسے؟“ جواب ملا، 2 یو ایس ڈالر۔ میں نے سوچا کہ مہرے سننے میں غلطی ہوئی ہے تو پھر پوچھا۔ اس بار اس نے 10 اکیاں دکھا کر کہا 2 ڈالر یو ایس مجبوراً ہانگ کا تنگ کا تنگ کلا اور دو ڈالر کاؤنٹر پر رکھ کر واپس ہوا۔ راستے میں مجھے ایسی ایسی کسی فلم میں مرحوم رنگیلا کا ٹکے کلام تھا کہ 3 سال تک ایک کا تنگ کے تنگے کا پانی پیا ہے۔ رنگیلا مرحوم نے اپنا انٹرپورٹ سے باہر سڑک پر گئے تنگے کا پانی پیا ہوگا۔ واپس اہلیہ کے پاس پہنچا تو ساتھ لائی ہوئی جائے نماز پکڑے لٹلی میں، کہنے لگیں۔ ”پہلے ظہر کی نماز پڑھ لی جائے۔“ میں نے تاخیر میں گردن ہلائی اور تھرک پانی کی بوتل بیگوں کے اس رکھ دی۔ بوتل پر نظر پڑی تو اہلیہ نے کہا کہ بڑی بوتل لے آئے۔ میں نے جواب میں کہا کہ یہ تھرک ہے، بھر گھوم دو گھومت پر گزارہ کرنا ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے 120 روپے کا پانی ہے۔ بھوک کوئی خاص نہیں مگر گریٹ پینے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ خیر سوچا نماز او

جارج برنارڈشا:

دین محمدی اپنی حیاتِ آفرینی کے باعث میری نظر میں ہمیشہ قابلِ تکریم رہا ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس میں تئذیاتِ عالم کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت دکھائی دیتی ہے اور جو ہر دور میں حاذبِ توجہ ہے۔

میں نے دین محمدی کے بارے میں یہ پیشگوئی کی ہے کہ جس طرح دورِ حاضر کا یورپ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے، اسی طرح مستقبل میں یہ سب کے لیے قابلِ قبول ہو جائے گا۔

جان ولیم ڈریپر:

جینین کی موت 569ء میں ہوئی اسی کے چار سال بعد عرب میں مکے کے مقام پر وہ انسان پیدا ہوا جس نے بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ نسل انسانی کو متاثر کیا۔

ایسے آرگب:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آپؐ کی اصطلاحات سے عورت کا عام مرتبہ بہت بلند ہو گیا۔

ایسے جے ٹائن بی:

اہل اسلام میں نسلی منافرت کا عدم وجود اسلام کا ممتاز ترین کارنامہ ہے اور عصر حاضر کے حالات کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کی اس خوبی کی نشر و اشاعت کی جائے۔

لامارتین:

اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی کمی اور محدثہ انگیزہ
مناج، تاملہ انسانی کے محض ہمارے ہاں کمال تاریخی
حاضر کی کون سی عظیم ہستی ہے جسے مصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے مقابلے میں پیش کرنے کی ہر اہمیت کی ہستی ہے؟
فلسفی، خطیب، مفتی، سپہ سالار، جس نے انکار و تصورات کو
تسخیر کیا، جس نے ایسے عقائد دیے جو عقل و استدلال کی
میزان پر پورے اترتے ہوں، جس نے دوزخ و عذاب کی
جس میں انسان کا وجود تک نہیں، جس نے بیس ارضی
سلطنتوں اور ایک روحانی سلطنت کی اساس رکھی۔ یہ ہیں
محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم پوچھتے ہیں کہ کون سا انسان
ہے جسے عظمت انسانی کے کسی بھی معیار کی رو سے آپ
سے عظیم تر قرار دیا جاسکے؟

انتخاب: اظہر بکمال صدیقی، کراچی

کھانے سے فارغ ہو کر آرام سے سگریٹ کا کش لگاؤں گا۔ ہم دونوں نے قصر نماز ادا کی اور روٹی کھا کر دو دو کھونٹ پانی پی کر "سیر" ہو گئے۔ کھانا کھاتے وقت ادھر ادھر دیکھا تو کسی مسافر کو بھی سگریٹ نوشی کرتے نہیں پایا۔ میں سمجھ گیا یہ نو اسموکنگ زون ہے۔ ذرا ٹہل کر دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی بورڈ آویزاں ہوگا لیکن کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ شیشے کا ایک الگ تھلک کمرانظر آیا جہاں بند ہو کر لوگوں کو سگریٹ نوشی کرتے دیکھا۔ میں بھی دروازہ کھول کر اندر چلا گیا اور اندر شیشے کے پاس کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگا۔ کمرے میں مردوں کے علاوہ تین لڑکیاں بھی تھیں جو شوق پورا کر رہی تھیں۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ "چمپ" کے پینے سے بہتر ہے کہ نہ پیوں۔ بس جہاز پر سوار ہونے سے قبل ایک بار آؤں گا اور بس۔

واپس آیا تو اہلیہ کو کرسیوں پر نیم دراز پایا۔ میں بھی الگ جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کراچی چھوڑے ہوئے ابھی وقت ہی کتنا گزر رہا تھا۔ خیال گھر کی طرف چلا گیا، کچھ گھنٹے پہلے انٹر پورٹ پہنچے تھے۔ وہاں یاد آیا کہ سوٹ کیسوں کی چابیاں گھر بھول آیا ہوں۔ چابیوں کے بیگر میں لٹتی رہ گئی ہیں۔ جان پدر ٹھیکل نے کہا۔ "کوئی بات نہیں، میں گھر سے چابی لے آتا ہوں۔" ہاں تا میں وہ نکل گئے۔ گلستان جو بری تو جانا تھا۔ کچھ دیر جب ہو گئی تو دوسرے بچوں نے جو خدا حافظ کہنے آئے تھے، سچ سچ کا خدا حافظ کہہ کر انٹر پورٹ کے اندر بھیج دیا۔ اندر پہنچے تو دیکھا مجمع نہیں ہے۔ اتنا ڈکا لوگ کاؤنٹر اور لائن میں ہیں۔ خود ہم دونوں چیکنگ بار سے گزر گئے۔ ٹرائی کا سامان بھی گزر گیا۔ ٹرائی مین ساتھ تھا۔ آگے بڑھے، دو صاحبان ایک کاؤنٹر پر کھڑے تھے، ان میں جو سینئر تھے انہوں نے السلام علیکم کہا۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ ٹکٹ اور پاسپورٹ لیا، دیکھا اور واپس کرتے وقت پوچھا۔ "آسٹریلیا کیوں جا رہے ہیں؟" بتایا وہاں صاحبزادے رہتے ہیں، گھومنے جا رہے ہیں۔ پھر میں نے گزارش کے انداز میں کہا کہ ہمارا سامان سیدھا ملبورن انٹر پورٹ پر اتارا جائے۔ انہوں نے جواب میں کہا۔ "انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا، اطمینان سے سفر کریں۔"

میں نے مزید کہا کہ میں چابیاں گھر چھوڑ آیا ہوں، اگر ہمیں کھول کر سامان چیک کرنا ہو تو ذرا توقف سے کام لیں گے۔

انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔ "ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں نے دل کو ٹہلی دی کہ اب ملبورن انٹر پورٹ پر

ضرورت پڑی تو تالا توڑ دیں گے۔ نماز پڑھنے کی جگہ نظر آئی تو ہم دونوں عشا کی نماز پڑھنے چلے گئے۔

نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا PIA کا ایک پورٹر مجھے تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے اسے دیکھا اور مسکرا دیا پھر اٹھ کر قریب آ گیا، وہ بولے "آپ.....!" میں نے جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی اپنا نام بتایا اور چونکہ چابیوں کا گچھا میں نے دیکھ لیا تھا لہذا چابیاں لے کر شکر یہ ادا کیا۔ میں فون کر کے کنفرم کر دینا چاہتا تھا۔ ایک صاحب PCO لگائے بیٹھے تھے، وہاں سے فون کیا اور بتا دیا۔ پھر میں نے پوچھا "چابی لانے والے کو کچھ....." میرا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ جواب میں بتایا گیا کہ مجھے کچھ نہیں دینا ہے۔ اب صرف خدا حافظ ہی کہتا باقی تھا، سمجھوں کہ ہم دونوں کی طرف سے خدا حافظ اور تمام آنے والوں کی طرف سے بھی خدا حافظ کہا گیا۔ نیلی فون کا بل 2 منٹ کی گفتگو کا ایک سو روپیہ، خیر مجبور کو سبھی لوٹتے ہیں۔ میں نے ادا کر دیا لیکن ذرا تنبیہ بھی کی تو صاحب بڑا مان گئے اور بک بک کرنے لگے۔ ایک اور صاحب کہیں سے آ گئے۔ مجھ سے احوال پوچھا۔ میں نے جو بات بھی بتادی۔ وہ صاحب فون والے کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے اور پھر سو کی جگہ پچاس روپے برسات ختم ہو گئی۔

عصر کے وقت عصر کی قصر ادا کی۔ کسی کسی گیٹ کے کاؤنٹر پر اب ذرا چہل پہل زیادہ نظر آنے لگی تھی۔ پلیٹ فارم کے دونوں طرف کے گلیوں پر بھی لوگ جمع تھے۔ میں نے کارڈ پر کنفاس کے گیٹ کا نمبر نہیں پڑھا تھا۔ اس لیے کہ سامنے ہی ایک گیٹ کے کاؤنٹر پر ملبورن لکھا ہوا دیکھا تو سمجھا کہ اسی گیٹ سے گزر کر جہاز پر جانا ہے۔ کچھ دیر بعد سگریٹ کا کش لگا کر واپس آیا تو سامنے کاؤنٹر پر عملہ پہنچ چکا تھا اور مسافر بھی اکٹھا ہونے لگے تھے۔ ہم دونوں نے بھی بیک اٹھائے اور مجمع میں شامل ہو گئے۔ کاؤنٹر کھلا تو لوگ لائن میں لگ گئے، ہم بھی لائن میں آگے بڑھتے رہے۔ اپنی باری پر اطمینان سے کارڈ حوالے کیا۔ ایک خاتون جلدی جلدی کام نمٹا رہی تھیں۔ ایک کارڈ بچ ہو گیا تو نہ جانے کیا خیال کیا اور دوسرا کارڈ پڑھنے لگیں۔ جلدی سے پہلا کارڈ بھی واپس کیا اور کہا کہ یہ گیٹ نہیں ہے۔ میں انھیں میں پڑ گیا دوسرے صاحب جو کاؤنٹر پر موجود تھے، ان سے کہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا، آگے ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایک خاتون تھی اس نے کہا کہ آئیں، میرے ساتھ..... جلدی کریں، وقت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر تیزی سے ایک طرف کوچل پڑیں۔

میں بھاری بیک اٹھائے اس کے پیچھے دوڑا اور اہلیہ سے

کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلتی آئیں۔ وہ مجھ سے آگے تھی، کافی آگے جا کر وہ مڑ گئی اور جب میں وہاں پہنچا تو وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں نے مڑنے سے قبل پلٹ کر اہلیہ کو دیکھا اشارے سے اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر میں آگے بڑھا۔ اس خاتون کو آگے ایک جگہ کھڑے پایا۔ خیر سے جب کاؤنٹر پر پہنچے تو خود ہی خاتون نے سچ کیے ہوئے بورڈنگ کارڈز ہاتھ میں تھمائے اور کہا کہ جلدی جائیں۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سرنگ نما کلیارے میں داخل ہو کر جہاز پر سوار ہو گئے۔

اطمینان کرنے کے بعد آس پاس نظریں دوڑائیں۔ اب گورے پنجروں کی تعداد زیادہ تھی۔ جہاز کے اندر کی فضا بدل گئی تھی۔ ہمیں احساس ہو گیا کہ اب ہم "مشرق" سے "مغرب" میں آ گئے۔ میزبانی کا شرف اب گوروں اور گوریوں کو حاصل ہے۔ جہاز کو سواچھ بجے پرواز کرنا تھا لیکن تاخیر ہوئی رہی۔ جہاز بہت بڑا تھا لیکن مسافروں کی تعداد کم تھی۔ خدا خدا کر کے پرواز کی باری آئی۔ گھڑی کا وقت تبدیل نہیں کیا تھا۔ ہانگ کانگ کے وقت کے مطابق رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کی ٹرے ملی۔ پورے جہاز میں ہم میاں بیوی واحد پنجر تھے جنہیں مہب سے پہلے کھانے کا سامان ملا۔ تعجب ہوا کہ ایسا کیوں ہے؟ کھانے کے ڈبے پر نظر پڑی تو انکس میں لفظ حلال لکھا ہوا نظر آیا۔ بات یہی سمجھ میں آئی کہ ڈبے بدل نہ جائیں اس لیے ہمیں منایا گیا۔ کھاپی کر اطمینان کیا اور وضو کر کے مغرب اور عشا کی نمازیں بیٹھے بیٹھے ادا کیں۔ ٹیک لگا کے سونے کی کوشش کی اور اونچے سوتے جاگتے سفر جاری رہا۔ بیٹشیں خالی پڑی تھیں کچھ لوگ دو دو تین تین سیٹوں پر لہبا لیٹے تھے۔

جب ناشتا ملنے لگا تو گھڑی دیکھی، صبح تو نہیں ہوئی تھی شاید ہم آسٹریلیا کے اوپر محو پرواز تھے۔ خیر ناشتا کیا، وہی حلال ڈبا سب سے پہلے ہمیں ملا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد نماز فجر ادا کی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہم ملبورن کے ہوائی اڈے پر اتر رہے تھے۔ ملبورن کے انٹر پورٹ پر ایک بڑے ہال میں چند کاؤنٹر لگے ہوئے تھے۔ لوگ لائن میں کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم میاں بیوی اسی ٹرائی دکھینے ہوئے لائن میں گئے جارہے تھے کہ ایک انعام میں ملبوس افسر نے روکا اور پوچھا "ڈیٹکریشن کارڈ لے کر لیا ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "یہ کیا ہوتا ہے؟" تو اس نے ایک الگ تھلک کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا ہاتھ سارے کارڈز رکھے ہوئے ہیں۔ ایک کارڈ اٹھایا تو

1928ء میں ہندوستان میں سائنس کمیشن آیا تو راجا محمود آباد نے میرے کان میں کہا کہ اب ہم بائیکاٹ کے مظاہرے کے لیے کوئی نیا طریقہ سوچیں۔ ہم نے طریقہ سوچ لیا۔ ہم نے "سائنس واپس چلے جاؤ" کے پوسٹر لکھ کر غباروں اور پتھروں کے ساتھ باندھے۔ لکھنؤ کے تعلق داروں نے کمیشن کے افراد کو قیصر باغ میں جانے کی دعوت دی تھی۔ جب وہ لوگ باغ میں جائے بی رہے تھے تو میں نے اپنے مکان کی محبت سے پتنگ بڑھانے شروع کیے۔ پھر غبارے اڑا دیے۔ اتفاق سے ہوا کا رخ موافق تھا۔ غبارے مہمانوں کے درمیان جا گرے۔ جب پتھریں مطلوبہ بلندی تک بڑھیں تو میں نے ڈوریں کاٹ دیں اور یہ بھی مہمانوں میں جا گریں۔ تعلقدار تو بہت گھبرائے لیکن کمیشن کے برطانوی ممبروں نے اس دلچسپ طریقہ احتجاج سے بہت لطف اٹھایا۔ شام کو پولیس میرے دروازے پر کھڑی تھی لیکن ان کے پاس وارنٹ نہیں تھے۔ میں نے مزاحمت کی اور وہ وارنٹ لینے چلے گئے لیکن لوٹ کے نہ آئے۔

اقتباس: چوہدری خلیق الزماں، بقلم خود
مرسلہ: نعمان فیض پوری، جہلم

معلوم ہوا کہ تک لگا کر اسے پڑ کرنا ہے جس میں مختلف قسم کی چیزوں کی ڈکٹریشن کا اندراج تھا۔ اس میں ایک خانہ بھی تھا کہ کھانے پینے کی کوئی چیز ساتھ لائے تو نہیں؟ ہم نے، دلوں کا ڈنڈہ نہیں، کانک لگایا اور کاؤنٹر کی طرف چل دیے۔ کاؤنٹر اب قریب قریب خالی پڑا تھا۔ ہمارے کاغذات چیک کیے گئے اور OK کر دیا۔

آگے بڑھے تو سامان کنویر بیلٹ پر ڈالا اور دوسری طرف سے نکال لیا۔ کاؤنٹر پر دو اشخاص ڈیوٹی پر تھے۔ آخری گھڑی میں ایک نے اہلیہ کا پرس کھولنے کو کہا تو اس میں سے 5/4 لیموں نکلے۔ اس نے کہا کہ یہ کھانے کی چیز ہے۔ کارڈ پر آپ نے ڈکلیئر کیا ہے کہ کھانے پینے کی کوئی شے نہیں ہے۔ جواب دیا کہ یہ کھانے کی تو ہے لیکن یہ تو قدرتی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ضبط ہوگا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "آپ کے بیک میں کوئی پھل وغیرہ تو نہیں؟"

اب جموٹ کیا بولتا، بتایا کہ تین کلو آم ہیں۔ اس نے وہ بھی نکلو لیے، اللہ اللہ خیر صلا۔ ٹرائی دھیلے ہوئے باہر نکلے تو سامنے ہی بیٹے اور بہو کودیکھا۔

انرپورٹ شہر سے 30/25 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ انرپورٹ سے باہر نکلے تو سردی کا احساس ہوا تھا۔ ہماری یوم آزادی کی صبح یعنی 14 اگست کی صبح ہم بلورن میں تھے۔ بلورن کے بارے میں سیرا پہلا تاثر عین خوشگوار احساسات کا حامل رہا۔ انرپورٹ سے گھر تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ راستے میں ہریالی اور ترتیب سے تراشے ہوئے سبزہ زاروں نے دل موہ لیا۔ کشادہ سڑکیں، بچوں کی چوڑی سفید پٹیاں اور چوڑی پٹیوں کی وائیں اور بائیں جانب دو دو تین تین گاڑیوں کی آمدورفت کے ٹریکس۔ ان کے بعد ایک ایک کم چوڑی پٹی جو سائیکل سواروں کے لیے، پھر دونوں جانب ایک اور سفید پٹی جہاں کاریں کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ اس پٹی کے ساتھ گرین بیلٹ جس پر گھاس لگی ہوئی تھی اور چھوٹے درخت، اس کے بعد فٹ پاتھ اور فٹ پاتھ کے بعد رہائشی مکانات کی بانڈری وال۔ بانڈری وال کے اندر بھی سبزہ اور پھول کے پودے لگے ہوئے تھے، سارے مکانات ایک سیدھ میں، ایک ہی طرح کے دکھائی دے رہے تھے۔ لال اینٹوں کی دیواریں اور لال ٹائلز کی چھتیں۔

میں اپنے بیٹے کے پاس کوبرگ کے علاقہ میں رہائش پذیر ہوا۔ مکان کے سامنے ہیرا اسٹریٹ ہے جو بل اسٹریٹ سے ملتی ہے۔ بل اسٹریٹ بھی شاہراہ ہے جو مشہور سڑک سڈنی روڈ کو کراس کرتے ہوئے گزرتی ہے۔

یہاں سردیوں کا موسم اپریل سے شروع ہو جاتا ہے اور اگست تک رہتا ہے۔ چنانچہ جانی سردیوں میں ہم بلورن میں تھے لیکن ان جانی ہوئی سردیوں میں بھی لحاف کے اوپر کبیل اور ہیٹر جلا کر رات کو سونا پڑتا تھا۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے وہاں مٹی اور جون کی سردیاں گزارنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اوپر سے گرج چمک کے ساتھ بارش۔ اگرچہ بارشیں لگتا نہیں ہوتی تھیں لیکن جتنی دیر بھی رہیں موسم کو اور بھی سرد بنا دیتی تھیں۔ بارش کا یہاں کوئی خاص موسم نہیں، کبھی بھی کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ ستمبر کی پہلی تاریخ سے موسم بہار شروع ہو جاتا ہے لیکن سردی دسمبر تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہاں کے لوگوں کے لیے 30 ڈگری گرمی شدید گرمی ہوتی ہے۔ لوگ گھر چھوڑ کر ساحلوں، جھیلوں اور فارم ہاؤس کی طرف اٹل پڑتے ہیں۔ 30 ڈگری سے زائد گرمی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ صرف ان کے لیے ہی نہیں

بلکہ نباتات کے لیے بھی۔ میرے قیام کے دوران کئی بار مضافات کی جھاڑیوں اور جنگلوں میں خطرناک آتشزدگی کے حادثات رونما ہو چکے تھے۔ احتیاطاً شہر کے اندر گھاس پھوس کو کاٹ کاٹ کر برابر کرتے رہتے ہیں ورنہ خود بخود آگ لگ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ گھروں اور گھروں کے سامنے گرین پلیٹ کی گھاس کی کاٹ چھانٹ کی ذمہ داری کمپنیوں پر ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر گھر میں گھاس کاٹنے کی مشین ضرور ہوتی ہے۔

بلورن نام ہے ایک صاف ستھرے خوبصورت مقام کا، جگمگاتی جھلملائی روشنیوں کا۔ بادلوں، بارشوں اور ٹھنڈی ہواؤں کا۔ یہ شہر ہے سرسبز و شاداب مناظر کا۔ خوبصورت رنگ برنگے پھولوں، پودوں اور درختوں کا۔ خوبصورت پرندوں کا۔ بڑے بڑے باغوں پارکوں کا، جھیلوں کا، سرسبز وادیوں کا۔ دنیا کے 140 ملکوں سے آکر بس جانے والے گورے، سانولے اور کالے لوگوں کا۔ ان کی تہذیبوں ثقافتوں، روایتوں، زبانوں اور مذاہب کا۔ امن پسند، بچہ، اپنے کام سے کام رکھنے والے شہریوں کا۔ ملکی قوانین کی حد درجہ پاسداری کرنے والے اصول پسند اور ترقی یافتہ لوگوں کا۔

قدم قدم پر تھانے نظر نہیں آتے، نہ ہی کہیں پولیس کی ٹوٹی نظر آتی ہے اور نہ ٹریفک پولیس۔ لگتا ہے پورا شہر ایک خود کار نظام کے تحت چل رہا ہے جہاں روزمرہ کے تمام کام ایک اصول، سلیقے اور خوبصورت طریقے سے انجام پتے ہوئے ہیں۔ ایسے شہر اور شہر کے ماحول میں کس کا جی یہاں رہنے کو نہیں چاہے گا۔ 1991ء کے ایک بین الاقوامی سروے کے مطابق اس شہر کو دنیا کا "Most Livable City" کا خطاب ملا تھا۔

یہ شہر ریاست وکٹوریہ کا صدر مقام ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے نام پر ریاست کا نام وکٹوریہ پڑا۔ ملکہ کا وزیراعظم بلورن ایک لائق وزیراعظم تھا اور ملکہ کا تالیق بھی، اسی کے نام پر خوبصورت شہر بلورن ہے۔

بلورن مشرقی سمندر سے قریب آسٹریلیا کے جنوب میں Port Philips Bay کے کنارے واقع ہے دریائے یارا کوہ اعظم فاصل کے جنوبی پہاڑی سے شروع ہو کر تقریباً 240 کلو میٹر کا راستہ مغرب اور پھر جنوب طے کرتا ہوا بلورن سے گزرتا ہوا Port Philips Bay میں گرتا ہے۔ یہ شہر دریائے یارا کے دونوں طرف آ ہے۔ بلورن ایک معروف بندرگاہ بھی ہے جہاں جہاز

نے لنگر انداز ہونے کے لیے بہت سے گھاٹ ہیں اور بند بنے ہوئے ہیں۔

بلورن شہر کے مصافات کا پھیلاؤ شمال کی جانب 70 کلو میٹر اور مشرق سے مغرب کی طرف 50 کلو میٹر تک ہے۔ یہ پھیلاؤ ایک عظیم آسٹریلیا کے خواب کو پورا کرتا ہے ہاں ہر شخص کو رہنے کے لیے اپنا گھر ملے۔ ابھی اس کی آبادی کا تناسب ایک ایکڑ اراضی پر صرف 16 نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کے مقابلے میں پیرس اور لندن میں ایک ایکڑ میں تقریباً 48 اور 56 افراد اوسطاً آباد ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ 1835ء میں ایک تجارتی انجن کے سربراہ جان ہیٹ نے 2 لاکھ 2 ہزار ایکڑ زمین ایک ایب اور انجن کنبے سے محض چند کمبلوں کے جوڑے، چھری چاقو اور لچنیوں، عینکوں، تولیہ، کپڑوں اور پچاس پونڈ آنے کے عوض حاصل کیا تھا۔ شروع میں بلورن کی آبادی دریائے یارا کے شمال مشرقی کنارے پر آباد ہوئی جو اب بلورن سٹی کہلاتا ہے بعد میں دوسرا کنارہ آباد ہوا جو زیادہ تر رہائشی علاقہ ہے۔ دریائے یارا کے دونوں کناروں کو ایک طرے صورت آہنی پل ملاتا ہے۔

بلورن کی آبادی تقریباً 35 لاکھ ہے۔ جو مختلف نسلوں، مذہبوں اور تہذیبوں کے حامل لوگوں کی ہے۔ اس آبادی میں 25 فیصد وہ لوگ شامل ہیں جن کی پیدائش اس مریض پر نہیں ہوئی ہے۔ ایب اور انجن کی آبادی اس دست میں 20 ہزار اور بلورن میں 12 ہزار کے قریب ہے اپنی کیونٹی سینٹر میں الگ تھلک رہتے ہیں۔ بلورن شہر میں ملک نسلی گروپ کی آمد سے یہاں 42 فی صد لوگوں کی گھریلو آبادی انکشاف نہیں بلکہ ان کی اپنی مادری زبان ہے۔

بلورن سٹی تجارتی مرکز ہے۔ یہاں بلند و بالا اسکائی گراؤنڈ، نادر ز اور گلاس ہاؤس ایسٹاڈ ہیں۔ Kinto Towai کرہ جنوب میں کوآلاپور کی جڑواں عمارت Petronas کی تعمیر سے قبل سب سے بلند عمارت تھی۔ اس کے ڈیزائن اور شیشے کی دیواروں کی وجہ سے یہ عمارت لکھ کے لائق ہے۔ یہ جڑواں ٹاور ہے۔ ایک میں 44 منزلیں اور دوسرے میں 40 منزلیں ہیں۔ نیچے 5 منزلہ ہالے میں انڈر گراؤنڈ پارکنگ لائٹ ہے۔ اوپر 55 ویں ل میں Observation ڈک ہے اور چھت پر کئی ہل سیل قائم ہے۔ Collins اسٹریٹ جو ایک معروف بین الاقوامی سینٹر ہے اسی اسٹریٹ پر یہ ٹاورز بنائے گئے ایک اور بلند رہائشی ٹاور ہے۔ یہ 91 منزل عمارت تمام

مشاہیر عالم کی نظر میں اسلام

حضور پر نور کی شخصیت

معروف مفکر باسور تھا سمجھ کا خراج عقیدت

آپ کے اخلاص کا سب سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخر تک اپنے لیے اسی نازل (یعنی پیغمبری) کا دعویٰ کیا جس سے انہوں نے ابتدا کی تھی اور جسے بلند و بالا فلسفہ اور سچی ترین عیسائیت بھی قبول کرتی ہے، مجھے پورا یقین ہے، ایک دن سب اتفاق کر لیں گے کہ آپ پیغمبر ہیں، خدا ہی کے پیغمبر۔

انتخاب: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

کی تمام تر رہائشی ہے اور رہائشی اعتبار سے دنیا میں سب سے بلند عمارت ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کمرشل بلند و بالا عمارتیں ہیں۔ دور سے یوں لگتا ہے کہ تمام بلند و بالا عمارتیں بلورن سٹی کے ایکس کوئے میں ایستادہ ہیں۔ یہیں Crown انٹرنیشنل مپلکس ہے جس میں ہوٹل ریسٹورنٹ اور کسینو ہیں۔ کسینو میں تین سو میزیں ہیں اور وہاں ہر ایک جوئے کی مشینیں ہیں۔ ایک سینما ہال، ٹائٹل ٹی وی خانے اور شاہنگ سینٹر بھی ہیں۔

دریائے یارا کے شمال میں،

سے قریب دریا، Goolong میں مغرب میں Westgate پارک کے اوپر سے گزرتا ہے جو ایک بڑا تفریحی مقام ہے۔

دریائے یارا پر ایک اور پل ہے جس کا نام Bolte Bridge ہے۔ اس کے نیچے ایک سرنگ ہے جو پانی کے اندر راستہ بناتی ہے۔ اس پل کے اوپر سے گزرتے وقت 2 ڈالر ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ پل کے اوپر ہی کیمرا اور مشینیں نصب ہیں اور گزرنے والی گاڑیاں ایک مخصوص کارڈ کو گزرتے وقت اپنی کار کے ڈیٹر اسکرین سے لگاتی ہیں۔ ایک Beep کی آواز ہوتی ہے گویا ٹیکس منہا ہو گیا جو

Handwritten signature

تفریحی ٹرین اور چلڈرن سٹی فارم کی بھی سیر کرائی جاتی ہے۔
ملبورن پارکوں، باغوں، سبزہ زاروں اور ٹھیکل کے
میدانوں کا بھی شہر ہے۔ البرٹ پارک جو دریائے یارا کے
کنارے ہے ایک خوبصورت جگہ ہے۔ رائل پارک بھی
خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں پہلی ستمبر سے موسم بہار شروع
ہوتا ہے۔ ہر طرف پودے اور درخت رنگ رنگ پھولوں
سے لد جاتے ہیں۔ پھولوں کی بڑی دراغی دیکھنے کو ملے
گی۔ گرمیوں میں زیادہ تر پھول جھڑ جاتے ہیں۔ لوگوں کو
گلاب لگانے کا بہت شوق ہے۔ رنگ برنگے گلاب خوب
بڑے بڑے ہوتے ہیں لیکن گہرے سرخ رنگ کے گلاب
کے سوا کسی میں خوشبو نہیں ہوتی۔ سڑکوں کے کنارے لگے
درختوں پر بھی موسم بہار میں مختلف قسموں کے پھول کھلے
نظر آتے ہیں۔ سفید، گلابی اور زرد رنگ کے پھولوں سے بھرے
.... درخت جن کی پتیاں جھڑ چکی ہوتی ہیں، عجیب
بہار دکھاتے ہیں۔ ایک درخت پر گلابی رنگ کا پھول پتوں کی
دودھ کی بوتل صاف کرنے والے برش کی طرح دیکھا۔ چھ
آٹھ انچ کی ڈنٹھل پرانچ ڈیڑھ انچ پلاسٹک کی سوئیوں کی
طرح گلابی گلابی پھول درخت میں بھرے نظر آئے۔ یہاں
کارواں پارک بھی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خیموں میں لوگ
رات بسر کرتے ہیں۔ اگر خیمہ نہیں ہے تو کرایہ پر بھی دستیاب
ہیں۔ یہاں کے ٹھیکل کے میدان بہت مشہور ہیں۔ یارا پارک
ٹھیکل کے میدانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس سے مراد
مشہور زمانہ ملبورن کرکٹ گراؤنڈ، ملبورن پارک، نیشنل ٹینس
سینٹر، اولمپک پارک اور چند دوسرے اسپورٹس گراؤنڈ اور
خالی سبز میدان ہیں۔



ڈنگ

حاذب احتشام

ایک معمولی سا واقعہ جو تقریباً ہر ملک میں رونما ہوتا ہے مگر اس واقعے نے ملک کی تقدیر بدل دی، ایک انقلاب کا پیغام بنا اور ساؤتھ افریقا میں آزادی حاصل کرنے کا ہگل بن گیا۔ اس واقعے پر کئی فلمیں بنیں، بہت سارے ناول لکھے گئے۔ انہی ناول میں سے ایک ناول کا خلاصہ، ایک دردناک حقیقت۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور اڑتی ہوئی گرد کو پختہ ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ یورپین اپنے پیچھے بس یہی کچھ ہو چکا تھا اور اب کسی دوسری ٹیلی کے استقبال کے لیے بالکل

چھوڑ جاتے تھے، اپنی کار سے اڑتی ہوئی سرخ کردہ، رنگا خالی ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ یورپین اپنے پیچھے بس یہی کچھ ہو چکا تھا اور اب کسی دوسری ٹیلی کے استقبال کے لیے بالکل

پارک کا قیام عمل میں آیا۔ 1960ء میں ساحل پر بیٹھ کر دیے گئے جہاں خاموشی سے بیٹھ کر پیٹنگوں کے پیریز کو دیکھتے ہیں۔ ساحل کے اوپر ریٹورنٹ اور اسٹور قائم ہو اور ٹکٹ کے ذریعے وقت مقررہ پروپووائنٹ پر لوگوں کو جانے لگا۔ ہم لوگ بھی ٹکٹ لے کر بیٹھ گئے۔ مغرب سے پہلے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ ہم بھی ساحل کی طرف دیکھتے رہے کہ کب دیدار ہو۔ کیمرا، سکرینٹ جلاتا، لائٹر نارچ روشن کرنا منع ہے۔

پیٹنگوں کی آمد شروع ہوئی۔ دودو، چار چار کی ٹو میں ساحل کے پانی میں ابھر کر کنارے آنے لگے پھر گئے۔ جو آ گئے وہ فوجیوں کی طرح لائن لگا کر آہستہ آہستہ ایک ڈسپلین کے ساتھ جھاڑیوں کے نیچے غائب ہو گئے۔ تماشا ختم پیسا ہضم۔ ہم لوگ بھی اٹھ گئے اور جانے لیے سیر میوں کے بعد نیچے کی جانب واش روم اور پہلے تختہ بچھا کر پلیٹ فارم بنا ہوا ہے اس پر چادر بچھا کر ہم لوگ مغرب کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ گزرنے والا جھانک جھانک کر دیکھنے لگے کہ یہاں کوئی اور تماشا ہوا ہے۔ کچھ لوگ جو سمجھتے تھے کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں، دیکھ گئے لیکن کچھ لوگ بحس کے مارے کھڑے کھڑے دیکھنے لگے۔

میں نے پانی کی کمی کا ذکر کیا تھا جس کی وجہ سے لوگ اپنے پودوں کو زیادہ پانی نہیں دے سکتے، نلکے میں پانی رہتا ہے لیکن قانون کی پاسداری ہے۔ ضرورت سے پانی نہیں بہا سکتے۔ اکثر گھروں میں بارش کا پانی جمع کر طریقہ بنایا ہوا ہے۔ چونکہ وہاں جھت عام طور پر نا کھریل کی ہوتی ہیں، بارش کے پانی کو پر تالے کے ذریعے بڑے بڑے ٹینکوں میں پانی جمع کر لیا جاتا ہے اور اہل سے اپنے لان کو سیراب کرتے ہیں۔ بارش کا یہاں کوئی مقرر نہیں، کبھی بھی اور کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ مہینہ بہار کا موسم ہے جب ہر طرف ہریالی اور لان میں طرح کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ پھول کے بڑے درخت بھی ہوتے ہیں جن میں لال پیلا اور نیلا کے پھول کھل جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ لیموں استعمال کرتے ہیں، ان کے گھروں میں لیموں کا پودا ہوتا ہے جو بارہ مہینے پھل دیتے رہتے ہیں۔ سرخ اور بڑے بڑے گلاب لہلہاتے ہیں جن میں خوشبو نہیں ہوتی

حساب سے دوسو سے لے کر ہزار روپے پیکٹ کی قیمتیں ہیں۔ ہندوستانی دکانوں میں گنگا عام مل جاتا ہے لیکن وہ بھی بہت مہنگا۔

انگریز اور یورپی ڈاکٹروں اور انجینئروں کے علاوہ انڈین، پاکستانی اور ترکی ڈاکٹر اور انجینئر یہاں کام کرتے ہیں۔ ان کے کلینک بھی ہیں۔ آسٹریلیئن سٹیشن کے لیے دوا علاج مفت ہے۔ باہر والوں کو علاج میں کافی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ یونانی، اٹالین اور لبنانی حجامت کی دکانیں چلاتے ہیں۔ شراب عام دستیاب ہے۔ انگریزوں اور یورپی باشندوں کے علاوہ چینی، مشرق بعید کے لوگ اور انڈین میں شراب نوشی عام ہے جبکہ اٹکاؤ کا لبنانی اور ترکی بھی شراب پیتے ہیں۔ عام طور سے سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمان شراب نہیں پیتے۔

ایک دلچسپ احوال قلب آ کی لینڈ کے پیٹنگوں کے Parade کا ہے جسے دیکھنے کے لیے شام ڈھلے ٹکٹ لے کر ساحل پر جانا پڑتا ہے۔ ملبورن کے نزدیک مغرب میں قلب آ کی لینڈ ہے جسے سمندر کے اوپر سے آہنی پل سے ملا دیا گیا ہے۔ اسی آ کی لینڈ میں مغرب اور جنوب میں سر لینڈ ساحل ہے۔ ساحلی ریت کے بعد مٹی کا ڈھیر جنگلی جھاڑیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان ہی ڈھیروں اور جھاڑیوں کے نیچے دنیا کے چھوٹے قد و قامت کے پیٹنگوں کا ڈیرہ ہے۔ وہ یہاں رات بسر کرتے ہیں۔ سارا دن سمندر کی تہوں میں غوطہ مار کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ ساحلی کناروں کی اونچی زمین پر پھیلے ہوئے پارک کو نیشنل نیچر پارک کہتے ہیں۔ ہزاروں سال سے رہائش پذیر پیٹنگوں سورج طلوع ہونے سے پہلے سمندر میں چلے جاتے ہیں اور شام کو واپس آنا شروع ہوتے ہیں۔ اسی واپسی کے منظر کو دیکھنے لوگ یہاں آتے ہیں۔ لوگوں کا یہ مشغلہ آج کا نہیں، تقریباً ایک سو سال سے جاری ہے۔ اس وقت بھی جب ٹیبل نصب نہیں ہوا تھا، لوگ لائنوں اور کشتیوں میں سفر کر کے وہاں پہنچتے تھے۔ شروع شروع میں ساحلی کنارے کے اوپر لوگوں نے مکانات اور گیسٹ ہاؤس تعمیر کرائے تھے۔ شوقین لوگ کبیل اور کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں ڈیرہ ڈالتے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور شور شرابے سے یہ معصوم جانور بہت ڈر رہتے ہوتے تھے اور نقل مکانی کر کے وہاں سے چلے گئے۔ کچھ جنگلی کتوں اور لومڑیوں کا شکار ہو گئے تو پھر حکومت نے ان کے تحفظ کی اگے داری کو محسوس کرتے ہوئے اس زمین کو پارک میں تبدیل کر دیا۔ اوپر باڑھ باندھ دی۔ مکانات گرا دیے گئے۔ ساحلی علاقوں کو خاموش زون قرار دیا یوں قلب آ کی لینڈ نیچر

جاری

تیار تھا۔ اگلی فیملی بھی پچھلی فیملیوں کی طرح کینیا میں دو سال یا ممکن ہے چار سال قیام کرے اور پھر واپس امریکا، انگلینڈ، جرمنی، فرانس یا جہاں کہیں سے بھی آئی ہو، چلی جاتی ہے۔ کچھ فیملیاں اسے یاد نہیں اور کچھ کو وہ بھول جاتا چاہتا تھا۔ مثلاً پہلی فیملی کو، جس کی اس نے خدمت کی تھی لیکن یہ آزادی سے پہلے کی بات تھی جب کوئی گوراکسی افریقی سے جیسا سلوک چاہتا کرتا۔

نیٹو کے پیچھے، کہیں کسی خالی کمرے میں، دیوار گیر الماری کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ وہ اس خیال سے مڑا کہ ممکن ہے، میم صاحبہ نہ آگئی ہو لیکن وہ تو کوہے تھا، جو جھاڑو سے الماری کی صفائی کر رہا تھا۔ گزشتہ کل کھڑکیاں دھوئی گئی تھیں اور اس نے فرش کو بھیڑکی کھال سے خوب رگڑ رگڑ کر بالکل آئینے کی طرح چمکایا تھا جس پر یورپین بچہ خوش ہو کر ہنسنے لگا تھا اور اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے اس کے ساتھ لگا رہا تھا۔

سنے آنے والوں کو یہ دکھانے کے لیے کہ وہ اور اس کا مددگار کوہے گھر کو صاف ستھرا رکھنے کا ہنر جانتے ہیں، گھر کی صفائی بے حد ضروری تھی کیونکہ نئی میم کسی بھی وقت آ کر دیکھ سکتی تھی۔ وہ پہلے بھی گوروں کی خدمت کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ انہیں کس وقت کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس نے کھڑکی کی چوکت سے تھوڑا سا رنگ ناخن سے کھرچ دیا اور جیب میں رکھی، بیس ٹیلنگ کی نوٹوں کی گڈی کی سرسراہٹ اپنی ران پر محسوس کرنے لگا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ گڈی نکال لی اور جیسے اس کی رگوں میں آسودگی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ یہ ایک مہینے کی تنخواہ اور دو مہینے کا پولس تھا۔ اس سے وہ اپنے بچوں کے اسکول کی فیس ادا کر سکتا تھا اور پھر اتنی رقم بچ جاتی کہ وہ اپنے لیے ایک نئی شرٹ خرید سکتا اور آج یا کل رات سنیما بھی جاسکتا تھا۔ وہ سنیما کا بہت شوقین تھا حالانکہ وہ انگریزی اتنی زیادہ نہیں سمجھتا تھا اور فلموں میں انگریزی بہت فراتے سے بولی جاتی تھی لیکن اب وہ دن دور نہیں کہ سواہلی زبان میں فلمیں بننے لگتیں جب سواہلی زبان میں فلمیں بننے لگیں گی تو خوب دیکھے گا۔ رنگین تصویریں، بھاگتی ہوئی کاریں، جہاز، طیارے، آگ، اونچی اونچی عمارتیں اور بار الماری۔

کوہے خاموشی سے اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا لیکن نیٹو کو اس کی آمد سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ اسے سگھ لپٹا تھا۔ کوہے اپنے بالوں میں جوتیل استعمال کرتا تھا اور جو میل اپنے ہاروں پر مالش کرتا تھا، اس کی بو

کے ہوئے آم جیسی تھی۔ اگر وہ کسی قرعہ سے بھی گزرتا تو وہ بتا سکتا تھا کہ کوہے دوسرے گزرا تھا۔ ”تمہیں ہوا کیا ہے؟“ کوہے نے پوچھا۔ وہ سترہ سال کا تھا، نیٹو سے دس سال چھوٹا مگر شہنی باز تھا اور اکھڑ لہجے میں بات کرتا تھا ”تم کھڑکی پر کیوں کھڑے ہو؟ میں تو تمہیں بہت دیر پہلے یہاں چھوڑ گیا تھا۔“

نیٹو نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا ”کیا تم نے ساری الماریاں صاف کر دیں؟“

”ساری..... اب میں شہر جا رہا ہوں۔“ اس نے جھاڑ

دیوار سے نکا دیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر بیس ٹیلنگ کے نوٹوں کی گڈی نکال لی۔ ”یہ ڈھیر سارے پیسے ہیں۔“ نیٹو نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کوہے نے اس سے پہلے اتنی رقم نہیں دیکھی تھی۔ شہر میں یہ اس کی پہلی نوکری تھی اور اس نے پہلی بار گوروں کی خدمت کی تھی۔ کوہے نے بے پروائی سے شاخ اُچکائے اور گڈی واپس جیب میں رکھ لی ”چلو، شہر چلیں۔“

بول۔ نیٹو نے نفی میں سر ہلایا ”پہلے میں کھانا کھاؤں گا اور پھر تھوڑا سوؤں گا، کل شہر جاؤں گا۔“

”پیسوں کے ہوتے ہوئے تمہیں نیند کیسے آئے گی؟“ ”کیونکہ میں اپنی ذات کے علاوہ دوسری چیزوں کے بارے میں بھی سوچتا ہوں۔“ نیٹو نے جواب دیا ”تمہیں سوچنا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ تم سب سے پہلے ڈاک خانے اور اپنا سیونگ اکاؤنٹ کھول لو۔ اس کے بعد شہر جاؤ۔“

”مجھے پیسے بچانے کی کیا ضرورت ہے؟“ ”کبھی نہ کبھی تم شادی کرو گے، تمہارے بچے ہوں گے اور انہیں کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ تمہیں انہیں اسکول بھی پڑے گا۔ اس میں بہت پیسے لگتے ہیں۔“ ”تم بالکل میم صاحب جیسی باتیں کرتے ہو۔“ اس ہنس کر کہا۔

کسی عورت سے اس کا موزانہ سخت توہین آمیز تھا۔ نیٹو اپنا غصہ پی گیا کیونکہ کوہے نے جو ان تھا۔ اس کی شکل بھی اور پھر اس کے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔

”جب وقت آئے گا تو میں بیوی اور بچوں کی فکر گا۔“ کوہے نے کہا ”اس وقت تو میں شہر جا رہا ہوں۔“ اس میں سنیما دیکھوں گا اور اس کے بعد بازار میں چکر لگاؤں گا۔“ نیٹو کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ کو

صن بہت جاتا تھا۔ نیٹو صرف دو مرتبہ وہاں گیا تھا اور لپٹا تھا کہ اب نہیں جائے گا۔ وہاں کی عورتیں اس کے گوروں جیسی نہیں تھیں۔ ان کی سرمنڈے ہوئے نہیں اور ان کے رنگے ہوئے منہ سے شراب کی بو آتی تھی۔ کی خوش ذائقہ بیئر کی نہیں، یورپ کی دھسکی کی بو۔ اس دھسکی بھی پی تھی۔ صرف ایک بوتل میں اس کے مہینے کی ادھ صاف ہو گئی تھی اور وہ دن بھر مریضوں کی طرح پڑا رہا تھا۔

”پہلے پوسٹ آفس جاؤ۔“ اس نے کہا ”اتنے پیسے لوں کے بعد دیکھنے کو ملیں گے۔ بازار میں جانے کے بعد بے پاس کچھ نہیں بچے گا۔“

لیکن وہ جانتا تھا کہ کوہے اس کی بات نہیں سن رہا تھا اور اس گڈی میں سے کچھ بھی نہیں بچے گا جس سے آج اس کو اتنی پھولی ہوئی تھی۔ وہ اداسی سے کھڑکی سے باہر لگا۔ یہ میم صاحب بہت اچھی تھی جو چلی گئی۔ ”تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟“ کوہے نے پھر پوچھا۔

”میں چاہتا تھا کہ یہ لوگ نہ جائیں۔ کون جانے اگلی بار کی ہوگی؟“ اس نے اداسی سے کہا اور پھر خیال نظروں کے آگے کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

اولوں ایک ہی قبیلے، ایک ہی برادری کے تھے۔ اس نے کوہے اس کا بھائی ہوتا تھا لیکن نیٹو ایک باپ جیسی راری محسوس کرتا تھا کیونکہ وہی اسے لے کر شہر آیا تھا اور لی دلائی تھی۔ ”تم نہیں جانتے کہ یہ لوگ کتنے مہربان لگے؟ تم نے بھی یورپ والوں کے ہاں کام نہیں کیا ہے۔“ ”میں ایک لمحہ توقف کیا اور پھر اسے اس گوری فیملی کے میں بتانے لگا جس کی اس نے پہلی بار خدمت کی۔“ ”ایک روز میں نے گلاس میں پانی پی لیا اور میم صاحب کہہ لیا۔ وہ بے حد خفا ہوئی۔ اس نے وہ گلاس اٹھا کر باہر دیا اور اس کے پیسے میری تنخواہ سے کاٹ لیے۔“

”تم یہ بات مجھے تمہارے ہی بتا چکے ہو۔“ کوہے نے کہا۔ ”لے لے اثبات میں گردن ہلاتی“ ”پھر تو تم نے ان میں اس کر لیا ہوگا اور پھر سوچنے کی حاجت نہیں کرو گے کہ آپ والے اچھے ہوتے ہیں، جیسے یہ میم صاحب بھی جو اس یہاں سے گئی ہے۔“

”وہ اچھی کیسے ہو گئی؟ کیا اس لیے کہ اس نے ہمیں پیسے دیے؟“ ”نہیں، اس نے کام کیا تھا۔ ہے کہ نہیں؟ نیٹو، میں تمہیں بتاؤں۔ تم صرف چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دیتے

جب تم کسی سے دوستی کرو تو پھر اس میں شک نہ کرو اور کسی سے شہرہ کرو اور نہ کسی سے اس کے پاس سے سوال کرو ممکن ہے کہ تمہیں اس کا دشمن مل جائے اور وہ اس میں وہ عیوب بتائے جو اس میں نہ ہوں اور تم میں تعزیری پیدا ہو جائے (حدیث شریف)

(شاہیہ نیازی بکس)

دوستی

ہو۔ گلاس میں پانی پینا..... کیا تم اپنی بیوی کے بارے میں بھول گئے؟“

”بیوی.....؟“ نیٹو نے نرمی سے دُہرایا۔ یوں گویا یہ اس کے لیے بالکل نیا لفظ ہو..... یا یوں گویا اس نے یہ لفظ طویل عرصے سے نہ سنا ہو۔ ”تم میری بیوی کا ذکر کیوں کر رہے ہو؟“

”اس لیے کہ تم ”اچھی“ میم صاحب کا ذکر کر رہے ہو۔“ کوہے نے کہا ”اور اس لیے کہ شاید تم بھول گئے ہو کہ جو کچھ بھی ہوا، اس کی ذمہ داری ”اچھی“ میم صاحب تھی۔“

نیٹو کے چہرے پر سوچ کی پر مہاں لڑ لے گئیں۔ کوہے کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ لیکن اس کے اندر جیسے کوئی شے حرکت کر لے گی ایک عجیب سا احساس کہ نہیں لے لے گا۔ اس میں ملا کی ٹانہ تھی۔ اس ٹانہ سے اسے اپنا سر بھاری محسوس ہونے لگا اور منہ خشک ہو گیا، زبان پر جیسے کانٹے پڑ گئے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچایا اور پھر گویا ہوا ”کیا ہوا تھا کوہے؟ تم کس واقعے کا ذکر کر رہے ہو؟“

کوہے دیر تک اسے گھورتا رہا پھر لب کھولے ”نیٹو، ہم بھائی جیسے ہیں۔ ہے کہ نہیں، اگر تمہیں کچھ یاد نہیں تو میں تمہیں یاد دلانا بھی نہیں چاہتا۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک بھائی دوسرے بھائی کے بارے میں جانتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا۔ اس بھائی سے بھی نہیں.....“ اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار سے ٹکا ہوا جھاڑو اٹھا لیا اور مزید ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

ٹیو کھڑکی سے اسے پختہ روش کو پار کر کے ان مجازوں کے پیچھے غائب ہوتے دیکھتا رہا، جو اس احاطے کو سروٹ کوارٹرز سے جدا کرتی تھیں۔ پھر جب اس نے کوپے کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو اپنی جگہ سے حرکت کی اور ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر اس جگہ رکھ لیا جہاں سے وہ جلن پھیلی تھی..... اور اب ایک آگ سی اس کے پیٹ اور سینے میں دیکھنے لگی تھی اور جیسے پھل پھل کر اس کی آنٹوں میں اترنے لگی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بچھنے لیے تاکہ شدت کرب سے اس کی چیخیں نہ نکل جائیں۔ وہ انتظار کرتا رہا اور جب کوپے کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تو وہ کھڑکی سے ہٹ گیا تاکہ کوپے اسے نہ دیکھ سکے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کوپے جا چکا ہے تو وہ بچھنے سے نکل آیا اور دروازے میں قفل ڈال کر چابی اپنی جیب میں رکھ لی جہاں وہ نئی فیل کی آنے تک محفوظ رہتی۔

☆☆☆

اس کے پیٹ کی آگ اب مدھم مدھم تھی لیکن اس نے اس کی بھوک کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ہانڈی میں رکھے ہوئے بھات کو گرم کرنے کی زحمت نہیں کی بلکہ بیلے میں اٹھیل کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور بستر پر لیٹنے کے بعد ایک باریک سا مکمل اپنے شانے تک پہنچ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت دیر ہو گئی اور نیند نہ آئی تو اس نے کروٹ بدل کر مکمل کو اپنے سر کے اوپر کھینچ لیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اس کی بیوی کا نام رتھ تھا۔ یہ نام اس کے باپ نے گوروں کے خدا کی کتاب میں موجود کسی کے نام پر رکھا تھا جبکہ ٹیو کے باپ نے کہا تھا ”ہم لوگوں کے نام ایسے نہیں ہوتے، کوئی دوسری لڑکی دیکھو۔ اس کے علاوہ اس کا قد چھوٹا ہے، وہ زیادہ بچوں کی ماں نہیں بن سکے گی۔“

لیکن اب قدریں بدل رہی تھیں اور کوئی بھی شخص خود اپنی دلہن کا انتخاب کر سکتا تھا۔ ٹیو نے اپنے لیے رتھ کو چنا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں ایک عجیب سی جاذبیت تھی اور وہ جسمانی اعتبار سے بھی بہت پرکشش تھی۔ ٹیو نے رتھ کو اپنا کر اپنے باپ پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ غلطی پر تھا۔ رتھ اس کے چار بچوں کی ماں بن چکی تھی اور پانچواں بھی تولد ہو چکا تھا۔ ہر سال، دس چاند کے بعد جب وہ اپنے گاؤں جاتا تو رتھ ایک نو مولود اس کے ہاتھوں میں لے کر آتی۔ وہ اس کے ساتھ ہوتا تو اس کا

دل ہر وقت خوشیوں سے لبریز ہوتا اور وہ وہاں سے واپس نہ چاہتا بلکہ سوچتا تھا کہ اسے واپس بھی جانا ہے۔ رتھ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اسے چٹائی پر لیٹے لیٹے رتھ آنکھوں میں جما نکلتا اور ان میں اترتی ہوئی چاہت کو دیکھ کر بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ کبھی اس سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ گاؤں میں کوئی کام نہیں ملتا تھا اور وہاں رکنے کا مطلب یہ کہ جیب میں پھولی کوڑی نہ ہوگی۔ اسے ہر حال میں دل واپس جانا پڑتا تھا جہاں وہ کما سکتا تھا اور اس پیسے سے اس کے لیے کپڑے خرید سکتا تھا، کھانا مہیا کر سکتا تھا اور اسکول فیس دے سکتا تھا۔ اس کے پانچ بچے تھے اور وہ جانتا تھا کسی روز چھ ہو جائیں گے، پھر سات، پھر آٹھ اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ وہ گنتا نہیں چاہتا تھا۔ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سوچنا تو اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ وہ ان کے لیے کپڑے کہاں سے خریدے گا؟ اسکول کی فیس کہاں دے گا؟ اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ کیا آسمان برسیں گے؟ سب کچھ انسان ہی کو تو کرنا پڑتا ہے ورنہ بھو مینا پڑتا ہے..... اس نئے دور میں تعلیم بہت ضرور تھی۔ اسے اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا تھا تاکہ وہ بڑے ملازمتیں حاصل کر سکیں اور گوروں کی طرح رہ سکیں۔

ایک دن میم صاحب نے اس سے، اس کی فیل باریے میں پوچھا تھا ”ٹیو، کیا تمہاری بیوی بھی شہر آئی؟“

”نہیں میم صاحب!“ اس نے احترام سے جواب دیا تھا ”وہاں سے بس میں یہاں تک آنے کے لیے بہت لگتے ہیں۔“

”کیا تم چاہتے ہو کہ وہ یہاں آئے؟ بولو، کیا تم چاہتے ہو کہ وہ یہاں آ کر ہم سے ملے، گھوسے پھرے؟“ صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

اس کی گہری نیلی آنکھیں براہ راست ٹیو کی آنکھ میں جما کر رہی تھیں۔ ٹیو نے اپنی نگاہیں جھکا لیں صاحب کو کیا پتا کہ وہ رتھ کو شہر لانے کا کتنا متشقی تھا۔ رتھ آنے والی پہلی عورت ہوتی۔

”ہاں میم صاحب! میرا دل بہت چاہتا ہے۔“ جواب دیا۔

”پھر وہ ضرور آئے گی، ٹیو!“ میم صاحب نے ہنس کر اتے ہوئے کہا ”وہ آ کر یہاں ایک ہفتہ رہ سکتی ہیں تمہیں بس کا کرایہ دوں گی اور جیب خرچ بھی دوں گا کہ تم اسے شہر میں تمہارا پھر لے سکو۔“

☆☆☆

جس دن رتھ آنے والی تھی، اس دن وہ اسے لینے والی کے بس ٹریٹل پہنچ گیا تھا۔ اس کا دل شدت جذبات سے بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے رتھ کو دیکھنے کی بہت خوشی تھی اور وہ اسے شہر دکھانے اور اچھی اچھی جگہوں پر لے جانے کے بارے میں سوچ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ پھر اس کی تھی اور جب اس نے رتھ کو بس سے اترتے دیکھا تو اس کا سر غر سے بلند ہو گیا۔ رتھ کا منڈا ہوا سر، ایک صاف سرے نیلے اسکارف سے بندھا ہوا تھا جو اس کے لباس کے رنگ تھا اور اس کے پیروں میں جوتے تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں جو تے نہیں پہنتی تھیں لیکن اس نے رتھ کو بتایا تھا کہ شہر میں سب لوگ جوتے پہنتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ رتھ نے کافی بے باغیہات میں اور ناگوار کیا ہوگا اور ان پیسوں سے جوتے لے لے ہوں گے۔ بس سے اترتے وقت اس کی آنکھیں بھی کھلی تھیں۔ پھر وہ اسے ان سبھی سبھی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔

”میں سب سے چھوٹے کو لے آئی ہوں۔“ وہ یونی میں اسے چھوڑ کر نہیں آ سکتی تھی۔“

اب تک ٹیو نے اس کے سینے سے لگی ہوئی ننھی سی گھری لڑکی نہیں کیا تھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اس کے جوتوں پر پڑی تھی اور پھر وہ اس کی آنکھوں میں جما کٹنے لگا تھا۔ اب اس نے اس ننھی سی گھری کو دیکھا۔ اس کا بچہ..... نیا بچہ..... اس نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل کسی تلی کی مانند اٹل سے پھڑپھڑانے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے خوف سے لرزے لگا۔ یوں جیسے کسی زہریلے کیڑے نے اس تلی کو دبوچ لیا۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی خوشیوں پر ڈنک مار دیا۔ کیا میم صاحب خفا ہو گیا؟ اس نے صرف اس کی بیوی کو دیکھ کر دھوکا دیا تھا۔ لیکن اب شاید وہ یہ دیکھ کر ناراض ہو کہ اس کے ساتھ آ گیا تھا۔

اب اس نے بچھلے کے دروازے پر دستک دی تو مارے گمراہ اور پریشانی کے اس کا خون جیسے پانی ہو گیا اور پھر اس نے رتھ کو میم صاحب کے آگے کر دیا۔ اسی وقت رتھ زور زور سے رونے لگا۔ ٹیو نے صاحب کے ہاتھ کو تھام لیا اور بھرتی ہوئی دیکھیں لیکن میم صاحب نے مسکرائی اور رتھ سے مصافحہ کیا۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں شفقت اتر آئی تھی۔ پھر اس نے بچے کو لڑکی سے ہاتھ پھیرا اور اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر اس کے گود کھانے لگی۔ ان لمحات میں ٹیو نے محسوس کیا کہ وہ

منجانب رب ذوالجلال

کوستان لبنان کے ایک بزرگ دمشق کی جامع مسجد کے حوض میں گر گئے۔ لوگوں نے انہیں بعد دشواری باہر نکالا۔ نماز کے بعد ایک شخص ان بزرگ کے پاس آیا اور بہت ادب کے ساتھ سوال کیا کہ حضرت، یہ تو بتائیے کہ جناب کی آج کی اور پہلی حالت میں اس قدر فرق کیوں نظر آیا؟ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار میں جناب کے ساتھ سفر کر رہا تھا، ہمارے راستے میں ایک دریا آیا تو جناب نے بغیر کشتی اور پل کے اس دریا کو اس طرح پار کر لیا کہ جناب کے پیروں کے نیچے بھی پوری طرح نہ بھیکے تھے جبکہ آج یہ حالت دیکھی کہ آپ ایک معمولی حوض میں گر گئے اور خود باہر نہ نکل سکے؟ بزرگ نے یہ سوال سن کر کچھ غور کیا اور پھر فرمایا۔

”اس سلسلے میں مختصر برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان قابل غور ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کبھی میری حالت یہ ہوتی ہے کہ براہ راست اللہ پاک کی قربت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی واسطہ نہیں بنتے۔ اس فرمان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لفظ ”کبھی“، ”میرا“، ”فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں تم نے سنا ہوگا کہ ایک وقت تو وہ تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں نے انہیں کنویں میں گرایا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو معلوم نہ ہوا کہ ان کا پیارا بیٹا کنویں میں گرا یا گیا ہے اور خان کو معلوم ہو گا تھا کہ ان کا پیارا بیٹا کہاں ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے سیکڑوں کوس دور سے حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے کی خوشبو سونگھ لی۔

اس حکایت میں حضرت سعدیؒ نے یہ بات بتائی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام سے جو معجزات اور کرامات ظاہر ہوتی ہیں ان کا انحصار ان کی ذاتی کوششوں یا اپنے کمالات پر نہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ پاک کی طرف سے ہوتا ہے، منج کمالات خدا ہی کی مقدس ذات ہے۔

(ماخوذ از گلستان سعدی) تلاش: اعظم جمل صدیقی، کراچی

میم صاحب کی اس شفقت اور مہربانی کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکے گا۔

☆☆☆

اس ہفتے اپنی بیوی کی موجودگی میں وہ خود کو کتنا بڑا آدمی محسوس کر رہا تھا۔ سینما میں رتھ اس کا بازو جکڑے ہوئے، بالکل پتھر کی صورت کی طرح بیٹھی رہی تھی۔ سینما کے پردے پر رنگین تصویریں حرکت کر رہی تھیں اور لوگ باتیں بھی کر رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر رتھ کو جیسے ہو گیا تھا۔ حیرت و جوش کی ملی جلی کیفیت نے اس کا خون مچھل کر دیا تھا۔

ایک ہفتے یوں گزر گیا جیسے ہاتھ سے مچھلی پھسل گئی ہو، لیکن وہ اب بھی اسے بہت سارے مقامات دکھانا چاہتا تھا اور ان کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ پارلیمانی عمارت اور وہ بڑا سا گھر جس میں صدر رہتا تھا۔ اس نے میم صاحب سے پوچھا کہ کیا رتھ مزید ایک ہفتہ ٹھہر سکتی ہے؟

”مزید ایک ہفتہ ٹیو!“ میم صاحب نے کہا ”اس کے بعد اسے ہر حال میں جانا پڑے گا۔ وہاں تمہارے بچے ہیں، کتنے بچے ہیں تمہارے ٹیو؟“

”پانچ بیٹے ہیں، میم صاحب!“
”اور جلد ہی چھ ہو جائیں گے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ جانتا تھا کہ دس چاند کے بعد رتھ کی گود میں ایک نیا بچہ، اس بچے کی جگہ لے لے گا۔ ”ہاں، میم صاحب!“ وہ بولا ”جلد ہی چھ ہو جائیں گے۔“

میم صاحب اپنا سر ہلانے لگی۔ اس کی نیلی آنکھوں سے الجھن برسنے لگی تھی ”کیا تمہارے باپ کے بھی بہت سارے بچے تھے ٹیو!“

”میرے باپ کے سترہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں، میم صاحب!“ اس نے جواب دیا۔

”اف! یہ تو بہت ہو گئے، ٹیو..... بہت، بہت سارے.....!“ میم صاحب ایک دم سے بوکھلا اٹھی تھی۔

”ہاں، میم صاحب..... بہت سارے..... میرے باپ کی دو بیویاں تھیں، لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔“ ٹیو نے کہا ”اب میرے ہاں صرف ایک اور بچہ ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو ٹیو! اب زمانہ بدل گیا ہے۔“ میم صاحب نے تائید میں سر ہلایا تھا ”تمہارے باپ کی زندگی میں..... میرا مطلب ہے آزادی سے پہلے تو اس سے کوئی لڑکی نہیں بننا تھا کہ بچوں کے پاس کپڑے ہیں یا نہیں۔ انہیں اسکول جانا ہے یا نہیں۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے ٹیو! اب

تم لوگوں کو اپنی سوچ بدلنی ہوگی، سوچ بوجھ سے کام لینا اندھا دھند اس راستے پر نہیں بھاگنا ہوگا جو صرف اور بتائی کی طرف جاتا ہے..... نسل در نسل..... ہاں، ٹیو! در نسل۔“

”میں جانتا ہوں، میم صاحب!“ وہ بولا تھا ”میں ہوں کہ مجھے اپنے سب بچوں کو اسکول بھیجنا ہے اس لیے بچے نہ ہوں تو اچھا ہے۔“

”یہاں نئے اسپتال میں ایک کلینک ہے، ٹیو!“ وہ ”جہاں وہ تمہیں بتا سکیں گے کہ انہیں کیسے روکا جاسکتا ہے اسے یاد آیا، اس وقت وہ الفاظ اسے بہت پراسرا تھے۔ بہت ہی پراسرا..... مارے خوف کے اس کا دل لگا تھا۔ وہ ایک دفعہ اسپتال گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک کود دیکھا تھا، جس کی ٹانگ کاٹ دی گئی تھی، تاکہ اسے م سے بچایا جاسکے۔“

”ہاں، ٹیو!“ میم صاحب کی نیلی نیلی آنکھیں اس چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور لہجے میں ملاحت تھی ”اسپتال ایسے لوگ ہیں جو مجھ سے بھی اچھی سوالی بولتے ہیں تمہیں بتائیں گے کہ ایسا ممکن ہے۔ اس میں کوئی..... ہوئی اور اگر تم بھی اپنا ارادہ بدلنا چاہو تو وہ بھی ممکن ہے۔ وہ جیسے جیسے بول رہی تھی، اس کے الفاظ اور بھی اور پراسرا لگنے لگے تھے لیکن یہ میم صاحب بہت اچھی اس سے بہت شفقت سے پیش آتی تھی۔ وہ اس پر بھروسہ تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا خوف دور ہونے لگا ”میم صاحب اگر آپ اسے اچھا سمجھتی ہیں، تو میں وہاں جاؤں گا۔“

”میں اسے اچھا سمجھتی ہوں ٹیو! اور میرے خیال تمہیں وہاں ضرور جانا چاہیے۔ وہ تمہیں تصویروں کی مدد سمجھائیں گے تاکہ تم ٹھیک سے سمجھ سکو کہ یہ سب کیسے ہے۔ رتھ کو اپنے ساتھ لے جاؤ تاکہ وہ بھی سمجھ سکے مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے، ٹیو۔ چاہے سنوار لو، ہاں بگاڑ لو۔“

ٹیو نے تعجبی انداز میں سر ہلایا ”میں وہاں ضرور گا، میم صاحب!“

وہ رتھ کو ساتھ لے کر کلینک گیا۔ وہاں ایک افریقی نے انہیں دو باتیں سمجھائیں جن کے بارے میں وہ تصوی نہیں کر سکتے تھے کہ یہ ممکن تھا۔ وہ وہاں سے واپس آ پاتو خوش تھا۔ ”میم صاحب، آپ نے ہمیں حیرت انگیز باتیں ہیں۔“ وہ بولا ”چھٹے بچے کی پیدائش کے بعد میں رتھ کو لے لے جاؤں گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رتھ بھی یہی

”میں اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی تو سوچتا ہوں، وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔“
”تم بہت سمجھ دار ہو، ٹیو!“ میم صاحب نے سر ہلا کر اسے کہا تھا ”افسوس یہ ہے کہ بیشتر لوگ اپنی ناک سے دیکھنا پسند نہیں کرتے اور انجام بخشتے ہیں، یہ ہٹ دھرمی لیا کرتے ہیں۔“

☆☆☆

چھٹے بچے کی پیدائش کے بعد رتھ ایک بار پھر شہر آئی تھی وہ کام ہو گیا تھا۔ جیسا کہ میم صاحب نے کہا تھا، کوئی کام نہیں ہوئی تھی اور دس چاند گزرنے کے بعد کوئی بچہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اب ٹیو اپنے گاؤں کا ”بڑا آدمی“ تھا۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس کی بیوی شہر گئی تھی، اس وجہ سے بھی کہ اس کی بیوی نے اسے چھ بچے دیے تھے اور اب اس کے ہاتھ کوئی ایسی خاص بات ہو گئی تھی کہ اب جب تک ٹیو نہ رتھ کے مزید بچے تولد نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ کتنا خوش تھا۔ رتھ بھی بہت خوش تھی کیونکہ جب وہ امید سے ہوتی تھی تو اسے اور کافی کے باغات میں کام نہیں کر سکتی تھی لیکن اب وہ اور ایک کام کر سکتی تھی اور اب کھانے، کپڑے اور اسکول لالچ کے لیے پیسے بھی زیادہ جمع ہو رہے تھے۔

ٹیو نے کوہے کو بھی اپنی خوش نصیبی میں شریک کرنا چاہا تھا اس نے اس سے کہا تھا کہ جب وہ شادی کرنے لگے گا تو اسے کلینک لے جائے گا اور اسے ایک ہی دن میں وہ اچھی معلوم ہو جائیں گی جنہیں جاننے میں ٹیو کو کئی سال لگے تھے لیکن کوہے اس کی بات سن کر ہنس پڑا تھا۔

”جب میری شادی ہوگی تو میری بیوی کے ڈھیر بچے ہوں گے۔“ وہ بولا تھا۔

”زیادہ بچے پیدا کرنا حماقت ہے، کوہے!“ اس نے ”مجھ سے کہا“ اس نے ہی بچے ہونے چاہئیں جن کی تم پرورش کرو گے۔“

”تم احمق ہو، ٹیو!“ کوہے بولا ”تم کوروں کی طرح بول رہے ہو۔“

”احمق تم ہو، کوہے۔ احمق نوجوان! میری بات غور سے سوچو، ایک نئی نسل ہے، نئی قوم ہے۔ جو کچھ ہمارے باپ دادا نے کیا تھا، ہمارے اور ہمارے بچوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ ان کا تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے تاکہ یہ ملک کے لیڈر بن سکیں۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ اونا بڑا ہو کر میری طرح لو کر بنے اور تم کیا ہو، کوہے؟“

ہو؟“

کوہے کی چہرے پر ایسے تاثرات ابھرائے جس سے ٹیو نے اندازہ لگایا کہ اس نے اپنی توہین محسوس کی ہے اور اسے خوشی ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے اس کی فطری نرم دلی غالب آ گئی اور اس نے سوچا کہ اسے اتنے سخت الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہیے تھے لیکن کوہے نے زبان کھولی تو اسے احساس ہوا کہ اس کے وہ الفاظ کوہے کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

”میں وہ بات نہیں کر رہا ہوں ٹیو!“ وہ بولا ”تم اسکول کی تعلیم کی بات کر رہے ہو۔ میں تمہاری بیوی کی بات کر رہا ہوں اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے اس کے ساتھ، کیا کیا تھا اور اس کی وجہ سے تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“
”مجھے کیا ہوا ہے، کوہے!“ ٹیو نے حیرانی سے پوچھا۔
”اب تم مرد نہیں رہے۔“

ٹیو اپنا سر پیچھے پھینک کر زور زور سے ہنسنے لگا ”جہیں بس اتنا ہی معلوم ہے۔ اب میں پہلے سے زیادہ مرد ہوں۔“
”یہ ایک کوہے اس سے بھی زور زور سے ہنسنے لگا ”تم بہت بڑے احمق ہو، ٹیو! تم اپنے قبیلے کی روایات کو بھول رہے ہو۔ شوہر کے سوا کوئی دوسرا مرد کسی بچے والی عورت سے نہیں مل سکتا ورنہ وہ مرد نہیں رہتا۔ اور کوئی بھی عورت اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کسی دوسرے مرد سے نہیں مل سکتی کیونکہ اس طرح بھانڈا پھوٹ جائے گا کہ بچہ اس کے شوہر کا نہیں ہے۔“

”میں یہ ساری باتیں جانتا ہوں، کوہے۔ لیکن ان باتوں کا ہمارے موضوع سے کیا تعلق ہے؟“ ٹیو نے حیرت سے پوچھا۔

”اب تمہاری بیوی کے کوئی بچہ نہیں ہے اور تم نے اس کے ساتھ جو خاص ترکیب آزمائی ہے، اس کی وجہ سے اس کے ہاں ولادت نہیں ہوگی۔“

ٹیو اپنی کیفیت پر قابو پا کر جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ کوہے ابھی نوجوان ہے۔ اس نے سوچا۔ اس کا شعور تپتا ہے۔ اس نے صرف بازاری عورتوں کو دیکھا ہے۔ جب اس کی بیوی آ جائے گی تو یہ ان دونوں کا فرق سمجھ جائے گا۔ وہ میرے قبیلے کا ہے، میرا بھائی ہے۔ میں اس کی باتوں کا بُرا نہیں مانوں گا۔“

☆☆☆

لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس گفتگو کے چند ہی دنوں کے بعد کوہے چھٹی لے کر گاؤں چلا گیا اور ہر چند یہ کہ

ٹیٹو کو اپنا اور کوبے کا بھی کام کرنا پڑ رہا تھا اور اس کی مصروفیات دو چند ہو گئی تھیں، اس کے باوجود کوبے کے کہے ہوئے وہ الفاظ گویا بار بار اچھل کر اس کے دماغ پر ٹھوکریں مارنے لگے تھے۔ اس نے رتھ کے بارے میں سوچا، اس کی آنکھوں کے بارے میں سوچا، جو اس کی جانب دیکھتے ہوئے چمک اُٹھتی تھیں۔ وہ اس کی مختصر مترنم ہنسی سن سکتا تھا، تصویر کی آنکھوں سے اسے کافی کے باغات میں کام کرتے ہوئے، اس کی مضبوط ٹانگوں کو دیکھ سکتا تھا۔

وہ پانچ مہینے سے گاؤں نہیں گیا تھا اور رتھ کو دیکھنے، اس کی مترنم ہنسی سننے اور اس کی آنکھوں کی چمک کا نظارہ کرنے کی آرزو اس کے اندر چمن کاڑھنے لگی تھی۔ اگر کوبے چھٹی پر نہ ہوتا تو وہ میم صاحب کے پاس جاتا اور اس سے کچھ دنوں کے لیے گاؤں جانے کی چھٹی لے لیتا لیکن بچکے کا یہ دستور تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی ملازم چھٹی پر جاسکتا تھا۔ پھر جب اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ رتھ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا تو میم صاحب نے اس سے کہا تھا کہ وہ لوگ ایک ماہ کے لیے شکار پر جا رہے ہیں اور بنگلہ بند کر دیا جائے گا۔

”کل تک رک جاؤ۔“ میم صاحب نے کہا ”اور جانے سے پہلے گھر کی صفائی کر دینا۔ اس کے بعد جاسکتے ہو۔“

اس نے بے حد جانفشانی سے بچکے کی صفائی کی تھی۔ ہر شے کو رگڑ کر چمکا یا تھا اور جب گاؤں جانے کے لیے بس پر سوار ہوا تھا تو خوشی بچرے میں بند کسی چھٹی کی طرح اس کے سینے پر پھڑپھڑانے لگی تھی اور اس کی حدت سے اسے اپنا جسم تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ایک بے حد طویل سفر تھا اور یہ طوالت اس کی بے چینی اور بے گلی میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ جب بس بلندی کو سر کرنے لگی تو سورج کچھ ہی دیر پہلے غروب ہوا تھا اور بارش شروع ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ جب تک بس دریا والی سڑک کو عبور نہ کر لے، بارش کی شدت میں اضافہ نہ ہو لیکن وہاں تک پہنچنے کے باوجود وہ مٹی سڑک کچڑ کے باعث اتنی خستہ ہو چکی تھی کہ وہ آگے جانے کے قابل نہ رہی۔ اب صرف بیٹھ کر انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن ٹیٹو سے صبر ممکن نہ تھا۔ اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ نے اسے بے کل کر دیا۔ وہ بس سے اتر پڑا اور اس دھواں و دھار بارش اور کچڑ میں چل پڑا۔ وادی میں پانی اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہا تھا لیکن وہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اس کی ہڈیاں بخ ہو گئیں اور دانت مسلسل بچنے لگے۔

☆☆☆

جب وہ گاؤں کے نزدیک پہنچا تو آدمی رات ہو چکی

تھی۔ سارے گاؤں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ مہینڈکوں کے ٹرانے اور جھینگر دوں کے بولنے کی آواز پر جمائے مہیب ستانے کو درہم برہم کر رہی تھیں۔ بارش بھیگا ہوا آسمان، چاند کے بغیر روٹھا روٹھا سا لگ رہا تو ساری کائنات گویا کیلی کیلی تاریکی سے لتھری ہوئی ابھی سرخ کے بانگ دینے میں کئی گھنٹے تھے۔

وہ چپکے سے گھر میں رینگ گیا اور اس نے اس کر رُخ کیا جس میں بچے سو رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کے ہو کر سردی سے کانپتے ہوئے، بھات ساٹن اور رتھ کے سے اُٹھتی ہوئی محبت کی میٹھی میٹھی ملی جلی بو کو سونگھنے لگا اپنے کیلے کپڑے اُتار کر فرش پر، ایک کونے میں ڈال اور نرم نرم اور گرم گرم تاریکی میں اپنے بچوں کی سانپو بدھم بدھم کی سرسراہٹ سننے لگا۔ پھر تاریکی میں راستہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ تاریکی میں سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ کمرے کے ایک کونے ایک اسٹول تھا اور اس کے پہلو میں لکڑی کا ایک صندوق کا ڈھکن کھینچ کے دانوں سے حریں تھا۔ رتھ اس میں کپڑے اور وہ جوتے رکھتی تھی جو اس نے شہر جاتے خریدے تھے۔ اس سے ایک ہی قدم کے فاصلے پر وہ چم جس پر وہ سوتی تھی۔

وہ آہستہ سے اس کے سامنے جھک گیا اور پیا سرگوشیاں کرنے لگا۔ وہی سرگوشیاں جو رتھ صرف اس سے سننے کی توقع رکھتی تھی۔ اسے خوف زدہ کرنا نہیں ہا کیونکہ اس کی آمد متوقع نہیں تھی۔ صرف چند ہی رو کوبے گاؤں آیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ دونوں بیک وقت پر گاؤں نہیں آسکتے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے کو خیال آیا اور اس نے سوچا، کوبے یہ جان کر کتنا خوش ہو گورے شکار پر چلے گئے تھے اور وہ ایک مہینے تک دا جائے گا۔ وہ رتھ کے مزید قریب ہو گیا اور اس کا راف ڈھکے ہوئے، اس کے منڈے ہوئے سر کو چھونے کی کو لیکن اس کی انگلیاں بالوں کو محسوس کرنے لگیں۔ نرم، کٹنے بال..... اسے یوں محسوس ہوا گویا کسی بچھوٹے مار دیا ہو۔ بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ نکل نے تیزی سے ہاتھ پیچ لیا۔ شاید میں بگلت اور وارنٹی دوسرے کے گھر میں گھس گیا ہوں، اس کے ذہن میں کوند گئی۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور جونہی ایک قدم اس کا برہنہ پاؤں صندوق سے ٹکرا گیا اور وہ جیسے پھر میں تبدیل ہو گیا۔ پھر وہ جھک کر صندوق کے ڈھکا

نے ہوئے، کھینچ کے دانوں کو محسوس کرنے لگا اور وہ لے اس کی انگلیوں کے لمس سے گویا انگاروں کی مانند دھکنے لگا۔ اس پورے گاؤں میں کسی کے پاس بھی ایسا صندوق تھا۔ سوائے اس کی بیوی کے۔ وہ ایک بار پھر پتھر کے میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے سارے احساسات فنا ہو چکے۔ صرف ایک ساکس تھی جو آ اور جا رہی تھی۔ پھر اس نے کیا میں کسی کو حرکت کرتے محسوس کیا۔ ساتھ ہی ایک سہی لای سرگوشی ابھری ”ابھی کوئی آہٹ ہوئی ہے۔۔۔۔۔“

۸..... جاؤ، جلدی.....“ وہ رتھ کی آواز تھی۔ پھر اسے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اگرچہ وہ اس کی میں دیکھ نہیں سکتا تھا، پھر بھی اس نے دیکھا، کوئی چٹائی بچیتے کی سی پھرتی سے اُٹھا اور سنسناتے ہوئے تیر کی ما کر عبور کر کے جھوپڑے سے نکل گیا۔ ٹیٹو سکتے کے میں اپنی جگہ کھڑا، کھینچ کے دھکنے ہوئے دانوں کو ٹٹو لٹا رہا ان کی جلن کو اپنے رگ و پے میں سرایت کرتے ہوئے لہ کر تار رہا۔ پھر جیسے اس کے اندر شعلے سے لپکنے لگے اور ما میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اچانک وہ کسی عقاب کی ما اپنی بیوی پر چھٹا۔ اس بیوی پر، جو اس کی خیال میں لہ اس کی تھی۔ اس کی آہنی انگلیاں رتھ کے حلق کی پھڑکتی لہ لہ پر جم گئیں۔ اس نے رگ کو تھپتھپاتے اور کسی دیے کی لوکی لڑکتے اور پھر..... اور پھر..... ڈوبتے ہوئے محسوس کیا، لہ لہ ساکت ہو گئی۔

دہا بجھ گیا..... تاریکی گہری ہو گئی..... باہر آسمان رور رہا

وہ ساکت ہو لے پر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گھور اندھیرے کی اندھیرے کی مانند گھورنے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے حرکت اور خاموشی سے دوسرے کمرے میں رینگ گیا جہاں اس نے چھوڑے تھے۔ بارش کے پانی سے شرابور چٹلون جاتے ہوئے وہ مارے سردی کے کپکپانے لگا اور پھر بھیکی ما پہننے ہوئے، اس کے دانت بچنے لگے پھر اس نے ملے پہنے اور بارش اور تاریکی میں نکل گیا۔

☆☆☆

اب وہ دریا والی سڑک پر پہنچا تو بارش کی دھند میں، اس میں کوہیں موجود پایا۔ جس کے پیچھے کچھڑ میں دھنسنے لگا۔ اب بھی دھواں و دھار بارش ہو رہی تھی اور سورج لہ کے کوئی آثار نہیں تھے۔ آسمان پر سیاہ گھٹائیں بھیلی تھیں۔ وہ خاموشی سے بس میں سوار ہو گیا۔ کسی نے بھی نہ دیکھا۔ ان میں جیسے ہر کوئی ان طویل میرا زما

ماہنامہ سرگوشیاں

169

لحاحات کے دوران رات میں بس سے اُترتا چڑھتا رہا تھا۔ بارش دن بھر ہوتی رہی، پھر تم گئی۔ سڑک کے خشک ہونے میں مزید ایک دن لگ گیا۔ تیسرے دن بس اشارت ہوئی اور اس کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس دوران ٹیٹو کا جسم بخار سے پھکنے لگا تھا اور زبان کو نکلے جیسی محسوس ہونے لگی تھی۔ بس رکی تو دو آدمیوں نے اسے سہارا دے کر اتارا۔ اتفاق سے کوبے وہاں موجود تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ اسے ہر طرف ایک آگ سی لگی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جو دھیرے دھیرے راکھ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے خشک حلق میں پانی اٹھایا جاتا تو پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہونے لگتی اور سارا پانی باہر آ جاتا۔ وہ سردی اور بخار سے کا پتار رہا اور اس تمام عرصے میں مسلسل زور شور سے بارش ہوتی رہی۔ پھر ایک روز وہ جاگ گیا۔ اب وہ آگ کہیں نہیں تھی۔ بارش کے پانی میں بجھ گئی تھی یا اور یا اسے بہا لے گیا تھا لیکن دریا تو بہت دور تھا اور رگنی روز سے بارش بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی عورت اس کے لیے پانی لے کر آئی۔ اس نے اس بوڑھی سے بات کرنا چاہی لیکن گڑبگڑ پایا اور سو گیا۔ خواب میں اسے پھر کوئی عورت نظر آئی۔ وہ سمجھا کہ وہ اس کی ماں ہے لیکن اس کی ماں کو مرے ہوئے تو مدت ہو چکی تھی۔ شاید وہ اس کی بیوی تھی۔

اس کی بیوی کہاں تھی؟ اس کے لیے پانی لے کر کیوں نہیں آئی تھی؟ ایک بیوی کا فرض ہے کہ اپنے بیمار شوہر کا خیال رکھے۔ اگر کسی کی بیوی نہیں ہوتی تو اس کی ماں اس کا خیال رکھتی ہے اور اگر ماں بھی نہ ہو تو خود اسے اپنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اب اس نے بوڑھی کو پہچانا۔ وہ کوبے کی ماں تھی۔ وہ کوبے کے گھر میں تھا۔ اگلی سہ ماہی جاگا تو اس کے پاس کوبے بھی تھا لیکن آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی وہ بکے ہوئے آم جیسی اس کے حلق کی بو پائی اور اس کا پی حلق لے لگا۔ پھر جب یہ کیفیت گزر گئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اپنی زبان کو حرکت دینے میں ناکام رہا۔

”تم بہت دن سے بیمار ہو۔“ کوبے نے کہا اور اسے بتانے لگا کہ دو ہفتے پہلے اسے بس سے اُتار کر لایا گیا تھا۔

اس نے اسے پانی پلایا اور جب اس کی زبان کیلی ہو گئی تو وہ اسے حرکت دینے میں کامیاب ہو سکا ”وہ لوگ مجھے گھر کیوں نہیں لے گئے؟“ اس نے نقاہت سے پوچھا ”میری بیوی کہاں ہے؟“

کوبے کی آنکھوں سے ایک عجیب سی کیفیت جھانکنے

جون 2012

168

ماہنامہ سرگوشیاں

پھنور جال

محمد ایاز راہی

انگریزوں کے دور حکومت میں، ایام غلامی میں رونما ہونے والا ایک غیرت مند عورت کی حمیت کا قصہ، وہ بہادری میں صوبہ سرحد کی پہچان بنی۔ آج بھی پشاور سے پاڑے تک اس واقعے کی گونچ سنی جاسکتی ہے۔ لوگ فخریہ اس قصے کو بیان کرتے ہیں۔

ماضی قریب کا ایک سبق آسودہ لیب واقعہ



بیسویں صدی کی دوسری دہائی اپنے آخری دموں پر تھی۔ برطانوی عہد کا سورج نصف النہار پر تھا، صوبہ سرحد ہزارہ کی حسین و شاداب وادی پکھل بھی انگریزوں کی عمل داری میں تھی اور وادی پکھل کا قدرتی حسن انسانی ہاتھوں کی دست برد سے محفوظ تھا۔ ندی سرن کا صاف شفاف اور صحت بخش پانی آب حیات کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کی پکھل اپنی لذت

کیفیت ختم ہوگئی اور وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ پھر اسے مہینے سے بھی زیادہ مدت کے بعد وہ واپس شہر جانے کے ہوسکا تھا اور میم صاحب اس کی بیوی کی موت کا سن کر بہ افسردہ ہوگئی تھی۔

☆☆☆

یہ ایک سال پہلے کی بات تھی۔ اس نے کوہے سے ہاگ سے بھی اپنی بیوی کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن آج کوہے نے انداز سے اس کا ذکر چھیڑا تھا کہ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہ کھل ہٹا کر اٹھ بیٹھا اور ایک موسم بقی جلا کر سرہانے ایک ڈبے پر رکھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات نو بجے تھے۔ اس وقت کوہے فلم دیکھ رہا ہوگا۔ اس کے بعد بازار حسن چلا جائے گا۔ کاش اسے کوہے کی بات پر غصہ نہ آئے اور وہ دوستوں کی طرح ساتھ شہر جاتے۔ تو وہ بھی وقت فلم دیکھ رہا ہوتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اس نے اپنے دو تین مرتبہ دھیرے سے جھٹکا۔ سارے خیالات آپس گڈنڈ ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ آج نہیں پیش آیا تھا۔ سال پہلے پیش آیا تھا۔ بس آج صرف وہ واقعہ اسے یاد آتا تھا۔ کوہے شروع سے سب کچھ جانتا تھا جیسی اس نے آتا تھا۔ ”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک بھائی دوسرے کے بارے میں جانتا ہے لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس بھائی بھی نہیں۔۔۔۔۔!“

ٹیڈ بہ آہستگی بستر سے نکل کر دروازے تک گیا کے پتے کھول دیے۔ رات کی ہوا خشک تھی۔ آسمان بہت بڑا چاند روشن تھا۔ اس کی روپہلی چاندنی میں، سنا کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی۔ یہ ویسی رات نہیں تھی، جب دھار بارش ہو رہی تھی اور وہ پانی میں شرابور اپنی بیوی ملنے کی آس میں سردی سے ٹھہر رہا تھا۔ اب آگیا۔۔۔۔۔ سب کچھ یاد آگیا۔۔۔۔۔ ہانڈی میں چھوڑے بھات، سالن اور اس کے بچوں کے جسم کی ملی جلی بو۔ بکے ہوئے آم جیسے تیل کی بو، جو اس کی بیوی کے جسم اس کے جسم کو چھوگئی تھی اور اس طرح چٹ گئی تھی کہ ہار پانی بھی اسے دھونہ سکا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔۔ آنسو، جو اپنی بیوی کی موت پر بھی نہیں بہائے تھے، وہ آنسو رہے تھے۔ ایک بھائی کی غداری پر بہہ رہے تھے۔ سینہ پھولنے اور پکھنے لگا۔ اب وہ سمجھ گیا کہ اس کے اسے کیا کرنا تھا۔

گئی۔ اتنی عجیب کہ اگر ٹیڈ کے جسم میں تھوڑی سی بھی سکت ہوتی تو وہ اچھل کر بیٹھ جاتا اور اس انہنی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرتا۔

”کس تمہیں یاد نہیں؟“ اس کی سماعت سے کوہے کی آواز ٹکرائی لیکن وہ نیند کی وادیوں میں اترنے لگا تھا۔ اس نے جانتے رہنے اور سوچنے کی کوشش کی۔ اسے بچنے کی کھڑکیوں کی صفائی اور فرش کی دھلائی یاد آئی۔ بچنے میں نفل ڈالنا یاد آیا۔ پھر ٹکٹ خرید کر بس میں سوار ہونا اور کھڑکی سے بارش کا نظارہ کرنا یاد آیا۔ پھر کچھ اور سردی یاد آئی اور پھر وہ بڑھیا یاد آئی۔ کوہے کی ماں۔۔۔۔۔ جو اس کے لیے پانی لاتی تھی۔ اس نے بند آنکھوں سے، پوٹوں کے اس پار، کوہے کو اپنے اوپر جھکتے ہوئے دیکھا ”میں تھوڑی دیر بعد واپس آؤں گا۔ پھر ہم باتیں کریں گے۔“ اس کی سماعت سے کوہے کی آواز ٹکرائی اور پھر اس پر غنودگی طاری ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

اگلی مرتبہ ہوش آیا تو اس نے فوراً ہی آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ کوہے سے باتیں کرنے سے پہلے کچھ سوچتا چاہتا تھا۔ کوہے اس وقت کمرے میں نہیں تھا لیکن وہ ہوتا تو اسے خبر ہو جاتی۔ اسے کوہے کی گئی ہوئی بات میں عیاری محسوس ہوئی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا، یہ عیاری کیسی تھی اور اس سے کیا یاد کرنے کی توقع کی جا رہی تھی۔ تاہم وہ کچھ سوچنے کی مہلت چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی آکر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ کوہے نہیں تھا۔ چنانچہ ٹیڈ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نظر اسی بڑھیا پر پڑی۔ وہ جھکی اور اسے پیالے میں کوئی سوپ پلانے لگی۔ پھر سیدھی کھڑی ہو کر مخاطب ہوئی ”میں کوہے کو بلا کر کہتی ہوں کہ تم جاگ گئے ہو؟“

”رکو۔“ وہ تھا بہت سے ایک ہاتھ اٹھا کر بولا ”اس تیار داری کا بہت بہت شکریہ لیکن ایک بات بتاؤ، میری بیوی کہاں ہے؟“ بڑھیا کی آنکھیں سسک گئیں ”کیا کوہے نے تمہیں نہیں بتایا؟“

”نہیں، اس نے کچھ نہیں بتایا۔“ ”تمہارے گاؤں آنے سے تین دن پہلے وہ مر گئی۔“ بڑھیا نے جواب دیا ”رات میں سوئی اور دن میں نہیں اٹھی۔“

بخار واپس آگیا اور اس کے شعلے اسے چاٹنے لگے اور اس کا جسم پسینے سے تر ہونے لگا۔ لیکن پھر کئی دنوں کے بعد یہ

کے لیے دور دور تک مشہور تھی۔ کوہ تنگلا کی چوڑی دیوار اور دیوار کے جیتی خزانے سے معمور تھا جس کی خوشبودار اور نفیس لکڑی اپنی مثال آپ تھی۔ اس پر سکون فضا اور تازگی سے بھرپور آب و ہوا نے اپنے کینوں کو تندرستی اور توانائی کا اصول تحفہ دے رکھا تھا۔ لوگوں کا رہن سہن، کھانا پینا اور پہناوا بھی انتہائی سادہ تھا۔ لامحدود خواہشات کی رنگینی و پیچیدگی کا ان کی زندگی میں کوئی گز نہیں تھا۔ اسی سادگی نے ان کے کردار و گفتار کو جرأت و ہمت سے نواز رکھا تھا۔ گاؤں کی پرمشقت زندگی لہو گرم رکھنے کا پختہ جواز تھی۔ کوہ تنگلا کی سر پہ فلک بلندی بڑے بڑے سیاہ و سفید پتھروں کی سیکنی اور اونچے نیچے راستوں کی دشواریاں اگر ہمت مردان کو ہمیز کیے رکھتیں تو دوسری طرف ندی سرن کی رواں منگنا بہت سیکڑوں شمس کے رنگ بہ رنگ چھپاتے پرندوں کی بولیاں خوش رنگ و خوش ذائقہ پھلوں کی لذت اور چاروں طرف پھیلے ہوئے سبزہ بیگانہ نے لوگوں کو کیف و سرور سے آشنا کر رکھا تھا۔ پہاڑوں کے یہ غیور باسی طاؤس و رباب کے ساتھ ساتھ شمشیر و سناں کے رمز شناس بھی تھے، رانی کا گھرانہ گاؤں کے دو چار خوش حال گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ گاؤں کی مخصوص طرز زندگی میں کثرتِ اولاد خصوصاً بیٹوں کا وجود، ایک بے بہا نعمت سمجھا جاتا ہے بلکہ مختلف کہادتوں کے پس منظر میں اس کی اہمیت کو جتایا جاتا ہے۔ اسے مضبوطی و سر بلندی کی دلیل گردانا جاتا ہے۔ اس ضمن میں رانی کے والدین خاصے سیرچشم تھے، چھ سات بیٹوں کی مسلسل پیدائش کے بعد بیٹی کی خواہش بالکل ایک فطری امر تھا ایسے میں جب رانی نے جنم لیا تو گویا تین، مرادیں اور دعائیں جسم ہو کر جیتا جاگتا وجود بن گئیں جس کی ہر ہر معصوم ادا پر سارا گھر واری صدمے جاتا اور جس کی رونے پر سبھی بے چین ہو جاتے۔ ایک گود سے اترتی تو دوسری آغوش وا ہوتی تھی۔ گھر کی فضا بھی رانی کی قلقلاریوں سے گونجتی تھی۔ دن رات ایک دوسرے کے تعاقب میں لپکتے بھاگتے اور آگے بڑھتے رہے۔ رانی لاڈ پیار کے مہکتے پھولوں میں تلخی ہمکتی رہی، بچپن نے لڑکپن کا چولا پہنا تو رانی بڑی خود سر ثابت ہوئی جو بے جالا ڈیپار کا منطقی نتیجہ تھا مگر سارا گھر اب بھی اس کے آگے سرنگوں رہتا۔ اسی طرح ناز اٹھائے جاتے، بے جکا مند اور خروں پر خوش ہوا جاتا۔ لفظ نہ نہیں اور ناممکن سے اسے بالکل آشنا نہیں ہونے دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اڑوس پڑوس اور محلے کی ہم جولیوں سے رانی کا واسطہ پڑا تو اپنی خود سرائی عادات کی بنا پر رانی سب پر غالب آتی گئی، اس کا حکمیہ لہجہ، گرم تپا اور ٹیکھا انداز تمام

سکھوں، سہیلیوں کو سرگوب کیے رکھتا، رہی سہی معصوم ملکوتی حسن نے پوری کردی تھی خصوصاً بڑی دلکش آنکھیں جن میں موتی کوٹ کوٹ کر بھر تھے، یہ ستاروں بھری آنکھیں جس پر جنتیں، اسے کی طرح اپنے سحر میں جکڑ لیتیں۔ لڑکیاں اس رہنے اور اسے خوش رکھنے پر مجبور ہو جاتیں۔ اس کی اور عتاب کا شکار لڑکی تمام سہیلیوں میں اچھوت بن جاتی اور بالآخر اسے رانی کو مناتے ہی بن پڑتی۔ یوں مزاج ایک مخصوص سانچے میں ڈھلتا چلا گیا جس میں غصے اور خند کے جراثیم جڑ پکڑتے رہے۔ چاند اور رات دن طلوع ہووے اسے دیکھتے اور سفر کرتے سورج کی تپش نے اگر رانی کے آتشیں مزاج کی پروا سے پختہ کیا تو چاند کی شیش چاندنی اور کوہِ ملامت اس کے حسر کھل کر روپ سروپ کی بہار بنتی اسے پروان چڑھاتی رانی نے آخر کار جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھا تو شباب تمام رنگوں سمیت قدموں پر جھکا ہوا پایا۔ سبھی رنگ نچھاور ہوئے مگر اس کا خود سر مزاج یہاں بھی حاوی ہی طرہ یہ کہ یہ رنگ و بے کے بجائے کچھ اس بے طرح و کی صورت ابھر کر گئے کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جا خاندان کے نوجوان لڑکوں کی پرشوق نظریں بے اختیار رانی پر آٹھتیں مگر رانی کی بے نیازی اور سرد مہری ان نگاہوں کے پُر نوج ڈالتی۔ سپاٹ لہجے کے روکے بین صنف مخالف کے جذبول پر اس پڑ جاتی۔

☆☆☆

ندی سرن کے اس پار دو کوس کے فاصلے پر شہر کی وحید خان کا گاؤں آباد تھا۔ وحید خان کا گھرانہ رانی خاندان سے دو پار کا رشتہ رکھتا تھا۔ کبھی کبھار کسی بڑی تقر کے موقع پر دونوں خاندانوں کے افراد مل بیٹھتے تھے ٹوٹے پھوٹے احوال و تعلق کی تجدید کا باعث بنتے مگر صرف بڑوں کی حد تک۔ وحید خان کے والد گاؤں کے امام تھے۔ بڑے سلیم الطبع شخص تھے۔ مذہبی کتب کے ساتھ دیگر کتابوں کے مسلسل مطالعے نے انہیں سلاست و کا درس دیا تھا چنانچہ وہ گاؤں بھر کی ایک مقبول محترم اور متاثرہ شخصیت تھے۔ مذہبی تقدس کے علاوہ بھی لوگ دل ان کی عزت کرتے تھے۔ کسب معاش کے طور پر انہوں دکان کا سہارا لے رکھا تھا۔ وحید خان ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ اور بیٹے کے لیے دکان کی آمدنی معقول تھی کیونکہ معمر رنگوں سے قطعی نا آشنا، گاؤں کی سادہ زندگی، بے جا خرچ

معلوم نہ تھی۔ وحید خان کے والد کا واحد مقصد اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا تھا۔ ان کی بھرپور توجہ اور لگن نے ابتدائی تعلیم سے بہ خوبی روشناس کر دیا تو اگلے مے لیے انہوں نے بیٹے کو شہر بھیجنے کا فیصلہ کیا جہاں میں داخلے کی کوشش کرنا تھی اس کے لیے ایک رشتے اس قیام کا انتظام کیا گیا۔ پھلے وقتوں کی ساعیتیں مہر کے انہوں نے وحید خان کو تیار دیا، پہلے پہل ماں دن وحید خان کے ساتھ شہر میں رہی اور پھر بادل اکلوتے تخت جگر کو سمجھا بجا کر گاؤں لوٹ آئی۔ وحید بھر مہر تو بے قراری کا شکار رہا پھر رفتہ رفتہ نئے ماحول ملی ہوتا چلا گیا۔ گھر اور گھر سے باہر کے ہم جولیوں کی نئی مے اسے اپنے اندر جذب کر لیا۔ علم سے دلچسپی اور لگاؤ، اور شے میں ملا تھا۔ چھٹیوں میں گاؤں آتا تو گاؤں کی اور جنائش زندگی اسے جرأت و عمل کا سبق دیتی یوں وہ مے ساتھ ساتھ عمل اور جرأت کی خوبی اپنا تا گیا مگر علم کا مل اس کی اولین ترجیح بن چکا تھا چنانچہ وہاں سے وہ مے تحصیل ہوا تو والد کی خواہش اور ہدایت پر اس نے کا رخ کیا۔

لہٰذا اپنے محو پر شب و روز کے قدم اٹھاتی مہ و سال طرے کرتی کھوتی رہی۔ لاہور اور پھر علی گڑھ کی اکاؤنٹس نے اگر اس کی علمی ترقی کو بہت حد تک دور کیا تو مے اسے عقل و فہم کی نعمت سے بھی مالا مال کیا، جذبات اور لہجہ کو اولیت دینا اس کا دیرہ بن چکا تھا۔ تعطیلات میں آکر اکثر لوگوں کو فہم و فراست کی عملی مثال دینے کی مے کرتا، لوگ بھی اس کے اخلاق و کردار اور حسن صورت کے قائل تھے۔ وحید خان تعلیم کے رسمی مراحل طے کر کے گاؤں واپس ہوا تو گھر میں مے کے چراغ جلانے مے۔ ماں کی آنکھیں جھکنا نہیں، باپ کے چہرے پر کامیابی و مہرانی کے پھول کھل اٹھے۔ اکلوتے بیٹے کو زیورِ علم سے عاتق کرنے کا خواب کسی حد تک پورا ہو چکا تھا۔ گاؤں کے مے مے و پسماندہ ماحول میں علم کی روشنی لیے باوقار، برادر بار مے خان کسی دیوتا کی طرح لگ رہا تھا۔ ہر آنکھ میں اس کا ام اور ہر گھر میں اس کا چرچا تھا۔ گاؤں کے چوپال میں مے اکثر وہ موضوع ہوتا کہ بڑا پڑھا لکھا انسان ہے۔

☆☆☆

رانی کے ہاں اس کے بھائی کی شادی تھی۔ شادی سے مے آدھ روز پہلے جہاں دیگر ہنگاموں نے سر اٹھایا۔ وہاں مے وازدیک کے رشتے داروں کو بھی رانی کے گھر آن بٹھایا۔

وحید خان کی ماں بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے ہمراہ آئی۔ ہونہار بیٹے کو قبیلے برادری سے متعارف کرانے کی شعوری اور دانستہ کوشش بھی شاید ذہن میں کہیں کا رہی مہر مہر مے کے مردانہ حسن کے گرد علم کی مقدس روشنی ہالہ کیے ہوئے تھی، وہ سبھی کی توجہ کا مرکز تھا۔ رانی کی نظریں اس پر پڑیں تو زندگی میں پہلی بار اس کی نگاہیں لڑکھرائیں۔ خاندان کے بزم خود بے سنورے لڑکوں کے برعکس وحید خان اسے کچھ اور طرح کا لگا صرف اسے ہی نہیں چھوٹوں بڑوں سب کو وہ بڑا منفرد اور کشش سے بھرپور لگ رہا تھا۔ علم کے سرور میں ڈوبی مخمور آنکھیں۔ ستانت سے جھکا ہوا سر۔ ادب کی چاشنی لیے نستعلیق گفتگو۔ دھیمہ خواب آلود لہجہ۔ چال و حال نشست و برخاست مکمل شرافت کی آئینہ دار۔ چہرے کے خدو خال پاکیزہ فطرت کے گواہ۔ اپنی ذات سے قدرے غافل مردانہ حسن اور خوبیوں کا بے چیتا جاکتا پیکر جسے رانی اپنی لاطنی کی بنا پر کوئی نام نہیں دے سکتی تھی لیکن اس کی بے پناہ کشش نے رانی کا سادہ مگر پُر بہار و پُر وقار حسن اثر کر چکا تھا، خصوصاً بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں کا جادو جس کا کوئی توڑ کوئی اپائے وحید خان کے پاس نہیں تھا۔ گویا عشق کے دیوتا کیو پڈ کا تیر دو نوں کے دلوں میں ترازو ہو چکا تھا۔

وحید خان گھر لوٹا تو اسے اپنے وجود میں ایک خلا سا محسوس ہوا۔ مرد اور عورت دونوں ازل سے ہی ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے انسانی وجود میں آئے ہیں۔ وحید خان کے اندر اپنی ذات کا مدت سے سویا ہوا یہ تشنہ احساس کا ایک بڑی شدت سے ابھر کر سامنے آیا اور اسے بے کل کر گیا۔ رانی جو سارے گھر میں کسی آزاد و پستی کی طرح اڑتی بھرا کرتی تھی۔ اب وحید خان کے تصور میں جکڑی ہے بسی سے بھڑ بھڑا رہی تھی۔ گھر میں رانی کا طور و لا مزاج کے رنگ احکام نے مسلسل خاموشی کی چادر اوڑھی تو اس کی ماں سوچ اور ابھمن کا فکار ہوئی۔ بوڑھی اور جہاں دیدہ نگاہیں کھولی ہوئی اکلوتی بیٹی کا سراغ ڈھونڈنے میں لگ گئیں۔

وحید خان کی بے تابی جب حد سے بڑھنے لگی تو سلیم الطبع ذہن نے علم و عقل کی مدد سے اسے ٹوٹے پھوٹے سے بچایا اور اظہار کی سیدھی راہ دکھائی۔ ایک روز ماں کو کسی بات پر بے حد خوش دیکھا تو ہمت کر کے دل کی بات بالآخر کہہ ڈالی۔ بڑے سلیقے اور سعادت سے اپنی طلب کی نشاندہی کی۔ اکلوتے اور پھر ہونہار بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کا ارمان خود بیٹے کے لبوں پر مچلتا دیکھا تو ماں خوشی سے نہال ہو گئی۔ یوں لگا جیسے برسوں پہلے کے ننھے منے وحید نے ان سے کسی خوش نما

کھلونے کی فرمائش کی ہو۔ ماں نے بے چین بیٹے کو دل سے لگایا اور یہ رنگین کھلونا لا کر دینے کا پختہ وعدہ اور عزم کیا۔ کچھ دن گزرے تو وحید خان کی ماں نے رانی کے ماں باپ کے آگے جھولی پھیلانی۔ وہ انکار نہ کر سکے کہ ایسا خوبصورت و نیک سیرت بڑبٹی کے لیے پھر یقیناً کہیں نہ ملتا۔ خصوصاً ماں کی نظروں نے بٹی کے چہرے پر کھلتے ابھرتے رنگوں کو دیکھا تو بہت کچھ سمجھ بوجھ لیا جہاں دیدہ نگاہوں نے آخر کار کھوئی ہوئی بٹی کا سراغ پایا۔ خود سربٹی کو گردن نیچے ڈالتے دیکھا تو ماں کو اس پر بے حد پیار آیا۔ ساتھ ہی یہ اطمینان بھی ہوا کہ کسی کو خاطر میں نہ لانے والی بٹی، خود پرست بٹی اب اپنے گھر کی ہو جائے گی۔

اور پھر تین ماہ بعد ہی ڈھولک پہ تھاپ پڑی۔ سہیلیوں کے جمر مٹ میں گھری رانی سہاگ کا جوز اپنے شرم اور خوشی کے طے جلے رنگوں میں نہائی ہوئی تھی۔ چہرے پر پھیلی ہوئی دھنک عجب بہار دے رہی تھی۔ سہیلیوں نے خوشی اور چمٹ خانی کے بہانے اسے خوب خوب ستایا اور پھر رخصتی کے گیت گا کر اسے وداع کیا۔ ماں باپ کی دعائیں، پند و نصائح اور بھائیوں کا مان بھی ہمراہ تھا۔

رانی کا ڈولا وحید خان کے ہاں اُترتا تو وحید خان کے دل اور گھر کا آنگن سج سنور کر جھوم اُٹھا۔ وحید خان کے والدین بہت مسرور تھے۔ سمجھانے سے جھولی بھرانے کی خواہش خوشی میں ڈھیلی تو سارے گھر کو گلستاں بنا گئی جس کی مہک اور خوشبو انومحی تھی۔ اپنی ذات کی بھرپور تکمیل کا احساس وحید خان کو شانت کر گیا۔ تنہائیاں گنگنا نہیں۔ سانسیں حتا کی خوشبو میں رچ بس کر مشام جاں کو مضطرب کر گئیں۔ دن وصل بھری راتوں کے امن بے خواب کی طرح گزر رہے تھے۔ شہد بھرے لمحات قطرہ قطرہ زندگی میں اُتر رہے تھے اور رانی تو جیسے دیوانی ہو اُٹھی۔ مثل مشہور ہے کہ مروجہ بارتا ہے تو شکست تسلیم کر لیتا ہے لیکن عورت جب ہارتی ہے تو اپنا سب کچھ مقابل کے سپرد کر دیتی ہے اور رانی تو اس بُری طرح سے ہاری کہ اپنا وجود ہی کھو بیٹھی، صرف وحید خان کا سراپا ہی حقیقت لگنے لگا۔ اپنا تن من وحید خان پر وار کے بھی رانی ہار نہ محسوس کرتی، اسے فتح کا ہی یقین ہوتا۔ اس کا آنگ آنگ محبوب شوہر کے رنگ میں رنگنے کے لیے بے تاب رہتا۔ وحید خان کو اس کی تنگ مزاجی، گرم تپے اور غصے سے مغلوب ہونے کا احساس ہوا تو اس نے رانی کے مزاج کو اعتدال پر لانے کے لیے اسے عقل و فہم کا درس دینا شروع کیا۔ وحید خان پیار سے رانی کو رزاں (پشتو میں روشنی) کہہ کر پکارتا تو

رانی خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرتی اکثر کسی بات پر جھنجھلا جاتی تو وحید خان کا ہلکا بھرا تادیبی فقرہ اسے سیدم پر لاتا۔ ”رزاں۔ عقل سے کام لو۔“ ”رزاں، خود پہ قابو سمجھنے کی کوشش کرو رزاں!“ ”رزاں پھر وہی نادانی، ہ بے ذہنی“ محبوب شوہر کی یہ ذہنی تربیت رانی کا من تیزی سے قبول کیا اور رانی بڑی حد تک خود پر قابو پانا سیکھا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی اہمیت اس پر واضح ہونے لگی اطوار میں تبدیلی آنے لگی کہ آخر کار اسے محبوب شوہر نظروں میں سرخرو ہونا تھا۔

☆☆☆

شادی کے دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔ رانی کو میکے کی گھیرا تو ایک روز علی الصباح وحید خان نے اسے ساتھ سسرال روانہ ہوا۔ اونچا نیچا سنسان پہاڑی راستہ درجہ وحید خان نے احتیاطاً ایک بڑا سا چھرا لباس کے اندر لیا۔ رات سسرال میں گزارنے کے باوجود دوسرے دن کے گھر سے نکلتے نکلتے بھی خاصی دیر ہو گئی۔ علاقے آزادی کے ترانے گونج رہے تھے۔ انگریزوں سے جنگ جاری تھی۔ انگریزوں کی مدد کے لیے راجہ مہار تن من دھن سے لگے ہوئے تھے۔ اپنے ہی ہم وطنوں کی میں جکڑے رکھنے کے لیے وہ مسلسل جتن میں لگے تھے۔ اس کے علاقے میں بھی پولیس چوکی بنادی گئی تھی وحید خان کے گاؤں سے باہر کچھ فاصلے پر بھی پولیس تھی۔ گاؤں کا ایک ہی راستہ تھا جو اس چوکی کے آگے تھا انہی دنوں چوکی میں ایک نئے سکھ نگران کا تقرر ہوا تھا جو جبر و ظلم کے باعث علاقے میں بدنام ہو چکا تھا۔ وہ مختلف میں نوکری کر چکا تھا مگر کسی دیہات میں یہ اس کی پہلی تھی۔ اپنے مذموم اور غلط ارادوں میں اب تک کی مسلسل نے اسے حد سے زیادہ نڈر اور بُرا اعتماد کر دیا تھا جس کی اس نے دیہات کے ماحول اور لوگوں کو سمجھنے کی کوشش کی، کسی کو بھی خاطر میں نہ لانا اس کی عادت بن چکی تھی اس سے بالاں اور بیزار تھے مگر خاموش تھے۔

رانی اور وحید خان نے بڑی تیزی سے سفر شروع اندھیرا تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ راستے میں وحید خان رانی سے سکھ نگران کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کیا ایک جگہ ایک خیال نے اسے روک لیا، کہنے لگا ”دیکھو اگر سکھ نگران نے کہیں میری تلاشی لی تو یہ چھرا بدرجہا نہ بسیار ثابت ہوگا لہذا یہ چھرا تم اپنے لباس چھپا کر رکھ لو۔“

رانی نے پُر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے چھرا اپنے پاس میں رکھ لیا۔ دونوں چوکی کے قریب پہنچے تو سکھ نگران ابھری کھڑا تھا۔ نوخیز و نو عمر جوڑے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اہانت کی سیاہی چھا گئی۔ اس نے بڑے درشت لہجے میں انہیں پکار کر روکا اور بڑے کٹ کٹے انداز میں وحید خان سے کہہ لیا۔ وحید خان، رانی کی وجہ سے مصلحت اندیشی پر مجبور تھا۔ اس نے بڑے رسان سے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر سکھ نگران بدھنتی پر آمادہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اور کچھ نہیں تو سکھ خان کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور ہوگا کیونکہ اس علاقے میں ہتھیار رکھنا ایک عام سی بات تھی۔ مگر تلاشی لینے پر ہی اسے ناکامی ہوئی تو جھنجھلا گیا۔ آخر اس نے نقص امن کا بہانہ بنایا کہ تم دونوں بچے ہوتے ہو تمہاری حفاظت میری ذمہ داری ہے لہذا اب تمہیں صبح ہی چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس پر وحید خان کے تیور بد گئے تو سکھ نگران نے مزید بہانہ کیا کہ اچھا میں تمہارے بڑوں کو اطلاع کرتا ہوں کہ آ کر تمہیں لے جائیں، اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ سکروں میں بند کر دو۔ سپاہی انہیں اندر لے جانے لگے تو وحید خان نے بڑے آہستہ مگر مضبوط لہجے میں رانی کو مخاطب کیا ”دیکھو ملاں۔ عقل سے کام لیتا۔ ہوش و حواس برقرار رکھنا۔“

دونوں کو الگ الگ کمروں میں بند کر دیا گیا۔ رانی لمبے میں چھپی واحد چارپائی کے پاس کھڑی مسلسل سوچ رہی تھی، آنے والے وقت کی تنگی اسے مضطرب کیے ہوئے تھی، اس کی چھٹی جس مکمل طور پر بیدار اور چوکی تھی۔ گہری لادھنی یقیناً کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

رات کے دوسرے پہر نقشے میں مست سکھ نگران رانی کے گھرے کی طرف جانے لگا تو ایک بُرائے اور ادھیڑ عمر کے ہائی نے دبے الفاظ میں اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے اسے بڑی بُری طرح جھڑک دیا اور کمرے میں داخل ہو کر ارہ بند کر کے چھٹی کو مضبوطی سے چڑھا دیا۔ رانی نے اسے کہا تو بُری طرح چونک اُٹھی۔ دشمن کی نیت سمجھتے ذرا دیر نہ لگا۔ اس کا جسم اور ذہن غصے سے سلگ اُٹھا مگر پھر وحید خان کی اہلی تربیت کام آئی۔ اس نے تیزی سے صورت حال پر قابو پا کر ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ سکھ نگران خباثت سے مسکرایا تو اس نے بڑی نرمی سے کہا ”دیکھو صاحب، میں اس وقت بے ہوش جو تم چاہو گے وہی ہوگا مگر میری ایک چھوٹی سی بات ہے۔“

سکھ نگران نے رانی کو تر نوالہ بننے دیکھا تو اس کی ہنس مکھ انہیں اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا تو رانی نے

اپنے سر سے چادر اُتار کر آگے کی اور کہا ”کم از کم یہ چادر اپنی آنکھوں پر باندھ لو۔“

نشتے میں دھت سکھ نگران نے چادر لی اور اسے آوارگی سے ایک دو بار سونگھا، چوہا اور آنکھوں پر باندھنے لگا کہ بھجرے میں قید اور جال میں پھنسی یہ چڑیا آخر جائے گی کہاں؟

رانی لپک کر دشمن کی پشت پر پہنچی اور چادر باندھنے میں مدد کے بہانے چادر کو مضبوطی سے باندھا، جلدی جلدی ایک دو گانٹھیں دیں پھر بجلی کی سی سرعت سے سامنے آ کر چھرا نکالا۔ بایاں ہاتھ تختی سے دشمن کے گریبان میں ڈالا اور پے درپے وار شروع کر دیے وہ یکا یک غیرت و حمیت اور جرأت کا مکمل استعارہ بن گئی۔

☆☆☆

باہر سے دوسری مرتبہ دروازہ دھڑ دھڑایا گیا اور اسی پُرائے اور بزرگ کے سپاہی نے قدرے جی کر دروازہ کھولنے کا کہا۔ رانی نے بڑی سختی سے انکار کیا اور کہا کہ سنو! تمہارا خنزیر صاحب اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے اور دروازہ میں اب صبح ہی کھولوں گی۔ شور سن کر دیگر سپاہی بھی جمع ہو گئے تھے، کبھی حواس باختہ تھے آخر انہوں نے وحید خان کو مدد کے لیے باہر نکالا۔ وحید خان نے دروازے پر پہنچ کر رانی کو پکارا ”رزاں! دروازہ کھولو رزاں، میں ہوں وحید خان!“

رانی نے پھر بھی انکار کیا اور ساری صورت حال وحید خان کے گوش گزار کر دی۔ وحید خان نے دو سپاہیوں کو گھر اطلاع دینے بھیجا۔ صبح ہوئی تو جھوم جھوم ہو چکا تھا۔ جرگے نے رانی کو اپنی تحویل میں لے کر گھر بھیج دیا۔ شہر سے پولیس کی نفری آئی تو جرگے نے بڑے نرمی افسر کو بلائے اور فیصلہ کرنے کا مطالبہ کیا۔ انگریز آقا بڑا بڑک اور ہالاک تھا۔ اپنے اقتدار، انصاف اور سپاہی مافی الامام کے مقابل اسے ایشیائی یا مقامی لوگوں سے کوئی غرض نہیں تھی، اس نے حکومت کا اچھا تاثر قائم کرنے کے لیے سکھ نگران کو ہی قصور وار ٹھہرایا تاکہ لوگ اور جرگہ خوش رہیں لیکن قانون کا پیٹ بھرنے کے لیے وحید خان کو معمولی قید کی سزا دی جسے جرگے نے تسلیم کر لیا۔ مگر اس واقعہ نے ایک نئی روش قائم کر دی۔ سرحد کی ہر اس چوکی پر رات کے اندھیرے میں حملہ شروع ہو گیا جہاں دہلی سپاہی تعینات ہوتے۔ آزادی کی اس لہر کو پیدا کرنے کا سہرا رانی کے سر ہے جو آج بھی علاقے بھر میں کسی دیوی کی طرح پوجی جاتی ہے۔ پشاور سے پاڑے تک رانی کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔





سیراب

راوی : شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

062820

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندمی ایک تہلکہ خیز کہانی

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آری میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد یا دوسرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز سے واپس آتے ہوئے نادری علی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور بددی کی ایک سلسلہ شروع دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہی جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میری بھانجی اپنے دو حوالہ جاری تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر زخمی ہو گیا۔ میں زرین کو لے کر سیر کے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرح جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بچنگے پر پہنچا احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک دائرہ تجزیہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہو سکی۔ یہی ڈیوڈ شاہی آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا قاتل تھا۔ اس نے مجھے رہا کر لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پرام دادی تک پہنچا دو تو میں مرشد سے بھی گلو خلاصی کرادوں گا۔ اس کے بعد شانے مجھے اپنے ایک آدی مارشل کے ساتھ کر دیا کہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے سال میں شہر آ گیا۔ ہم اس بچنگے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، مونا و سادھنا کو عبداللہ والے بچنگے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ وہ مجھے اپنے بچنگے پر پہنچی۔ ہم دیوار پھاڑ کر اندر پہنچے تھے کہ شہلا نے پستول نکال کر کہا کہ تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ میں نے اسے قابو کیا اور را کر لیا کہ وہ بینک کالا کر کھلوانے میں ہماری مدد کرے گی مگر اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے اس کے پیروں میں نعلی بم باندھ کر کہ یہ ریوٹ سے پھٹ سکتا ہے اگر تم نے غلط حرکت کی۔ یہی اس نے عجیب حرکت کی اور اپنا پیر میرے پیروں میں پھنسا کر کہا ”میرے ساتھ تم بھی مرد گے۔“ بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا کہ یہ صرف احتیاط کیا ہے کیونکہ گزشتہ بار اس نے دھوکا کیا تھا۔ وہ حالت میں بینک جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لو ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدیور بلا لیا ہے۔ وہ مجھے بری فال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدی پکڑ لائے تھے اور کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کر کے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیب آدمی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوش بھاگ دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کر لیا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کر کے لے لے مجھے ڈیوڈ شاہی کے ہیرو تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپکادی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو مدد لانے کے لیے فرار کر دیا۔ تب فتح خان، برٹ شاہ کو آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے سیل کر کے ایمین کو بلوایا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شانے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدی نے برٹ شاہ کو مار دی۔ مرتے وقت برٹ شاہ بڑا بڑا ”تار تار“ ہکست ”دم توڑتے برٹ شاہ کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں انداز ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، یہی مانیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدی ہیں۔ وہاں سے میں نکل میں آیا۔ وہاں ایمین بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمین کو خودش جیکٹ پہنادی جسے اُتارنے کی کوشش کی جانی تو رہا جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوئی میں پہنچے تو فون آ گیا۔

کچھ دیر کے لیے ہم سب ہی ساکت رہ گئے تھے۔ ہم ہی مرشد کی آواز اور اس کا لہجہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اسی طرح مرشد میری، سفیر اور وسیم کی آوازیں بھی پہچانتے تھے۔ البتہ عبداللہ کی آواز اس کے لیے اجنبی تھی میں نے گھرا دیا کہ ہم میں سے کسی نے بات نہیں کی ورنہ مرشد کی اہل کی اسی وقت تصدیق بھی ہو جاتی۔ میں نے عبداللہ کو اہل جاری رکھنے کا اشارہ کیا اور اس نے پرسکون آواز میں کہا: ”مرشد صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اس نمبر پر کوئی گھبرانای شخص نہیں پایا جاتا ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ مرشد نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”مجھے نہ صرف یہ معلوم ہے کہ اس کا اس جگہ سے تعلق ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ یہاں موجود ہے۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“

”میں آپ سے بلاوجہ جھوٹ کیوں بولوں گا؟“ عبداللہ نے جھنجھلائے بغیر کہا۔ ”ویسے یہ شہباز کون ہے اور آپ یہاں اس کی موجودگی پر اصرار کیوں کر رہے ہیں؟“

مرشد نے عبداللہ کا سوال نظر انداز کیا اور بولا۔ ”سنو“ شہباز سے کہو مجھ سے بات کرے ورنہ بڑے خسارے میں ہے گا۔“

”جب یہاں کوئی شہباز آیا تو میں اسے مطلع کر دوں گا۔“ عبداللہ نے ہنسی سے کہا اس نے کال کاٹ دی اور پھر طرف دیکھا۔

”یہ اچھا نہیں ہوا۔“ سفیر پریشان ہو گیا۔ ”اسے کیسے ظم ہوا کہ شہباز یہاں موجود ہے۔“

”اس سے بھی اہم بات کہ اسے اس کو بھی کا علم کیسے ہوا؟“ وسیم بولا۔

میں سوچ رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے مرشد نے کسی طرح معلوم کر لیا ہے کہ یہ کوئی راجا عمر دراز کی ہے۔“

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس صورت میں وہ یوں مال کر کے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ میرا خیال ہے اس کا تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”ممکن ہے وہ اس طرح یہ جاننا چاہتا ہو کہ شہباز صاحب یہاں ہیں یا نہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

میں اچھل پڑا تھا۔ ”عبداللہ وہ کسی قسم کا جال بچھا رہا ہے۔ ایک بار اسے یہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا تو وہ اسے بھی بھیج سکتا ہے۔ پولیس نے مجھے پکڑ لیا تو سمجھو مرشد لے ہاتھ آ گیا۔“

وسیم نے میری تائید کی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں

ہیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

”پھر در بدری۔“ سفیر نے گہری سانس لی۔ ”لیکن ان خواتین کا کیا ہوگا؟“

”میرا خیال ہے یہ یہیں رہیں۔“ میں نے کہا اور سفیر کی طرف دیکھا۔ ”ایاز کہاں ہے؟“

”وہ دو دن کے لیے سرگودھا گیا ہوا ہے کسی کام سے، کل تک آجائے گا۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”کیا اس سے رابطہ کرنا ہے؟“

”نہیں میں پوچھ رہا تھا۔“ عبداللہ ہمیں فوری طور پر جانا ہوگا ممکن ہے مرشد پولیس بھیج ہی دے اس صورت میں تم بھی مشکل میں پڑ جاؤ گے میری عدم موجودگی میں تم آرام سے پولیس کو ڈیل کر سکتے ہو۔“

عبداللہ نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے آپ کھانا کھائیں اتنی دیر میں آپ کی روانگی کا انتظام کرنا ہوں۔“

ہم ڈانٹنگ روم میں آئے جہاں خواتین پریشان بیٹھی تھیں۔ سویرا نے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے ڈش اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”کسی نے کال کر کے میرا نام لیا تھا۔ خیر دیکھ لیں گے کھانا کھاؤ۔“

کھانا خاموشی اور بے دلی سے کھایا جانے لگا۔ سب ہی کھٹک گئے تھے کہ کوئی چکر ہے خاص طور سے خواتین کے چہرے اتر گئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو ہم ان سے الگ ہو جائیں گے تاکہ وہ ہماری مشکلات میں شامل نہ ہوں۔ عبداللہ چلا گیا تھا۔ بیٹو کھانے میں بھی شریک نہیں تھا اس کا مطلب تھا اس کی طبیعت کج کج خراب تھی۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اور میں نے ٹھٹھ میں کھانا بھٹکا یا پھر وسیم کو ایک طرف لے گیا۔ ”بتا کو تار کر ۱۰ بات بھی جانا ہوگا۔“

”اسے تیز بخار ہے۔“

”لیکن اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتے ورنہ پولیس اسے لے جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے پاس شناختی دستاویزات نہیں ہیں۔“

وسیم نے کہا۔ ”اب ہیں، عبداللہ نے بیٹو کا آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ بھی بنوایا ہے۔“

میں نے اطمینان محسوس کیا۔ ”اس صورت میں ہم اسے یہاں چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔ کیونکہ پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے عبداللہ کو چاہیے اسے کوئی کا ملازم ظاہر کرے۔“

میں جانے سے پہلے بیٹو سے ملنا چاہتا تھا لیکن وہ سو رہا

تھا اس لیے میں صرف دیکھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر سویرا موجود تھی۔ میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”شہباز کیا بات ہے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“ میں نے گہری سانس لی اور اسے بتا دیا۔ ”سویرا آنے والی کال مرشد کی تھی۔ تم سمجھتی ہو یہاں مرشد کی کال آنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“

”میرے خدا۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں اس سے پہلے کہ۔۔۔۔۔“

”ہم یہی کر رہے ہیں تم فی الحال یہیں رکو گی پھر عبداللہ سوچ دیکھ کر تمہیں حوصلہ بخود دے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ متفق ہو گئی۔ ”لیکن آپ کہاں جائیں گے؟“

میں نے اسے تسلی دی۔ ”فکرت کرو یہاں ہمارے پاس اور بھی کئی ٹھکانے ہیں۔“

اتنے میں عبداللہ آگیا۔ ہمیں دیکھ کر ٹھنکا پھر بولا۔

”شہباز صاحب روائی کا بندوبست ہو گیا ہے۔“

وہ کہہ کر چلا گیا میں نے سویرا کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم حوصلہ واپس جا کر میرا انتظار کرنا۔“

اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں لیکن وہ حوصلے سے مسکرائی۔ ”میں یہی تو کر رہی ہوں۔“

مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ دن سویرا کے ساتھ رہوں گا اور پھر اسے حوصلہ بھیج کر اپنے دشمنوں کی طرف توجہ دوں گا لیکن دشمنوں نے مجھے سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ابھی میں آیا تھا اور اب دوبارہ بھاگنا پڑ رہا تھا۔ سویرا سے مل کر میں باہر آیا۔ سفیر اور ویم اپنی والیوں کو سمجھا بھاگ رہے تھے۔ رحمتی کا الٹا سین ہر جگہ نمایاں تھا۔ عبداللہ صبر کے ساتھ نشست گاہ میں منتظر تھا۔ اس نے کہا۔

”عقبی گلی میں ایک منزل واٹر والی گاڑی موجود ہے۔ آپ سب تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اس کے کیمین میں بیٹھ کر یہاں سے نکلیں گے۔“

”تمہارا مطلب ہے یہاں کی نگرانی ہو رہی ہے؟“

”اگر نہیں بھی ہو رہی ہے تب بھی ہمیں یہی سمجھنا چاہیے کہ یہاں کی نگرانی ہو رہی ہے۔“ عبداللہ نے کہا اور

موہاں نکال کر کسی کو کال کی۔ ”آس پاس کی کیا پوزیشن ہے؟۔۔۔ ٹھیک ہے کڑی نظر رکھو اگر کوئی نگرانی کرتا نظر آئے تو بے آواز ہتھیار سے اس کی گاڑی کا کارہ بنا دو۔“ اس نے موہاں رکھ کر میری طرف دیکھا۔ ”میں نے اپنے آدمی آس پاس گلیوں میں پھیلا دیے ہیں۔ وہ مشکوک افراد اور

گاڑیوں کی تلاش میں ہیں۔“

عبداللہ اب ان کاموں کا باہر ہوتا جا رہا تھا۔ خیال آیا۔ ”تم اور ویم مل کر ایک سینٹرل کمانڈ بنا رہے تھے گاڑی میں۔۔۔۔۔ اس کا کیا بیانا؟“

”گاڑی تیار ہے اور فارم پر کھڑی ہے۔ آپ لو بھی وہیں جا رہے ہیں۔“

”ہماری روائی کے لیے کیا انتظامات کیے گئے ہیں یہ سچ سچ منزل واٹر سپلائی کرنے والی دین ہے۔“

یہاں منزل واٹر سپلائی کرتی ہے۔ دونوں آدمی اعتماد ہیں۔ لیکن دین کے آگے پیچھے بھی تین گاڑیاں اور ایک درختی افراد ہوں گے۔“

”عبداللہ سب باہر ہوں گے تو کوشی میں کون ہوگا میں نے نقطہ اٹھایا۔“ ممکن ہے مرشد کی یہی پلاننگ ہو کہ یہاں سے نکل جائیں اور وہ پیچھے کوئی کارروائی کرے۔“

”آپ فکر نہ کریں یہاں کی سیکورٹی میں کوئی کمی ہوگی۔ راجا صاحب نے اپنے محل سے بھی چھ تربیت یافتہ آدمی بھیجے ہیں۔“

میں مطمئن ہو گیا۔ ویم اور سفیر بھی آگئے۔ ہم عقبی میں آئے اور دروازے کے بالکل ساتھ گلی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گلی میں تاریکی تھی۔ ہمارے بیٹھے ہی وین کا دروازہ

ہو گیا۔ ہمارے پاس اسلحہ تھا تاکہ راستے میں کسی ہنگام صورت حال سے آرام سے نمٹ سکیں۔ ابھی ہم دروازے سے نکلنے سے بیٹھے ہی تھے کہ وین حرکت میں آگئی۔ اس

عقب میں پس لیئرز والے منزل واٹر کے کیمین بھرے ہوئے تھے۔ جگہ کم تھی اس لیے ہمیں سکرٹسٹ کر بیٹھنا پڑ رہا تھا۔

نے ایک پستول، ایک برس اور ایک عدد موہاں کی میری طرف بڑھایا۔ ”یہ آپ کے لیے تیار کیا ہے اس میں سب کے کمرے ہیں اور اس کا نمبر سب کے پاس ہے۔“

پرس میں رقم تھی۔ ”یہ تم نے اچھا کیا، عبداللہ تمہارا کہ کمانڈر وین تیار ہے؟“

”بالکل تیار ہے۔“

”نادر علی کے ممکنہ ٹھکانے کی نگرانی کا کیا بیانا؟“

”نادر علی سچ سچ وہاں موجود ہے اور اب مستقل کوشی میں رہتا ہے۔ پتا یہ چلا ہے کہ اس کے اور مرشد اختلافات شدت اختیار کر گئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اس میں اٹھ آیا ہے۔ عبداللہ کا ایک آدمی بھکاری کے روپ

مستقل وہاں کی نگرانی کر رہا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میری عدم موجودگی سے یہاں

حالات پر کوئی فرق نہیں پڑا۔“

سفیر نے مجھے گھورا۔ ”شوہی تم کس چکر میں ہو، کہیں ہمارے ساتھ رحمتی کا کارادہ تو نہیں ہے؟“

”سارے منڈے لگ گئے کام سے۔“ میں نے سرد مہری۔ ”وہی تم نے آئیڈیا اچھا دیا ہے۔ ایسا کرتے ہیں ہر کوئی بلا لیتے ہیں اور پھر ہم کہیں نکل جائیں گے۔“

”اپنے ابا جی کو بھول رہا ہے گنجائش کر دیں گے۔“ سفیر نے دلدلایا۔

ویم دروازے کے ساتھ لگا کسی سوراخ سے باہر بھاگ رہا تھا اس نے مڑ کر کہا۔ ”پیچھے تو کئی گاڑیاں ہیں ان میں سے دو عبداللہ کی ہیں اور باقی پانچ کئی لوگوں کی ہیں؟“

سفیر بولا۔ ”مجھے یقین ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی دل یا گاڑی مرشد کی ضرور ہوگی۔“

”سوال یہ ہے کہ اس نے فون کیوں کیا؟“ میں نے کہا۔ ”کیا وہ ہمیں کوشی سے نکالنا چاہتا تھا؟“

”سامنے کی بات ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”باہر اس کے گھر کے ہمارے منتظر ہوں گے۔“

”اور ہم نے باہر نکل کر اس کی توقع پوری کر لی؟“ میں نے کہا۔ ”کیا یہ عقل مندی ہے؟“

”اگر یہ عقل مندی ہے تو جناب اس میں برابر کے فرق ہیں۔“ سفیر نے یاد دلایا۔

”بس یار دوستوں کی عقل مند یوں میں بھی شریک ہوتا ہوں مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔“ میں نے

کال لگائی۔ منزل واٹر وین اب ایک شاہراہ پر آگئی تھی یہاں پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں۔ یہ پتا چلانا ناممکن تھا

مگر ان میں سے کون ہمارے پیچھے ہے اور کون نہیں ہے؟ اگر ہم کی ویران سڑک پر ہوتے تو پتا بھی چلتا۔ ”آگے کچھ عقل مندی ہے اس شاہراہ پر نکل آئے ہیں یہاں کیسے پتا چلے گا

مگر وہوں گاڑیوں میں سے کون سی پیچھے ہے؟“

”میرا خیال ہے یہ عبداللہ کی ہلچل کے مطابق کام کر رہے ہیں۔“ ویم نے کہا اور اسی لمحے میرے موہاں کی نیل

ل۔ عبداللہ کال کر رہا تھا اس نے کہا۔ ”جناب منزل واٹر کی کال کے پیچھے ایک نیل کار ہے۔“

”تمہیں یقین ہے کہ بس یہی گاڑی ہے؟“

”جی جناب یہ ہماری گلیوں سے نکلی ہے اور پانچ منٹ

بھرے آدمی اسے ناکارہ کر دیں گی۔ اس وقت وین ایک

وال میں مڑے گی اور ایک جگہ رکے گی آپ وہیں اتر

آئیں گے۔“

”میں سمجھ گیا اور وہاں سے روائی کیسے ہوگی؟“

”اس سڑک پر بے شمار ٹیکسیاں ہوں گی آپ لوگ تین الگ الگ ٹیکسیوں میں روانہ ہو گئے اور ایک دوسرے سے

فاصلہ رکھیں گے اس طرح پتا چل جائے گا کہ مزید تعاقب کیا جا رہا ہے یا نہیں۔“

عبداللہ کا پلان بہترین تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس قسم کے حالات کے لیے اس نے پہلے سے پلان سوچ رکھا تھا

اور موقع آنے پر عمل کر رہا تھا۔ ویم عقب میں دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ ”نیل گاڑی کئی وہاں چاٹک کھوم کر گرین ہیلٹ پر چڑھ گئی ہے۔“

”عبداللہ کے آدمی نے اس پر بے آواز ہتھیار آزمایا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”فائر کی آواز نہیں آئی ہے۔ اب تمہارے

جاؤ وین رکے گی اور ہمیں فوراً اترنا ہے اسلحہ چھپا لو۔“

ایک چھوٹی خود کار رائل ویم کے پاس تھی وہ اس نے

جیکٹ میں کر لی۔ میرے اور سفیر کے پاس بس پستول تھے۔ وین رکنے سے پہلے ویم نے ہمیں ان کے اضافی میگزین بھی

دے دیے۔ اسی لمحے وین رکی اور ہم تینوں نیچے اتر آئے۔ ویم نے وین کے دروازے پر ہاتھ مارا تو وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ کمرشل

اسٹریٹ تھی اور یہاں مارکیٹ تھی۔ رات کے دس بجے اور شدید سردی کے باوجود یہاں خاصی رونق تھی۔ ایک طرف بہت

ساری یلو کپس کھڑی تھیں۔ اس سڑک پر بھی کئی گاڑیاں تھیں جو مین روڈ سے اندر آئی تھیں اور ممکن ہے ان میں سے کوئی وین کا

تعاقب کر رہی ہو۔ میں نے مختصر الفاظ میں انہیں عبداللہ کا پلان بتایا۔ ”اب ہمیں الگ الگ ٹیکسیوں میں سفر کرنا ہے فارم ہاؤس

کس نے دیکھا ہے؟“

”میں نے اور ویم نے۔“ سفیر نے جواب دیا۔

”بس تو میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔“ میں نے ایک نزدیکی بلڈ کمپ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں نے جان

بوجھ کر رفتار سست رکھی تھی۔ ویم اور سفیر مجھ سے پہلے ہی دو ٹیکسیوں تک پہنچ گئے۔ ان کے بیٹھے ہی میں نے بھی ایک یلو

کیب والے بڑے میاں سے کہا۔ ”جا چا چلنا ای۔“

”کتنوں۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”ادھر جی ٹی روڈ تے۔“ میں نے کہا اور اندر بیٹھ

گیا۔ اس نے خاموشی سے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ وطن عزیز کے

دیگر شہروں کے مقابلے میں راولپنڈی اسلام آباد کے ٹیکسی

ڈرائیور حیل و جھٹ نہیں کرتے۔۔۔ اور نہ کرائے کے نام پر کھال

اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھار کہانی سنا کر

بہرہ ریزی کے نام پر اضافی رقم سیننے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ وہ

بھی سب نہیں کچھ ڈرائیور ایسے ہیں۔ میں نے سفیر اور ویم کی ٹیکسیوں کی نشان دہی نہیں کی تھی وہ ویسے ہی ان کے پیچھے تھا۔ ذرا دیر بعد ہم جی ٹی روڈ پر تھے یہاں پہلی تیز روشنی والی اسٹریٹ لائٹس تھیں۔ میں اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کون سی گاڑی مستقل ہمارے پیچھے لگی ہے مگر فی الحال ایسی کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ گاڑیاں مستقل مڑ رہی تھیں یا آگے نکل رہی تھیں کوئی مستقل مزاجی سے تعاقب کرتی نہیں دکھائی دی تھی۔ جی ٹی روڈ پر آنے کے بعد میں نے سفیر کو کال کی۔

”کیا صورت حال ہے؟“

”ابھی تو معاملہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔“

میں نے ویم کو کال کی اس نے بھی ٹیکسی کی رپورٹ دی۔ میں نے کہا۔ ”پھر بھی احتیاطاً تھوڑا پہلے رک جانا میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”جی میں سمجھ گیا۔“ اس نے جواب دیا۔

”سفیر کو بتا دو۔“

ہم پشاور کی طرف جا رہے تھے۔ راولپنڈی سے باہر جی ٹی روڈ پر جی ٹی چھوٹے بڑے شہر آتے تھے۔ ہمیں ٹیکسلا سے پہلے کہیں رکنا تھا۔ جگہ میرے علم میں نہیں تھی۔ اس لیے میں عقب کے ساتھ ویم اور سفیر کی ٹیکسیوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ مگر تینوں تقریباً ایک ہی رفتار سے جا رہے تھے۔ اس لیے ٹیکسیوں کا فاصلہ آپس میں برابر ہی تھا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ مرشد نے اس طرح کال کیوں کی تھی؟ یہ قدم خلاف معمول تھا اگر اسے کوئی اور یہاں میرا سراغ مل گیا تھا تو اس نے خاموشی سے نگرانی کرانے پھر دھاوا بولنے یا مجھے اور میرے ساتھیوں کو اٹھانے کی کوشش کے بجائے مجھے کال کر کے ہوشیار کر دیا اور ہم فوری طور پر وہاں سے نکل آئے تھے۔ ابھی میں راستے میں تھا اس لیے اس پر سوچنے کے بجائے میں نے آس پاس نظر اور ساتھیوں سے رابطہ رکھنے کا سوچا۔ عبداللہ کو کال کی۔

”تم کہاں ہو؟“

”میں واپس کوئی آگیا ہوں لیکن دو گاڑیاں آپ کے ساتھ ہیں مجھے پل پل کی رپورٹ مل رہی ہے۔“

”تم نے ٹھیک کیا مجھے وہاں موجود لوگوں کی فکر ہو رہی ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں احتیاط کے طور پر انہیں کوئی ایک ایسے جگہ میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں سوائے میرے اور کوئی نہیں جاسکتا۔“

عبداللہ کی یہ احتیاطی تدبیر بھی مجھے پسند آئی تھی۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو کوئی سے نکال کر مرشد کا وہاں بولنے کا ارادہ تھا تب بھی تینوں خواتین آسانی سے اس ہاتھ نہیں آتیں۔ لیکن میرے خیال میں ان تینوں کا بھی دما رہتا اب مخدوش ہو چکا تھا۔ مطلع صاف ہوتے ہی انہیں وہ سے روانہ کر دینا چاہیے تھا۔ سویرا کو تو واپس جی ٹی جانا تھا مونا اور سعد یہ کسی صورت نہیں مانتیں۔ ان کے لیے یہیں کہ بندوبست کرنا تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو انہیں فارم ہاؤس پر ہی لیتے۔ لیکن فی الحال تو ہمیں دیکھنا تھا کہ ہم خود بھی محفوظ ہیں نہیں۔ نصف گھنٹے بعد مجھے ویم کی کال آئی۔ ”میں ٹیکسی سڑک سے اتار رہا ہوں آپ سفیر کی ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے آئیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

آگے کوئی گاڑی سڑک سے اندر کی طرف مڑتی دکھا دی۔ پھر سفیر کی ٹیکسی مڑی تو میں نے بڑے میاں کہا۔ ”آپ اس ٹیکسی کے پیچھے موڑ لو اور یہ جہاں رکے دیکھا روک لو۔“

اس پر بڑے میاں نے پہلی بار مجھے مشکوک نظر سے دیکھا۔ ”کوئی چکرتے نہیں اے۔“

”تسی فکر ای نہ کرو کوئی چکر نہیں اے۔“ میں اسے تسلی دی تو اس نے بادل نا خواستہ ٹیکسی کو اس کے راہ پر موڑ دیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ویم کی ٹیکسی کوئی ٹرلاگم بعد رکی ہوئی تھی اور سفیر والی ٹیکسی اس کے پاس رک رہی تھی۔ بڑے میاں نے اپنی ٹیکسی ان سے ذرا دور روک دیا اور مجھے بولا۔ ”میںوں فارغ کرو جی۔“

”کتنے ہوئے؟“ میں نے اترتے ہوئے پوچھا۔

”دو سو ویدو۔“ اس نے ہچکچا کر کہا تو میں نے پر سے دو سو نکال کر اسے دے دیے۔

”اللہ تینوں خوش رکھے۔“ اس نے خوش ہو کر کہا اور ٹیکسی ریورس کر لی۔ اس دوران میں باقی دو ٹیکسیاں بھی واپس جا رہی تھیں اور ویم سفیر میری طرف آ رہے تھے۔ جب تک تینوں ٹیکسیاں مین روڈ پر جا کر مڑیں ہم جمع ہو چکے تھے ابتدائی چاند کی روشنی کافی تھی اور یہاں مکمل اندھیرا نہیں تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”اب کس طرف جانا ہے؟“

”میرے ساتھ آئیے۔“ ویم نے کہا اور ایک خشک کھیت کے کنارے بنی منڈ پر پر چلنے لگا۔ کھیت میں کوئی فصل نہیں تھی حالانکہ میزن تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ اس علاقے

میں کاشت کار نہری پانی کے محتاج بھی نہیں تھے۔ صرف گندم لگانے والوں کو بھی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا تھا کہ کسی کا آدمے یا ایک کنال کا پلاٹ خالی ہوا تو وہ اس پر گندم لگا دیتا ہے اور کم سے کم اپنے کز اورے کی گندم حاصل کر لیتا ہے۔ جبکہ زمین کی صورت سے یہ زرعی علاقہ لگ رہا تھا۔ بہر حال ہو سکتا ہے مالک کسی وجہ سے گندم کاشت نہیں کر سکا ہو۔ ہم اس منڈ پر پر چلتے ہوئے آگے آئے پھر ویم دوبارہ مین روڈ کی طرف مڑ گیا لیکن اس طرف جانے کا راستہ نہیں تھا کیونکہ آگے ایک بڑے احاطے کی دیوار نے راستہ روک رکھا تھا۔ میں نے کہا۔

”یہاں تو راستہ بند ہے۔“

”تو آتو یا رتیرے لیے دیوار میں بھی راستے کھلوا دیتے ہیں۔“ سفیر نے ناموجود موچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ تب مجھے دیوار میں ایک چھوٹا سا لوہے کا بنا دروازہ دکھائی دیا۔ پہلے کم روشنی کی وجہ سے نہیں دکھائی دیا تھا۔ دروازے میں اندر باہر دونوں طرف سے کھلنے والا تالا فکس تھا۔ ویم نے ایک عدد دیا پانی برآمدی اور اس سے تالا کھول لیا۔ ہم اندر آئے جگہ جگہ روشن گارڈن لائٹس میں ایک خوب صورت باغ نظر آیا۔ یہاں گریپ فروٹس کے بہت سارے درخت لگے تھے۔ کہیں کہیں لوکاٹ اور شہتوت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں سے پھل اتر چکا تھا۔ کچھ آگے ایک چھوٹی سی دو منزلہ کوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے جگہ کا معائنہ کیا۔

”تو یہ ہے وہ فارم ہاؤس؟“

”جی جناب اور صرف دس ہزار روپے ماہانہ کرائے پر مل گیا۔ اصل میں مالک جاپان جا رہا تھا اور اسے رقم کی ضرورت تھی اس نے پورے سال کا ایڈوانس لے کر یہ کوئی اور فارم کرائے پر دے دیا۔ فرش بھی ہے۔“

”اور ہمیں کل ہی یہاں سے بھاگنا پڑا تو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے جس اسٹیٹ والے سے لیا ہے اس سے بات کرتی ہے وہ آرام سے اسے چندرہ ہزار کرائے پر اٹھا دے گا۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ میں نے کوئی کی طرف قدم بڑھائے۔ یہاں کچی زمین نہیں تھی بلکہ پودوں کے درمیان اینٹوں سے پختہ روش بنی ہوئی تھیں۔ ہم گھوم کر سامنے آئے جہاں ایک چھوٹا سا جدید طرز کا لان تھا اور پورچ میں سینٹرل گماٹر وین، سفیر کی شاندار سفاری جیپ اور میری بیوی بائیک کھڑی تھی۔ کوئی کے اندر باہر روشنی تھی۔ سفیر نے کہا۔

”ہم نے پہلے ہی بہت کچھ یہاں منتقل کر دیا ہے۔“

”کوئی خالی ہے؟“

”نہیں یا راندروہ نمونہ ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔“

”یہ زیادتی ہے جناب۔“ اچانک کسی نے کہا لیکن بولنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آواز کسی اسپیکر سے آئی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔

”مافی ہے خود کو نمونہ کہنے پر برا مان رہا ہے لیکن تم اسے دیکھ کر بتاؤ کہ اسے نمونے کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”سفیر صاحب اپنے الفاظ واپس لیں ورنہ دروازہ نہیں کھلے گا اور آپ کے ساتھ ویم صاحب اور شہباز صاحب منت میں پریشان ہوں گے۔ باہر سردی بہت ہے۔“

”مت کھولو ہم دروازہ توڑ کر بھی آسکتے ہیں۔“ سفیر نے لاپرواہی سے کہا۔ ”لیکن برخوردار تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ابھی میں اپنے الفاظ واپس لے لوں گا تو اندر آ کر دوبارہ تمہیں یہی کہوں گا۔“

”دروازہ کھول دو یا ر۔“ ویم نے اسے تسلی دی۔ ”میں اور شہباز صاحب ہرگز تمہیں نمونہ نہیں کہیں گے۔“

مافی نے خفا ہونے کے باوجود دروازہ کھول دیا تھا۔ یہ الیکٹرانک لاک تھا جسے اندر سے ٹھن دبا کر کھولا جاسکتا تھا۔ اس مختصر گفتگو سے ظاہر تھا کہ مافی نہ صرف ہماری آوازیں سن رہا تھا بلکہ ہمیں دیکھ بھی رہا تھا اور ہم تک اپنی آواز بھی پہنچا سکتا تھا۔ شاید صرف داخلی دروازے پر ہی نہیں بلکہ اس احاطے کو پوری طرح کیمروں اور مانک کی زد میں لیا گیا تھا۔ ہم اندر آئے۔ نیچے کوئی میں ایک بڑی سی نشست گاہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈائننگ ہال اور مکن تھا۔ میزچیوں کے عقب میں اسلامی کے لیے ٹھکانہ ص کمر تھا لیکن اب یہ کنٹرول روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ مافی مافی لوجوان نے یہیں اپنے تمام کمپیوٹر انڈر جاسوسی آلات لگا رکھے تھے اور نگرانی کا سسٹم ایک لیپ ٹاپ میں سیٹ کر رکھا تھا۔ کیمرے اور مانک وائرلیس پر کام کر رہے تھے۔ اور یہ سب ایک آلے کی مدد سے لیپ ٹاپ کے والی فائی سے منسلک تھے گویا مافی اپنے لیپ ٹاپ کو کہیں بھی لے جا کر استعمال کر سکتا تھا۔

مافی دیکھنے میں واقعی ویسا ہی ثابت ہوا جیسا سفیر نے کہا تھا۔ مختصر جسامت اور چھوٹے سے قد کے ساتھ اس نے سر کے چاروں طرف پھیلے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے تھے اور اس کے ننھے سے چہرے پر بہت دبیز شیشے والی عینک

تھی۔ گورا چٹا اور بڑے نازک نقوش والا نوجوان تھا۔ اس نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور چھوٹے ہی پوچھا۔ ”سر کیا میں آپ کو نمونہ لگتا ہوں۔“

”بالکل بھی نہیں۔“ میں نے کہا اور دل ہی دل میں خدا سے اس جھوٹ کی معافی مانگی جو میں نے اس کے ایک بندے کی دل آزاری کے خیال سے بولا تھا۔ ”جو تمہیں نمونہ کہے وہ خود نمونہ ہوگا میرے خیال میں تم آج کے جینیٹس ہو۔“ وہ خوش ہو گیا اور اس نے دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”سر آپ پہلے شخص ہیں جس نے مجھے پہچانا ہے۔“

”آخری بھی یہی ہے۔“ سفیر نے سر ہلایا جس پر مانی نے سراپا فریاد بن کر میری طرف دیکھا میں نے اس کا شانہ سہلایا۔

”چھوڑو یا ریشو ہر بن کر بعض لوگ ایسے ہی ہو جاتے ہیں یہ بتاؤ کہ تم نے یہاں کیا کیا ہے؟“

وہ جوش و خروش سے بتانے لگا کہ اس نے نگرانی کا کتنا شاندار سسٹم بنایا ہے۔ کوئی ایک درجن کیمروں اور اتنے ہی مائیک کی مدد سے وہ اس پورے فارم ہاؤس کی نگرانی کر سکتا تھا۔ اس کے لیب ٹاپ پر ان تمام کیمروں کو دیکھا جاسکتا تھا۔ اس نے نگرانی کے لیے ایک خاص سافٹ ویئر بنایا تھا اگر کسی کیمرے کا منظر اسکرین پر نہیں ہوتا تھا اور اس کیمرے کے سامنے کوئی حرکت آتی تو سافٹ ویئر خود بہ خود اس کیمرے کا منظر اسکرین پر لے آتا تھا۔ میں متاثر ہوا تھا۔ ”یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔“

”جھینک یو سر اور یہ سسٹم جس روٹر سے منسلک کیا ہے وہ ایسے کسی لیب ٹاپ کو یہ ڈیٹا اسی طرح دے سکتا ہے۔ یعنی ایک سے زیادہ افراد فارم ہاؤس کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ بس اس لیب ٹاپ میں میرا بنایا ہوا سافٹ ویئر انشال ہونا چاہیے۔“

”تم واقعی جینیٹس ہو۔“ اس بار میں نے دل سے کہا۔

”جھینک یو سر۔“ مانی خوش ہو گیا۔ ”کیا میں آپ کے لیے کافی بناؤں میں کافی بھی بہت اچھی بناتا ہوں۔“

”کیوں نہیں دوست نکلی اور پوچھ پوچھ۔“

مانی کافی بنانے چلا گیا۔ میں، وسیم اور سفیر اوپر آئے۔ اوپر کونٹری میں دو عدد ٹیرس تھے اور تین بڑے بیڈرومز معہ انچ ہاتھ تھے۔ لیکن مجھے کہیں بیٹنگ کے لیے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اندر سردی نہیں تھی۔ ”یہاں بیٹنگ کا سسٹم نہیں ہے؟“

”میں کونٹری سینٹرلی ہیڈ ہے۔“ سفیر نے بتایا۔ ”نیچے

ایک چھوٹا سا خانہ ہے اسی میں بٹنی لگی ہے پانی بھی اسی سے گرم ہوتا ہے۔ مانی نے آگ جلا دی ہوگی۔“

”بھی اندر سردی کا اثر خاصا کم تھا میں نے مانی کے بارے میں پوچھا۔“ یہ کہاں سے ہاتھ آیا؟“

”کسی بڑے باپ کی اولاد ہے مطلب یہ کہ باپ سرکاری انفر اور راشی ہے۔ یہ اس سے نالاں ہے۔ ایک دن کچھ لوگ اسے اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ عبد اللہ نے درمیان میں مداخلت کی اور اغوا کاروں کو بھاگنا پڑا۔ بس تب سے یہ عبد اللہ کے سر ہو گیا۔ پھر عبد اللہ کو پتا چلا کہ یہ کپیوٹر پروگرامنگ اور آئی ٹی کے شعبے کا ماہر ہے۔ سینٹرل کمانڈ وین کے لیے ہمیں ایک آدی کی ضرورت تھی اس لیے عبد اللہ نے اسے رکھ لیا۔ یہ بھی گھر سے بھاگ کر بڑا خوش ہے۔“

”گھر سے بھاگنا ہوا ہے؟“ میں چونکا۔

”ہاں درنہ اس کا باپ کسی صورت اسے ملازمت کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ یہ جس گھر میں رہتا ہے اس میں نصف درجن ملازم ہیں۔“

”اس لحاظ سے یہ زیادہ قابل قدر ہے۔“ میں نے سفیر سے کہا۔ ”اور تم اسے نمونہ کہتے ہو۔“

”آج کل ایسے لوگوں کو نمونہ ہی کہتے ہیں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”اگر اس کے باپ نے گم شدگی یا اغوا کی ایف آئی آر درج کرادی ہو تو؟“

”میں اس نے گھر سے نکلنے کے بعد اسے فون کر کے بتا دیا کہ وہ جہاں ہے اپنی مرضی سے ہے اور خوش ہے۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ میں نے وسیم کی طرف دیکھا جو ایک کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کونٹری پوری طرح فرشتہ تھی حد یہ کہ کھڑکیوں پر بیش قیمت پردے تک موجود تھے۔ دس ہزار کرائے میں تو یہ کونٹری فری تھی۔

”ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا ہے۔“ وسیم بولا۔ ”آپ دونوں کا کیا خیال ہے اب ہمیں خواتین کو بھی یہی شفٹ کر دینا چاہیے؟“

”نہیں اتنی غلٹ کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ عبد اللہ کی کونٹری میں محفوظ ہیں۔ ممکن ہے مرشد کا مقصد انہیں کونٹری سے نکالنا ہو۔“

سفیر چونک گیا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے وہ یقیناً عورتوں کو نکالنے کی فکر میں ہوگا تب ہی صرف ایک گاڑی نے ہمارا پیچھا کیا اور عبد اللہ کے آدمیوں نے آرام سے اسے ناکارہ بنا دیا۔“

”بس تو انہیں اسی جگہ رہنے دو۔ عبد اللہ کونٹری کے

مائنٹی انتظامات سخت کر دے اور ہم یہاں سے اپنا کام جاری کر سکتے ہیں۔“

”ایاز آئے تو اسے بھی یہیں بلا لیتے ہیں اور بیٹو کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو سیدھا واپس ہی آئے گا۔“

”ایاز کیوں گیا ہے اس نے کچھ بتایا ہے؟“

سفیر مسکرایا۔ ”بھائی کو ہماری صحبت نے متاثر کیا ہے۔ موصوف شادی کی فکر میں ہیں۔“

”شادی کس سے؟“

”شاہین سے اور کس سے۔“

”میں شاہین کو تو بھول گیا تھا۔“ وہ کہاں ہے اب؟“

”مجھیں نہیں معلوم، ایاز اسے اپنے گھر لے گیا تھا اور وہ اس کے ماں کے پاس ہے۔“

”ماں....؟ مجھے تو یاد ہے کہ ایاز کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”وہ اپنی خالہ کو ماں سمجھتا ہے اور ماں کہتا ہے۔ وہ بیوہ ہے اور سرگودھا میں اس کی حویلی ہے۔ جب شاہین کو کہیں نقل کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو ایاز نے پیشکش کر دی۔“

”وہ مجھے بھی لگتا تھا کہ وہ شاہین کو پسند کرتا ہے۔“

”بھائی آگ دونوں طرف ہے برابر لگی ہوئی۔“ سفیر نے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ شادی کر کے ہی آئے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں بستر پر دراز ہو گیا اور عبد اللہ کو کال ملائی۔ ”حالات کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں ابھی تک کوئی چیز معمول سے ہٹ کر سامنے نہیں آئی ہے۔“

”راستے میں گاڑی کو ہٹ کرنے کے بعد تمہارے آدمیوں نے دیکھا تھا کہ اس میں کون ہے اور پھر ان کی مدد کو کون آتا ہے؟“

”میںیں وہ کام کر کے وہاں سے نکل گئے تھے۔“

”عبد اللہ نے کسی قدر عداوت سے کہا۔“ آپ کہہ رہے ہیں تو مجھے خیال آ رہا ہے ان کی نگرانی کرنی چاہیے تھی۔“

”کوئی بات نہیں آدی ہر پہلو پر تو نظر نہیں رکھ سکتا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”مرشد کی طرف سے دوبارہ

”میںیں اس کے بعد سے کوئی کال نہیں آئی۔“

”میں فکر مند ہو گیا۔“ عبد اللہ کوئی چکر ہے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، خواتین کو اسی خفیہ جگہ رکھو اور اپنے آدمیوں کو بھی ہوشیار کر دو۔ ممکن ہے مرشد کا مقصد ہمیں کونٹری سے ہٹانا ہو۔“

عبد اللہ سمجھ گیا۔ ”وہ عورتوں کے چکر میں ہے؟“

”میرا خیال ہے یہ خواتین ہماری کمزوری ہیں اور مشکل یہ ہے کہ دور رہنے پر بھی تیار نہیں ہیں۔“

”گستاخی معاف دور رہنے پر تو حضرات بھی تیار نہیں ہیں۔“

میں نے وسیم اور سفیر کی طرف دیکھا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو بھائی، واقعی یہ کون سا دور رہنے پر تیار ہیں۔“

سفیر نے وسیم سے کہا۔ ”لے بھائی ہماری چغلیاں ہو رہی ہیں۔“

”ایاز کا نمبر ہے تمہارے پاس؟“

”جی وسیم صاحب نے جو موبائل آپ کو دیا ہے اس میں ہے۔“

”بیٹو کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بخار اتر نہیں ہے، ڈاکٹر ابھی چیک کر کے گیا ہے اس نے دوائی اور انجکشن بھی دیا ہے۔ امید ہے کل تک بخار اتر جائے گا۔“

”وہ میرے پاس آنے کی ضد کرے گا لیکن جب تک اس کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتی.... تم اسے وہیں روکے رکھو گے۔ اٹھ جائے تو میری بات کر دینا۔“

”ٹھیک ہے جنتاب۔“

میں نے موبائل رکھا تو مانی ٹرے میں کافی کے مگ اور دوسرا سامان لے آیا تھا۔ مہک بتا رہی تھی کہ یہ نہیں کیف گولڈ تھی۔ میں نے پہلا ٹھونٹ لیا اور بے ساختہ کہا۔ ”واقعی مان گیا تم کافی ماسٹر بھی ہو اگر یورپ چلے جاؤ تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔“

”آپ بلیک پیتے ہیں اگر کریم استعمال کرتے تو میں کریم سے ایسا ڈنک بن کر دیتا کہ کافی کا ذرا مل ہو جاتا۔“

”مجھے بنا کر دو۔“ سفیر نے کہا تو مانی نے صاف انکار کر دیا۔

”آپ کو تو بالکل نہیں بنا کر دوں گا آپ نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔“

”مانی بیٹے اتنا ناراض نہیں ہوتے۔“ سفیر نے اسے پچکارا۔ ”وہ تو میں تمہیں پیار سے کہتا ہوں۔“

مانی کا موڈ خوشگوار ہوا تو وہ مان گیا۔ اس نے کریم کا کون نما پات اٹھایا اور کون سے پھرتی کے ساتھ کافی پر پودے نما ڈیزائن بنا دیا۔ کریم کافی میں فوراً حل نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ ڈیزائن کچھ دیر برقرار رہا تھا۔ سب نے مانی کو حیرت سے دیکھا۔ وسیم بولا۔ ”یار تم تو آرٹسٹ بھی ہو۔“

”شکریہ جناب۔“ اس نے شرمناک کہا۔

”سننا ہے تمہاری اپنے ڈیڈی سے اسی وجہ سے نہیں بنی کہ وہ آرٹ وغیرہ کو بکواس سمجھتے ہیں؟“ سفیر نے کہا۔

مافی اُداس ہو گیا اور اس نے اپنی نگ سے ایک لمبا گھونٹ لے کر کہا۔ ”بالکل جی ان کے نزدیک دنیا میں صرف ایک آرٹ ہے اور وہ ہے دولت کمانا، وہ تو مجھے کمپیوٹر پر بھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے ان کی خواہش تھی کہ میں گریجویشن کرتے ہی سول سروس کا امتحان دوں۔ لیکن میں نے آئی ٹی کے شعبے کا انتخاب کیا اور یو ایس اے سے سافٹ ویئر انجینئر بن کر آیا۔“

میں دم بہ خود رہ گیا۔ ”تم سافٹ ویئر انجینئر بھی ہو؟“ وہ ذرا ابرامان گیا۔ ”کیوں کیا نہیں ہو سکتا؟“

”نہیں یار کیوں نہیں ہو سکتے میرا تو خیال ہے تم اس سے بھی کئی آگے کی چیز ہو لیکن میں تو تمہیں انٹرکاسٹوڈنٹ سمجھتا تھا۔“ مافی ہنسا۔ ”آپ غلط سمجھے ہیں جناب میں پورے پچیس برس کا ہوں۔ دو دن پہلے میرا برتھ ڈے تھا۔“ وہ دیکھنے میں مشکل سے اٹھارہ برس کا لگتا تھا۔ شاید اپنی نہ ہونے کے برابر جسامت اور نازک سے نقوش کی وجہ سے وہ اتنا کم عمر نظر آتا تھا۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی گزشتہ صبح سے جاگ رہا تھا اور پھر اتنا طویل سفر بھی کرنا پڑا تھا۔ کافی پی کر اعصاب سکون میں آئے تو نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ مافی برتن لے گیا تھا۔ سفیر نے محسوس کر لیا اس نے کہا۔ ”سو جا یا ر.... تو تھک گیا ہوگا۔“

”آپ کے کپڑوں کا بیک میں پہلے ہی لے آیا تھا اس الماری میں ہے۔“ وسیم نے کہا۔ وہ اور سفیر بھی چلے گئے میں نے بیک کھولا اس میں ایک موٹا سوتی پا جامہ اور جرسی کی پوری آستین کی ٹی شرٹ تھی۔ یہ ٹائٹ سوٹ تھا، میں نے پہنا اور کبل میں مگس گیا۔ لیکن نیند فوری طور پر میرے نصیب میں نہیں تھی۔ سب کے ساتھ بیٹھا تھا تو خیال نہیں آیا لیکن اکیلا ہوا تو خدشات ذہن میں سانپ بن کر سرسرا نے لگے تھے۔ مرشد کو اس ٹھکانے کا علم کیسے ہوا اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے کال کرنے کا مقصد کیا تھا؟ یقیناً اس کا مقصد پورا ہوا تھا اس لیے اس نے دوبارہ کال نہیں کی۔ چنانچہ کوئی طریقے سے چل سکتا تھا ممکن ہے وسیم، سفیر یا کوئی اور مرشد کے آدمیوں کی نظر میں آگیا ہو یا جب میں آ رہا تھا تو ہمارا تعاقب کیا گیا ہو اور مجھے بھی یہی بات قرین قیاس لگ رہی تھی۔ تب ہی مرشد نے پورے یقین سے کہا تھا کہ میں

اس کوٹھی میں ہوں اور وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ زیادہ الجھن کی بات مرشد کا مقصد تھا۔ اس نے یوں کال کر کے مجھے ہوشیار کیوں کیا؟ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا بس ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ مرشد کا مقصد مجھے اور میرے ساتھیوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ کیا چاہتا تھا؟ کیا یہ ٹھکانہ کسی طریقے سے اس کی نظروں میں آگیا تھا؟ ہم نے آتے ہوئے ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن کوئی سو فیصد تو نظر نہیں رکھ سکتا ہے۔ ممکن ہے تعاقب کرنے والے اسے ہوشیار ہوں کہ ہم ان کا پتا ہی نہیں چلا سکے ہوں۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا کہ کہیں فتح خان نے تو مرشد کو میرے اس ٹھکانے کا پتا دیا ہو۔ فتح خان کے بارے میں مجھے شک تھا کہ وہ عبداللہ والی کوٹھی سے آگاہ ہے لیکن اس نے بھی اس کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اب وہ چوٹ کھائے ستاب کی طرح مشغول تھا۔ وادی میں اس کی ناکا کی کے اسباب میں بھی شامل تھا اور اب وہ مجھ سے اس ناکا کی کا بدلہ لینا چاہتا ہوگا۔ سویرا اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اس لیے اس نے یہ چال چلی اور مرشد کو عبداللہ والی کوٹھی کے بارے میں بتا دیا۔ مرشد کے آدمیوں نے کوٹھی کی نگرانی شروع کر دی ہوگی۔ اس لیے جیسے ہی میں وہاں پہنچا مرشد کو خبر ہوگئی۔

یہ مفروضہ دل کو لگنے والا تھا لیکن یقینی بات نہیں تھی۔ دوسرے مرشد کوٹھی اور وہاں میرے وجود سے واقف ہو گیا تھا۔ اس لیے زیادہ غور کرنا سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پینے والی بات ہو سکتی تھی۔ اصل بات یہی تھا کہ مرشد نے کال کیوں کی؟ ان سوالوں اور سوچوں نے میری نیند آڑا دی تھی۔ پھر مجھے ایک خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اگر سفیر یا وسیم میں سے کوئی جاگ رہا ہے تو اس سے تبادلہ خیال کر لوں میں اٹھ کر باہر آیا۔ سفیر بے خبر سو رہا تھا لیکن وسیم اس سردی کے عالم میں کوٹھی کی چھت پر گیا ہوا تھا۔ وہ واپس آیا تو میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا اور اسے اپنے خیالات سے آگاہ کیا، اس نے سر ہلایا۔ ”آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے کہ یہ فتح خان کی شرارت ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مرشد نے وہاں کال کیوں کی؟ وہ خاموش رہ کر کہیں زیادہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔“

”یہی تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اسے کال کر کے دیکھتے ہیں۔“ ”موبائل سے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”نہیں باہر چلتے ہیں اسلام آباد میں کئی پی سی اوساری رات کھلے رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مافی سے نہ معلوم کریں اس نے یہاں انٹرنیٹ کا سیٹ اپ بھی کیا ہے۔ اس کے پاس ڈائی سیٹلائٹ انٹرنیٹ کاسٹم ہے چھوٹا سا انٹینا ہے جو چھت پر لگا ہے۔ اسے وین کی چھت پر بھی لگایا جاسکتا ہے اس کے ماہانہ بل کی ادائیگی عبداللہ نے لے لی ہے۔“

”ٹھیک ہے آؤ پہلے اس سے معلوم کرتے ہیں ویسے انٹرنیٹ سے کالز ہوتی ہیں۔“ مافی سے پوچھا تو اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ ”سر می اتنا سا کام بھی نہ کر سکوں تو پھر میرا فائدہ ہی کیا ہے؟“

”یعنی ہم انٹرنیٹ کی مدد سے کال کر سکتے ہیں اور کوئی اس کال کو ٹریس نہیں کر سکے گا۔“ ”کسی کا باپ بھی نہیں کر سکے گا بیشک حکومت بھی کوشش کر لے۔“ مافی نے دعویٰ کیا۔ ”آپ نمبر بتائیں۔“ میں نے اسے مرشد ہاؤس کے فکسڈ فون نمبر بتائے وہ مجھے زبانی یاد تھے۔ مافی نے انٹرنیٹ پر کچھ دیر کام کیا اور پھر ایک بلوٹوتھ ایئر فون مانک میری طرف بڑھایا یہ کمپیوٹر سے بلوٹوتھ کی مدد سے منسلک تھا۔ جب میں نے اسے کان پر سیٹ کر لیا تو مافی نے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور مجھے تیل ہانے کی آواز آنے لگی۔ فوراً ہی کسی نے کال ریسیو کی اور مجھے اسی تعلق لہجے والے شخص کی آواز آئی۔ ”ہیلو کس سے بات کرنی ہے؟“

”مجھے مرشد سے بات کرنی ہے۔“ ”آپ کون بات کر رہے ہیں؟“ ”تمہیں نہیں معلوم میں اس کا والد نمبر پانچ جنم سے بات کر رہا ہوں۔“ ”جناب یہ طریقہ گفتگو مناسب نہیں ہے۔“ آدمی نے گھبرا کر کہا۔

”واقعی مرشد کے لیے اتنا شریفانہ طریقہ گفتگو مناسب نہیں ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”بہر حال اصل گفتگو مجھے اسی سے کرنی ہے۔ کال اسے ٹرانسفر کرو اور کال کا سراغ لگانے میں بے کار وقت ضائع مت کرنا۔ اس کا پتا نہیں چلے گا کہ میں کہاں سے کال کر رہا ہوں؟“

”ایک منٹ ہولڈ کریں۔“ اس نے کہا اور غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مرشد کی آواز آئی۔ ”شہباز بالآخر تم نے مان لیا۔“

”کیا مان لیا؟“ میں نے انجان بن کر کہا۔

”اس کوٹھی میں تم تھے۔“

”مرشد اگر اس کوٹھی میں تھا تو اب نہیں ہوں۔ وہ صرف ایک ٹھکانہ ہے اور اب تمہیں وہاں میں یا میرا کوئی ساتھی نہیں ملے گا۔“

”مجھے معلوم ہے وہ راجا عمر دراز کی کوٹھی ہے اور وہاں اس کے ملازمین ہوتے ہیں۔“

”مجھے حیرت ہے تم نے وہاں کال کی اور مجھ سے بات کرنا چاہی۔ تمہارا یہ رویہ مجھے ہضم نہیں ہو رہا ہے۔“

”شہباز میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن فون پر نہیں آئے سائے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ اس میں میرے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔“ میں نے انکار کر دیا۔ ”وہ تم اس کال کو محفوظ سمجھو۔“

”تمہاری طرف سے تو محفوظ ہے لیکن....“ وہ کہتے کہتے رک گیا مجھے حیرت ہوئی اس وقت اس کا لہجہ بدل ہو رہا تھا اور اس میں کہیں بھی کلف یا کراہٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”تم اپنا کوئی نمبر دے دو میں تم سے رابطہ کروں گا۔“

ایسا لگ رہا تھا جیسے مرشد کو اپنی فون لائنوں پر اعتبار نہ رہا ہو اور وہ مجھ سے کسی محفوظ نمبر سے بات کرنا چاہ رہا ہو۔ لیکن یہ اس کی طرف سے دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ اس طرح وہ میرا سراغ لگانا چاہ رہا ہو۔ میں نے کہا۔ ”اس کے بجائے تم مجھے اپنا کوئی نمبر دے دو میں اس پر کال کر لیتا ہوں۔“ اس نے ایک موبائل نمبر دیا۔ ”دس منٹ بعد اس پر کال کر لیتا۔“

میں نے نمبر ایک کاغذ پر لکھا اور مافی کو کال منقطع کرنے کا اشارہ کیا اس نے کال کاٹ دی تو میں نے موبائل نمبر اس کی طرف بڑھایا۔ ”دس منٹ بعد اس پر کال کرنی ہے۔“

”موبائل ہے۔“ مافی نے کہا۔ ”لیکن ہو جائے گی بس کچھ آواز کا مسئلہ ہوگا اگر آواز کچھ دیر کے لیے غائب ہو جائے تو پریشان مت ہوئے گا اور ذرا رک رک کر بات کرے گا۔“

”رک رک کر کیوں؟“ وسیم نے پوچھا۔ ”یہ ڈیجیٹل سسٹم ہوتا ہے آواز پکٹ کی صورت میں سفر کرتی ہے اگر چیز بولیس کے تو زیادہ پکٹ نہیں گے اور رفتار کم ہو جائے گی۔ آواز کٹنے لگے گی۔ لیکن آہستہ بولیں تو آواز نہیں کٹے گی۔“

مافی نے وضاحت کی اور اپنے کام میں لگ گیا اور میں نے وسیم کو مرشد کی گفتگو سنائی کیونکہ میری بات تو وہ سن رہا

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels, Imran series, Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or
send message at
0336-5557121

تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ مرشد یا تو کسی چکر میں ہے یا پھر وہ خود کسی چکر میں آ گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”شہباز صاحب دونوں بھائیوں کی علیحدگی اور نادر کا مرشد سے دور رہنا ثابت کرتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔“

”لیکن فاضلی دونوں کے لیے کام کر رہا ہے اگر کوئی چکر ہوتا تو وہ کسی ایک بھائی کے ساتھ ہوتا۔“ میں نے سوچ کر کہا۔

”ممکن ہے مرشد نے اسے نادر کے ساتھ لگا رکھا ہو کیونکہ آدمی وہ مرشد کا ہی ہے۔“

”ہاں مرشد ایسا ہی آدمی ہے اپنے بھائی پر بھی اعتبار نہ کرنے والا۔“ وسیم نے سوچ کر کہا۔

”کیا بات کر رہے ہو کیسا بھائی اور کہاں کا بڑا بھائی؟ یہ سب بھیڑیے ہیں جن کا کام ہی کمزوروں کا شکار کرنا ہے۔ ان میں رشتوں کا کوئی پاس نہیں ہے، اگر کوئی بھیڑیا کمزور پڑ جائے تو دوسرے بھیڑیے اسے پھاڑ کھاتے ہیں یہی حال ان بھائیوں کا بھی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ مانی نے لقمہ دیا۔ ”یہ بہت ہی گھٹیا قسم کے اور ذلیل لوگ ہیں۔“

”تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تو نہیں لیکن ڈیڑی ان کے بارے میں بات کرتے رہتے ہیں۔ وہ وزارت داخلہ میں ہیں تو مرشد جیسے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس لیے وہ ان کے بارے میں جانتے ہیں۔“

میں نے گھڑی دیکھی۔ ”دس منٹ ہونے والے ہیں۔“

”میں کال ملا رہا ہوں۔“ مانی نے کہا اور کال ملانے لگا۔ کچھ دیر میں نیل جانے لگی اور مرشد نے کال ریسیو کی اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”یہ تم کس نمبر سے کال کر رہے ہو؟“

”کیوں کیا تمہارے موبائل پر نمبر نہیں آ رہا ہے؟“

”نہیں صرف ان نون لکھا ہے۔“

”میری کالز آئندہ ایسے ہی نمبروں سے آئیں گی اس لیے تم کام کی بات کرو۔“

”شہباز کام کی بات یہ ہے کہ میں اب دشمنی کا یہ چکر ختم کرنا چاہتا ہوں۔“ مرشد نے کہا۔

”مرشد تم اس قسم کی باتیں پہلے بھی بار بار کر چکے ہو

لیکن افسوس کہ تمہاری باتیں صرف باتیں ہوتی ہیں اور عملی طور پر تم مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس بار معاملہ مختلف ہے۔“ مرشد نے برائے نام بغیر اعتراف کیا۔ ”تم اچھی طرح جاننے ہو دشمنی کا یہ چکر کس طرح شروع ہوا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ چکر نادر نے شروع کیا؟“

”بالکل ٹھیک یہ سب اس کا کیا دھرا تھا، مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کے ساتھ دشمنی میں برابر کا شریک رہا اور تمہارے ساتھ جو ہوا اس میں میرا حصہ بھی ہے لیکن اب میں اس چکر سے نکلتا چاہتا ہوں۔“

”کیا اس لیے کہ اب نادر سے تمہارے برادرانہ تعلقات نہیں رہے۔۔۔؟“ میرا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔

”تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔“ اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ”لیکن اب میں اس چکر سے نکلتا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں نے مان لیا کہ تم نکلتا چاہتے ہو لیکن نادر تو مجھے اور میرے ساتھیوں کے بدستور درپے آزاد رہے گا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”جب تک وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا یہ دشمنی کس طرح ختم ہو سکتی ہے؟“

”تم چاہو تو میں اس معاملے میں بھی تم سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں ورنہ میری طرف سے یہ یقین دہانی ہے کہ میں یا میرا کوئی آدمی اب تمہارے یا تمہارے ساتھیوں کے پیچھے نہیں آئے گا۔“

میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔ ”کس قسم کا تعاون کیا تم نادر کو اس دشمنی سے باز رکھ سکتے ہو جبکہ اس سے تمہارے تعلقات بھی نارمل نہیں رہے؟“

”نادر پاگل ہو گیا۔“ مرشد نے آہستہ کہا۔ ”تم جانے ہو جب کتنا پاگل ہو جائے تو اس کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے؟“

میں ہنسا۔ ”تم نے برادر خورد کو فارسی والی مثال دے دی۔ بہر حال یہ تمہارا فیملی میٹر ہے۔ اگر تمہارا اشارہ اس طرف ہے کہ نادر کے ساتھ وہی کیا جائے جو پاگل ہو جانے والے کتے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تو میں تم سے متفق ہوں۔“

سوال یہ ہے کہ میں اس سلسلے میں تم سے کیا تعاون کر سکتا ہوں؟“

”شہباز میں جانتا ہوں تم نے نادر کی رہائش کا پتا چاہا ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے آسانی سے ختم کر سکتے ہو۔“

”مرشد تم نے میرے بارے میں نہایت غلط اندازہ ہے۔“ میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”جہاں تک کسی کو آسانی سے کرنے کا تعلق ہے اگر میں ایسا مزاج رکھتا تو دشمنی کا یہ

بہت پہلے ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ تم میں سے کوئی دشمنی نہانے کے لیے زندہ نہ ہوتا لیکن میں قاتل نہیں ہوں۔ میں صرف اپنے بچاؤ کے لیے کسی پر ہاتھ اٹھا سکتا ہوں۔

”اس صورت میں نادر کا مسئلہ رہے گا۔“

”تو یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تم خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے؟۔۔۔۔۔ نہ تو تمہیں وسائل کی کمی ہے اور نہ حکم کی تعمیل کرنے والے بندوں کی۔“

”شہباز میرے کچھ خاندانی مسائل ہیں جن کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔“ وہ بولا۔

”مجھے ان مسائل کا بھی علم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے مرشد مجھے حیرت ہے کہ آج تم اتنی کھل کر بات کر رہے ہو۔“

”کیونکہ میں پوری نیک نیتی سے بات کر رہا ہوں۔“

”اور میں پوری نیک نیتی سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہاری بات پر بالکل یقین نہیں آ رہا۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”میں نے اس بار بات کرنے سے پہلے اپنی نیک نیتی کا عملی ثبوت دے دیا ہے۔“ اس نے کہا۔

میں اس کا اشارہ سمجھ رہا تھا لیکن انجان بنا رہا۔

”وہ کیسے؟“

”اگر میری نیت خراب ہوتی تو میں سرے سے راجا عمر دراز کی کوٹھی پر کال نہ کرتا۔ میں اپنے آدمی بھیجتا اور وہ اس کوٹھی کو ہوں سے اڑا دیتے۔“

”یہ اتنا آسان تو نہ ہوتا لیکن میں تمہاری بات تسلیم کرتا ہوں کہ تم چاہتے تو ایسا بھی کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود ابھی میرا ذہن اس بات کو غم نہیں کر سکا ہے۔“

”یہ تو آغاز ہے۔“ اس نے کہا۔ ”جلد تمہیں یقین بھی آ جائے گا۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے بس میں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اب میری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اگر تم چاہو تو اپنی نیک نیتی کا ایک ثبوت اور دے سکتے ہو؟“

”وہ کیا؟“

”یہ بتا کر کہ تمہیں راجا عمر دراز کی اس کوٹھی کا کس طرح پتا چلا؟“

”فتح خان سے۔“ اس نے بلا جھجک کہا۔ ”اسی نے بتایا کہ تم ابھی اس کوٹھی میں ہو۔“

”فتح خان۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”یہ شخص بلا وجہ میرے پیچھے پڑ گیا حالانکہ میں نے اسے کوئی نقصان نہیں

پہنچایا اور نہ ہی کبھی اس کا راستہ کاٹنے کی کوشش کی۔ مرشد علی کیا تم جانتے ہو کہ پچھلے کچھ عرصے میں تمہیں ہونے والا مالی نقصان کس نے پہنچایا ہے؟“

”میں جانتا ہوں یہ فتح خان کا کام ہے۔“ وہ بولا۔

”جس دن بھی وہ میرے قابو میں آ گیا اسے ان نقصانات کا حساب دینا ہوگا۔“

اس نے بات کھل کرتے ہی فون بند کر دیا۔ وسیم اور مانی خاموشی سے میری بات سن رہے تھے۔ میں نے وسیم کو بتایا کہ مرشد کیا چاہتا ہے؟ ایک طرف گفتگو سے بھی اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا لیکن مرشد کی بہت ساری باتیں اس کے علم میں نہیں آئی تھیں۔ میری بات سن کر اس نے کہا۔ ”مرشد کی یہ بات دل کو لگ رہی ہے کہ اس نے کوٹھی فون کر کے اپنی نیک نیتی کا اولین ثبوت دیا ہے۔“

”اس کے باوجود میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ اس وقت وہ کسی وجہ سے مجبور ہے۔“

”وجہ بالکل سامنے کی بات ہے وہ چالاکی سے کام لے کر نادر کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے کیونکہ وہ اس کی راہ کی رکاوٹ بن گیا ہے۔“

”نادر اتنی بڑی رکاوٹ نہیں بنا ہے بلکہ مرشد کی مونوپولی نے باقی خاندان والوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کی آمریت کا تختہ الٹ دیں۔ یہ ایک فیملی بزنس ہے۔ تم چاہو تو اسے فیملی مافیا بھی سمجھ سکتے ہو جس میں ایک فرنٹ مین سامنے رہ کر پورا بزنس چلاتا ہے وہ خطرات مول لیتا ہے۔ اس لیے اصل آمدنی کا حقدار وہ ہوتا ہے باقی فیملی ممبر ایک طرح سے حصے دار ہوتے ہیں اور انہیں سال کے سال آمدنی میں حصہ ملتا ہے۔ یقیناً مرشد کے خاندان میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا لیکن اکثر مافیائوں کے سربراہ بے ایمان ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ وہی ہیں اور جب وہی سب کچھ ہیں تو کسی اور کو حصہ کیوں دیں؟ یہاں سے خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔ گدی نشینوں کے درمیان آپس میں لڑائی کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

وسیم غور سے میری بات سن رہا تھا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ مرشد کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی اتنے طاقتور ہیں کہ مرشد ان کے سامنے مجبور ہو رہا ہے ورنہ وہ انہیں کب کا ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔“

”بالکل، میرا یہی مطلب ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”اب خاندان کے دوسرے لوگ اس چکر میں ہیں کہ مرشد کی جگہ نادر کو گدی پر بٹھا دیں۔ وہ مکمل طور پر مخدور ہو چکا ہے اور اس طرح وہ خاندان کے لوگوں کے قابو میں رہے

گا۔ مرشد کی طرح بے قابو نہیں ہو جائے گا۔ مرشد اس خطرے کو بھانپ چکا ہے اور فی الحال اس کا سدباب اس طرح کر رہا ہے کہ نادر کا کاندار میان سے نکال دے۔“

”اس کے لیے بندوق وہ ہمارے کندھے پر رکھ کر ہلانا چاہتا ہے؟“

”یہی اصل نقطہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نادر ہماری وجہ سے اس حال کو پہنچا ہے اور وہ ہمارا شدید ترین دشمن ہے اور لازمی بات ہے ہم بھی دشمنی میں کچھ کم جذبات نہیں رکھتے اس لیے اگر نادر مارا جاتا ہے تو نام ہمارا آئے گا۔“

وسیم نے سوچ کر کہا۔ ”تب مرشد اسے مار کر الزام ہمارے سر کیوں نہیں ڈال رہا ہے؟“

”یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی ہے ممکن ہے مرشد ایسا کرتے ہوئے ذرا رہا ہو کہ بات خاندان والوں پر مکمل سکتی ہے یا اس کام کے لیے اس کے پاس قابل اعتماد بندے نہ ہوں۔“

”بندے تو بہت ہوں گے لیکن مرشد خود کسی پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔“ وسیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”شہباز صاحب نہ جانے کیوں مجھے اس معاملے میں گڑبگ محسوس ہو رہی ہے۔“

”مرشد دھوکے باز آدمی ہے، اس سے کسی قسم کے ظلم کی توقع بیکار ہے۔ اگر اس نے کوٹھی بردھاوا نہیں بولا تو اس کے پس پشت یقیناً کوئی بڑی چال ہوگی۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”پہلے غینہ نہیں آ رہی تھی لیکن مرشد سے بات کر کے مجھے غینہ آنے لگی ہے۔“

وسیم مجھے سمجھنے لگا تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ ”یعنی آپ کے خیال میں اب خواتین کو اتنا خطرہ لاحق نہیں رہا ہے۔“

”ہاں ورنہ اس سے پہلے میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ مرشد اصل میں ان کے چکر میں ہے اور ہمیں وہاں سے نکال کر خود دھاوا کرنا چاہتا ہے۔“

”لیکن ہمیں اس معاملے میں بالکل بھی بے فکر نہیں ہانا چاہیے۔“

”لازمی بات ہے ہمارا مقابلہ مرشد جیسے مکار دشمن ہے۔ اگر اسے معلوم ہوگا کہ کوٹھی میں مورتمیں بھی ہیں تو ہمیں مجبور کرنے کے لیے وہ انہیں بھی استعمال کر سکتا ہے۔“

”بالکل کر سکتا ہے۔“ وسیم نے زور دے کر کہا۔ ”جب وہ فتح خان کر سکتا ہے تو مرشد فتح خان سے کہیں زیادہ مکار اور کینہہ دشمن ہے۔“

”عبداللہ نے کوٹھی میں کوئی خفیہ جگہ بنا رکھی ہے جس صرف وہی واقف ہے۔ اس نے ان تینوں کو فی الحال وہیں

رکھا ہوا ہے۔ اگر باہر سے کوئی دشمن کسی طرح کوٹھی میں داخل بھی ہو جائے تو وہ ان کو آسانی سے تلاش نہیں کر سکتا۔“

”اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ انہیں جلد از جلد وہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔“

میں نے وسیم سے اتفاق کیا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن پہلے اس کے لیے یہ یقین کرنا ہوگا کہ مرشد کے آدمی کوٹھی کے آس پاس موجود نہیں ہیں۔“

”میں سمجھتا ہوں جناب۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”اب آپ آرام کریں کل میں آپ کو دین دکھاؤں گا۔“

مجھے اب غینہ آ رہی تھی لیکن سونے سے پہلے میں ایک کام کرنا چاہتا تھا میں نے مانی سے پوچھا۔ ”یہاں کوئی اور کمپیوٹر ہے۔ مجھے انٹرنیٹ پر کام ہے۔“

”ایک لپ ٹاپ اور ہے۔“ اس نے کہا اور ایک طرف رکھی چھوٹے سائز کی نوٹ بک اٹھا لیا۔ ”اس میں والی فائی بھی ہے اس گھر میں بلکہ گھر سے باہر بھی سو میٹر کے دائرے میں آپ انٹرنیٹ استعمال کر سکتے ہیں۔“

”شکریہ۔“ میں نے اس سے نوٹ بک لے لی اور اوپر کمرے میں آ گیا۔ میں نے اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولا اور وہ کھل گیا اس کا مطلب تھا کہ فتح خان نے اس کے پاس ورڈ میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ شاید اس نے ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ وہ اپنا کام تو نکال چکا تھا۔ میں نے سب سے پہلے پاس ورڈ تبدیل کیا اور پھر ایمین کو میل کی اس سے خبریت اور اس مسئلے کے حوالے سے پروگرامس پوچھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اسی ای میل کمپنی کے سیکرٹری ای ای کی کے ساتھ مل لاگ ان ہوں گا وہ مجھ سے بات کرے گی یا اس کا کوئی فون نمبر ہے تو وہ مجھے ای میل کرے گا۔ میں اس سے رابطہ کر لوں گا۔ یہ کام کر کے میں نے نوٹ بک بند کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس بار مجھے پندرہ منٹ بعد ہی نیند آ گئی تھی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو ایک طرف کھڑکی کے پٹے پر دے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ میں اٹھ کر دوش روم میں آیا اور وہاں سے فارغ ہو کر سب سے پہلے عبداللہ کو کال کی۔

”کیا حال ہیں سب ٹھیک ہے؟“

”جی جناب! ابوری تھک از آل راست۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ سنا میں؟“

”میں ٹھیک ہوں اور یہ تم نے زبردست چیز تلاش کی ہے۔“

”مانی۔“ وہ ہنسا۔ ”آپ اسے چیز کہہ رہے ہیں میرا مان جائے گا۔ ویسے ہے بہت کام کا لڑکا۔ آئی ٹی اور کمپیوٹر

سے متعلق کوئی مسئلہ ہو چند منٹ میں حل کر دیتا ہے۔ اس نے کوٹھی کا کمپیوٹر انڈیکسنگ سسٹم بھی آپ گریڈ اور استعمال میں بہت آسان کر دیا۔ اب ہم اس کی مدد سے ٹائٹ ویڈیو سنرز بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“

”یہاں بھی اس نے کمپروں اور مائیک کی مدد سے بہترین سیکورٹی سسٹم بنا رکھا ہے، ایک آدمی آس پاس ہر جگہ نظر رکھ سکتا ہے۔ کل رات میری مرشد سے بات ہوئی ہے۔“

”مرشد سے۔“ عبداللہ نے فکر مندی سے کہا۔ ”کیا اس کی کال آئی تھی؟“

”نہیں میں نے کی تھی۔ مانی نے انٹرنیٹ کی مدد سے کال ملائی تھی جس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔“

”کیا بات ہوئی اس سے؟“

”مرشد کا رویہ بدلا ہوا ہے اور وہ صلح کی بات کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے کوٹھی پر کال کی اور اسے وہاں کا پتا فتح خان نے بتایا اس خبیث نے یہ بھی بتا دیا کہ میں بھی وہیں ہوں۔“

”صلح کی وجہ؟“

”مرشد اور نادر میں کھٹ پٹ ہو گئی ہے۔ گدی نشینی کی خاندانی سیاست کا معاملہ ہے۔ خاندان والے مرشد سے بیزار ہیں اور اس کا تختہ الٹ کر نادر کو گدی پر بٹھانا چاہتے ہیں۔“

”اور مرشد کیا چاہتا ہے؟“

”وہ برے سے نادر کا پتا ہی صاف کرنا چاہتا ہے، اس نے کہا ہے وہ اب اس دشمنی سے ہاتھ اٹھا رہا ہے۔ وہ یا اس کا کوئی آدمی اب ہمارے خلاف کسی کارروائی میں شریک نہیں ہوگا۔“

”میں اس پر پہلے ہی کام کر رہا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”ممکن ہے ایک دو دن میں یہ کام کر بھی لوں۔ ہاں ایک بات کا ذکر کرنا تو بھول گیا۔ کل رات انجینیئر سے ایک کال آئی۔ بولنے والی عورت تھی اور اس نے ایک موبائل نمبر دے کر کہا کہ آپ اس سے رابطہ کریں۔“

”اس نے اپنا نام بتایا، کال تم نے ریسیو کی تھی؟“

”نہیں مزید تھا، رات میں اس کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ عورت نے کال کرتے ہی پہلے نمبر لکھنے کو کہا اور جب نمبر لے کر لکھ لیا تو اس نے صرف اتنا کہہ کر کال کاٹ دی۔ شہا سے کہنا مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کرے۔“

”نمبر بتاؤ۔“

عبداللہ نے نمبر بتایا جو میں نے ذہن نشین کر لیا اور پھر نیچے آیا۔ سفیر اور وسیم کچن میں موجود تھے۔ وسیم انڈے پھینٹ رہا تھا اور سفیر پراٹھے بنا رہا تھا۔ میں چھوٹی سی میز پر آ بیٹھا۔ ”ماشا اللہ کیا سکھڑ پن ہے لگتا ہے، میری غیر موجودگی میں خواتین نے تم دونوں کو خاص اثرینڈ کیا ہے۔“

”یہ ہمیں پہلے سے آتا ہے۔“ سفیر نے جواب دیا۔ ”یہ جو شادی سے پہلے کڑھائی اور بروسٹ بنانا رہا۔ کیا اس کا کریڈٹ سویرا کو جائے گا؟“

”وہ الگ بات ہے لیکن اتنی مہارت سے گول پراٹھے بنانا اور یوں انڈا پھیلا بغیر ٹریننگ کے نہیں آتا۔“

”اچھا یار جو تو سمجھتا رہے۔“ سفیر بتاتا گیا۔ ”خواتین والے سارے کام ہم ہی کریں گے۔“

”بس ایک کام مت کرنا اور نہ ساری دنیا میں شہرہ آ جائے گا۔“ میں ہنساتا سفیر نہیں سمجھا لیکن وسیم سمجھ گیا اور ”نے فہمہ مارا تھا۔ سفیر ذرا دیر سے سمجھا اور پھر اس نے جواب جاہلاں با شد غموشی مناسب سمجھا۔ ذرا دیر میں ناشتا لگ گیا تو مانی کو اطلاع ملی تو وہ دوڑا آیا اور آتے ہی شکوہ کیا۔

”یہ اچھی بات نہیں ہے جناب اگر میں ملازم ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے بچا کھلا یا جائے۔“

”بچا کھلا۔“ سفیر دم بہ خود رہ گیا۔ ”اوہ بھائی ابھی ہم میں سے کسی نے نوالہ نہیں توڑا ہے۔“

مانی نے سب سے پہلے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ ”مما سب سے آخر میں بلائے جانے کو بچا کھلا ہی سمجھتا ہوں۔“

میں نے سختی سانس لی۔ ”بر خوردار ہر معاملے جینٹلمن ہے۔“

دیر مناسب نہیں تھی کیونکہ پراٹھے اور انڈے بڑی گرمی سے معدوں میں منتقل ہو رہے تھے اور کچھ دیر بعد میز پر کچھ

رہ جاتا۔ سفیر کتنا ہی گھڑسی لیکن وہ خواتین کی طرح کھانے کی لالچ دہلائی نہیں دے سکتا۔ ناشتے کا صفایا کر کے میں اور وسیم مائے کے گنگ تھامے باہر پورچ میں آئے۔ جہاں کماٹھ وین گزرتی تھی۔ یہ فل سائز وین تھی اور پیچھے سے اس کا کیمین خاصا بڑا تھا۔ وسیم نے ریسیوٹ سے اس کا دروازہ ان لاک کیا اور ہم اندر آئے۔ اندر سے وین بالکل اسی طرح کمپیوٹر انڈیکسنگ آلات اور اسکرینوں سے بھٹی جیسی کہ ہم فلموں میں دیکھتے ہیں۔ اس میں ایک طرف بڑی ایل سی ڈی اسکرین تھی اور دوسری طرف دو بھونکی اسکرینیں تھیں۔ کئی کی بورڈز تھے اور دیوار پر ہی کئی طرح کے جشٹن باکس نظر آ رہے تھے۔

”ان آلات کی مدد سے وین کے آس پاس کئی سو گز کی دوری تک نظر رکھی جاسکتی ہے۔ اس کا اپنا کمپیوٹیشن سسٹم ہے جو مخصوص آلات کی مدد سے استعمال کیا جاسکتا ہے اور اسے ہڈنا مشکل ہے۔ اس کا دائرہ تین کلومیٹر تک ہے اس میں آواز اور تصویر دونوں کی ترسیل شامل ہے۔“ وسیم نے ایک مہوٹا سا آلہ اٹھا کر دکھایا۔ یہ بہ ظاہر سر پر پہننے والی فلیش لائٹ کی طرح تھا۔ ”اس میں ویڈیو کیمرہ ہے، مائیک ہے اور ازون ہے۔ کیمرے میں ٹائٹ ویڈیو کا آپشن بھی ہے۔“

”یہ تو بہت کام کی چیز ہے۔“ میں نے تعریف کی۔

وسیم نے کمپیوٹر آن کیا۔ ”اس میں چار پروسیسرز والا ہڈ ترین مٹی کمپیوٹر نصب ہے جو اس سارے نظام کو کنٹرول کرتا ہے۔ وین میں جتنے سینرز اور آلات لگے ہیں وہ سب اس سے منسلک ہیں جیسے وین کے اوپر ایک طاقتور دوربین لگی ہے۔“ وسیم نے کہا اور ایک کی بورڈ پر چند بٹن دبائے فوراً وین کی چھت سے ہلکی سی آواز آئی اور بڑی اسکرین پر باہر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ ”یہ دوربین چھت سے بھی کوئی دو میٹر اوپر چلی جاتی ہے جس سے دور کی چیز بھی دیکھی جاسکتی ہے۔“

میں اسکرین پر باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ فارم ہاؤس کے گیٹ کے اوپر سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر ہم نے منظر کو زوم کیا اور یہ اتنا واضح ہو گیا کہ روڈ سے گزرتی گاڑیوں میں موجود افراد کے چہرے بھی صاف نظر آنے لگے۔

”جیکہ وہ یہاں سے کم سے کم ایک فرلانگ دور تھے۔ اور میں کی کارکردگی واقعی بہترین تھی۔ وسیم نے دوربین اندر کی اور پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کمپیوٹر میں اس آلے ملائے کا نہایت تفصیلی نقشہ ہے۔ اگر اس وین کو کہیں

لے جائیں تو اس علاقے کا مکمل نقشہ صرف ایک منٹ میں انٹرنیٹ سے مل جائے گا۔ اس نقشے کی مدد سے کہیں بھی ہمارا ہمت آسان ہوگا۔“

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک ہلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین کیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی اگر اس کے باہر گیس یا دھواں اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے سامان کہاں سے لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر سسٹم ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئر کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔“

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنالے جس میں خواتین کو نہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

وسیم چوٹکا۔ ”کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں چلی رہا ہے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال مزید ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر دینا مودے کر کال بند کر دی۔“

”شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو یا اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خیال میں ہمارے پاس اس کی تصاویر کے کچھ پرنٹ ہیں۔“

”ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”تب آؤ ذرا اس سے بات ہو جائے۔ لیکن ضروری نہیں ہے وہ شہلا ہو۔“ میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی نمبر مونا کا تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سویرا تھی۔

”شہباز کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام دعا کے بعد

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک ہلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین کیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی اگر اس کے باہر گیس یا دھواں اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے سامان کہاں سے لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر سسٹم ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئر کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔“

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنالے جس میں خواتین کو نہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

وسیم چوٹکا۔ ”کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں چلی رہا ہے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال مزید ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر دینا مودے کر کال بند کر دی۔“

”شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو یا اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خیال میں ہمارے پاس اس کی تصاویر کے کچھ پرنٹ ہیں۔“

”ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”تب آؤ ذرا اس سے بات ہو جائے۔ لیکن ضروری نہیں ہے وہ شہلا ہو۔“ میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی نمبر مونا کا تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سویرا تھی۔

”شہباز کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام دعا کے بعد

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک ہلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین کیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی اگر اس کے باہر گیس یا دھواں اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے سامان کہاں سے لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر سسٹم ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئر کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔“

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنالے جس میں خواتین کو نہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

وسیم چوٹکا۔ ”کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں چلی رہا ہے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال مزید ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر دینا مودے کر کال بند کر دی۔“

”شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو یا اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خیال میں ہمارے پاس اس کی تصاویر کے کچھ پرنٹ ہیں۔“

”ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”تب آؤ ذرا اس سے بات ہو جائے۔ لیکن ضروری نہیں ہے وہ شہلا ہو۔“ میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی نمبر مونا کا تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سویرا تھی۔

”شہباز کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام دعا کے بعد

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک ہلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین کیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی اگر اس کے باہر گیس یا دھواں اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے سامان کہاں سے لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر سسٹم ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئر کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔“

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنالے جس میں خواتین کو نہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

وسیم چوٹکا۔ ”کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں چلی رہا ہے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال مزید ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر دینا مودے کر کال بند کر دی۔“

”شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو یا اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خیال میں ہمارے پاس اس کی تصاویر کے کچھ پرنٹ ہیں۔“

”ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”تب آؤ ذرا اس سے بات ہو جائے۔ لیکن ضروری نہیں ہے وہ شہلا ہو۔“ میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی نمبر مونا کا تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سویرا تھی۔

”شہباز کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام دعا کے بعد

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک ہلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین کیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی اگر اس کے باہر گیس یا دھواں اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے سامان کہاں سے لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر سسٹم ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئر کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔“

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنالے جس میں خواتین کو نہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

وسیم چوٹکا۔ ”کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں چلی رہا ہے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال مزید ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر دینا مودے کر کال بند کر دی۔“

”شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو یا اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خیال میں ہمارے پاس اس کی تصاویر کے کچھ پرنٹ ہیں۔“

”ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”تب آؤ ذرا اس سے بات ہو جائے۔ لیکن ضروری نہیں ہے وہ شہلا ہو۔“ میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی نمبر مونا کا تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سویرا تھی۔

”شہباز کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام دعا کے بعد

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک ہلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین کیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی اگر اس کے باہر گیس یا دھواں اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے سامان کہاں سے لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر سسٹم ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئر کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔“

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنالے جس میں خواتین کو نہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

وسیم چوٹکا۔ ”کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں چلی رہا ہے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال مزید ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر دینا مودے کر کال بند کر دی۔“

”شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو یا اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خیال میں ہمارے پاس اس کی تصاویر کے کچھ پرنٹ ہیں۔“

”ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”تب آؤ ذرا اس سے بات ہو جائے۔ لیکن ضروری نہیں ہے وہ شہلا ہو۔“ میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی نمبر مونا کا تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سویرا تھی۔

”شہباز کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام دعا کے بعد

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک ہلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین کیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی اگر اس کے باہر گیس یا دھواں اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے سامان کہاں سے لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر سسٹم ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئر کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔“

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنالے جس میں خواتین کو نہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

وسیم چوٹکا۔ ”کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں چلی رہا ہے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال مزید ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر دینا مودے کر کال بند کر دی۔“

”شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو یا اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خیال میں ہمارے پاس اس کی تصاویر کے کچھ پرنٹ ہیں۔“

”ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”تب آؤ ذرا اس سے بات ہو جائے۔ لیکن ضروری نہیں ہے وہ شہلا ہو۔“ میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی نمبر مونا کا تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سویرا تھی۔

”شہباز کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام دعا کے بعد

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک ہلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین کیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی اگر اس کے باہر گیس یا دھواں اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے سامان کہاں سے لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر سسٹم ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئر کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔“

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنالے جس میں خواتین کو نہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

وسیم چوٹکا۔ ”کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں چلی رہا ہے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال مزید ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر دینا مودے کر کال بند کر دی۔“

”شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو یا اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خی

کہا۔ ”آپ تو یہاں سے جا کر بھول ہی گئے۔“
 ”سوری۔“ میں نے معذرت کی۔ ”اصل میں آتے ہی کچھ معاملات میں الجھ گیا تھا۔ پھر رات بہت ہو گئی تھی اور ابھی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوئے ہیں۔“
 ”سوری مت کہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔۔۔۔۔
 ”زیادہ نہیں۔۔۔۔۔ بس دن میں ایک بار اس بندی کو یاد کر لیا کریں۔“

”بندی کا کوئی نمبر بھی ہونا چاہیے۔“
 ”ابھی تو موبائل نہیں ہے جو تھا وہ حویلی میں رہ گیا ہے۔“
 ”بیٹو کے پاس ایک آئی فون ہے تم وہ لے سکتی ہو۔“
 ”نہیں ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔
 ”آپ سے بات تو ہو جاتی ہے۔“
 ”میں اس کی جھجک سمجھ گیا۔“ تم بے فکر ہو کر لے لو، ہم میں اس قسم کی چیزیں مشترک ہیں اور وہ میں نے ہی لیا تھا۔“
 ”تب ٹھیک ہے۔“
 ”اس وقت کہاں ہو؟“

”ابھی تو ہم کچن میں آئے ہیں ناشتے کے لیے لیکن زیادہ وقت اس خفیہ کمرے میں گزر رہا ہے جہاں عبداللہ بھائی نے ہمیں رکھا ہوا ہے۔“
 ”یہی کوشش کرو کہ زیادہ تر وہیں رہا کرو اور صرف ضرورت کے تحت باہر آیا کرو کوٹھی سے باہر تو کسی صورت مت نکلتا اور نہ ہی کھلے میں جانا۔“
 ”ہم یہ ساری احتیاط کر رہے ہیں۔“ سویرا نے کہا۔ ”شہباز مجھے حویلی کب بھیجیں گے مجھے ماں جی اور بابا یاد آ رہے ہیں فون پر ان سے بات ہوتی ہے لیکن۔۔۔۔۔“
 ”بس کچھ دن صبر کر لو پھر تمہیں وہاں پہنچا دیا جائے گا اور ممکن ہے یہ دونوں خواتین بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“
 ”سچ میں؟“ سویرا خوش ہو گئی تھی۔

”ہاں کیونکہ تم سب ہی ہمیں عزیز ہو اور سب کی حفاظت کا خیال ہے، ایسا کرو تم ورا ان دونوں کو ٹھو لو کہ یہ حویلی میں رہ گئیں گی کیونکہ یہ آسانی سے جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔“
 ”میں بات کرتی ہوں ویسے اگر یہ وہاں رہنے کے لیے تیار ہو جائیں تو بہت مزہ آئے گا۔“

”یہ تو ان سے پوچھنے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ کتنا مزہ آئے گا۔“ میں نے ہنس کر کہا اور کچھ دیر بات کر کے فون بند کر دیا۔ مانی کسی جن کی طرح تازہ دم اپنی ڈیوٹی پر حاضر تھا

اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ ”تم سوئے کب ہو پر خوردار؟“
 ”رات تین سے صبح آٹھ بجے تک۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرے لیے اتنی نیند کافی ہے اس کے بعد میں سارا دن چاق و چوبند رہتا ہوں۔“
 ”نیند کی کمی کا اثر اس کے ذہن پر نہیں لیکن جسم پر ہوا تھا مجھے ایک نمبر پر بات کرنی ہے۔“

”اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ اسی سے بات کریں آپ والی ٹوٹ بک میں بھی اس کا سسٹم موجود آپ کو بس ایک سائٹ پر جا کر لوگ ان ہونا پڑے گا۔ طریقہ میں ابھی آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔“
 اس نے ایک منٹ میں مجھے طریقہ سمجھا دیا اور بلوٹوٹھ پنڈ فری مجھے تھما دیا۔ ”ٹھیک ہے پر خوردار لگتا ہے تمہیں بھی پسند نہیں ہے کہ کوئی ہمہ وقت تمہارے سر پر سوار ہو۔“
 ”ایسا نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”آپ سفیر بھائی کی طرح میرے غلوں کی توہین کر رہے ہیں۔“
 ”ارے نہیں پر خوردار، ویسے صبح تم نے بھی خود کو ملنا کہہ کر ہمارے غلوں کی توہین کی تھی۔“

وہ مسکرایا۔ ”میں سفیر بھائی کو چھیڑ رہا تھا۔“
 ”اگر اس قسم کی نوک جھوک دل پر لیے بغیر کی جائے صحت مند ہوتی ہے لیکن اگر تمہیں کوئی بات پسند نہ آئے بلا تکلف کہہ سکتے ہو۔“

”مجھے آپ لوگوں کی کوئی بات بُری نہیں لگتی۔۔۔۔۔“
 سفیر بھائی سے جوڑتا جھگڑتا ہوں تو وہ صرف اوپر اوپر سے ہے۔“
 ”بس یہی اہم بات ہے۔“ میں اس کا شانہ چھبنا اپنے کمرے میں آیا۔ ٹوٹ بک کھولی اور ویب سائٹ پر آئی ڈی اور پاس ورڈ سے لوگ ان کیا، اس دوران میں ای میل بھی چیک کیا اور توقع کے مطابق مجھے ایمین کی میل تھی۔ اس نے بھی ایک نمبر بھیج دیا تھا۔ باقی اتنا پیغام تھا کہ اجمال ٹھیک ہے اور میری جان بچانے کے لیے کام ہا ہے۔ میں نے طریقہ کار کے تحت اجنبی عورت کا دیا ہوا ملایا اور فوراً ہی تیل جانے لگی۔ یعنی نمبر آن تھا۔ کچھ دیر بعد عورت نے کال ریسیو کی اور میں پہچان نہیں سکا کیونکہ سے لگ رہا تھا وہ نشے میں ہے۔

”ہیلو کون ہے؟“
 ”وہی جس سے تم بات کرنا چاہتی تھیں۔“
 اس بار وہ سکھل کر بولی۔ ”شہباز تم۔۔۔۔۔“
 میں نے بھی اسے پہچان لیا۔ ”شہلا۔۔۔۔۔“

ماہی ہوا اور تمہیں اس جگہ کا نمبر کس نے دیا؟“
 ”نمبر مجھے فتح خان نے دیا ہے اور تم جانتے ہو میں کیا ماہی ہوں؟“
 ”اگر تم کھل کر بات کرو تو میں جواب دوں۔“
 ”میری تصویریں۔“ اس نے کہا تو میں چونکا اور اہان بن کر بولا۔

”کون سی تصویریں؟“
 ”جو تمہارے پاس ہیں۔“ اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔
 ”اپنی تصویروں کا ذکر کرتے ہوئے تم میری ایک چیز بھول رہی ہو جو تمہارے پاس ہے۔“
 ”وہ بریف کیس۔“ شہلا بولی۔ ”میں نے ابھی تک اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔“
 ”ایسی کوشش بھی مت کرنا ورنہ اس کے ساتھ خود بھی ضائع ہو جاؤ گی۔ سوائے درست طریقے کے علاوہ اسے اور کسی طریقے سے کھولنے کی کوشش کی گئی تو یہ دھماکے سے پھٹ جائے گا اور اس پاس موجود ہر چیز تباہ کر دے گا۔“
 ”مجھے اس سے دلچسپی بھی نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”تم میری تصاویر میرے حوالے کر دو اور اسے لے جاؤ۔“

”تمہیں کس نے بتایا کہ تمہاری کچھ تصاویر میرے پاس ہیں؟“
 ”فتح خان نے، اس کی بتائی ہر بات درست ثابت ہوئی ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے فتح خان نے اپنی حماقت سے ہمیشہ کے لیے کھودے ہیں۔“
 ”مجھے سب معلوم ہو گیا ہے اور مجھے ان کی پروا نہیں مجھے تو پردیسر کے لاکر سے اپنا اور دوسروں کا اسٹف ہا ہے قہارہ میں نے حاصل کر لیا بس تمہارے پاس میری کچھ تصاویر باقی ہیں۔“

میں اسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے پاس اس کی کوئی تصویر باقی نہیں رہی۔۔۔۔۔ فتح خان سے جو تصاویر حاصل کیں تھیں وہ سب میں نے شہلا کے سپرد کر دی تھیں اور اس نے لہو اٹھ جلا دیا تھا۔ یہ فتح خان کی شرارت تھی وہ دوسروں کو ہم سے پیچھے لگا رہا تھا۔ پہلے مرشد کو لگا یا تھا اور اب شہلا کو بھی لگی کا نمبر دے دیا تھا۔ ”ٹھیک ہے تصاویر تمہیں مل سکتی ہیں لیکن بریف کیس دو گی تب ہی مل سکتی ہیں۔“

”میں تیار ہوں ہم آج ہی تبادلہ کر سکتے ہیں۔“ اس نے لہو اٹھا کر کہا۔
 ”تبادلے کے لیے ضروری ہے کہ تم آؤ، میری طرف

سے بریف کیس کوئی بھی لے سکتا ہے۔“
 ”میں۔۔۔ میں کیوں آؤں؟“
 ”میں شہلا کیا تم چاہتی ہو کہ وہ تصاویر کوئی اور بھی دیکھ لے؟“

وہ چپ ہوئی پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے میں آؤں گی۔۔۔۔۔ لیکن آج نہیں تم مجھے کل کال کرو گے۔“
 ”ٹھیک ہے میں کل اسی وقت کال کروں گا اور اچھا ہوا تم نے رابطہ کر لیا ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا تم مجھ سے خود رابطہ کرتے بلیک میل کرنے کے لیے؟“ اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔
 ”نہیں میں ان تصاویر کو ضائع کرنے والا تھا۔ بے شک یہ تمہاری ہیں اور میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میرے خمیر پر بوجھ بن گئی ہیں۔“
 ”اس کا مطلب ہے میں لے کچھ غلط سے کام لیا ہے؟“ اس کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔
 ”نہیں تم نے ٹھیک کیا ہے ورنہ کیا تم یقین کرتیں کہ میں نے وہ تصاویر ضائع کر دی ہیں؟“
 ”کبھی بھی نہیں۔“ اس نے بلاتل کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا ہے۔“

”کل بات کروں گا۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں نے اس سے جھوٹ کہا تھا کہ میرے پاس اس کی کوئی تصویر ہے اور اب میں سوچ رہا تھا کہ تبادلے کے لیے تصویریں کہاں سے پیدا کروں؟ مجھے خیال آیا کہ میں احقانہ بات سوچ رہا تھا مجھے اصل میں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ شہلا سے بریف کیس کس طرح حاصل کیا جائے؟ اگر وہ بریف کیس لے کر کہیں آجائے تو یہ کام لہو اٹھا۔ اگر چہ دھوکا تو ہوتا لیکن شہلا خود کون سی شریف تھی اور اس لیے موقع ملنے پر مجھے دھوکے دینے میں کون سے کسر چھوڑی تھی اس لیے اگر میں اس کے ساتھ دھوکا کرتا تو یہ بُری بات نہیں تھی پھر دھوکا ان معنوں میں تھا کہ وہ جن تصاویر کا سوچ کر مری جا رہی تھی وہ میرے پاس نہیں تھیں اس لیے میں اسے نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ہاں اس بہانے میں بریف کیس نکال لیتا تو یہ میرا فائدہ ضرور بن جاتا۔

وسیم ٹرے میں کافی کے گگ لیے اندر آیا۔ ”ہات ہو گئی میں نے سوچا جب تک کافی بنالوں۔ مانی اچھی بناتا ہے لیکن بُری میں بھی نہیں بناتا۔“

اس کی تصدیق پہلے گھونٹ نے کر دی تھی۔ وسیم بھی اچھی کافی بناتا تھا۔ میں اسے شہلا سے ہولے والی کنگو کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ پُر جوش ہو گیا۔ ”گنہ گین کی پہلی

آزمائش اس موقع پر ہو جائے گی۔
”وین کی آزمائش کیسے؟“

”میں کوئی پلان سوچتا ہوں۔ وہ بہت چالاک عورت ہے یقیناً چیزوں کے تباہی کے لیے ایسی جگہ منتخب کرے گی جہاں ہم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکیں یا اس کے ساتھ دھوکا نہ کریں۔“

”کارروائی کا ارادہ نہیں ہے لیکن دھوکا کرنا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ وہ جو تصویریں مجھ سے مانگ رہی ہے وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ یہ بات میں اسے بریف کیس حاصل کرنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔ دوسرے میرے خیال میں اس کام کے لیے وین کا استعمال ضروری نہیں ہے۔“

”وہ دیکھ لیں گے ویسے آپ نے بالکل ٹھیک سوچا ہے شہلا اور فتح خان جیسے لوگوں کے معاملے میں ضمیر صاحب کو تھکیاں دیتے رہا کریں۔ یہ شرافت کی زبان سمجھنے والے انسان نہیں ہیں۔“

”شہلا کو بھی فتح خان نے کوشی کا پتا بتایا ہے وہ اس طرح سے مجھے تنگ کرنے پر آمرا آیا ہے۔“

”شاید وہ اس طرح سے ہمیں ایمین شا کے معاملے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شہلا نے کل بات کرنے کو کہا ہے۔“

”ہمارے پاس کل تک کا وقت ہے۔“ ویم نے سوچ کر کہا۔

”لیکن جب تک وہ نہیں بتائے کہ تبادلہ کہاں اور کس وقت ہوگا تم کوئی قابل عمل پلان کیسے بنا سکتے ہو؟“

”میں اپنے وسائل کا جائزہ لے سکتا ہوں۔“ ویم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں عبداللہ کی مدد کی ضرورت بھی پڑے گی۔“

میں کچھ کہنے جا رہا تھا کہ موبائل کی بیل نے روک دیا عبداللہ کی کال تھی۔ میں نے ویم کی طرف دیکھا۔ ”تم جس کا ذکر کر رہے تھے اس کی کال آگئی ہے۔“

ویم مسکرایا۔ ”بڑی لمبی عمر ہے اس بندے کی۔“

میں نے کال ریسیو کی۔ ”ابھی تمہارا ذکر ہو رہا تھا۔“ وہ ہنسا۔ ”ایک شخصیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا نام لو اور وہ حاضر ہو جاتی ہے۔“

”اس کے برعکس یہ بھی کہتے ہیں کہ لمبی عمر ہے۔“ اطلاع یہ ہے کہ وہ عورت شہلا نکلی۔“

”مجھے بھی یہی غور تھا اور اسے بھی یقیناً اس مرد پر فتح

خان نے بتایا ہوگا۔ وہ بیک وقت آپ سے اور راجا صاحب سے دشمنی کر رہا ہے۔“

”فتح خان وہ شخص ہے جس نے میرے انداز ہمیشہ غلط ثابت کیے ہیں۔ اس وقت بھی یہ کس مقصد کے قحہ یہ سب کر رہا ہے میں اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ یقیناً اس کے کئی مقاصد ہوں گے۔ بہر حال یہ منہنی ہاتھ ہے۔ اصل معاملہ اس وقت یہ ہے کہ شہلا بریف کیس کے بدلے اپنی تصاویر چاہتی ہے جو میرے پاس برے سے نہیں ہیں۔“

”تب تبادلہ کیسے ہوگا؟“

”یہی تو کرنا ہے اگر میں اسے کہہ دیتا کہ تصاویر نہیں ہیں تو وہ بریف کیس نہیں دے گی۔“

”بالکل نہیں دے گی۔“

”اس لیے اسے دھوکا دے کر بریف کیس حاصل کیا ہے۔ اب پلان ایسا تیار کرنا ہے جس سے ہم بہر صورت بریف کیس حاصل کر سکیں چاہے وہ کتنی ہی چالاک دکھائے۔“

”میں سمجھ گیا۔ ویسے اس قسم کے کام ویم صاحب بہر طریقے سے کر سکتے ہیں۔“

”نہیں یا تم بھی کم نہیں ہوتے جتنی صفائی سے ہمیں کوشی سے نکالا ہے یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔“

”نوازش ہے آپ کی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”میں ویم صاحب سے بات کر کے اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل تیار کرنا ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم اسے کال کر لو۔“

عبداللہ نے ویم کو کال کر لی اور وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا وہ سمجھ گیا کہ میں کہیں اور بات کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے انٹرنیٹ کی مدد سے ایمین کا دیا نمبر ملایا۔ اس نے فوری کال ریسیو کی اور چھوٹے ہی بولی۔ ”تم انٹرنیٹ سے کال کر رہے ہو؟“

”تم جانتی ہو میں نارٹل طریقے سے کال نہیں کر سکتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہارے لیے کیا ہو رہا ہے؟“

”میں نہیں جانتی فی الحال میں سب سے الگ تھک رکھی گئی ہوں۔ آج صبح ایک ماہر نے جیکٹ کا معائنہ کیا ہے اور اسے بعض آلات سے چیک کیا اس نے تصدیق کی ہے کہ جیکٹ میں نہایت خطرناک بارودی مواد ہے اور اس میں بہت جدید قسم کا کنٹرولنگ سرکٹ بھی موجود ہے۔ اس لیے اسے بے احتیاطی سے چھیڑنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آج دو ماہر برطانیہ سے یہاں پہنچنے والے ہیں وہ جیکٹ کا معا

لریں گے۔“

”مجھے امید ہے وہ اس جیکٹ کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔“

”اور اگر نہیں نکال سکے تو....؟“ ایمین کے لہجے میں دل نہیں تھا لیکن سوال ضرور تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے چپ رہ گیا۔

”تم منفی سوچ مت رکھو۔ ایک آدمی کے مقابلے زیادہ آدمی ہوں تو زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔“

”لیکن اس ایک آدمی نے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ مجھے نہیں لگتا کہ میں اس کی مرضی کے بغیر اس جیکٹ سے نجات حاصل کر سکوں گی۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”شہباز نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کوئی مجھے اس جیکٹ سے نجات نہیں دلا سکتا سوائے دو افراد کے۔ ایک تم اور ایک فتح خان۔“

”ایمین اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی ہے۔ کیا برٹش حکومت نے تادان دینے سے انکار کر دیا ہے؟“

”مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم.... میں جب کل یہاں کسی ذمے دار فرد سے معلوم کرتی ہوں مجھے یہی بتایا جاتا ہے کہ کیس حکومت کے ہاتھ میں ہے اور انہیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

”یقیناً برٹش حکومت کچھ نہ کچھ کر رہی ہوگی۔“

ایمین کچھ دیر خاموش رہی مگر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز اگر وہ کچھ نہ کر سکیں فتح خان کو تادان دینے کا لہلہ نہیں کیا گیا اور ماہرین مجھے اس جیکٹ سے بھی نجات نہ دلا سکتے تو پھر کیا ہوگا؟“

میں ایک لمحے کو چپ کر گیا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ میں اسے بچانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے سوچ کر کہا۔ ”ایمین میں تمہیں یوں بے بسی مرتے نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم یقین رکھو تم زندہ رہو گی میں وعدہ نہیں کر رہا بلکہ یہ میرا یقین ہے۔“

”اگر تمہیں یقین ہے تو میں زندہ رہوں گی۔“ وہ ہنسی اور دل سے ہنسی تھی اس کا لہجہ بتا رہا تھا۔ ”اب میں نہیں ہمدردی کی تم کیا کرو گے؟ مجھے معلوم ہے تمہارے بس میں ہوا وہ تم کرو گے اور شہباز یقین کر دے اگر تم نہیں بچا سکتے تب ہی میں خوشی سے اس دنیا سے جاؤں گی یہ سوچ کر کہ تم افری لمحے تک مجھے بچانے کی کوشش کرتے رہے ہو گے۔“

میں نے موضوع بدل دیا۔ ”برٹ شا کا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے؟“

روپا کی لاش برطانیہ پہنچ چکی تھی مگر اب میں اس

چکر سے نجات حاصل کر کے جاؤں تو ان کی آخری رسومات ادا کروں۔“ اس کا لہجہ دوبارہ افسردہ ہو گیا۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے ہم باپ بیٹی کی آخری رسومات ایک ساتھ ہی ادا کی جائیں۔“

”پھر مایوسی کی بات۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”ایمین میں تمہیں اتنا کم حوصلہ نہیں سمجھتا تم تو بہت مشکل مراحل سے گزر چکی ہو۔“

”ہاں.... لیکن میں نے پہلے موت کو یوں بدن پر لپٹا ہوا محسوس بھی نہیں کیا۔ یہاں موجود لوگوں کا یہ حال ہے کہ میرے کمرے کے پاس سے بھی نہیں گزرتے ہیں، کمرے میں تو بس چند ایک افراد آتے ہیں۔ ایک دو بار میں کمرے سے باہر آئی تو یہاں ایسا خوف پھیلا کہ پھر سفیر نے خود مجھے کمرے تک محدود رہنے کا حکم دے دیا۔ اب میں کمرے سے باہر نہیں جاسکتی۔“

”کیا خیال ہے ڈیوڈ شا کو پتا چل گیا ہوگا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

”بہ ظاہر تو ایسے کوئی آثار نہیں ہیں لیکن شاید پتا چل گیا ہو۔“

”تم اس طرح مجھ سے بات کر رہی ہو کیا تمہیں بات کرنے کی اجازت ہے؟“

”بالکل یہ مجھ پر پابندی نہیں لگا سکتے۔۔۔ اتنا تو یہ بھی سمجھتے ہیں کہ میری زندگی و موت کا مسئلہ ہے اور میں کوئی غیر ذمے دارانہ حرکت نہیں کر سکتی؟“

”اگر تم ہر رابطے کی پابندی نہیں دے تو تم اپنے وکیل کو کال کر کے اس سے پوچھو کہ برٹ شا کی کم شدگی کا معاملہ ہونے کے بعد اس کی وراثت کی کیا پوزیشن ہوگی؟“

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“

”تم معلوم کر دو اور اپنا ایمین الیکٹ سے ہما۔ اس معاملے کو سلجھانا تمہارے بس میں نہیں ہے اسروں کے ہاتھ میں ہے اس لیے انہیں کوشش کر لے دو اور اپنی توجہ یہ سوچ کر آنے والے معاملات کی طرف رکھو کہ بالآخر تمہیں اس جیکٹ سے نجات مل جائے گی۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میں اس معاملے میں جتنی دیر کروں گی کسی پیچیدگی کا امکان اتنا ہی زیادہ ہو جائے گا۔“

”گڈ ٹم سمجھ گئی ہو بس اب یہ کام شروع کر دو اور اگر مجھ سے رابطہ کرنا ہو تو مجھے ای میل کر دیا کرو یا ایک نمبر بتا رہا ہوں اس نمبر پر کال کرتے کہہ دو کہ تم مجھ سے بات کرنا چاہ رہی ہو۔“

میں نے اسے راجا عمر دراز کی کوٹھی کا نمبر دے دیا۔ کیونکہ اب تو یہ مرشد اور شیخ خان سمیت میرے تمام دشمنوں کے علم میں آچکا تھا تو ایمن کو دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ”لیکن اسے زبانی یاد کرنا کہیں ٹوٹ مت کرو۔“

”ٹھیک ہے مجھے یاد ہو گیا۔“ ایمن نے کہا۔ ”ٹھیک یو شہباز تم سے بات کر کے میرے دل دو ماغ پر طاری ہو جھکم ہوا ہے۔“

”ایمن تم میری اچھی دوست ہو اور دوست وہی ہوتا ہے جو ضرورت پڑنے پر کام آئے اور بغیر بلائے آئے۔ تم فکر مت کرو تمہارے لیے میں ایسے کروں گا جیسے اپنے لیے کر سکتا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں اور تم سے میری درخواست ہے کہ میری طرف سے راجا عمر دراز کا شکریہ ادا کر دینا جو اس نے پاپا کی لاش کو اسلام آباد پہنچانے میں مدد دی۔“

”میں کہہ دوں گا۔“ میں نے کہا اسی لمحے میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ بیو کا نام آ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے ایمن میں تم سے پھر بات کرتا ہوں ایک کال آ رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے بائے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا میں نے بیو کی کال ریسیو کی۔

”شوبی۔“ اس نے میری آواز سنتے ہی چلا کر کہا۔ ”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا مجھ سے ملے بغیر چلے گئے۔“

”کہاں سے ملتا تم تو پڑے سو رہے تھے۔“ میں ہنسا۔ ”اب طبیعت کیسی ہے؟“

”بالکل ٹھیک ہے میں آپ کے پاس آ رہا ہوں پر عبداللہ بھائی اجازت نہیں دے رہا۔“

”وہ ٹھیک کر رہا ہے جب تک تم بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے آرام کرو۔ وہاں تمہیں اچھے اچھے کمرے کھانے ملیں گے یہاں تو باہر کے کھانوں پر گزارا چل رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں آپ کے ساتھ رہ کر ہم باہر کا بھی کھا لے گا۔ میرا بخار آ رہا ہے۔“

”بیو تم حکم نہیں مان رہے؟“

”آپ حکم دے رہا ہے؟“

”ہاں یہ میرا حکم ہے کہ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے تب تک وہیں رہو۔“

”حکم تو ہم عبداللہ بھائی کا بھی مان رہا ہے۔“ اس نے دہرائی میں کہا۔ ”پر آپ سے اس لیے بولا کہ آپ عبداللہ بھائی کو بھی حکم دے سکتا ہے۔“

”اسے میں نے ہی کہا تھا۔ یہ سو کی بخار ہے اور ذرا سی ماہنامہ سرگزشت

بے احتیاطی سے بگڑ سکتا تھا ہے اس لیے تم آرام کرو اور طاقت والی خوراک لو۔“ میں چار دن میں جب کہ گے تو پھر بے شک آ جانا۔“

”ٹھیک ہے، شوبی اولی آپ خوش قسمت ہے، سب سے اچھا کھانا بنا تا۔“ نا ہے۔ کل میرے لیے میکر کی ”یہ بھی ٹھیک ہے ہے بیٹا چینی کھانے کی پریکٹس ہے تمہاری زندگی میں آ۔“ نے والی چینی کھانے بنائے

”شوبی۔“ اس نے حلقی سے کہا۔ ”یہ آپ ہم چین کا کیوں سنا تا ہے؟“

”چلو اگر تمہیں چینی پسند نہیں ہے تو تبت ہوں یا کہو تو نیپال کا ذکر کروں۔“

”میں آپ سے بات نہیں کرے گا۔“ وہ بولا ”لگتا ہے ابھی سے بات چیت بند کر رہے ہو

نے اسے چھیڑا تو وہ سچ بولنا شروع ہو گیا اور پھر اسے تھا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے منوالیا کو ”لازمی میرے پاس آ جائے گا اور ان دونوں میں لگ کرے گا اور دو پا بندی۔“ سے کھائے گا۔ جس وقت یقین دہانی کر رہا تھا سعد۔ یہ وہاں آگئی اور اس نے موبائل لے لیا۔

”شہباز بھائی یہ جھوٹ بول رہا ہے، ابھی بھی سے آ رہا ہے اور دو نہیں کھایا تا۔ اس کے سوا سب کھانے رکتا ہے۔“ سعد یہ بتا رہی تھی اور پیچھے سے بیو اس کی

ساجت کر رہا تھا۔ ”میں تو کہہ رہی ہوں ڈاکٹر اسے گولیوں کے بجائے انجکشن لگائے تب ہی یہ ٹھیک ہوگا۔“

”دے دی تم کیوں ہمیرا دشمن ہو رہا ہے؟“ عقب بیو چلا یا۔

”ٹھیک ہے ذرا اس سے بات کراؤ۔“ میں نے سعد یہ نے اسے موبائل دے دیا۔ ”بیو سادی کیا کہہ ہے۔“

”دے دی ٹھیک کہتا ہے ہم سے دو نہیں کھایا جاتا اب وعدہ کرتا ہے پورا آرام کمرے گا اور ٹھیک سے دو آگے گا۔“

”دونوں بعد آنے والی اجازت منسوخ کی جاتی اور اب میں تمہیں عبداللہ کے سپرد کروں گا وہی تمہارا

سے علاج کرائے گا وہ اسپتال میں داخل کرنے کو کہہ رہا تھا بیو گھبرا گیا۔ ”میں اسپتال نہیں جائے گا۔ جیسا بولو گے ویسا ہی کرے گا پکا والا وعدہ۔“

”یہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔“ پیچھے سے سعد یہ نے کہا

”مگلی۔“ میں ہنس رہا تھا بیو سے بات کر کے ہاتھ۔ وہ ایسا ہی معصوم اور سادہ انسان تھا جو اسی کے اندر کی شین ختم کر دیتا تھا۔ الماری ل لہ پیاں رکھی تھیں۔ میں ایک شال اوڑھ کر نشست گاہ میں بیٹھائی دی دیکھ رہا تھا۔

”ای ای اور دوسری چیزیں بھی کوٹھی کے ساتھ ہی

لانا لگ سب کچھ فراغ دلی سے کرائے داروں پر اس سے ملے بھی نہیں، کیونکہ ایجنٹ کے توسط آگے بھی ایڈوائس کا وہی ذمے دار ہوگا۔“

”اگر کے کھانے کا کیا ہوگا؟“

”نے بیڑا منگوایا ہے میں صرف ناشتا سپلائی کر رہا ہے کافی بنا سکتا ہوں۔“

”لہجہ ہے صرف کھانے پینے کے لیے کسی کا باہر جانا پڑتی ہے اور اسلام آباد کوئی بڑے شہر نہیں ہیں اس سے سامنا ہو جانے کا پورا امکان ہے۔“

”اس بھی سوچ کر میں نے بیڑا والوں کو آرڈر کر دیا کہ درجن کوٹیکٹس ہیں میرے پاس جو چیز کھانے کو منگوا سکتے ہیں۔“

”کب تک آئے گا تیرا بیڑا؟“ میں نے پیٹ پر ہاتھ مچھڑے بنائے درتی پراٹھے کب کے ہضم ہو چکے

”درتی نہیں تھے بیٹے تم جیسوں کے لیے درتی بن رہا۔“ اس نے کہا اور ایک ایسا چمیل لگایا جہاں سے اس کے اٹس دکھائے جا رہے تھے ایک بڑے سے اسٹج

”ارجن خواتین و حضرات رقام اپنے اپنے فن کا نمونہ ہے تھے۔ اچانک کہیں گھٹی بجی۔“

”کیا ہے؟“ میں نے سفیر سے پوچھا۔

”کال بیل ہے میرا خیال ہے بیڑا والا آ گیا ہے۔“

”اسے میں اسٹڈی سے مانی نکل کر باہر کی طرف لہرا والا ہی ہے ورنہ یہ اس طرح دوڑ نہ لگتا۔ اس کی

ہمت جانا کھانے میں اسے بیو کا بھی باپ سمجھو۔“

”تو میں صبح ناشتے کے موقع پر دیکھ چکا تھا۔“ یارو ماغی

”ہے بھوک تو لگے گی۔“

”میر نے میری طرف دیکھا۔“ بھائی آپ انٹی بات ہیں بھوک تو جسمانی کام کرنے والوں کو ملتی ہے۔“

”یہی تو غلط فہمی ہے جسم میں سب سے زیادہ توانائی کا استعمال کرتا ہے، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دماغ انسانی

جسم کے کل وزن کا تقریباً تین فیصد ہوتا ہے لیکن یہ کل توانائی کا تین فیصد استعمال کرتا ہے۔“

”سفیر کے لیے یہ بات قابل ہضم نہیں تھی لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے صرف میری خاطر مان گیا ہو۔ مانی بیڑا کے

چار بیکٹ اور جبو سائز کولڈ ڈرنک کی بوتل لیے اندر آیا اور ہمارے سامنے سب میز پر رکھ دیا۔ یہ بڑے سائز کے پیڑھے

تھے۔ سفیر جا کر گلاس لے آیا۔ وسیم اور پر معروف تھا اس نے کہا کہ اس کا حصہ رکھ دیا جائے وہ بعد میں کھالے گا۔ اس لیے ہم

سب ٹوٹ پڑے تھے۔ مانی اپنا حصہ آدھا کھا کر باقی آدھا اسٹڈی میں لے گیا۔ میں اور سفیر اپنے حصے کا ختم کر کے وہیں

صوفے پر قیلولہ کرنے لگے تھے۔ بیڑا خاصا بھاری تھا اس لیے پہلے اوٹھ آئی اور پھر آٹھ لگ گئی۔ سونے کے دوران ہی کسی

نے مجھ پر کبل ڈال دیا تھا۔ آٹھ کھلی تو لیکن سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں میں اٹھ کر وہیں چلا آیا عبداللہ موجود تھا۔

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”میں آیا تو آپ سو رہے تھے۔“

”کیا حال ہیں؟“

”سب کے حال ٹھیک ہیں۔ ایک پلان بنایا ہے لیکن اس کے لیے آپ کی منظوری کی ضرورت ہے۔“

”پلان کس بارے میں؟“

”خواتین کو کوٹھی سے کہیں اور منتقل کرنے کے بارے میں۔“ عبداللہ بولا۔ وسیم شاید کافی تیار کر رہا تھا۔ سفیر اوپر سو

رہا تھا۔ شادی کے بعد اسے نیند بہت آنے لگی تھی۔ جہاں موقع ملتا تو سو جاتا۔

”کہاں منتقل کرنے کا ارادہ ہے؟“

”سیٹلائٹ ٹاؤن میں ایک کوٹھی کرائے پر لی ہے۔“

”فائلال وہاں صرف ایک چوکیدار رکھا ہے۔ وہ بھی اعتماد کا آدمی ہے۔ انہیں وہاں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ بھینز بھاڑ کی

ضرورت نہیں ہے۔ بیو اور ایاز ان کے ساتھ ہوں گے۔“

”ایاز آ گیا؟“

عبداللہ نے گھڑی دیکھی۔ ”راستے میں تھا سیدھا یہیں آئے گا۔ شاید دو گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔“

تو کسی نگرانی کرنے والے کے لیے ان کا سرانگ لگانا مشکل ہو جائے گا اور وہ آگے کہیں طے شدہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل جائیں گی۔

میں نے سوچا۔ ”پلان تو اچھا ہے لیکن گاڑی کا بندوبست باہر سے کرنا پڑے گا۔ ورنہ کوئی سے جو گاڑی نکلے گی اس کی نگرانی بھی کی جائے گی۔“

”آپ نے ٹھیک کہا ہے میں اس کا بھی خیال رکھوں گا۔ ہم آخر تک نگرانی کریں گے اور اگر ذرا بھی خطرہ محسوس ہوا تو خواتین کو واپس کوٹھی میں لے آئیں گے۔“

”اچھا پلان ہے اسے بعد میں مزید ری فائن کیا جاسکتا ہے فی الحال مسئلہ شہلا سے بریف کیس کا حصول ہے۔“

وسیم بولا۔ ”میں نے اس پر خاصا غور کیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی ایسی جگہ جادے کا کہے گی جہاں عوام زیادہ ہو اور آنے جانے کے کئی راستے ہوں۔“

”کوئی باریکٹ پلیس؟“ عبداللہ نے سوال کیا۔

”بالکل وہ کسی ویران یا ایسی جگہ آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی جہاں ہم اسے گھیر سکیں۔“

”حالانکہ اسے گھیرنے کا خیال بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تو خود دوسروں کو گھیر لیتی ہے۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”اللہ بچائے ایسی عورتوں سے۔“

میں نے اس کی تائید کی۔ ”ویسے میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے۔ کیونکہ ہماری نیت صاف ہے اس لیے نہایت آسانی سے شہلا کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ وہ پبلک پلیس پر تصویریں چیک کر کے تو نہیں بیٹھ جائے گی۔“

”اس صورت میں ہمیں اس کی طرف سے بھی دھوکے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“ وسیم بولا۔ ”بریف کیس میں نے بھی غور سے نہیں دیکھا تھا اور کسی نے تو سرے سے نہیں دیکھا ہے اس لیے اگر اس نے اس سے ملنا جلتا تھا دیا۔“

”تم بیٹو کو بھول رہے ہو اس نے بہت غور سے دیکھا ہوا ہے۔ اگر بیٹو لینے جائے گا تو شہلا اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔“

”ہاں اسے میں بھول گیا تھا۔“ وسیم بولا۔ ”لیکن اس کی طبیعت خراب ہے۔“

عبداللہ مسکرایا۔ ”شہباز صاحب نے اس کی کلاس لی ہے دوائی نہیں کھا رہا تھا آج اس نے ٹھیک سے دوا کھائی ہے اور اس کی طبیعت خاصی حد تک ٹھیک ہوئی ہے امید ہے ایک دو دن میں بالکل فٹ ہو جائے گا۔“

”ضروری نہیں ہے سب کچھ شہلا طے کرے سمجھ باتیں

اسے ہماری بھی ماننا ہوں گی۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے وہ بریف کیس ناگزیر نہیں ہے بس ایک امانت ہے جس کے ملک تک پہنچانا ہے۔ اگر وہ نہیں بھی پہنچا تو اسے کوئی نہیں کھول سکتا لیکن وہ تصاویر شہلا کے لیے ناگزیر ہیں جو ہمارے پاس سرے سے ہی نہیں ہیں۔“ وسیم

”لیکن شہلا تو یہی سمجھتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیے مجبوراً صل میں وہ ہے، ہم نہیں ہیں۔“

”گویا ہمیں بالادست بن کر بات کرنی چاہیے نے کہا۔“ اگر وہ دام میں آگئی تو کم سے کم ایک مسئلہ تو حل جائے گا۔“

”واقعی جتنے ادھر ادھر کے مسئلے کم ہوں گے ہم اصل مسئلے یعنی مرشد پر اتنی ہی توجہ دے سکیں گے۔“ میں سوچ کر کہا۔ ”یہ فتح خان اور شہلا جیسے لوگ بلا وجہ ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

”بلا وجہ نہیں جناب، ان کی بھی غرض ہوتی ہے عبداللہ نے کہا۔“ ویسے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ فتح خان اتنا خطرناک ثابت ہوگا۔ آپ کو اس نے اتنے عرصے کا یوں رکھا۔“

”وہ واقعی حیران کر رہا ہے اور یہ سلسلہ اب تک ہے اب اس نے ایمین کو بارود دی جیکٹ پہنا دی۔ گویا نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ برٹ شا سے ہیرا نکلوانے میں ناکام رہا تو اس کے بعد کیا کرے گا۔“

”اگر وہ برٹش حکومت سے رقم نکلوانے میں کامیاب رہا تب بھی وہ ملک سے باہر نہیں جاسکے گا۔ اس صورت اثر پول سمیت بہت ساری بین الاقوامی ایجنسیاں اس پیچھے پڑ جائیں گی اور اس کے لیے ان سے چھپنا مسئلہ جائے گا۔“

”میرا خیال ہے فتح خان کے ذہن میں اس کا حل ہوگا۔“ میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک بار فتح خان مجھے بتایا تھا کہ اس کے وسط ایشیا کے ممالک میں بھی تعلقات ہیں اور اگر اسے کوئی مشکل ہوئی تو وہ وہاں بھی جاسکتا ہے۔“

”ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”روس افغانستان میں موجودگی کے دوران اس خطے کی مملکتوں کی آہ میں دشمنی تھی لیکن اس دوران میں بحرمانہ سرگرمیوں میں افراد کے آپس میں تعلقات خوب پھولے پھلے تھے۔ فتح خان کے جاننے والے وہاں ہو سکتے ہیں۔ درحقیقت روس سمیت پورا خطہ دنیا بھر کے جرائم پیشہ اور دہشت گردوں کے لیے الم گڑھ بننا جا رہا ہے کیونکہ یہاں وہ اپنی دولت سمیت ہر

”آپ کی مراد یقیناً امریکا یا بھارت سے ہے۔“

”چین کے سب سے بڑے دشمن یہی دو ممالک ہیں۔ شوشنستی سے فتح خان یا شہلا بریف کیس کی اہمیت سے گاہ نہیں ہیں اس لیے وہ اتنی آسانی سے اسے واپس کرنے والا ہو گئے ہیں۔“

”اگر فتح خان جانتا ہے کہ ہمارے پاس شہلا کی مزید تلاش نہیں ہے تو وہ اسے دھوکا دے رہا ہے۔“

”ماہنامہ سرگزشت

میں ہیں اور کوئی ان سے پوچھتا نہیں ہے۔ یہی نہیں وہ بلیک لائوٹ بھی کر سکتے ہیں۔ یہاں ذرائع اور وسائل لامحدود ہیں۔“

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”سرحدیں ٹٹی ہونے کی وجہ سے مان جیسے آدمی کے لیے آمد و رفت بھی کوئی مسئلہ نہیں ہو ہمارے شمالی علاقے اور قبائلی علاقے سے تو وسط ایشیا بھی قریب پڑتا ہے۔ اس پورے علاقے کی معیشت ہی

میں تعاون پر چل رہی ہے۔ امریکیوں کی افغانستان میں ہونے والی بھی ان کے کاموں میں خلل نہیں ڈال سکتی۔“

”اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔“ شہلا کو یہ فتح خان نے بتائی ہے کہ ہمارے پاس اس کی تصویروں کے برٹش باقی ہیں جبکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہمارے مزید کوئی پرنٹ نہیں ہے اس نے ہمیں جتنے پرنٹ دیے ہیں ان میں شہلا کے حوالے کر دیے تھے اور اس نے انہیں ہاتھ خان خان نے یقیناً شہلا سے اس کی تصدیق کرنی ہوگی اس نے کیوں شہلا سے جھوٹ بولا کہ ہمارے پاس مزید

ہاں ہیں اور اس وجہ سے شہلا ہم سے رابطہ کر کے بریف کیس کی بات کرنے پر مجبور ہوئی؟“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ فتح خان آپ کا فیور کیوں کیا؟“

”بالکل دیکھو اس کا یہ قدم ہمارے حق میں گیا ورنہ ہلا کی طرف سے بلا وجہ بریف کیس کی واپسی کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی اہمیت سے تو فتح خان بھی واقف نہیں ہوتا ورنہ وہ خود اسے حاصل کر کے کسی سے اس کا سودا کرنے کا شش کرتا۔“

”مسئلہ کس سے؟“

”اس خطے میں ایسی طاقتوں کی کمی نہیں ہے جو چین کی سیٹی اور فوجی ترقی سے شدید خوف زدہ ہیں اور ان کی ہر ممکن

”اس نے اپنے ساتھی کو بلا تا مل شوٹ کر دیا تھا جس نے برٹ شا پر گولی چلائی تھی۔“ میں نے کہا۔ میں نے ابھی تک برٹ شا کے آخری الفاظ خود تک مدد رکھے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بتائے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ

”وہ پاگل ہو گیا ہوگا؟“

”اس نے اپنے ساتھی کو بلا تا مل شوٹ کر دیا تھا جس نے برٹ شا پر گولی چلائی تھی۔“ میں نے کہا۔ میں نے ابھی تک برٹ شا کے آخری الفاظ خود تک مدد رکھے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بتائے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ

”وہ پاگل ہو گیا ہوگا؟“

”بالکل وہ اسے دھوکا دے رہا ہے اور ہمارا فیور کر رہا ہے۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”شاید فتح خان اپنے رویے کا ازالہ کرنا چاہ رہا ہے۔ جو اس نے کچھ عرصے سے میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ روا رکھا ہے۔ ویسے معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔“

”لیکن ساتھ ہی وہ مرشد اور شہلا کو بھی ہماری طرف متوجہ کر چکا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”ممکن ہے اس نے ڈیوڈ شا کو بھی بتا دیا ہو۔“

”شاید.... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے نہ بتایا ہو۔ پچھلے کچھ عرصے سے فتح خان بڑی اچھی ہوئی چالیں چل رہا ہے جو سامنے آجاتی ہیں تب بھی ان کا مرہبہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس وقت بھی وہ کچھ ایسا ہی کر رہا ہے۔“

”وہ مجھے اندھا دھند قدم اٹھانے والا تو نہیں لگتا ہے۔“ وسیم بولا۔

”وہ بالکل بھی ایسا نہیں ہے اس کی کمر ہڈی میں شیطان کا دماغ فٹ ہے یہ بات اب میری سمجھ میں آرہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان کے معاملے میں ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے ممکن ہے وہ اس بریف کیس کو ٹریپ بنا کر ہمیں پھانسا چاہتا ہو؟“

”میرا خیال ہے ہمیں اس سے نجات حاصل کر لینی چاہیے۔“ وسیم نے گلے پرائی پھیری۔

”بعض اوقات میں بھی یہی سوچتا ہوں لیکن نہ جانے کیا بات ہے فتح خان کے خلاف میرے جذبات بھی مار ڈالنے کی حد تک نہیں جاتے ہیں۔“

”میں نے بھی محسوس کیا ہے آپ اسے رعایت دے جاتے ہیں۔“ عبداللہ نے سر ہلایا۔

”حالانکہ وہ موقع ملے پر کوئی کمی نہیں رکھتا۔۔۔۔۔“ وسیم کسی قدر تکی سے بولا۔

”میں یاد اس نے بھی کئی سواقتوں پر مجھے جھوٹ دی ہے جیسے ابھی کا واقعہ لودہ وادی سے فرار ہونے سے پہلے مجھے گولی مار سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ مگر مجھے خاموشی سے چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے ہی برٹ شا مارا گیا تھا اور تم لوگ سوچ سکتے ہو کہ وہ اس کے لیے کتنا اہم تھا۔“

”وہ پاگل ہو گیا ہوگا؟“

”اس نے اپنے ساتھی کو بلا تا مل شوٹ کر دیا تھا جس نے برٹ شا پر گولی چلائی تھی۔“ میں نے کہا۔ میں نے ابھی تک برٹ شا کے آخری الفاظ خود تک مدد رکھے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بتائے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ

”وہ پاگل ہو گیا ہوگا؟“

نہیں تھی بس میں فی الحال اس معاملے کو ایک طرف ہی رکھنا چاہتا تھا مستقبل میں کبھی کوئی ایسا موقع آتا تو میں اپنے ساتھیوں کو بتا سکتا تھا۔ مگر فتح خان کے موجودہ رویے کو دیکھتے ہوئے مجھے خدشہ ستانے لگا تھا کہ کہیں اس کے شیطانی ذہن میں یہ خیال تو نہیں آگیا تھا کہ برٹ شانے مرنے سے پہلے مجھے کچھ بتایا ہو۔ اگر اسے یہ خیال آیا ہوگا تو وہ اسے حقیقت سمجھنے لگا ہوگا اور اب اس کا لائحہ عمل اسی کے مطابق ہوگا۔ تو فتح خان میرے بارے میں پھر سے کوئی منصوبہ لے کر سرگرم عمل ہو گیا ہے اور وہ جو کر رہا تھا اس کے پیچھے یہی منصوبہ ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فتح خان مرشد اور شہلا کو آگے کر کے ان کی آڑ میں خود بھی موجود ہو۔

اس معاملے پر غور کرتے ہوئے مجھے لگا جیسے میں کسی بہت ہی پیچیدہ بین الاقوامی جاسوسی کے چکر میں آگیا ہوں۔ انسانوں کے آپس کے ذاتی معاملات بھی اتنے پیچیدہ ہو سکتے ہیں یہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں جانتا تھا۔ اب میں پہلے کی طرح اندھا دھند قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مجھے ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔ حالات پہلے سے یوں بھی مختلف اور پیچیدہ ہوئے تھے کہ اب ہمارے ساتھ خواتین بھی تھیں۔ پہلے صرف مونا تھی اور سفیر سے اس کا رشتہ محبت کا تھا اس لیے وہ اس سے دور بھی رہ سکتی تھی۔ مگر اب وہ بیوی تھی اور شوہر سے دور نہیں رہ سکتی تھی جبکہ اس کے اپنا کوئی گھر بھی نہیں تھا یہی حال سعدیہ کا تھا صرف ایک سویرا ابھی بیوی نہیں بنی تھی لیکن وہ بھی یہیں تھی۔ ان کی وجہ سے ہم پر دباؤ آتا تھا اور ہمارا بہت سارا وقت اور توانائی ان کے تحفظ میں صرف ہو جاتی تھی۔ ان کا تحفظ ہماری اولین ترجیح ہو سکتی تھی۔ صرف خواتین ہی نہیں بلکہ مجھے بعض اوقات اپنے ساتھیوں کی وجہ سے بھی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ بھی میری کمزوری تھے۔ اکیلا میں مضبوط اور پُر اعتماد ہوتا ہوں کہ میری ذات پر جو گزرے گی میں جھیل جاؤں گا۔ کسی کا ساتھ بعض اوقات مجھے کمزور کر دیتا ہے اور میں درست اور بروقت فیصلے نہیں کر پاتا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے میرے ساتھیوں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ اگر وہ نہ ہوتے تو شاید میں کب کا مرشد اور نادر جیسے درندوں کا نشانہ بن چکا ہوتا۔ وہ میرے دست و بازو تھے۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ وسیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا تو وسیم عجیب سے انداز میں مسکرا دیا۔ ایسا لگا جیسے وہ میری سوچ بھانپ گیا ہو۔ پھر اس نے تعذیب بھی کر دی۔

”میرا خیال ہے آپ بھی بھاڑ سے مشکل کرتے ہیں؟“

میں نے حیرت ظاہر نہیں کی لیکن اعتراف کر لیا جب گھٹیا دشمن سے مقابلہ ہو تو میں اکیلے میں زیادہ محسوس کرتا ہوں۔

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔“ وسیم نے ہلایا۔ ”کم سے کم خواتین کے بارے میں میری بھی کیا ہے کہ ان کو کہیں دور دراز محفوظ جگہ ہونا چاہیے جس سے بھی ناواقف ہوں۔“

اس دوران میں سفیر آگیا اور اس نے کیتلی سے لیے کافی انڈیلی اس نے کہا۔ ”لیکن میرے بھائی“ رائے سے کہاں متفق ہوں گی جن کے لیے یہ رائے ہے۔

”مجھے تو ان سے زیادہ تم نا متفق لگ رہے“ میں نے کہا تو سفیر بھٹا گیا۔

”ٹھیک ہے تو خود ہی مونا میرے سرمت مارتا اور

”لو بھائی ابھی سے بلا ہو گئی۔“ وسیم ہنسا۔ ”شہباز صاحب آپ بھی اپنے والد صاحب کی بات ماننا کہ تینوں ایک ہی جگہ صبر سے رہیں۔“

میں پھر اپنی اور وسیم کی سوچ کی یکساں کا قائل رہی میں بھی سوچ رہا تھا کہ ان تینوں کو حلی بھیج دوں وہاں دشمنوں کی نظروں سے دور اور محفوظ ہوں گی۔ سفیر سمجھ گیا اس نے ملائمت سے کہا۔ ”تم بھول رہے ہو سویرا کو وہیں سے اغوا کیا گیا ہے اور وہ دشمنوں کے لیے پہچانی جگہ ہے۔“

”پھر تیرا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو طے ہے کہ اب انہیں یہاں نہیں ہے۔“

”دیکھ سویرا کو تو حلی بھیج دے اس کا معاملہ الگ اور حلی سے زیادہ دیر تک دوری اس کے لیے دوسرے مسائل کو جنم دے گی میری بات سمجھ رہا ہے ابھی تک مر ملک صاحب ہی جانتے ہیں کہ سویرا حلی میں نہیں ہے۔“ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن باقی دو کا کیا کریں میں نے سوچ کر کہا اس کی بات دل کو لگی تھی۔

”وہ ہمارے ساتھ رہ سکتی ہیں۔“ سفیر نے کہا تو بار میں بھٹا گیا۔

”بات وہیں رہی ان کو ہمارے ساتھ ہی سب زیادہ خطرہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ انہیں

مے لیے مضر عام سے بالکل غائب کر دیا جائے۔ وہ دشمن بلکہ ہماری پہنچ سے بھی دور رہیں۔“

”یہ بالکل مناسب نہیں ہوگا۔“ سفیر ہڑبڑا کر بولا۔

”لیکن سے کیوں دور رہیں؟“

ایم اور میں نے قہقہہ مارا تو سفیر جھینپ گیا۔ ”تب

میں ان کے ساتھ تجھے بھی چھوڑ دیتے ہیں۔“

”اب تم بکواس کرنے پر اتر آئے ہو۔“ سفیر نے کہا۔

”اب مطلب نہیں ہے۔“

وسیم کچھ سوچ رہا تھا اس نے کہا۔ ”میری ایک تجویز

دشمن خواتین کو خود سے جدا کر کے ملک میں کہیں بھی

مل ان کے بارے میں ہمیں تشویش تو رہے گی۔“

”آپ کا مطلب ہے انہیں کہیں باہر بیچ دیا جائے؟“

اللہ نے پوچھا

”میری یہی تجویز ہے۔ دیکھیں اس پاس کئی ایسے

ہیں۔ جہاں کا ٹورسٹ ویزہ آسانی سے مل جاتا ہے۔“

”مثلاً چین۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن

ٹ ویزے پر بھی وہاں لامحدود نہیں رہا جاسکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے دو تین مہینے کا ویزہ مل سکتا ہے۔“

اللہ بولا۔ ”آپ کہیں تو میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔“

”یہ بعد میں دیکھیں گے کہ کون سا ملک موزوں ہے۔“

لہن میں تمہاری تجویز سے متفق ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم

ف چین ہی نہیں بلکہ مالڈیپ، تھائی لینڈ اور اسی طرح ان

ملوں کے بارے میں معلوم کرو جہاں پاکستانی اکثر آتے

ہاتے رہتے ہیں۔“

”میں بھی اس تجویز سے متفق ہوں۔“ خلاف توقع

میر نے بھی کہا۔

”ان کو یہاں سے روانہ کر کے ہم سکون سے اپنے دو

لمن معاملات نمٹا سکیں گے۔ جیسے بریف کیس والا، پھر ایجن

ا معاملہ ہے اور سب سے اہم نادر کا معاملہ ہے۔ ایک بار

اس کا کاٹنا کل جائے تو مرشد سے معاملہ کیا جاسکتا

ہے۔“ وسیم بولا تو میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”اگرچہ مجھے اس کی امید نہیں ہے مرشد اور نادر ایک ہی

مل کے زہریلے سانپ ہیں اور یہ موقع ملنے پر ڈسے بغیر نہیں

دکتے۔۔۔ لیکن سانپ ایک کم ہو تو خطرہ بھی کم ہو جائے گا۔“

سفیر نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”کیا تو مرشد کی بات

سے متفق ہے کہ نادر کو اس دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔“

”یہ تو میری پُرانی خواہش ہے لیکن یہ کام مرشد کی

مرضی کے مطابق نہیں ہوگا۔“

ماہنامہ سرگزشت

”بالکل ٹھیک وہ ہمیں پھنسانا چاہ رہا ہے لیکن ہم اس کے چکر میں نہیں آئیں گے۔“ وسیم نے کہا۔ مانی نے اٹلنگ روم میں جھانکا۔

”یہ بے ایمانی ہے خادم تو سب کی خدمت کرے اور

جب اپنی باری آئے تو لوگ اسے بھول جاتے ہیں۔“

”یاد تم رہتے ہی رہتے ہو۔“ سفیر نے کہا۔ ”آکر

یہاں بنا لو کسی نے منع نہیں کیا ہے۔“

”جی نہیں شکریہ۔“ اس نے حق کی سے کہا اور واپس چلا

گیا۔

”ویسے یہ زیادتی ہے۔“ میں نے مانی کی تائید کی۔

”دوسرا بیٹو آگیا ہے۔“ وسیم ہنسا۔ ”ویسے خواتین کے

ساتھ کسی کو تو بھیجتا ہوگا تو بیٹو چلا جائے یہ اس کی محسوس

نہیں ہونے دے گا۔“

عبداللہ کھڑا ہو گیا۔ ”اچھا اب مجھے اجازت ہے میں

کل سے اس کام کا آغاز کرتا ہوں۔“

عبداللہ کے جانے کے بعد وسیم نے اٹھ کر لابی سے

مانی کے لیے کافی نکالی اور اسے دینے چلا گیا۔ کچھ دیر میں وہ

اس کے ساتھ خوش خوش آگیا اور بولا۔ ”شہباز بھائی مجھے لگتا

ہے اللہ نے دو کاموں کے لیے مجھے اس دنیا میں بھیجا ہے ایک

کمپیوٹر کے لیے اور دوسرا کافی پینے کے لیے۔“

”نہیں پر خوردار اس کے علاوہ بھی تم سے بہت سے

کام لینے ہیں۔“ سفیر نے حسب عادت اسے چھیڑا۔ ”یہ بتاؤ

کبھی پستول، رائفل، مشین گن، بھاری مشین گن اور راکٹ

لانچر چلانے کا اتفاق ہوا ہے۔ نشانہ کیسا ہے دستی بم کونشانے پر

پھینک لو گے۔“

مانی نے جلدی سے کافی کا بڑا سا گھونٹ لیا اور کانوں کو

ہاتھ لگا لیا۔ ”ان سب ہتھیاروں کا استعمال کمپیوٹر گیم میں کیا

ہے۔ سچ میں تو مجھے دیکھا بھی نہیں ہے اور قارئ کی آواز سن کر

میرے ہاتھ پاؤں کاٹنے لگتے ہیں۔“

”تب دستی بم کا دھماکا تمہارا ہارٹ فلٹ کر دے

گا۔“ وسیم نے کہا۔

”جی بالکل مجھے اس قسم کے معاملات میں معاف

رکھیں ہاں جہاں تک کمپیوٹر کا تعلق ہے تو میں آپ کے لیے

جان لڑاؤں گا۔“

”تو بس پر خوردار تم جا کر جان لڑاؤ۔“ سفیر نے اس کا

شانہ تھپکا۔

”رات کے لیے جو منگوائیں ذرا ابھی مقدار میں

منگوا لے گا۔“ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ بیڑا سے میرا ہاتھ

جون 2012

خدارا © خدارا شوگرمریض ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور نا کارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد ویسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہریل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سہائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(ویسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

ایڈریس کی سیکورٹی کرتا ہے۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”سمجھ لو امریکی صدر کے ای میل ایل سیکورٹی ہوگی اتنی ہی اس شخص کے ای میل کی بھی ہو گا ایسے شخص کا ای میل ہیک کرنا مشکل ہوتا ہے؟“ جنہیں جناب مشکل تو نہیں ہوتا ہے لیکن سیکورٹی کی وجہ سے پتا چل جاتا ہے اس لیے وہ اپنا پاس ورڈ بدل لیتا ہے یا ل پھر استعمال ہی نہیں کرتا ہے۔ تو پھر ہیکنگ کا مقصد ہی اور کیا نا۔ اس لیے ہمیں ایسے ای میل ایڈریس اس طرح گمنام ہوتے ہیں کہ اس کے مالک کو پتا نہ چلے۔“ تم کس طرح معلوم کرو گے کہ ڈیوڈ شا کا ای میل

کونسا ہے؟“ اس کے لیے آپ کو مزید معلومات دینا ہوں گی اس شخص کے بارے میں۔“ میں اسے ڈیوڈ شا کے بارے میں بتانے لگا۔ مانی مکمل کیا تھا جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ ”جناب آپ کس شخص کے ساتھ بیٹھا کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ تو اپنے بارے میں بہت خطرناک لگ رہا ہے۔“ یہ پہلے ہی میرے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اس لیے ہانکے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ مانی نے کی بورڈ پر انگلیاں چلانا شروع کیں۔ ”اس شخص کے لیے بہت محتاط ہونا پڑے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک رات فارم اس میں بیٹلی کا پٹر آ کر آئیں اور اگلے دن میری آنکھ کھلے تو میں گوانتا مو بے جیسے کسی قید خانے میں پڑا ہوں۔“ ”سمجھ لو تقریباً اتنا ہی خطرناک آدمی ہے۔“ میں نے کہا۔

مانی نے چند منٹ میں معلومات کی مدد سے ڈیوڈ شا کا ای میل نکال لیا۔ یہ اس کے اپنے نام سے تھا۔ مانی نے کہا۔ ”ممکن ہے یہ اس کا عام ای میل ایڈریس ہو خاص اس کی اور نام سے بتایا ہو۔“ ”اسے تلاش کرنے کا کیا طریقہ ہوگا۔“ ”طریقہ بڑا طویل ہو گا لیکن ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ سب سے پہلے اس ای میل کو ہیک کر کے اس کی کوئی مکمل حد تک ہونگے ممکن ہے ڈیوڈ شا کا خفیہ ای میل ایڈریس اس میں شامل ہو۔“

”ہاں پہلے اسے تو ہیک کرو۔“ میں نے کہا اور اپنے سر سے ہاتھ لگا کر کہا۔ ایک محفوظ طریقہ رابطہ ہاتھ آ جانے کے بعد اول لڑ رہا تھا کہ مرشد سے چھیڑ خانی کروں۔ میں نے اہمیت کی ۱۰ سے اس کے موبائل پر کال کی۔ ایک بار اس

حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ ویسے بھی وہ بریف کیس محفوظ ہیں۔ اسے سوائے درست لاک کمی نیشن کے اور طریقے سے کھولنے کی کوشش کی گئی تو یہ دھماکے سے پٹ جائے گا۔ اس طرح اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے بریف کیس غلط ہاتھوں میں چلا گیا تو وہ اسے کھول کر اس راز معلوم کر سکتے ہیں۔“

”مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔“ وسمیہ نے کہا۔ ”حکومتوں کے پاس وسائل لامحدود ہوتے ہیں۔ ان ماہرین کی نہ کسی طریقے سے بریف کیس کھول سکتے ہیں۔“ ”لیکن فی الحال وہ شہلا کے پاس ہے۔“ میں بات ختم کر دی۔ ”اب اس سے بات کر کے دیکھتے ہیں۔“ سورج غروب ہو چکا تھا کچن میں ہلکی سی سردی محسوس ہونے لگی۔ وسمیہ نے کہا۔ ”شاید نیچے بھی میں آگ کم کر رہی ہوں جا کر دیکھتا ہوں۔“

”روز کتنی لکڑی ڈالتے ہو بھی میں؟“ میں پوچھا۔ ”ڈھائی سے تین من۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر پیچھے شیڈ میں تقریباً تین سو من کے قریب لکڑی موجود ہے ساری سردیوں کے لیے کافی ہوگی۔“ ”یہ تو اچھا ہے۔ میرا خیال ہے یہاں کیس نہیں کی۔“ میں نے کہا۔

”کیس یہاں سے کچھ ہی دور ہے لیکن شاید فارم کے مالک نے خود نہیں لی۔“ سفیر نے کہا۔ اس لکڑی دیکھی۔ ”سات بجنے والے ہیں کیا خیال ہے کھانے کے لیے آرڈر کروں۔“

”منگوا لو۔“ وسمیہ نے کہا اور تہ خانے کی طرف چلا گیا جہاں بھی لگی تھی۔ میں مانی کے پاس آیا جو حسب معمول اپنے لیپ ٹاپ پر جھکا ہوا تھا۔ میں اس سے گپ شپ کرنے کے ارادے سے آیا تھا لیکن ایک موقع پر جب اس نے بتایا کہ کسی کا ای میل ایڈریس بھی ہیک کر سکتا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے اس سے پوچھا۔

”کوئی بھی ای میل ایڈریس؟“ ”ہاں کوئی بھی۔“ ”ایک شخص ہے ڈیوڈ شا کیا تم اس کا ای میل ہیک کر سکتے ہو؟“

”کس پوزیشن کا آدمی ہے؟“ ”یہ سوال کیوں کیا ہے؟“ ”آدمی رازداری کی اہمیت کے حساب سے اپنے آپ

نہیں بھرا۔“ سفیر کی آنکھیں باہر آ گئیں اس نے مجھے اور وسمیہ کو دیکھا۔ ”لارج سائز پیزا کھا کر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرا۔“ وسمیہ ہنسا اور پی ڈی پر دکھائے جانے والے ایک اے سی کے ایڈ کی نقل کی۔ ”اس کے چھوٹے سائز پر مت جانا۔“ کچھ دیر ہی مذاق کے بعد ہم دوبارہ اصل موضوع پر آ گئے۔ ”یہ طے ہے کہ انہیں کہیں باہر بھیجتا ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”بیٹے ان سے پوچھتے بغیر طے کر رہے ہو اکیلے میں کیسے نمونے؟“ ”ابھی کچھ اور کہہ رہے تھے۔“ سفیر جھنجھلا گیا۔ ”تمہاری کوئی ایک زبان ہے۔“ ”اوہ بھائی ڈیپلو میسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”اب طریقے سیکھتے سے منواد تو کیوں نہیں مانیں گی۔“

وسمیہ ہماری نوک جھوک سے قطع نظر سوچ و بچار میں مصروف تھا۔ اس نے کہا۔ ”شہباز صاحب اگر ان کو چین بھیج دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا ہم بھی چینی حکومت کے ایک معاملے میں ملوث ہیں اور اگر ہم بریف کیس واپس کرنے میں کامیاب رہے تو یقیناً چین کی حکومت خوش ہوگی۔“

”وہ دوسرا معاملہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر ہم بیٹو اور خواتین کو چین ٹورسٹ ویز سے پر بھیجیں تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ چین نے ٹورسٹوں کے لیے بہت سہولیات رکھی ہیں اور یہ سہولیات پاکستانی سیاحوں کے لیے بھی ہوں گی۔“ ”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”بریف کیس والا معاملہ الگ ہے اور میرا تو خیال ہے کہ ہمیں بریف کیس مل جائے تو اسے یوں واپس کرنا چاہیے کہ ہم سامنے نہ آئیں ورنہ ممکن ہے کسی اور چکر میں پڑ جائیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”مملکتوں کے لیے راز انسانوں یا ان سے وابستہ کسی بھی جذبے سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے چکروں سے دور رہنا ہی ٹھیک ہوگا۔“ وسمیہ نے گہری سانس لی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ یہ بریف کیس ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے لازمی مجبوری نہیں ہے؟“

”بالکل اگر ہم اسے حاصل کر کے چین کو واپس کر دیں تو اپنی اخلاقی ذمہ داری پوری کر دیں گے اور اگر نہ کر سکتے تو ہم کسی قسم کا الزام نہیں آئے گا کیونکہ نہ تو ہم نے اس حوالے سے کسی قسم کی ذمہ داری لی ہے اور نہ ہی چین کے رازدوں کی

”تم باہر آ جاؤ۔“ وسیم نے کہا۔ ”موسم واقعی بہت خوشگوار ہو گیا ہے۔“

”مجھے معاف رکھو، اس سے بہتر ہے میں مانی کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں۔“ سفیر نے کہا اور اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد میں اور وسیم بھی اندر آ گئے۔ میں نے مانی سے ڈیوڈ شا کے ای میل کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ ڈیوڈ شاید مستقل لاگ ان ہے اس لیے وہ ابھی تک اپنا کام نہیں کر سکا ہے۔ ہمارے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے ٹی وی دیکھتے رہے پھر کھانا آ گیا، وہ کھایا اور دوبارہ لاؤنج میں آ گئے۔ میرا سونے کا سوڈ ہوا تو میں اوپر چلا آیا۔ شاید یہ گزشتہ کچھ مہینے سے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میں سارا دن آرام کرنے کے بعد لیٹا اور سو گیا۔ صبح بھی دیر سے آنکھ کھلی جسم میں کسکندی تھی۔ میں گرم پانی سے نہایا تو کسکندی کسی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی، آج ناشتا حلوہ پوری اور بھانجی کا تھا یہ بھی آرڈر کرنے پر آ گیا تھا۔ سفیر مجھے دیکھ کر چپکا۔ ”موبائل فون کا سب سے اچھا استعمال یہی ہے۔“

”اچھا میں تو سمجھتا تھا بیوی سے بات کرنا ہے۔“ میں نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ سفیر نے منہ بنایا۔ ”جب آدمی دوبارہ گفتگو اور دوسرے امور انجام دے سکتا ہے تو موبائل فون کی کیا ضرورت ہے اس معاملے میں؟“ ”یہ بھی ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”وسیم کہاں ہے؟“ ”عبداللہ کی کال آئی تھی اس نے بلایا ہے وہ خواتین کو نکالنے کے منصوبے کو حتمی صورت دینا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں وسیم کو بلایا ہے وہ دین لے گیا ہے۔“

”جنسی جلد یہ کام ہو جائے اچھا ہے اس کے بعد ہم زیادہ بے فکری سے مرشد کی طرف توجہ دے سکیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن فی الحال میں بے کار ہوں۔“

سفیر نے یاد دلایا۔ ”تمہیں ناشتے کے بعد شہلا سے بات کرنی ہے بریف کیس کے لیے۔“ ”مجھے معلوم ہے لیکن نہ جانے کیوں میں خود کو فی الحال بے کار محسوس کر رہا ہوں۔“

”شاید اس لیے کہ تمہیں کچھ عرصے سے اکیلے کام کرنے کی عادت پڑ گئی ہے اور اب سب مل کر کرتے ہیں اس لیے تمہیں اپنا آپ بے کار لگ رہا ہے۔ ویسے دشمنوں کی طرف سے بھی سنا ہے۔ فتح خان صرف چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے اور مرشد نے بھی دشمنی سے ہاتھ اٹھانے کا اشارہ دے دیا ہے۔ شہلا بریف کیس دے پر آمادہ ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن مجھے یقین ان میں سے کسی پر ماہنامہ سرگزشت

بھی نہیں ہے۔ یہ سب اپنے ہی چکروں میں ہیں۔“ ”ٹھیک کہا اور ہمیں ان کے چکروں سے اپنا کام ہے۔“ سفیر نے چائے میرے سامنے رکھی۔ ”میں بھی ہوں کچھ سامان لانا ہے۔“

”عبداللہ کی طرف مت جانا۔“ میں نے خبردار کہا سفیر نے سر آہ بھری۔ ”ہاں یار فی الحال تو کہ جاناں کی طرف جانے پر پابندی ہے۔“

”کیونکہ وہاں سے سوئے دار کی طرف جانے کا پورا امکان ہے۔“ میں نے سر ہلایا اور چائے کا کپ لیا۔ ”آؤ ذرا شہلا سے بات ہو جائے۔“

”تم کرو میں جا رہا ہوں آج دوپہر کے لیے خواہ لے کر آؤں گا۔“ سفیر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ میں نے اسٹڈی میں جھانکا مانی حسب معمول کپیلر سامنے موجود تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ ”نوٹ کما رہا ہوں جناب۔“ اس نے اٹھا چلا تے ہوئے جواب دیا۔ ”دو گھنٹے میں چار سو ستر ڈالر کا ہوں۔“

”انٹرنیٹ کے ذریعے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”ہاں یہاں کمائی کے بہت مواقع ہوتے ہیں۔ اتنا وقت نہیں ملتا ہے ورنہ اس سے بھی زیادہ کما سکتا ہوں۔“ ”یعنی فی گھنٹہ دو سو پینتیس ڈالر؟“

”نہیں جناب یہ تو خاص کام ہے ایک سافٹ ویئر خامی ٹھیک کی ہے۔ یہی کام کسی کمپنی سے کراتے تو ان کو کم کم بھی دو ہزار ڈالر دینا پڑتے۔ مجھ سے پانچ سو سے بھی کم لے لیا۔ ویسے نارٹل میں روز سو سے ڈیڑھ سو ڈالر کا جاسکتے ہیں۔“

”تمہیں ادائیگی کس طرح ہوتی ہے؟“ ”انٹرنیٹ پر میرا اکاؤنٹ ہے دنیا کے کسی بھی بینک کریڈٹ کارڈ سے مجھے ادائیگی کی جاسکتی ہے۔ اب تو ائیٹ بینک بھی آگئے ہیں۔“

”تم تو ماشاء اللہ کم پوت ہو۔“ ”لیکن میرے ڈیڈی اس سے مطمئن نہیں ہیں چاہتے ہیں کہ میں سول سروس میں آ جاؤں اور پھر میرے امریکا اور یورپ میں اٹاٹے ہوں اور سوئس بینک اکاؤنٹ ہو۔“ مانی کا لہجہ تنگ ہو گیا۔

میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”مانی تم جیسے نوجوان آ کے دور میں قابل فخر ہیں کیونکہ ہماری نئی نسل اچھے برے

ہی ہے۔“ ”میں بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ عبداللہ بھائی اور آپ مل گئے جو فطرت کے لحاظ سے اچھے ہیں اور اچھوں کرتے ہیں۔“

”فی الحال تو ہم تمہاری قدر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں نے عداوت سے کہا۔“ ”اگلا تم سے فری میں کام ہے ہیں۔“

”میرے آپ سے کس نے کہا عبداللہ بھائی نے مجھے جواب دی ہے اور مجھے تنخواہ دی جاتی ہے۔ پہلی تنخواہ تو نے چٹکی دے دی تھی کیونکہ میں کپڑے تنگ نہیں لایا تھا اپنا کپیوٹر اور اس کا ضروری سامان لایا تھا۔“

”انٹرنیٹ کام کر رہا ہے میں ایک کال کرنے جا رہا ہوں۔“

”جی بالکل کام کر رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں اوپر آیا اور لیپ ٹاپ آن کیا۔ شہلا کا نمبر ملایا۔ لے کچھ بعد کال ریسیو کی۔“ ”کون بات کر رہا ہے؟“ ”کسی نامعلوم نمبر سے کون بات کر سکتا ہے؟“

”صرف تم نہیں ہو۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”مجھے پتہ ہے اور بھی کالز آتی ہیں۔ یہ بتاؤ تم تبادلے کے لیے دو؟“

”ہاں لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم کوئی دھوکا نہیں دی؟“ ”یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے۔“ ”تمہیں؟“ میں نے طعنے لگا دیے۔ ”جس نے موقع ملنے پر مجھے دھوکا دیا۔ اب یہ بریف کیس تمہارے کس کام کا تھا۔“

”مجھے کماؤ تمہارے ہاتھ میں آئی تو تم نے بلا تکلف اسے مہالیا۔ دوسرے مجھے شبہ ہے کہ تمہارے پیچھے اب بھی فتح ہے اور وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو قابو کرنے کی فکر ہے۔“

”میرا اب فتح خان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ ”تجسسی اس نے تمہیں راجا عمر دراز کی گولی کا بتایا ہے۔“ ”اس نے خود مجھے کال کر کے اطلاع دی تھی۔“

”یعنی اس کے پاس تمہارا نمبر ہے دوسری طرف وہ مجھے کہہ رہا تھا کہ اب اس کا تم سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔“ ”ہماری راہیں الگ ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم میں کوئی رابطہ کا ذریعہ نہیں رہا ہے۔ اگر تم اعتبار کر رہے ہو تو تبادلے کی کیا صورت ہوگی؟“

ماہنامہ سرگزشت

”تمہیں میری بتائی جگہ آنا ہوگا۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے فوراً کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”بریف کیس تم اپنے پاس رکھو تم اس کو کھول نہیں سکتی ہو اور اپنی تصویریں بھول جاؤ۔“

”کیوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”تم ان تصویروں کا کیا کرو گے؟“

”وہی جو تم بریف کیس کا کرو گی۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”شہلا تم بھول رہی ہو مجبور تم ہو میں نہیں اس لیے تبادلہ میری شرائط پر ہوگا۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ تبادلہ آج ہی ہو جائے۔“

”مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں گیارہ بجے کال کر کے بتاتا ہوں کہ تبادلہ کیسے اور کہاں ہوگا؟“

میں نے کال کاٹ کر موبائل سے وسیم کو کال کی۔ ”شہلا مان گئی ہے تبادلہ اور اس کا طریقہ کار میں بتاؤں گا اب سے دو گھنٹے بعد۔“

”میں اور عبداللہ ملے کر چکے ہیں کہ ہمیں آج ہی خواتین کو یہاں سے نکالنا ہے۔ طریقہ مجھے پسند آیا ہے اب آپ فرمائیں۔“

”اگر تم مطمئن ہو تو کر گزرو۔ یہ بتاؤ کہ بیوی کی طبیعت کیسی ہے؟“ ”ٹھیک نہیں ہے آج پھر اسے بخار ہے۔ ڈاکٹر آیا ہے دیکھنے کے لیے۔“

”اس کا مطلب ہے مجھے ٹوڈ جانا ہوگا بریف کیس لینے کے لیے۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”اچھا ایاز آ گیا ہے؟“ ”نہیں کل اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ وہ سرگودھا میں ہے اب نکلا ہے وہاں سے میرا خیال ہے دوپہر تک آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے تم اور عبداللہ اس کام پر توجہ دو میں اور ایاز شہلا کا مسئلہ نمٹاتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو سفیر کو بھی کال کر کے اپنی طرف بلواؤ وہ باہر نکلا ہوا ہے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے وہ آرام سے امور خانہ داری نمٹا سکتا ہے۔“

میں ہنسا۔ ”سامان بھی اسی کا لینے نکلا ہے۔ ٹھیک ہے زیادہ بھیڑ بھاڑ سے کام خراب ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک مسئلہ

ہے ہمارے پاس جتنی گاڑیاں ہیں وہ سب دشمنوں کی نظر میں آچکی ہیں۔

وسیم بولا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ہمیں اب اپنی گاڑیاں بدل لینا چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے اس پر بھی کام کرنا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ میرے پاس ہیوی بائیک جانی پہچانی ہوگئی تھی کم سے کم شہلا اور فتح خان اسے پہچانتے تھے اس لیے میں اس کام میں اسے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ سیاہ دین اس کام کے لیے مناسب نہیں تھی پھر مجھے اس کے سشم آپریٹ کرنا بھی نہیں آتے تھے اور اسے وسیم لے گیا تھا۔ اسے آج خواتین کو عبداللہ والی کوٹھی سے نکالنے کے آپریشن میں استعمال ہونا تھا۔ میں نے پوچھا نہیں کہ ان کو وہاں سے نکال کر کہاں لے جایا جائے گا۔ جب کام نمٹ جاتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ انہیں کہاں رکھیا گیا ہے۔ اب مجھے اس کام کے لیے دوسری بائیک کی ضرورت تھی۔ میں نے جیکٹ اور ہیلمٹ لیا اور نیچے آیا اب صرف مانی رہ گیا تھا میں نے اسے اپنی روائی اور ایاز کی مکمل آمد کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔ "آپ بے فکر ہیں جناب میں ایاز بھائی کو پہچانتا ہوں۔" پھر اس نے اپنا شاید بچپن کا سینہ پھلا کر کہا۔ "آپ بے فکر ہو کر جائیں میں ہوں یہاں نگرانی کے لیے۔"

"لیکن بر خور دار اگر دشمن یا کوئی غیر متعلقہ فرد یہاں ٹکس آئے تو بلا وجہ کی بہادری مت دکھانا پھیلی طرف سے فرار ہو جانا۔" میں نے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ بائیک پر ہیلمٹ لینے کی وجہ سے میں ناقابل شناخت ہو گیا تھا اور اس طرح پورے شہر میں دندناسکتا تھا۔ لیکن اس بائیک کی وجہ سے مجھ پر شک کیا جاسکتا تھا۔ اب میں اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا میں سیدھا اسی ڈیلر قریبی کے پاس گیا جس سے یہ بائیک لی تھی اس نے مجھ سے پہلے بائیک کو پہچان لیا اور گرم جوشی سے ملا۔ "کیسے ہیں سرکار، آج ایاز نہیں آیا؟"

"وہ شہر سے باہر ہے۔" میں نے کہا اور براہ راست کام کی بات پر آ گیا۔ "مجھے یہ بائیک پہنچ کرنی ہے۔"

"بائیک بھی پہنچ ہو جائے گی جناب پہلے چائے پانی تو ہو جائے کسی کا موسم نہیں ہے۔"

"نہیں دوست میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

میں نے نرمی سے کہا۔ "چائے پانی پھر سہی۔"

"ٹھیک ہے جی پھر آئیں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "کیسی چاہیے اس بار؟"

"نارٹل ہو لیکن انجن طاقتور ہو اور کنڈیشن اے ون ہو۔"

"ٹھیک ہے میرے پاس ایک سوزوکی اسپر ہے۔ بہترین کنڈیشن ہے صرف تین چار مہینے استعمال ہے اور وہ بھی صرف دو ہزار کلومیٹرز۔ ہر چیز نئی جیسی ہے رنگ ہے۔"

بائیک واقعی بہترین کنڈیشن میں تھی۔ میں اشارت کی تو نصف کلک میں اشارت ہوگئی تھی۔ اسے دوست قریبی اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کہہ رہا تھا۔ کاغذات بھی مکمل تھے اور وہ ایک دن میں ٹرانسفر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں بائیک چھوڑ کر لے جا رہا ہوں۔ حساب کتاب بعد میں ایاز کر لے گا۔"

"بعد میں۔" وہ ہچکچایا۔ "پر سرکار یہ مناسب نہیں گا۔ اگر سودا آپ کر لو تو بہتر ہے اس کا حساب میں ایاز کر لوں گا۔"

میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے معاہدہ کرنا آدمی قیمت ابھی لے لو اور باقی رجسٹری کے بعد۔"

"آپ بے فکر ہو جناب ایسا ہی ہوگا بڑا امت ماما کسی کی چیز ہے بغیر لکھا پڑھی کے نہیں دے سکتے۔"

اس نے قیمت چالیس مانگی تھی اور پینتیس پر آ گیا۔ معاہدے عام طور سے تیار رکھے ہوتے تھے اسے صرف میرا نام اور بائیک کا نمبر وغیرہ ڈالے اور سائن کرنا مجھ سے اٹھارہ ہزار وصول کیے اور بائیک مع کاغذات، اور اس کے اور جنٹل ہیلمٹ کے ساتھ میرے حوالے دی۔ اپنی بائیک کے بارے میں کہا۔ "اسے پہچانا نہیں کرنا ہے اس کے بدلے کوئی ایسی ہی طاقتور بائیک نکال رکھو لیکن جیسے میں اس سے مختلف ہو۔"

"آپ دیکھ لیں کئی ایسی بائیک ہیں۔"

"یہ بھی ایاز دیکھ لے گا۔" میں نے کہا اور وہاں نکل آیا کیونکہ مجھے ابھی شہلا سے رابطہ کرنا تھا۔ وقت کم رہا تھا میں بائیک دوڑاتا ہوا فارم ہاؤس پہنچا تو اتفاق سے وقت سفیر اور ایاز بھی پہنچ گئے تھے۔ ایاز سینے سے لگ گیا۔

"کیسے ہیں شہباز صاحب آپ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم بہت خوش نظر آ رہے ہو۔" وہ جھینپ گیا۔ "بس جی خوشی کی خبر ہے۔ میری مرنے میرا اور شاہین کا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

"مبارک ہو ویسے اگر تم دونوں میاں بیوی بن جا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔"

"موسی کی تو یہی خواہش تھی لیکن میں ابھی شادی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"ہماری وجہ سے؟"

ہم اندر آ گئے تھے اس نے سر ہلایا۔ "یہ وجہ بھی ہے لی کے بعد بیوی توجہ مانگتی ہے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ایاز تم شادی کرو رہا ہیں پر توجہ بھی دو ہمارا ساتھ دینے سے زیادہ یہ کام ری ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اس سلسلے میں آپ کی یا کسی اور کی بات بھی نہیں مانا۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"ایاز یہ خدا کا احسان ہے کہ اس نے اتنی محبت کرنے کے پر خلوص دوست دیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ آج ہمیں دوا ہم کام نہٹانے ہیں۔"

سفیر سچ اسور خانہ داری کا ہو گیا تھا وہ جیب سے بان لے جا کر کچن میں رکھ رہا تھا۔ میں ایاز کے ساتھ اوپر باور شہلا کو کال کرنے سے پہلے اسے موجودہ صورت حال کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ بائیک کا سن کر اس نے کہا۔ "یہ آپ نے اچھا کیا یہ بائیک یونیک تھی اور فوراً گھروں میں آ جاتی تھی اب جو آپ لائے ہیں اسی شہر میں ایسی ہزاروں بائیک ہوں گی۔ باقی میں دیکھ لوں گا۔ خواتین کو کہاں منتقل کیا جا رہا ہے؟"

"یہ عبداللہ اور وسیم کا دروسر ہے۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ میں اپنی ساری توجہ شہلا سے بریف کیس حاصل کرنے پر لگا رہا ہوں اور تم میرے ساتھ ہو گے۔"

"میں سمجھ گیا جناب۔ اب آپ کا پلان کیا ہے؟"

"میرا ارادہ شہلا کو فریپ کرنے کا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اسے مری میں نئے بننے والے ملیم شاپنگ مال میں بلاؤں گا لیکن ہم اسے راستے میں ٹریپ کر لیں گے۔"

"میں سمجھ گیا ہم ہائی دے پر اس کا انتظار کریں گے اور پھر اس کا تعاقب کر کے جائزہ لیں گے کہ کوئی اور تو اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کے بعد کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اسے روک لیں گے۔"

"بالکل یہی سوچا ہے میں نے۔" میں نے سر ہلایا اور انگریٹ سے شہلا کا نمبر ملا لیا۔ وہ شاید موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

"تم نے کیا سوچا تبادلہ کس طرح کرنا ہے؟"

"تبادلہ مری میں ہوگا۔"

"مری؟" وہ چونکی۔ "اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں نے کہا تھا کہ تبادلہ میری شرائط پر ہوگا تمہیں وہاں ملیم شاپنگ مال کے سامنے موجود ہونا چاہیے شام کے ٹھیک چار بجے اور تم وہاں تک اپنی سرخ چیری کار میں جاؤ گی۔"

"اس میں کیوں؟"

"تاکہ ہمیں اطمینان رہے کہ تم کسی کو ساتھ نہیں لا رہی ہو اس کار میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے مجھے کب تک وہاں پہنچنا ہوگا؟"

"ٹھیک تین بجے۔" میں نے جواب دیا۔ "یعنی اب سے کوئی چار گھنٹے بعد۔"

وہ چپ ہوگئی پھر بولی۔ "میں آ جاؤں گی لیکن شہباز مجھے امید ہے تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔"

"میں دھوکا دینے والا آدمی نہیں ہوں اور شہلا تم اطمینان رکھو میری ذات سے تمہیں نقصان نہیں ہوگا۔ یاد رکھنا ٹھیک چار بجے ملیم پر دیکھا ہوا ہے نام نہ؟"

"ہاں میں نے دیکھا ہے۔" وہ بولی۔

"بس تو وہیں ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا اور کال ختم کر دی۔ ایاز خاموش بیٹھا تھا اس نے کہا۔ "ہمیں جلدی لانا ہوگا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ایک چکر ہے شہلا نے تمہاری جیب دیکھ رکھی ہے اسے دیکھ کر وہ کھٹک سکتی ہے۔ اس لیے تمہارے لیے بھی کوئی دوسرا بندوبست کرنا ہوگا۔"

"سفیر صاحب والی جیب ٹھیک رہے گی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں فتح خان اسے دیکھ چکا ہے اور اسے ٹریپ بھی لگا لیا تھا۔ میرا خیال ہے تمہارے لیے بھی بائیک ٹھیک رہے گی۔ اگر ہم کہیں پھنسے لگیں تو فرار میں بھی آسانی رہے گی۔"

"یعنی دوسری بائیک لینا پڑے گی۔" ایاز نے میری بات پر غور کیا۔

"ہاں ہمیں تمہارے اس جاننے والے قریبی کے پاس جانا پڑے گا۔"

سفیر دوپہر کے کھانے کے لیے پائے اور روٹی لے آیا تھا لیکن ہمارے پاس وقت نہیں تھا اس لیے ہم روانہ ہو گئے۔ میں نے پستول کے ساتھ چھوٹی نال والی شاٹ کن ساتھ لے لی یہ میری جیکٹ میں آسانی سے آگئی تھی۔ ایاز کے پاس پستول تھا۔ ساتھ ہی اس نے دھوئیں والے ہم رکھ لیے تھے، کہیں فرار کی ضرورت پیش آتی تو یہ ہم کام آتے ہیں۔ سفیر کو پروگرام بتا کر ہم نکلے اور پہلے قریبی کے پاس پہنچے۔ ایاز کو دیکھ کر اس نے بلا ہچکچاہٹ ایک دن ٹو فائیو اس کے حوالے کر دی اور معاہدے

کی بات بھی نہیں کی۔ صرف دو ہزار روپے ٹوکن کے پکڑائے
ایاز نے اس سے کہا۔ ”اگر بایک پسند آگئی تو کل حساب کر لوں
گا ورنہ بایک واپس کر جاؤں گا۔“

میں نے باہر نکل کر ایاز کو بتایا کہ قریشی نے بغیر معاہدہ
کیے بایک میرے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایاز طیش
میں آگیا۔ ”آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا میں اس حرای کا
پیٹ چھاڑ دیتا۔ احسان کر رہا ہے ہم پر اپنا کمیشن پورا رکھتا ہے
میں کل ہی اس کا دماغ درست کرتا ہوں۔“

”تم آرام سے اس کا دماغ درست کرتے رہنا۔ ابھی
تو ہمیں دو مختلف جگہوں پر جانا ہے۔ تمہیں شہلا کے گھر کی
طرف میں روڈ پر آنے والے راستے پر موجود رہنا ہے اور جیسے
ہی وہ روانہ ہو تم مجھے اطلاع کرو گے اور پھر اس کا پیچھا کرو
گے لیکن اس طرح کہ اسے احساس نہ ہو۔“

”میں سمجھ گیا۔“

”اپنا موبائل پنڈ فری سے لگا لو تاکہ جب اس کا
تھقب کرو تو تمہیں اطلاع کرنے میں مشکل نہ ہو۔“

ہم دونوں نے روانہ ہونے سے پہلے یہ کام کر لیا۔ ایاز
نے پوچھا۔ ”آپ کہاں ہوں گے؟“

”میں راول چوک سے ذرا آگے سڑک پر ہی کہیں
ہوں گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن کسی سنان جگہ مت رکھے گا آج کل
پولیس چیکنگ کر رہی ہے بلاوجہ آجائے گی۔“

”میں کسی ریستوران یا ہوٹل میں رک جاؤں
گا۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی ایک بجایا ہے ایسا کرو تم کھانا کھا
لینا۔“

قریب اس کی کال آئی۔ ”جناب وہ نکل گئی ہے سرخ چیری کار
میں ہے اور درخ سری روڈ کی طرف ہی ہے۔“

”تم تعاقب کر رہے ہو؟“

”جی اس وقت رش ہے اس لیے میں قریب سے پیچھا
کر رہا ہوں۔“

میں نے اسے اپنا پتا بتایا۔ ”میں یہاں ہوں جب پانچ
منٹ کی ڈرائیو رہ جائے تو مجھے دوبارہ کال کر کے بتانا۔“

”ٹھیک جناب۔“

میں ایاز سے گفتگو کے دوران ہی ہوٹل سے دور
پارکنگ کی طرف آگیا تھا۔ اٹھتے ہوئے ایک سو کا لوٹ میز پر
رکھ دیا تھا اس لیے ہوٹل کے مالک نے میری اچانک روانگی پر
کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایاز سے بات کر کے میں نے
بایک اشارت کی اور اسے سڑک کی طرف لے آیا اور وہیں
رک گیا۔ انجن بند کر کے اسے اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور خود اس
سے نکل گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ایاز اور شہلا نصف گھنٹے میں
یہاں پہنچ جائیں گے۔ سردی کی وجہ سے سڑک پر رش بہت کم
تھا۔ اس لیے ڈرائیو کرنے والے فری ڈرائیونگ کر رہے
تھے۔ کیونکہ خطرناک علاقہ ابھی اوپر تھا اس لیے سامنے سے
گزرنے والی گاڑیاں زن زن کرتی گزر رہی تھیں۔ کوئی میں
منٹ بعد ایاز کی کال موصول ہوئی۔

”ہم تقریباً پانچ منٹ کی دوری پر ہیں۔“

”ٹھیک ہے اب تم مجھ سے مستقل رابطہ رکھو گے۔“

میں نے کہا اور موبائل کو پنڈ فری پر منتقل کر دیا۔ بایک
اشارت کر کے میں سڑک پر آیا اور سست روی سے بایک
چلانے لگا۔ ”ایاز اس دوران میں تم نے دیکھنے کی کوشش کی
کہ شہلا کے ساتھ گاڑی میں کوئی اور تو نہیں ہے؟“

مورت میں تم راستے پر نظر رکھو گے۔“

”آپ کا پروگرام کیا ہے؟“

”بس اس سے بریف کیس لینا ہے اس کی گاڑی کا
اڑ پکچر کرنا ہے اور واپس آنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب تم
اپنے مقب میں بھی نظر رکھنا ممکن ہے کوئی ہمارے پیچھے ہو۔“

”میں دیکھتا آ رہا ہوں۔۔۔۔۔ بعض گاڑیاں نظر آئیں
لیکن وہ آگے نکل گئیں یا کسی اور راستے پر مڑ گئیں۔ کوئی مستقل
ہمارے پیچھے نہیں ہے۔“

”پھر بھی تم اس طرح ہوشیار رہو جیسے ہمارا تعاقب کیا
ہا رہا ہے۔“

”ٹھیک جناب۔“ ایاز نے کہا اور اسی لمحے رابطہ ٹوٹ
گیا۔ یہاں پر سگنل ختم ہو گئے تھے۔ ہم ذرا آگے آئے تو سری کا
ٹول پلازہ آگیا۔ میں جیسے ہی آگے نکلا شہلا کی کار آگئی اور میں
نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب
مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں کسی مداخلت کے بغیر شہلا
کو روک سکوں۔ چند کلومیٹر ز اوپر جانے کے بعد مجھے دائیں
طرف ایک سڑک اوپر جاتی دکھائی یہ شاید کوئی نئی راستہ تھا یہاں
مہاڑوں پر بے شمار چھوٹی چھوٹی بستیاں بن گئیں ہیں یہ سب
دلت مندوں کی بستیاں ہیں جنہوں نے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں
ٹریڈ کر ان پر اپنے لیے کوشیاں بنائی ہیں جہاں وہ اور ان کے
الہ خانہ گرمیاں گزارنے آتے ہیں۔ مجھے یہ جگہ مناسب
لگی۔ میں نے بایک اس سڑک پر ذرا آگے جا کر روک دی
اور ہیلیمٹ اُتار کر واپس آیا۔ میں نے پستول نکال کر اسے
پشت پر کر لیا تھا شہلا کی کار دو منٹ بعد نمودار ہوئی اور جیسے ہی
اس نے مجھے دیکھا اس کی رفتار کم ہونے لگی تھی۔ اس نے یقیناً
مجھے پہچان لیا تھا۔ کار مجھ سے کوئی دس گز کی دوری پر رک گئی۔ شہلا
کار سے اتر کر میری طرف بڑھی۔ لیکن اس کا ہاتھ خالی تھا۔ میں
نے پوچھا۔

”بریف کیس کہاں ہے؟“

”تصاویر کہاں ہیں؟“ اس نے بھی سوال ہی کیا۔ میں
لے پستول سامنے لا کر کہا۔

”بریف کیس گاڑی میں ہے۔“ اس نے اشارہ کیا۔
”چلو اور نکالو لیکن کوئی چالاکی مت کرنا میں گولی
چلانے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کروں گا۔“

وہ پلٹی اور اس نے کار کی فرنٹ سیٹ پر رکھا ہوا بریف
کیس نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس پر سے نظریں
ہٹائے بغیر بریف کیس لیا اور بولا۔ ”اب تم نیچے اتر جاؤ۔“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”نیچے... کیا
مطلب؟“

”نیچے کا مطلب نیچے ہی ہوتا ہے اوپر نہیں.... اس
ڈھلان سے نیچے اترو اور کم سے کم سو گز نیچے چلی جاؤ۔“

”لیکن میری تصویریں....؟“

”پہلے میں تصدیق کروں گا کہ یہ بریف کیس اصلی
ہے جب ہی میں تمہاری تصویریں حوالے کروں گا۔ اب نیچے
اتر جاؤ۔ میرے پاس وقت نہیں ہے کوئی آگیا تو اس کے
ساتھ تم بھی مکمل میں ہڑ ہاؤ گی۔“

”شہباز تم دھوکا کر رہے ہو۔“ اور وہ اسی نظر آ لے گی۔
”نہیں میں اپنے وعدے پر قائم ہوں کہ میری امانت
سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

شہلا نے میرے تیور سے بھانپ لیا تھا کہ میں اس
وقت کسی رعایت کے موڈ میں نہیں ہوں۔ وہ مجبوراً ڈھلان
سے نیچے جانے لگی یہاں ڈھلان بہت زیادہ ترچھی تھی اور اگر
سہارے کے لیے بڑے تنوں والے درخت نہ ہوتے تو وہ
اتنی آسانی سے نیچے نہیں جاسکتی تھی۔ ذرا سی غفلت اس کے
قدم اکھاڑ دیتی اور وہ کئی سو فٹ کی گہرائی میں جا کر
رکتی۔ جب وہ سو گز سے زیادہ دور چلی گئی تو میں نے پہلی بار
بریف کیس کا معائنہ کیا۔ یہ ظاہر یہ وہی بریف کیس لگ رہا
تھا۔ سلور رنگ کی دھات سے بنا ہوا اور اس میں ویسے ہی نمبر
سے کھلنے والے تالے تھے۔ اس کی خاص نشانی اس کا پیش بٹن
تھا جو مرغ رنگ کا تھا۔ یقیناً اس قسم کا بریف کیس مہیا کر لینا
آسان نہیں تھا لیکن یہ ناممکن بھی نہیں تھا۔

وقت نہیں تھا میں نے اسے بیک میں ڈال کر اسے
پشت پر باندھ لیا اور تیزی سے بایک کی طرف لپکا۔ اسے
اشارت کرتے ہوئے کار کے پاس سے گزرا تو اس کے عقبی
پیسے پر قاز کر کے اسے ناکارہ بنا دیا اور خود نکلتا چلا گیا۔ قاز
اور تاثر بھٹنے کے دھماکے کی آواز کچھ دیر پہاڑوں میں گونجتی
رہی تھی۔ جب میں سوڑ مڑ رہا تھا تو بایک کے عقبی آئینے میں
شہلا سڑک پر آئی دکھائی دی اس نے حیرت انگیز پھرتی دکھائی
تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن بات اس کا اتلی



پریٹ بارگزی

(فرحانہ سعید قاسمی، ڈالوال کا جواب)

خالد یونسی..... لیہ
اک فوج ظفر موج کبھی ساتھ تھی اپنے
اب میں ہوں اور اک گردش ایام ہے باقی

محمد خادم حسین..... اوکاڑہ

اپنی چمت بلاتی ہے ایک دن مسافر کو
ایک دن مسافر کو لوٹتا تو ہوتا ہے
ابو ذر حسن..... لندن (یو، کے)

آواز میں تمہاری جادوئی کھٹک ہے
ایسا لگے ہے کسی شکر و کی ہمک ہے
منظر علی خان..... لاہور

اب تو ہر شور طرب سن کر دہل جاتا ہے دل
جانے کس اندیشہ فردا سے مل جاتا ہے دل
انجم رفیق..... گجرات

اس کی محفل نہ سہی ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں
(سعد احمد چاند، کراچی کا جواب)

سلطان فتح علی..... بکھر (گلگت)

وہ اپنی کہتا رہا کہنے کچھ دیا نہ مجھے
سمجھ گیا تھا وہ مجھ کو جو اس سے کہتا تھا
محمد اختر..... رحیم یار خان

دشمنیں ہی ہیں اب امن و دل مرگ و پے میں
اس رہا ہے روز و شب لیت ہے مہی بن کر

مراسف ترمذی..... ملتان

وہ جو مشکل تھا بہت آسان کیسے ہو گیا
کم غن آکھوں میں دل کی بات کیسے آگئی
ہمیں اطہر چنیوی..... اعلین، یو، اے ای

وہ ساتھ تھا تو مجھ کو مجھ چھاؤں رہتی تھی
بس اب تو ایک ہی موسم ٹھہر گیا مجھ میں
خالد یونسی..... لیہ

وہ شخص آخری سچ ہے مرے فسانے کا
اور اس کے بعد کا قہقہہ فطرت کھانی ہے

(یاسمین پاملا، فیصل آباد کا جواب)

محمد سعید قاسمی..... ڈالوال
نرم شبنی پہ نئے پھول کی صورت ہوں وہی
تو مجھے توڑ کے رکھ دے کسی بارش کی طرح

(انجم رفیق، گجرات کا جواب)

رانا محمد سجاد..... شاہ جمال
یہ خط بدگمانیاں دلوں کے سچ آگئیں
خطلوں کا سلسلہ بھی درمیاں نہیں رہا

(سلطان فرید الدین، قنبر کا جواب)
حکیم سید محمد رضا شاہ..... نورنگہ میانوالی
اگر کبھی ہو فرصت تو میرے آئینہ دل کو بھی دیکھ
اس میں تیری صورت فریاد کے سوا کچھ بھی نہیں

(خلیل الرحمن، کھاناں کا جواب)
احمد توصیف..... لیہ
یہ بات نہیں معلوم تھی
وہ کن سوچوں میں ڈوبی ہے

نصرت جاوید..... حاصل پور
یہ کیسی مہو پ نعت کی پڑی ہے
محبت بھاپ بن کر اڑ گئی ہے

(راجا ثاقب نواز، ساہیوال کا جواب)
زاہد بخش..... پشاور
آنکھوں سے میرے اس لیے لانی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی

نواز بیٹ..... نوشہرہ
اپنے وحشت زدہ کمرے کی اک الماری میں
تیری تصویر عقیدت سے سجا رکھی ہے

نصرت جاوید..... حویلی لکھاں
اک طرف خون دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشن جاں منائے گئے

(عصمت آراء، حیدر آباد کا جواب)
مرزا ہادی بیگ..... حیدر آباد
زندگی کیا کسی مفلسی کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

میں رکھوں گا کہ بریف کیس میں ہم ہو سکتا ہے اس لیے وہ نام
ہم ہی استعمال کریں گے۔

”ہو سکتا ہے۔۔۔“ ایاز نے کہنے کی کوشش کی تھی کہ لفظ
ایک زور دار دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ جہاں میں لے
بریف کیس رکھا تھا وہاں سے پہلے شعلہ نکلا تھا اور گرد و غبار
اُڑنے لگا تھا۔ دھماکے نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور اب
پہاڑوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی میں نے سنبھلتے ہوئے
ایاز سے کہا۔

”یہاں سے نکل لیکن سڑک کی طرف مت جانا۔“
ہم آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ کچھ دور جا کر ایاز میرے
برابر آگیا۔ ”آپ کو اس علاقے میں راستوں کے بارے
میں پتا ہے؟“

”نہیں میں اس طرف پہلے نہیں آیا۔“ میں نے چلا کر
کہا دو ہانگوں کے انجن کا مشترکہ شور زیادہ تھا۔
”تب میرے پیچھے آئیے میں اس علاقے سے واقف
ہوں۔“

ایاز واقعی اس علاقے سے واقف تھا۔ آدھے گھنٹے بعد
ہم ہائی وے پر واپس آ گئے تھے۔ ہم ٹول پلازہ سے کچھ دور
تھے۔ ابھی تک ہمیں کوئی ایسا فرد نظر نہیں آیا تھا جو ہمارا پیچھا کر
رہا ہو۔ اگر اس چکر کے پیچھے فتح خان تھا تو اس نے شہلا کو
استعمال کیا تھا وہ جانتا تھا کہ اگر تعاقب کیا گیا تو میں کھٹک
جاؤں گا اور شاید اس دھوکے میں نہ آؤں۔ کسی کے پیچھے نہ
ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ شہلا نے اپنے طور پر میرا
کام تمام کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرا اس سے ایسا کوئی معاملہ
نہیں تھا لیکن شاید اسے خطرہ تھا کہ میں سویرا کے اغوا کا بدلہ
لینے کے لیے اس کے خلاف کوئی کارروائی کروں کیونکہ وہ اس
معاملے میں ملوث رہی تھی۔ چار بجے ہم واپس اسلام آباد کی
حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ ایک جگہ بایک روک کر میں
نے دسم سے رابطہ کیا کیونکہ اس وقت تک انہوں نے خواتین
کو عبداللہ والی کوٹھی سے نکال لیا ہوگا۔

”دسم کام ہو گیا؟“ میں نے پوچھا۔
”جی کام ہو گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا تو میں اس
کے لہجے پر چونکا۔
”دسم کیا بات ہے خیریت تو ہے؟“
”سویرا ابھی تک مقررہ جگہ نہیں پہنچی۔“ دسم نے
جواب دیا اور مجھے لگا جیسے میرا دل رک گیا ہو۔

آسانی سے بریف کیس میرے حوالے کر دینا تھا۔ میرا خیال
تھا کہ جس طرح میں خالی ہاتھ تھا اس بات کا پورا امکان تھا کہ
وہ بھی خالی ہاتھ ہوگی۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے بریف کیس
نہیں دے گی جب تک کہ تصویروں کے سلسلے میں اسے
اطمینان نہ ہو جائے۔ اس کا اتنی آسانی سے بریف کیس
حوالے کرنا مجھے کھٹکتے لگا تھا۔

جاری ہے



ہم نے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام..... ہے۔

نام:

پتا:

نام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سپنس □ پاکیزہ □ سرگزشت □ بھجوا دیا جائے گی ایک پر □ کیجیے۔

جون 2012ء تک 81 سب سے زیادہ 982 بار 74200 بار ارسال کریں۔



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہنامہ سپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فوری کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمار 0301-2454188

بدالدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ ایلی گیشنز
C-63/11-12-13-14-15-16-17-18-19-20-21-22-23-24-25-26-27-28-29-30-31-32-33-34-35-36-37-38-39-40-41-42-43-44-45-46-47-48-49-50-51-52-53-54-55-56-57-58-59-60-61-62-63-64-65-66-67-68-69-70-71-72-73-74-75-76-77-78-79-80-81-82-83-84-85-86-87-88-89-90-91-92-93-94-95-96-97-98-99-100-101-102-103-104-105-106-107-108-109-110-111-112-113-114-115-116-117-118-119-120-121-122-123-124-125-126-127-128-129-130-131-132-133-134-135-136-137-138-139-140-141-142-143-144-145-146-147-148-149-150-151-152-153-154-155-156-157-158-159-160-161-162-163-164-165-166-167-168-169-170-171-172-173-174-175-176-177-178-179-180-181-182-183-184-185-186-187-188-189-190-191-192-193-194-195-196-197-198-199-200-201-202-203-204-205-206-207-208-209-210-211-212-213-214-215-216-217-218-219-220-221-222-223-224-225-226-227-228-229-230-231-232-233-234-235-236-237-238-239-240-241-242-243-244-245-246-247-248-249-250-251-252-253-254-255-256-257-258-259-260-261-262-263-264-265-266-267-268-269-270-271-272-273-274-275-276-277-278-279-280-281-282-283-284-285-286-287-288-289-290-291-292-293-294-295-296-297-298-299-300-301-302-303-304-305-306-307-308-309-310-311-312-313-314-315-316-317-318-319-320-321-322-323-324-325-326-327-328-329-330-331-332-333-334-335-336-337-338-339-340-341-342-343-344-345-346-347-348-349-350-351-352-353-354-355-356-357-358-359-360-361-362-363-364-365-366-367-368-369-370-371-372-373-374-375-376-377-378-379-380-381-382-383-384-385-386-387-388-389-390-391-392-393-394-395-396-397-398-399-400-401-402-403-404-405-406-407-408-409-410-411-412-413-414-415-416-417-418-419-420-421-422-423-424-425-426-427-428-429-430-431-432-433-434-435-436-437-438-439-440-441-442-443-444-445-446-447-448-449-450-451-452-453-454-455-456-457-458-459-460-461-462-463-464-465-466-467-468-469-470-471-472-473-474-475-476-477-478-479-480-481-482-483-484-485-486-487-488-489-490-491-492-493-494-495-496-497-498-499-500-501-502-503-504-505-506-507-508-509-510-511-512-513-514-515-516-517-518-519-520-521-522-523-524-525-526-527-528-529-530-531-532-533-534-535-536-537-538-539-540-541-542-543-544-545-546-547-548-549-550-551-552-553-554-555-556-557-558-559-560-561-562-563-564-565-566-567-568-569-570-571-572-573-574-575-576-577-578-579-580-581-582-583-584-585-586-587-588-589-590-591-592-593-594-595-596-597-598-599-600-601-602-603-604-605-606-607-608-609-610-611-612-613-614-615-616-617-618-619-620-621-622-623-624-625-626-627-628-629-630-631-632-633-634-635-636-637-638-639-640-641-642-643-644-645-646-647-648-649-650-651-652-653-654-655-656-657-658-659-660-661-662-663-664-665-666-667-668-669-670-671-672-673-674-675-676-677-678-679-680-681-682-683-684-685-686-687-688-689-690-691-692-693-694-695-696-697-698-699-700-701-702-703-704-705-706-707-708-709-710-711-712-713-714-715-716-717-718-719-720-721-722-723-724-725-726-727-728-729-730-731-732-733-734-735-736-737-738-739-740-741-742-743-744-745-746-747-748-749-750-751-752-753-754-755-756-757-758-759-760-761-762-763-764-765-766-767-768-769-770-771-772-773-774-775-776-777-778-779-780-781-782-783-784-785-786-787-788-789-790-791-792-793-794-795-796-797-798-799-800-801-802-803-804-805-806-807-808-809-810-811-812-813-814-815-816-817-818-819-820-821-822-823-824-825-826-827-828-829-830-831-832-833-834-835-836-837-838-839-840-841-842-843-844-845-846-847-848-849-850-851-852-853-854-855-856-857-858-859-860-861-862-863-864-865-866-867-868-869-870-871-872-873-874-875-876-877-878-879-880-881-882-883-884-885-886-887-888-889-890-891-892-893-894-895-896-897-898-899-900-901-902-903-904-905-906-907-908-909-910-911-912-913-914-915-916-917-918-919-920-921-922-923-924-925-926-927-928-929-930-931-932-933-934-935-936-937-938-939-940-941-942-943-944-945-946-947-948-949-950-951-952-953-954-955-956-957-958-959-960-961-962-963-964-965-966-967-968-969-970-971-972-973-974-975-976-977-978-979-980-981-982-983-984-985-986-987-988-989-990-991-992-993-994-995-996-997-998-999-1000-1001-1002-1003-1004-1005-1006-1007-1008-1009-1010-1011-1012-1013-1014-1015-1016-1017-1018-1019-1020-1021-1022-1023-1024-1025-1026-1027-1028-1029-1030-1031-1032-1033-1034-1035-1036-1037-1038-1039-1040-1041-1042-1043-1044-1045-1046-1047-1048-1049-1050-1051-1052-1053-1054-1055-1056-1057-1058-1059-1060-1061-1062-1063-1064-1065-1066-1067-1068-1069-1070-1071-1072-1073-1074-1075-1076-1077-1078-1079-1080-1081-1082-1083-1084-1085-1086-1087-1088-1089-1090-1091-1092-1093-1094-1095-1096-1097-1098-1099-1100-1101-1102-1103-1104-1105-1106-1107-1108-1109-1110-1111-1112-1113-1114-1115-1116-1117-1118-1119-1120-1121-1122-1123-1124-1125-1126-1127-1128-1129-1130-1131-1132-1133-1134-1135-1136-1137-1138-1139-1140-1141-1142-1143-1144-1145-1146-1147-1148-1149-1150-1151-1152-1153-1154-1155-1156-1157-1158-1159-1160-1161-1162-1163-1164-1165-1166-1167-1168-1169-1170-1171-1172-1173-1174-1175-1176-1177-1178-1179-1180-1181-1182-1183-1184-1185-1186-1187-1188-1189-1190-1191-1192-1193-1194-1195-1196-1197-1198-1199-1200-1201-1202-1203-1204-1205-1206-1207-1208-1209-1210-1211-1212-1213-1214-1215-1216-1217-1218-1219-1220-1221-1222-1223-1224-1225-1226-1227-1228-1229-1230-1231-1232-1233-1234-1235-1236-1237-1238-1239-1240-1241-1242-1243-1244-1245-1246-1247-1248-1249-1250-1251-1252-1253-1254-1255-1256-1257-1258-1259-1260-1261-1262-1263-1264-1265-1266-1267-1268-1269-1270-1271-1272-1273-1274-1275-1276-1277-1278-1279-1280-1281-1282-1283-1284-1285-1286-1287-1288-1289-1290-1291-1292-1293-1294-1295-1296-1297-1298-1299-1300-1301-1302-1303-1304-1305-1306-1307-1308-1309-1310-1311-1312-1313-1314-1315-1316-1317-1318-1319-1320-1321-1322-1323-1324-1325-1326-1327-1328-1329-1330-1331-1332-1333-1334-1335-1336-1337-1338-1339-1340-1341-1342-1343-1344-1345-1346-1347-1348-1349-1350-1351-1352-1353-1354-1355-1356-1357-1358-1359-1360-1361-1362-1363-1364-1365-1366-1367-1368-1369-1370-1371-1372-1373-1374-1375-1376-1377-1378-1379-1380-1381-1382-1383-1384-1385-1386-1387-1388-1389-1390-1391-1392-1393-1394-1395-1396-1397-1398-1399-1400-1401-1402-1403-1404-1405-1406-1407-1408-1409-1410-1411-1412-1413-1414-1415-1416-1417-1418-1419-1420-1421-1422-1423-1424-1425-1426-1427-1428-1429-1430-1431-1432-1433-1434-1435-1436-1437-1438-1439-1440-1441-1442-1443-1444-1445-1446-1447-1448-1449-1450-1451-1452-1453-1454-1455-1456-1457-1458-1459-1460-1461-1462-1463-1464-1465-1466-1467-1468-1469-1470-1471-1472-1473-1474-1475-1476-1477-1478-1479-1480-1481-1482-1483-1484-1485-1486-1487-1488-1489-1490-1491-1492-1493-1494-1495-1496-1497-1498-1499-1500-1501-1502-1503-1504-1505-1506-1507-1508-1509-1510-1511-1512-1513-1514-1515-1516-1517-1518-1519-1520-1521-1522-1523-1524-1525-1526-1527-1528-1529-1530-1531-1532-1533-1534-1535-1536-1537-1538-1539-1540-1541-1542-1543-1544-1545-1546-1547-1548-1549-1550-1551-1552-1553-1554-1555-1556-1557-1558-1559-1560-1561-1562-1563-1564-1565-1566-1567-1568-1569-1570-1571-1572-1573-1574-1575-1576-1577-1578-1579-1580-1581-1582-1583-1584-1585-1586-1587-1588-1589-1590-1591-1592-1593-1594-1595-1596-1597-1598-1599-1600-1601-1602-1603-1604-1605-1606-1607-1608-1609-1610-1611-1612-1613-1614-1615-1616-1617-1618-1619-1620-1621-1622-1623-1624-1625-1626-1627-1628-1629-1630-1631-1632-1633-1634-1635-1636-1637-1638-1639-1640-1641-1642-1643-1644-1645-1646-1647-1648-1649-1650-1651-1652-1653-1654-1655-1656-1657-1658-1659-1660-1661-1662-1663-1664-1665-1666-1667-1668-1669-1670-1671-1672-1673-1674-1675-1676-1677-1678-1679-1680-1681-1682-1683-1684-1685-1686-1687-1688-1689-1690-1691-1692-1693-1694-1695-1696-1697-1698-1699-1700-1701-1702-1703-1704-1705-1706-1707-1708-1709-1710-1711-1712-1713-1714-1715-1716-1717-1718-1719-1720-1721-1722-1723-1724-1725-1726-1727-1728-1729-1730-1731-1732-1733-1734-1735-1736-1737-1738-1739-1740-1741-1742-1743-1744-1745-1746-1747-1748-1749-1750-1751-1752-1753-1754-1755-1756-1757-1758-1759-1760-1761-1762-1763-1764-1765-1766-1767-1768-1769-1770-1771-1772-1773-1774-1775-1776-1777-1778-1779-1780-1781-1782-1783-1784-1785-1786-1787-1788-1789-1790-1791-1792-1793-1794-1795-1796-1797-1798-1799-1800-1801-1802-1803-1804-1805-1806-1807-1808-1809-1810-1811-1812-1813-1814-1815-1816-1817-1818-1819-1820-1821-1822-1823-1824-1825-1826-1827-1828-1829-1830-1831-1832-1833-1834-1835-1836-1837-1838-1839-1840-1841-1842-1843-1844-1845-1846-1847-1848-1849-1850-1851-1852-1853-1854-1855-1856-1857-1858-1859-1860-1861-1862-1863-1864-1865-1866-1867-1868-1869-1870-1871-1872-1873-1874-1875-1876-1877-1878-1879-1880-1881-1882-1883-1884-1885-1886-1887-1888-1889-1890-1891-1892-1893-1894-1895-1896-1897-1898-1899-1900-1901-1902-1903-1904-1905-1906-1907-1908-1909-1910-1911-1912-1913-1914-1915-1916-1917-1918-1919-1920-1921-1922-1923-1924-1925-1926-1927-1928-1929-1930-1931-1932-1933-1934-1935-1936-1937-1938-1939-1940-1941-1942-1943-1944-1945-1946-1947-1948-1949-1950-1951-1952-1953-1954-1955-1956-1957-1958-1959-1960-1961-1962-1963-1964-1965-1966-1967-1968-1969-1970-1971-1972-1973-1974-1975-1976-1977-1978-1979-1980-1981-1982-1983-1984-1985-1986-1987-1988-1989-1990-1991-1992-1993-1994-1995-1996-1997-1998-1999-2000-2001-2002-2003-2004-2005-2006-2007-2008-2009-2010-2011-2012-2013-2014-2015-2016-2017-2018-2019-2020-2021-2022-2023-2024-2025-2026-2027-2028-2029-2030-2031-2032-2033-2034-2035-2036-2037-2038-2039-2040-2041-2042-2043-2044-2045-2046-2047-2048-2049-2050-2051-2052-2053-2054-2055-2056-2057-2058-2059-2060-2061-2062-2063-2064-2065-2066-2067-2068-2069-2070-2071-2072-2073-2074-2075-2076-2077-2078-2079-2080-2081-2082-2083-2084-2085-2086-2087-2088-2089-2090-2091-2092-2093-2094-2095-2096-2097-2098-2099-2100-2101-2102-2103-2104-2105-2106-2107-2108-2109-2110-2111-2112-2113-2114-2115-2116-2117-2118-2119-2120-2121-2122-2123-2124-2125-2126-2127-2128-2129-2130-2131-2132-2133-2134-2135-2136-2137-2138-2139-2140-2141-2142-2143-2144-2145-2146-2147-2148-2149-2150-2151-2152-2153-2154-2155-2156-2157-2158-2159-2160-2161-2162-2163-2164-2165-2166-2167-2168-2169-2170-2171-2172-2173-2174-2175-2176-2177-2178-2179-2180-2181-2182-2183-2184-2185-2186-2187-2188-2189-2190-2191-2192-2193-2194-2195-2196-2197-2198-2199-2200-2201-2202-2203-2204-2205-2206-2207-2208-2209-2210-2211-2212-2213-2214-2215-2216-2217-2218-2219-2220-2221-2222-2223-2224-2225-2226-2227-2228-2229-2230-2231-2232-2233-2234-2235-2236-2237-2238-2239-2240-2241-2242-2243-2244-2245-2246-2247-2248-2249-2250-2251-2252-2253-2254-2255-2256-2257-2258-2259-2260-2261-2262-2263-2264-2265-2266-2267-2268-2269-2270-2271-2272-2273-2274-2275-2276-2277-2278-2279-2280-2281-2282-2283-2284-2285-2286-2287-2288-2289-2290-2291-2292-2293-2294-2295-2296-2297-2298-2299-2300-2301-2302-2303-2304-2305-2306-2307-2308-2309-2310-2311-2312-2313-2314-2315-2316-2317-2318-2319-2320-2321-2322-2323-2324-2325-2326-2327-2328-2329-2330-2331-2332-2333-2334-2335-2336-2337-2338-2339-2340-2341-2342-2343-2344-2345-2346-2347-2348-2349-2350-2351-2352-2353-2354-2355-2356-2357-2358-2359-2360-2361-2362-2363-2364-2365-2366-2367-2368-2369-2370-2371-2372-2373-2374-2375-2376-2377-2378-2379-2380-2381-2382-2383-2384-2385-2386-2387-2388-2389-2390-2391-2392-2393-2394-2395-2396-2397-2398-2399-2400-2401-2402-2403-2404-2405-2406-2407-2408-2409-2410-2411-2412-2413-2414-2415-2416-2417-2418-2419-2420-2421-2422-2423-2424-2425-2426-2427-2428-2429-2430-2431-2432-2433-2434-2435-2436-2437-2438-2439-2440-2441-2442-2443-2444-2445-2446-2447-2448-2449-2450-2451-2452-2453-2454-2455-2456-2457-2458-2459-2460-2461-2462-2463-2464-2465-2466-2467-2468-2469-2470-2471-2472-2473-2474-2475-2476-2477-2478-2479-2480-2481-2482-2483-2484-2485-2486-2487-2488-2489-2490-2491-2492-2493-2494-2495-2496-2497-2498-2499-2500-2501-2502-2503-2504-2505-2506-2507-2508-2509-2510-2511-2512-2513-2514-2515-2516-2517-2518-2519-2520-2521-2522-2523-2524-2525-252

1893ء میں بمقام بنارس پیدا ہوئے اور 9 ستمبر 1960ء کو بمقام گوڈڑہ انتقال فرمایا۔ اردو کے مقبول شعرا میں شمار ہوئے۔ شعلہ طور اور آتش گل کے علاوہ بھی ان کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہوئے اور اشعار زبان زد عام کہلائے۔

سید علی شاہ گیلانی کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جاتا ہے۔ بچپن سے اب تک وہ ایک ہی خواب دیکھتے رہے ہیں کہ انہیں آزادی نصیب ہو۔ مسلسل کشمیر کی جدوجہد آزادی میں مصروف رہے۔ پہلے ایک گروہ خراب ہوا جسے انہوں نے نکلوا دیا، اب خبر آئی ہے کہ دوسرے گروہ میں بھی کینسر کے جراثیم در آئے ہیں۔ 1989ء میں ان کا پاسپورٹ حکومتی اہلکاروں نے چھین لیا۔ 2005ء میں حج پر جانے کے لیے دیا گیا لیکن واپسی کے بعد ضبط ہو گیا۔ مگر ان کا جوش جہاد کم نہ ہوا۔

1- عنایت قائم خانی، حیدرآباد-2 بے بی اسلام شیخ، راولپنڈی-3 الطاف بی بی، کراچی

4- نوید تو تائی، مظفر گڑھ - 5 کوکب سلمان، سیالکوٹ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: سید عزیز الدین، سید سعید الدین اشرف (سعود آباد) فضل خان، الطاف شیرازی، نصرت جاوید، فضل



ملے گی۔ پورے لاہور میں ڈھونڈتے پھر دے اس کو۔“
 ”ملے گی۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”میں بھی اس وقت درزی
 کی دکان کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ درزی اسے بتا رہا تھا کہ
 اس کے کپڑے تیار ہو گئے ہیں۔ وہ کل شام پانچ بجے آ کر
 لے جائے۔ تو یارا۔ وہ کل پانچ بجے اسی
 دکان پر آئے گی۔ تم بھی
 چلنا میرے ساتھ۔“
 ”میں کیا کروں
 گا؟“ میں
 نے دھڑکا۔

حافظ کرنی ہے۔“
 ایک دن اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ ”اوئے
 میرے میں تو تباہ ہو گیا یار۔ برباد ہو گیا۔“
 ”کیوں بھائی۔ ایسی کون سی بات ہو گئی۔“
 ”یار۔ انارکلی میں کیا لڑکی دیکھنے کو ملی ہے کہ دل خوش
 کیا۔“ اس نے بتایا۔ ”میں تو پہلی نظر میں
 کا عاشق ہو گیا ہوں۔“
 ”کون ہے وہ۔“
 ”یہ میں نہیں
 بتاؤں۔“ اس نے کہا۔
 ”انارکلی کی ایک درزی کی
 ان پر کھڑی ہوئی تھی۔“
 ”شاہ جی۔ اب وہ
 نہیں کہیں کہاں سے

www.Paksociety.com

کہانی ایک محبت کی

محترم معراج رسول صاحب
 السلام علیکم!

میں ایک انگریزی اخبار سے وابستہ ہوں۔ اردو میں کہانی لکھنا میرے
 بس کی بات نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے انگریزی کا ہی بھی ساتھ
 اٹیچڈ کر دی ہے۔ اردو میں جہاں جہاں غلطی نظر آئے، اسے انگلش
 کا ہی سے درست کر لیں۔ مگر میں نے نواز شاہ کا نام اور مقام بدل
 دیا ہے۔ اس عجیب و غریب محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے
 میں نے یہ کہانی لکھی ہے۔

اشعر علی سید
 (کراچی)

اس کا مزاج ویسا ہی رہا تھا۔
 نواز شاہ نام تھا اس کا۔ ایک بہت بڑا جاگیردار۔ جس
 کی زمینیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان زمینوں پر اس
 کے اینٹوں کے بھٹے بھی تھے جہاں سے لال لال اینٹیں بن کر
 آس پاس کے شہروں میں سپلائی ہوا کرتیں۔
 نواز شاہ سے میرا تعلق کالج کے زمانے سے تھا۔
 ہم ایک ساتھ ہی پڑھا کرتے۔ حالانکہ ہم دونوں کے
 سوشل اسٹڈیز میں بہت فرق تھا۔ اس کے باوجود ہم دونوں
 میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔
 وہ اس زمانے میں بھی اپنے مزاج کے لحاظ سے
 جاگیردار ہی تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ اتنے پیسے ہوا کرتے کہ
 وہ پورے کالج کو عیش کرا سکتا تھا۔
 میں نے ایک دو بار اس کے باپ کو بھی کالج میں آتے
 جاتے دیکھا تھا۔ کس شان سے آتا تھا۔ شاندار گاڑیاں اور
 محافظ اس کے ساتھ ہوتے۔
 وہ اپنے چہرے اور باتوں ہی سے ایک غضب ناک
 اور سخت گیر آدمی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ایک بار نواز شاہ
 سے پوچھا۔ ”یار۔ یہ تمہارے فادر کے چہرے پر ہر وقت اتنا
 غصہ کیوں رہتا ہے؟“

”بے وقوف۔ یہ ان کی ضرورت ہے، مجبوری ہے ان
 کی۔“ نواز شاہ نے کہا۔ ”اگر وہ اپنا رعب قائم نہ رکھیں تو کام
 کیسے چلے؟“
 ”یہ... کام پیارا اور مہربانی سے نہیں چلتا۔“
 ”اوئے۔ تم شہری لوگ ایسی باتیں کیا جانتو۔ یہ جو مزدور
 کسان وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ بہت سست اور کاہل ہوتے ہیں۔
 جب تک ان کے سروں پر ڈنڈا نہ ہو یہ کوئی کام نہیں کرتے۔“
 میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نواز شاہ تعلیم کیوں حاصل
 کر رہا ہے؟ میں نے جب یہ بات پوچھی۔ تو ہنس کر کہنے لگا۔
 ”تم بھی بہت بے وقوف ہو۔ اشعر علی۔ ارے بھئی۔
 کچھ ترنگ شریک میں زندگی گزارنی ہے۔ اس کے بعد
 زمینداری سنبھالنا ہی ہے۔“
 ”ہاں یار۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم
 لوگوں کے تو عیش ہیں۔ ایک ہمیں دیکھو۔ مزدور باپ۔
 مزدور اولاد۔“
 ”او بھائی۔ ادا اس کیوں ہوتا ہے؟ آ جانا ہماری
 طرف۔ تمہیں بھی زمینیں شہینیں دے دیں گے۔ کاشت کاری
 کیا کرتا۔“
 ”نہیں یار۔ اپنے بس کا روگ نہیں ہے۔ اپنے کو

”ایک نظر دیکھ تو لیتا۔ پھر دونوں مل کر کوئی راستہ نکالیں گے۔“ اس نے کہا۔

اس کے پاس ایک گاڑی بھی ہوتی تھی۔ یہ گاڑی اس کے باپ نے اسے سال گزشتہ کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اگلے دن وہ اسی گاڑی میں مجھے انارکلی تک لے گیا۔

ہم نے ٹیلا گنبد کے پاس گاڑی کھڑی کی اور پیدل انارکلی کی طرف چل پڑے۔ شام کے وقت انارکلی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اتنا رش ہوتا ہے کہ چلنا محال ہو جاتا ہے۔

ہم کسی نہ کسی طرح اس درزی کے پاس پہنچ ہی گئے۔ ہم کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ ”یار۔ اب وہ آنے والی ہوگی۔“ نواز شاہ نے بتایا۔ ”میرا تو دل ابھی سے دھڑک رہا ہے۔“

کچھ دیر کے بعد وہ لڑکی دکان میں آئی گئی اور واقعی وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ کیا ملاحظہ بھی اس کے چہرے پر کہ نظرس ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔

”ہاں۔ اب بتاؤ اشعر علی۔“ نواز شاہ نے میرے کاندر سے پرہیز مار کر پوچھا۔ ”کیسی ہے میری پسند؟“

”واقعی یار۔ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس میں ایک خاص قسم کا وقار بھی ہے جو آج کل کی لڑکیوں میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔“

”یار۔ تم نے تو میرا جی خوش کر دیا ہے۔ اور اب یہاں سے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔“

”کیوں۔ مجھے کیا کرنا ہے؟“

”تم اس کا پیچھا کرو گے۔“ اس نے کہا۔ ”دیکھو کہاں رہتی ہے؟“

”یہ کیا بات ہوگی۔ عاشق تم ہوئے ہو اور پیچھا میں کروں؟“

”یار۔ سمجھا کرو۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”میں ایک بڑا زمیندار ہوں۔ مجھے پیچھا کرتے ہوئے اچھا نہیں لگے گا۔“

”واہ۔ اس وقت بھی تمہیں اپنی پوزیشن کا خیال ہے۔“

”بکواس نہیں کرو۔ دیکھو وہ جانے لگی ہے۔“ نواز شاہ نے اشارہ کیا۔

وہ لڑکی شاہر میں کپڑے لے کر ایک طرف چل پڑی تھی۔ اس کا رخ اردو بازار کی طرف تھا۔ میں نے ایک مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔

اردو بازار سے ہوتی وہ مال روڈ پر آ گئی۔ وہ اب تک پیدل ہی چل رہی تھی۔ اس کا رخ کرشن نگر کی طرف تھا جو وہاں سے قریب ہی تھا۔ شاید اسی لیے وہ پیدل جا رہی تھی۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ کرشن نگر جا رہی تھی بالآخر وہ ایک مکان کے دروازے پر آ کر رک گئی۔

مجھے پتا چل گیا تھا۔ اس لیے میں واپس ہو گیا۔ نواز شاہ بہت بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ کہا ہوا یار۔ کچھ پتا چلا؟“

”ہاں۔ میں نے اس کا گھر معلوم کر لیا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اب یہ بتاؤ۔ کیا کرنا ہے؟“

”اب اس کے بارے میں معلومات کرنی ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”کون ہے۔ کیا نام ہے۔ کیا کرتی ہے۔ اس کے ماں باپ کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سمجھ لے یار کہ پورا جاسوسی کرنی ہوگی۔“

”اور یہ جاسوسی میں کروں گا؟“

”ہاں یار۔ تمہارے علاوہ میں اور کس پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟“ اس نے کہا۔

”نواز شاہ۔ ایک بات بتاؤ۔“ میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آخر تم اس لڑکی سے کیا چاہتے ہو۔ صرف دوستی۔ یا شادی بھی کر لو گے؟“

”یار۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے اس سے دوستی تو ہو جائے۔“ اس نے کہا۔ ”بس یار تو میرا یہ کام کر دے۔“

میں نے اس کے کہنے پر اس لڑکی کی جاسوسی شروع کر دی۔ یہاں تک معلوم کر لیا کہ وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ اپنے تئیں ایک ساتھ رہتی تھی۔ اس کا تعلق لاہور سے نہیں تھا۔ وہ کہیں اور سے آئی تھی جبکہ اس کے ماں باپ کہیں اور رہتے تھے۔ وہ لاہور میں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی۔

اور اس کا نام صاحبہ تھا۔ اتنی معلومات آسانی سے نہیں ملی تھیں۔ ان کو حاصل کرنے کے لیے مجھے بہت محنت کرنی پڑی تھی۔ لیکن میرا مشن کامیاب جا رہا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔

نواز شاہ یہ سب سن سن کر خوشی سے بے حال ہوتا جا رہا تھا۔ ”یار۔ تو نے تو کمال کر دیا اور اب اس سے ملاقات کوئی راستہ بھی نکالو۔“

”یہ بھی تو کہو کہ تمہارے Behalf پر اس سے محبت بھی میں ہی شروع کروں۔“ میں نے جمل کر کہا۔

”بھائی۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔ میں تو اس سے ملاقات کا طریقہ پوچھ رہا ہوں۔“ نواز شاہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”ویسے یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس کے ماں باپ

نہیں رہتے ہیں؟“

”ہاں۔ یہ لوگ مدن پورہ کے رہنے والے ہیں۔“

”مدن پورہ۔“ نواز شاہ اچھل پڑا تھا۔ ”جیو میرے ل۔ کیا زبردست شغز دی ہے۔ کیا خبر سنا کی ہے۔ مدن پورہ ہمارا ہی علاقہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہاں کی ساری زمینیں ہماری ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ ہم وہاں کے حاکم ہیں۔“

”چلو پھر تو تمہارا کام ادا آسان ہو گیا۔“

”آسان۔ یار۔ آسان تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ سارا مسئلہ ختم ہو گیا۔ اب تم چلو میرے ساتھ۔ ہاں۔ اس کے باپ کا نام کیا ہے؟“

”فتح محمد۔“ میں نے بتایا۔ ”مدن پورہ میں کوئی اسکول ہے۔ وہ اس کا ہیڈ ماسٹر ہے۔“

”وہ اسکول بھی ہمارا ہی ہے۔ ہم ہی نے بنوایا تھا۔“ وہ دھڑکا جا رہا تھا۔ ”اب تم چلو میرے ساتھ۔ اب کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم خود چل کر میرا کرشمہ دیکھ لیتا۔“

میں بھی اس کا ”کرشمہ“ دیکھنے اس کے ساتھ چل پڑا۔ کرشن نگر کی تنگ جگہوں میں گاڑی روکی گئی اور ہم اس مکان تک پہنچ گئے۔ اس وقت نواز شاہ میں بلا کی خود اعتمادی اگائی دے رہی تھی۔ وہی جاگیر دارانہ خود اعتمادی۔ جب ایسے لوگ کسی کو بھی خاطر میں بھی نہیں لاتے۔

اس نے دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے جواب میں ایک تقریباً پوڑھے شخص نے دروازہ کھولا تھا۔ بری انفارمیشن کے مطابق وہی صاحبہ کا تئیا تھا۔

وہ ہمیں دروازے پر دیکھ کر کچھ نرمس ہو گیا تھا۔ ”کس سے ملنا ہے جی آپ لوگوں کو؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہارا نام نیاز محمد ہے؟“ نواز شاہ نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

”ہاں جی۔ میں نیاز محمد ہوں۔“

”بہنیں تمہاری سبھی صاحبہ سے ملنا ہے۔“ نواز شاہ نے کہا۔ ”فتح محمد کی لڑکی۔ وہ اس گھر میں رہتی ہے نا۔“

”ہاں جی۔ وہ اس گھر میں رہتی ہے لیکن آپ لوگ۔“

”میرا نام نواز شاہ ہے۔ تم میرے بابا کو تو جانتے گے۔“ دلدار شاہ۔ مدن پورہ کے جاگیر دار۔

”آ..... آپ۔“ دلدار شاہ صاحب کے بیٹے ہیں۔

”اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔“

”ہاں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ اور یہ میرا دوست ہے۔“

ہماری اردو زبان جوانی زمانہ علوم و فنون کا خزانہ بھی جمع کر رہی ہے، کیا بلحاظ فصاحت کیا بھیاں بلاغت ہندوستان کی جان ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ اس زبان نے قلعہ معنی اور دہلی شاہجہاں آباد کی چار دیواری سے قدم باہر نہیں نکالا تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے کہ کشمیر سے راس کمار کی اور کلکتہ سے کراچی تک اردو مادری زبان کا درجہ حاصل کرتی جا رہی ہے بلکہ پشاور، شیلانگ، کوئٹہ، افغانستان بھی اس کے الفاظ سے بوسیلہ تجارت و سلطنت موجودہ خالی نہیں پایا جاتا۔ خدار کے اب تو ہندوستان کے باہر بھی قدم رکھنا شروع کر دیا ہے۔ مدن، مالدیپ، جزائر سلون، لنکا، انڈمان، سنگاپور، ہانگ کانگ، شامی میں بھی اس کے شیدا پیدا ہو گئے ہیں۔ عرب میں حاجیوں نے بغداد شریف، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف، مشہد اور بیت المقدس میں زائروں نے، مصر، شام اور روم میں سیاحوں نے، انگلستان میں طلبائے ہندویشن یافتہ انگریزوں نے اس کا چرچہ پھیلا دیا ہے۔ روس کی عملداری.... میں بھی اس کا رواج ہو چلا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہندوستانی زبان کا پروفیسر بھی وہاں بلایا گیا ہے۔ بلکہ سنا ہے کہ قسطنطنیہ میں بھی سلطان المعظم نے اس طرف گوشہ چشم منہ تلف فرمایا ہے۔

انتہاس: سید احمد دہلوی، مولف لڑھک آصفیہ
مرسلہ: شاہد سمیل، جھنگ صدر

اشعر علی۔ ”اس نے میری طرف اشارہ کیا۔
بوز حاتو پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ نواز شاہ واقعی وہاں کرشمہ ہی دکھا رہا تھا۔ ہمیں فوری طور پر اندر لے جا کر ٹھکانا دیا گیا تھا۔

بوز حاتو نواز شاہ کے سامنے اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے وہ اس کا ازلی غلام ہو۔ نواز شاہ کے چہرے ایک فاتحانہ سی

ماہنامہ سہ ماہی

جون 2012ء

223

مسکراہٹ تھی۔

”جاد بابا۔ اس لڑکی کو بھیج دو۔“ نواز شاہ نے کہا۔

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“
بوڑھا جلدی سے اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد
میں نے نوازی کی طرف دیکھا۔ ”یار۔ یہ تو واقعی کمال ہے۔“
”اسے کہتے ہیں اقتدار اور طاقت۔“ نواز مسکرا کر
بولے۔ ”اب دیکھ لینا۔ وہ لڑکی بھی ہاتھ باندھے ہوئے سامنے
آئے گی۔“
لیکن ایسا نہیں ہوا۔

وہ لڑکی بہت باغیانہ انداز سے نواز کے سامنے آئی تھی۔
وہ سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ”جی فرمائیں۔“ اس نے
پوچھا۔ ”کیسے آنا ہوا آپ دونوں کا۔ مجھ سے کیا کام ہے؟“
”تمہارے بارے میں پتا چلا تھا کہ تم لوگ مدین پورہ
کے رہنے والے ہو۔“ نواز نے کہا۔ ”وہ میری ہی جاگیر ہے
اور تمہارے قادر ہمارے ہی بتائے ہوئے اسکول میں ہیڈ
ماسٹر ہیں۔“

”تو پھر اس سے کیا فرق پڑا۔“ صاحبہ نے جیسے انداز
میں پوچھا۔ ”کیا مدین پورہ کا ہونا کوئی جرم ہے۔“
”تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ نواز شاہ تمللا کر رہ گیا
تھا۔ ”ہم تو اس لیے آئے تھے کہ تم سے یہ معلوم کریں کہ لاہور
میں تمہیں کوئی پرائیلم تو نہیں ہے۔“

”بہت بہت شکریہ آپ کا۔“ صاحبہ نے کہا۔ ”ہمیں
یہاں کوئی پرائیلم نہیں ہے۔“
اب نواز شاہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا
تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ زور زور سے
قہقہے لگاؤں۔ وہ یہاں اپنا کرشمہ دکھانے آیا تھا لیکن لڑکی اس
سے مرعوب ہی نہیں ہوئی تھی۔

”کچھ اور کہنا ہے آپ کو۔“ صاحبہ نے پوچھا۔
”نہیں۔“ نواز شاہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ”اور کچھ نہیں کہنا۔“
وہ بوڑھا اتنی دیر میں چائے اور ناشا وغیرہ لے کر
آ گیا تھا لیکن نواز شاہ نے اس پر دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ وہ
باہر نکل آیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔
”یار۔ یہ تو بہت بُری ہوئی۔“ اس نے باہر آ کر کہا۔
”اس لڑکی کے تو مزاج ہی آسمان پر ہیں۔“

اب میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس کے تمللائے
ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ ”ہاں بھی۔ اب کیا
کہتے ہو۔ تمہارے عشق کے بھوت کا کیا حال ہے؟“
”یار۔ اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ میں اس سے پیچھے

بٹ گیا ہوں۔“ نواز شاہ نے کہا۔ ”بلکہ میری آگ اور
بھڑک اُٹھی ہے۔ میں اس کو حاصل کر کے رہوں گا۔“

”اب ایک جاگیر دار کی انا بول رہی ہے نواز شاہ۔“
”ایسا ہی سمجھ لو۔ شہر آ کر اس کا دماغ خراب ہو گیا
ہے۔ اگر مدین پورہ ہوتا تو میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی
رہتی۔ خیر دیکھ لوں گا اس کو۔“
”میرا خیال ہے کہ تم اب اس کا پیچھا چھوڑ دو۔“ میں
نے کہا۔ ”یہ تمہارے ہاتھ نہیں آنے والی۔“

”اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ نواز شاہ غرائے
لگا۔ ”اس نے مجھے پاگل کر دیا ہے اور میں اتنی جلدی پیچھے نہیں
ہوں گا۔“

میں نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا
تھا۔ ”یار۔ اب تم اس معاملے میں مت بولنا۔“ اس نے کہا۔
”اب یہ معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔“

پتا ہے وہ کچھ اور معاملہ کیا تھا۔
ایک عجیب بات یہ تھی کہ کچھ دنوں کے بعد نواز شاہ نے
اس لڑکی کے بارے میں کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ اس
کے دھیان سے نکل گئی تھی یا اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا۔
بہر حال اب اس کی دوسری مصروفیات اس کے سامنے
آ گئیں اور وہ ان میں مصروف ہو گیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ اپنے علاقے کی طرف چلا گیا۔
شاید گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئی تھیں کیونکہ اس کی واپسی دو
مہینوں کے بعد ہی ہوئی تھی اور جب واپس آیا تو ایک نئی کہانی
لے کر آیا تھا۔ ”یار۔ اس لڑکی نے تو انتہا کر دی۔“
”کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟“

”وہی کرشن نگر والی۔“ اس نے کہا۔ ”اب اس نے
میری ایسی توہین کی ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“
”کمال ہے۔ تم اب تک اسے بھولے نہیں۔“

”یار۔ وہ بھولنے والی چیز تو نہیں ہے نا۔“ نواز شاہ
مسکرا دیا۔ ”دیکھ لینا ہم دونوں ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے۔“
بات آئی گئی ہوئی۔ پھر اس لڑکی کا ذکر ہی نہیں آیا۔
اس نے خود دو چار دنوں کے بعد یہ بتایا تھا کہ اس لڑکی نے
دوبارہ کس طرح اس کی توہین کی تھی۔ ”یار۔ میں نے اس
کے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ باقاعدہ رشتہ لیکن اس نے صاف
انکار کر دیا۔“

”تو اس میں ایسی کون سی بات ہو گئی؟ ہر ایک کو یہ حق
حاصل ہے کہ وہ جس سے چاہے شادی کرے۔“
”یہ تم شہر کے ماحول میں کہہ رہے ہو کیونکہ تمہیں

ی روایات نہیں معلوم۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے اس بستی
میں ایک اور بندے کا رشتہ قبول کر لیا ہے کیونکہ دونوں ایک
دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہی بات میری توہین کی
ہے۔“

اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ اب یہ دور غلاموں کا نہیں
ہے۔ اب ہر شخص۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے
آزاد ہے۔

پھر کئی مہینے گزر گئے۔ ہم کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر
اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نواز شاہ اپنی زمینوں
و حویلیوں کی طرف چلا گیا تھا اور میں کراچی آ گیا۔ یہاں
میں نے ایک اخبار جو آن کر لیا تھا کیونکہ میری منزل یہی تھی۔
پھر کئی برس گزر گئے۔ شاید چار یا پانچ برس۔ اس
دوران نواز شاہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ وہ یقیناً
اپنی زمینوں پر حکمرانی کر رہا ہوگا۔

☆☆☆

بہت عجیب مہم ہمارے سامنے تھی۔
ہمیں گاؤں میں تعلیمی سہولیات کے موضوع پر فہم تیار کرنا
تھا۔ میرے ساتھ ایک لڑکی نالکھ اور ایک ساتھی بشیر بھی تھے۔
ہم اپنی جیب میں گاؤں گاؤں گھومتے پھر رہے تھے
اور اس دوران یہ معلوم ہوتا جا رہا تھا کہ گاؤں میں رہنے
والوں کی زندگی کتنی سخت ہے۔

تعلیم بنیادی ضرورت ہونے کے باوجود ان کے لیے
تیسری یا چوتھی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا پہلا مسئلہ اپنی روزی کمانا
تھا جس کے لیے وہ بے چارے رات دن محنت کرتے تھے۔
مل چلانا۔ فصلیں بونا۔ ڈھور ڈنگر کی پرورش۔ اینٹیں
بنانا۔ لکڑیاں چرنا اور نہ جانے کیا کیا۔ تب جا کر انہیں روٹی
کے دو ٹکڑے مل پاتے تھے۔

اس کے بعد ان کے لیے دوسرا مسئلہ اپنی عزت نفس
بچانے کا تھا۔ نہ جانے کس وقت کس زمیندار یا کس پولیس
آفیسر کی انا مجروح ہو جائے۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ
بے چارے تو کسی سے فریاد بھی نہیں کر سکتے تھے۔
ان سب کے بعد تعلیم کا نبرہ آتا تھا۔

اس کی حالت اور بھی خراب تھی۔ ٹوٹے ہوئے
اسکول۔ نہ پڑھانے والے نہ پڑھنے والے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں
اور دھوپ میں بیٹھے ہوئے بچے۔

ہم سب یہی سوچتے رہتے کہ خدا جانے ہمارے ملک
میں تعلیم کو کب اہمیت دی جائے گی؟ ہم بہت دھکی دل سے فہم
جاو کر رہے تھے۔

عجیب وحشت سی ہونے لگی تھی۔

نالکھ خاص طور پر بہت پریشان تھی۔ ”اشعر علی۔ یہ
بتاؤ۔ آخر یہ سب کب تک چلتا رہے گا؟“

”جب تک ہم تعلیم کو اپنے پیٹ سے زیادہ اہمیت نہیں
دیں گے۔“

”اور یہ ہونے سے رہا۔“ بشیر نے کہا۔ وہ بھی بہت
حساس قسم کا نوجوان تھا۔

ایک بار ہم ایک ایسی بستی میں پہنچ گئے جہاں اسکول
نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پتا چلا کہ ایک اسکول ہوا کرتا تھا لیکن
ایک بار اس میں آگ لگ گئی اور پورا اسکول خاک کا ڈھیر
ہو گیا۔

اس کے بعد اس اسکول کو بنانے کی لوبت نہیں آئی تھی
اور اس بستی سے تعلیم کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا تھا۔

”کیا اس اسکول سے وابستہ کوئی آدمی مل جائے گا؟“
نالکھ نے پوچھا۔

یہ آئیڈیا بھی اچھا تھا۔ ہم اس آدمی سے انٹرویو لے
سکتے تھے۔ ”ہاں جی۔ کیوں نہیں۔ اس اسکول کو چلانے
والے بابا سے آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ آپ جو کچھ معلوم
کر سکتے ہیں۔ اس سے پوچھ لیں۔“

”اور یہ بابا کہاں ملیں گے؟“
”آئیں۔ ان کا گھر دکھا دیتا ہوں۔“

بابا کا گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ایک منزلہ چھوٹا سا
گھر۔ ہم نے دروازے پر دستک دی۔ تو ایک بزرگ باہر
آ گئے۔ وہ اپنے دروازے پر اجنبیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے
تھے۔

”ہم آپ سے کچھ باتیں کر لے آئے ہیں۔“ میں نے
بتایا۔ ”ہمارا تعلق ایک اہلکار سے ہے۔ ہم سمجھنا لوگ ہیں۔“
”آؤ گی آؤ بسم اللہ۔“ ہالے دروازہ کھول دیا۔

اہلکار نے ہمیں اپنی بیٹھک میں بٹھا دیا تھا اور
گناہ شروع ہونے سے پہلے ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ
ہمارے لیے چائے لینے چلے گئے تھے۔

اس چھوٹے سے کمرے میں کتابیں بھی رکھی ہوئی
تھیں۔ جن سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس گھر میں علم موجود
ہے۔ بابا کچھ دیر میں بڑے سلیقے سے چائے میں چائے لے کر
آ گئے۔ ”پتا نہیں جی۔ کیسی چائے بنی ہوگی۔“ بابا نے کہا۔
”خود سے بنائی پڑتی ہے نا۔ اسی لیے اندازہ نہیں ہوتا۔“
”کیا آپ کے یہاں کوئی اور نہیں ہے؟“ بشیر نے
پوچھا۔

”نہیں جی۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”کوئی اور نہیں ہے۔ صرف میں ہوں۔ بتائیے۔ میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”ہم نے... سنا ہے کہ یہاں ایک اسکول ہوا کرتا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں صاحب ہوتا تھا لیکن اب وہ ایک پرانی داستان بن گیا ہے۔“

”آگ کیسے لگی تھی۔“

”کچھ نہیں معلوم۔ بس رات گئے آگ لگی اور جب تک گاؤں والے بھانے کی کوشش کرتے سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس بستی سے تعلیم بھی ختم ہو گئی۔“

”افسوس ہوا سن کر۔“ میں نے کہا۔

”آپ نے گاؤں کے زمیندار سے بات نہیں کی۔“

”نہیں سلسلے میں؟“

”یہی کہ وہ اسکول دوبارہ تعمیر کروادے۔ اس کے لیے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔“

”ہاں۔ اس کے لیے تو کوئی بات نہیں ہوتی۔ لیکن وہ مجھ سے ناراض تھا جی۔ اسی لیے اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔“

”کیوں؟ وہ آپ سے ناراض کیوں تھا؟“ بشر نے پوچھا۔

”بس بھائی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”ان لوگوں کو پورا حق حاصل ہے جس سے چاہیں ناراض ہو جائیں اور جس سے چاہیں راضی ہو جائیں۔ ویسے میں نے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی لیے ناراض ہو گیا۔“

”اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا چمک گیا۔ مجھے کچھ یاد آنے لگا تھا۔“ آپ یہ بتائیں۔ آپ کی ایک بیٹی بھی ہے صاحب۔“

”ہاں۔“ وہ تڑپ اٹھا۔ ”آپ کو کیسے معلوم۔ آپ کیسے جانتے ہیں۔ کہاں ہے میری بیٹی۔ خدا کے لیے بتا دیجئے۔“

”کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی بیٹی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں ان دونوں کو غائب ہوئے چار سال ہو گئے۔“

”اس نے بتایا۔“ میں نے اس کی شادی کر دی تھی وہ اسی بستی کا نوجوان تھا اور شادی کے کچھ دنوں کے بعد دونوں میاں بیوی غائب ہو گئے۔ خدا جانے کہاں چلے گئے؟ کہاں کہاں نہیں

ڈھونڈا۔۔۔ ان دونوں کو لیکن کوئی پتا نہیں چلا۔ آپ میری صاحبہ کو کیسے جانتے ہیں۔ کہاں ملی ہے آپ کو؟“

”بابا اب سے چھ سال پہلے وہ مجھے لاہور میں ملی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ شاید وہاں کسی کالج میں پڑھتی تھی میں نے ایک بار اس سے انٹرویو لیا تھا (میں نے مصطفیٰ کہا تھا۔ میں نواز شاہ کا حوالہ نہیں دیتا چاہتا تھا) اس نے اپنے بارے میں مجھے بتایا تھا اور اب یہ من رہا ہوں کہ وہ کہیں غائب ہو گئی ہے۔“

”ہاں بیٹا۔ وہ غائب ہو گئی ہے۔“ بابا نے بتایا۔ ”اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ ہے۔“

”خدا یا۔ یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔“

”بس جو میرے خدا کی مرضی اب میں کیا کر سکتا ہوں؟“

میں نے اس بابا سے اجازت چاہی اور اس کے مکان سے باہر آ گیا۔ مجھے اب نواز شاہ سے ملنا تھا کیونکہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اس کا ہی گاؤں ہے۔ اسی کی بستی ہے۔ وہ حاکم ہے یہاں کا۔

”اب ہمیں اس بستی کے حاکم یعنی زمیندار سے ملنا ہے۔“ میں نے اعلان کیا۔

”کیوں اس سے مل کر کیا کرنا ہے؟“

”اس لیے کہ وہ میرا دوست ہے۔“ میں نے بتایا۔

”ہم دونوں کالج میں ایک ساتھ ہی ہوتے تھے۔“

”داہ پھر تو ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔“

نواز شاہ کی حویلی تک پہنچنا کوئی اتنا مشکل نہیں تھا۔ پورے گاؤں میں سب سے شاندار حویلی جس کے درودیوار سے رعب اور دبدبہ جھلک رہا تھا۔ اونچے سے گیٹ کے سامنے دو دروازے محافظ کھڑے ہوئے تھے۔

”جی آپ لوگوں کو کس سے ملنا ہے؟“ ایک محافظ نے پوچھا۔ ”ہمارے چلے اور اسٹائل سے اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم لوگ شہر سے آئے ہیں۔“

”شاہ صاحب سے ملنا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”کون سے شاہ۔ دیدار شاہ صاحب یعنی بڑے شاہ صاحب یا چھوٹے شاہ صاحب۔“

”اس وقت پتا چلا کہ نواز شاہ کا باپ ابھی زندہ تھا۔“

”چھوٹے شاہ۔ نواز شاہ سے۔“ میں نے بتایا۔ ”ان سے کہنا کہ شہر سے کچھ لوگ ان سے ملنے آئے ہیں۔“

”ہمیں کچھ دیر میں اندر بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ ہم سب حویلی کی سجادت اور شان و شوکت دیکھ دیکھ کر حیران ہوئے جا رہے تھے۔“

”خدا کی پناہ اس طبقے کے لوگ کتنے شاندار طریقے سے ہیں۔“ نائلہ نے کہا۔

”اسی لیے تو ان کے سردوں میں غرور بھرا رہتا ہے۔“

”لے تھرہ کیا پھر میری طرف دیکھا۔“ بھائی یہ بتا دو یہ نواز شاہ تمہیں پہچانے گا بھی یا نہیں۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”انسان کو بدلتے در کیا ملتی ہے۔“

کچھ دیر بعد ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ شاہ ب تشریف لا رہے ہیں پھر نواز شاہ کمرے میں داخل آرا بھی نہیں بدلا تھا البتہ بدن تھوڑا سا فرہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ارے۔ ارے تو اشعر،

یہ یار تو ادھر کہاں؟“

پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اس کی م جوئی اسی طرح برقرار تھی۔ ”یار۔ تو عجیب آدمی ہے تو اپنی اطلاع بھی نہیں دی۔ میں خود تجھے لینے آ جاتا۔“

”میں نے سمجھا تھا کہ تم اب مکمل جاگیردار اور حاکم ہو چکا نہیں لفت بھی دو گے یا نہیں۔“

”بکو اس نہیں کرو۔“ اس نے پھر نائلہ اور شیر کی طرف دیکھا۔ ”آپ لوگ معاف کریں جی ہم بہت پرانے ت ہیں۔ ہمارے درمیان ایسی عداوت ہے نکلفی ہے۔“

”جی ہاں اشعر نے راستے میں بتا دیا تھا۔“

پھر میں نے نائلہ اور بشیر کا تعارف کر دیا۔ اپنے رے میں بتایا کہ ہم کس مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کی بھی شادی ہو چکی ہے، اپنے بیٹے جیسے ایک گھرانے کی لڑکی کے ساتھ۔ ایک بیٹا بھی تھا۔

”ن نے اپنی بیوی کو بھی بلا لیا تھا۔“

وہ بھی کنگ ایڈورڈز کالج کی پڑھی ہوئی ایک لڑکی تھی۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھانے کا دور ہلا۔ چائے چلی پھر بڑے شاہ بھی آ گئے یعنی دیدار شاہ، وہی مپ داب، ویسا ہی کرخت چہرہ لیکن ہم سے بہت خوش ملائی سے ملے تھے کیونکہ میں لاہور میں دو مین باران سے مل چکا تھا۔

اب تم لوگ چار پانچ دنوں تک ہمارے ساتھ رہو گے۔“ دیدار شاہ نے حکم دیا۔

”انکل۔“ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن نواز شاہ نے مجھے اشارہ کر دیا کہ میں کسی بات میں اختلاف نہ کروں۔

اب اختلاف کی کیا گنجائش ہو سکتی تھی۔ نائلہ کو زنان خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ میں اور نواز شاہ گزرے دنوں کی

باتیں کرنے لگے تھے۔

اس وقت شبیر سونے کے لیے جا چکا تھا۔ جبکہ میں اور نواز شاہ لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ”نواز۔“ میں نے اصل موضوع چھیڑ دیا۔ ”میں نے سچ محمد سے بھی ملاقات کی ہے۔“

”کون فتح محمد؟“

”وہی تمہاری بستی کے اکلوتے ہیڈ ماسٹر اور اس لڑکی صاحبہ کا باپ۔“ میں نے بتایا۔

”اودہ تو تم اس سے ملتے ہوئے آرہے ہو۔“ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”پھر تو تمہیں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہوگا۔“

”ہاں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے اور بہت کچھ جانتا چلتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مثال کے طور پر اس سہ ماہی کے اسکول میں آگ کیسے لگی اور مثال کے طور پر صاحبہ اور اس کا شوہر کہاں غائب ہو گئے؟ کیا حادثہ ہوا ہے ان دونوں کے ساتھ؟“

”یار اتم آگئے ہو تو اب میرے دل کا بوجھ اتر جائے گا۔“ اس نے کہا۔ ”بہت دنوں سے یہ سوچ رہا تھا کہ تم کو بلا کر سب کچھ بتا دوں۔ کیونکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے اگر میں نے نہیں بتایا تو شاید میرا سینہ پھٹ جائے گا۔“

”ہاں نواز شاہ بتاؤ مجھے کیا ہے یہ سب۔“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بابا نے اپنے مقام سے بہت نیچے آ کر صاحبہ کے لیے میرا رشتہ بھیجا تھا لیکن ان لوگوں نے صاف انکار کر دیا تھا کیونکہ صاحبہ اس بستی کے کسی اور نوجوان سے محبت کرتی تھی۔“

”ہاں یار یہ تم مجھے بتا چکے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے آگے کی کیا کہانی ہے؟“

”آگے کی کہانی یہ ہے کہ یہ انکار بابا کو بہت بُرا لگا۔ بہت بُرا زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا ہوگا کہ کسی نے ان کی بات ری فیوز کی ہوگی۔ اس وقت تو انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا لیکن.....“ وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

”ہاں بتاؤ لیکن کیا؟“

”لیکن انہوں نے صاحبہ کے باپ سے اپنا بدلہ اس طرح لیا کہ اسکول میں آگ لگوا دی حالانکہ وہ اسکول انہوں نے ہی بنوایا تھا۔ وہ چاہتے تو اسے اسکول سے الگ کر سکتے تھے لیکن انہیں اتنا غصہ آیا ہوا تھا کہ اسکول ہی کو کھنڈر بنا دیا۔“

”نواز شاہ میرا بھی خیال کچھ ایسا ہی تھا۔“ میں نے

کہا۔ ”جس وقت میں نے یہ بات سنی اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ اس اسکول کی تباہی میں تمہارا یا تمہارے بابا کا ہاتھ ہے۔ چلو اب ان دونوں کے بارے میں بتاؤ۔ وہ دونوں کہاں گئے؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ اس نے اپنی گردن جھکالی تھی۔

”نہیں نواز شاہ۔ تمہیں بتانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”شروع سے آخر تک اس کہانی میں ساتھ رہا ہوں اسی لیے اس بد نصیب لڑکی کا انجام بھی معلوم ہونا چاہیے۔“

”وہ دونوں مر گئے۔“ نواز شاہ نے بتایا۔ میں سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو مجھ سے بولا ہی نہیں گیا پھر میں نے غصے سے کہا۔ ”نواز شاہ تم ایک ظالم اور بے رحم انسان ہو۔ آخر تم نے ماریا ان دونوں کو شرم نہیں آئی تمہیں۔“

”یار۔ میری بات تو سنو؟“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہ حکم بابا نے دیا تھا۔“

”تو کیا تم ان دونوں کو بچا نہیں سکتے تھے۔“ ”یار بابا کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔“ اس نے کہا۔ ”زندگی میں پہلی بار وہ میرے لیے کسی کے سامنے شرمندہ ہوئے تھے پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے ان دونوں کی موت کا اس وقت پتا چلا جب یہ کہانی ہو چکی تھی۔“

”افسوس ہے مجھے تم پر نواز شاہ بہت افسوس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے بزدل اور بے رحم نکلو گے۔ میں تمہاری دوستی پر شرمندہ ہو رہا ہوں۔“

اس نے اپنی گردن جھکالی تھی۔ ہمارے درمیان شاید کچھ کہنے سننے کے لیے رہ ہی گیا تھا۔ کتنے ظالم لوگ تھے جو ذرا سی بات پر کسی کو اس طرح ہلاک کروادیا کرتے تھے۔

میں نے اس قسم کے جاگیرداروں اور زمینداروں وغیرہ کی صرف داستانیں سنی تھیں لیکن اب ایسا ایک کردار میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس شخص سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ ”نواز شاہ ہم لوگ کل صبح یہاں سے جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیوں یار؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”اس لیے کہ تمہارا اب کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ نہ جانے کون سی بات بڑی لگ جائے اور تم مجھے بھی ٹھکانے لکوا دو۔“ ”نکو اس نہیں کرو۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”بابا تمہیں نہیں جانے دیں گے۔ تم نے ضد کی تو یہ بھی ان کی توہین ہوگی۔“

”ویسے ایک بات بتاؤ۔ ان دونوں کی موت کس طرح ہوئی اور گاؤں والوں کو کیوں نہیں معلوم؟ خود اس کا باپ بھی

اس بارے میں کچھ نہیں جانتا؟“

”ان دونوں کا کام بہت خاموشی سے رات کی ۱۲ بجے ہوا تھا۔“ نواز شاہ نے بتایا۔ ”بابا ہر کے کسی آدمی خدمات لی گئی تھیں اور اس کا کام تھا کہ وہ دونوں کو بارہ کے بعد ہمارے خاندانی قبرستان کی کسی پرانی قبر میں کر دے۔ قبرستان کے گیٹ کی چابی اس کے حوالے کر دی تھی۔ اس نے بڑی خوبی سے اپنا کام کیا۔ ان دونوں کو دفن کیا اور بابا سے ایک لاکھ روپے لے کر راتوں رات گاؤں سے نکل گیا۔“

”اوہ کتنا برا ظلم ہوا ہے اسی لیے کسی کو نہیں معلوم ہوا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا گزری؟“

”ہاں کسی کو نہیں معلوم کہ اس رات اور کیا ہوا تھا؟ اس نے بتایا۔ ”یہ راز سوائے ایک عورت کے اور کوئی لکھ جانتا۔“

”عورت۔ کون ہے وہ عورت؟“ ”عالیہ نام ہے اس کا۔“ نواز شاہ نے بتایا۔ ”کراچی میں رہتی ہے۔ تم اگر اس سے مل لو۔ تو وہ تمہیں سارا کہانی سنا دے گی۔“

”لیکن یہ عالیہ ہے کون؟“ ”اسی حویلی کی ایک ملازمہ۔“ نواز شاہ نے بتایا۔ ”بس یار۔ اب اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا ہوں جاؤ جا کر سو جاؤ۔ ویسے بھی بہت رات ہو گئی ہے۔“

میں رات بھر کروٹیں ہی لیتا رہا تھا۔ ان دونوں کے حسرتناک انجام پر بے پناہ دکھ ہو رہا تھا۔ ویسے الہ زمینداروں اور حاکموں کے لحاظ سے اس بے چاری صدمہ کے کئی گناہ تھے۔

پہلا گناہ تو یہی تھا کہ وہ ان کے علاقے میں پیدا ہوئی تھی۔ نمبر دو اس کا تعلق ایک انتہائی غریب گھرانے سے تھا یہ کہ وہ بد قسمتی سے خوبصورت بھی تھی۔ پھر یہ کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے ہی مزاج اور حیثیت کے ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ اس نے چھوٹے زمیندار کو لکھت نہیں دی تھی۔ اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ توہین کی گئی اس کی۔

تو یہ ایسے معمولی گناہ تو نہیں تھے کہ جن پر اسے معاف کر دیا جاتا۔ اتنی جرأت کی سزا تو ملنی چاہیے تھی اور وہ سزا مل گئی تھی۔

لغت ہوا ایسے معاشرے پر ایسی دولت اور طاقت پر۔

ہانے کی اجازت مانگ لی۔ میں اس حویلی میں اب نہیں سکتا تھا۔ نالکھ اور بشیر بھی بہت حیران ہو رہے تھے نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟

پھر میں نے نواز شاہ سے کہا۔ ”کیا تم مجھے اس عورت سے مل سکتے ہو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں میں تو خود یہی چاہتا ہوں کہ تم مل لو تاکہ تمہارا ذہن میری طرف سے صاف ہو۔“ اس نے پتا لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں نواز شاہ۔ میں یہ صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ ل تمہاری طرف سے کبھی صاف نہیں ہوگا اور شاید تم سے بھرتہ ملوں۔“

”لیکن میرا دل یہ کہہ رہا ہے کہ تم مجھ سے ملتے رہو۔“ اس نے کہا۔

ایسی بے جس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے اس کے باپ سے بھی ملنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اس سے روانہ ہو گئے۔ نواز شاہ اس وقت بہت اداس ہو رہا تھا۔ ”یار۔ مجھے معاف کر دینا جو کچھ ہوا ہے اس میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا۔“

”نواز شاہ تمہیں معافی مانگنی ہے تو خدا سے مانگو۔ اس عورت کے باپ کے پاس جاؤ۔ وہ بوڑھا ابھی تک اس انتظار میں آگیا ہے۔“

نواز شاہ نے پھر کچھ نہیں کہا اور ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ہاں چلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ”یار جب اس عورت عالیہ سے مل کر میرا حوالہ دو گے تو وہ تم کو سب بتانے کے لیے تیار ہوگی۔ ورنہ وہ تم سے بات بھی نہیں کرے گی۔“

ہم بوجھل دل سے.... واپس آ گئے۔ میں نے نالکھ اور بشیر کو نواز شاہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا ورنہ وہ بھی اس سے نفرت کرنے لگتے اور خواہواہ ایک ایسے ٹکڑا ہو جاتا۔

دو دن آرام کرنے کے بعد تیسری شام میں اس گھر تک گیا جس کا پتا نواز شاہ نے دیا تھا اور جہاں عالیہ رہتی تھی۔ گلبرگ کا یہ مکان دو منزلہ اور خوبصورت بنا ہوا تھا۔

”مجھے نواز شاہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ ”ہاں، ان کا فون بھی آ گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”آئیں اندر آ جائیں۔“

ڈرائنگ روم بھی بہت سلیقے کا تھا۔ اگر یہ ملازمہ تھی تو اس کے حالات بہتر معلوم ہوتے تھے۔

”جی بتائیں کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“ ”میں صاحبہ اور اس کے شوہر کے موت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ان دونوں کی موت کس طرح ہوئی تھی؟“

”میں یہ نہیں بتا سکتی۔“ ”کیوں، کیوں نہیں بتا سکتیں؟“ ”اس لیے کہ وہ دونوں ماشاء اللہ زندہ ہیں۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”کیا.....؟“ میں اچھل پڑا تھا۔ ”دونوں زندہ ہیں۔“ ”ہاں دونوں زندہ ہیں اور یہ مکان بھی انہی کا ہے۔“ وہ انکشاف پر انکشاف کیے جا رہی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ میں خود ان کی قبریں دیکھ کر آ رہا ہوں۔“ ”اب آپ کو ساری باتیں ان ہی دونوں سے معلوم ہوں گی۔“ وہ کھڑکی ہو گئی۔ ”میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔“ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت تھی۔

میں کیا سن رہا تھا۔ دونوں زندہ تھے پھر وہ سب کیا تھا؟ وہ پوری کہانی۔ ان کا غائب ہونا۔ ان کی قبریں اس کے باپ کا دادیلا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے اور یہ وہی صاحبہ تھی، اس میں کوئی شک ہی نہیں تھا۔ اس کے وہی خدو خال، وہی دلکشی، وہی تیور، وہی انداز اور اس کے ساتھ ایک معقول صورت مہذب انسان تھا جو یقیناً اس کا شوہر ہوگا۔

میں آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھتا رہا تھا۔ ”اشعر علی صاحب۔ آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں؟“ صاحبہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا پھر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ ”یہ میرے شوہر ہیں کمال شاہ۔“

کمال نے بڑی گرجوٹی سے ہاتھ ملایا تھا۔ ”صاحبہ۔ آخر یہ سب کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ سب بے پناہ محبت کی داستان ہے، اشعر صاحب۔“ اس کے شوہر کمال نے کہا۔ ”ایسی محبت جس کی مثال اس دور میں نہیں مل سکتی۔“

”یہ محبت کس طرح ہوئی؟“ ”صاحبہ بھی بولی۔“ میں

دی گئی تھیں۔ پورے گھر میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس رات چاند بھی روشن تھا لیکن اس کی روشنی وہاں پہنچی ہو رہی تھی۔

اچانک ایک ایک کر کے سارے بلب بجھا دیے گئے صرف چاندنی رہ گئی۔ خوبصورت چاندنی اور ہلکی ہلکی سوسیتی شروع ہو گئی۔ رمیز نے نائمہ کا ہاتھ تھاما اور دونوں کسی کی پردا کیے بغیر رقص کرنے لگے۔ پیار کا رقص۔

ہم سب دم بخود رہ گئے تھے۔
محبت کا ایسا انوکھا مظاہرہ کم ہی دیکھنے میں آیا کرتا ہوگا۔
جب یہ رقص ختم ہوا تو ہم بہت دیر تک تالیاں بجاتے رہے اور یہ بات صرف ایک ہفتہ پہلے کی تھی۔



محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!

میں سرگزشت کا ایک ادنیٰ قاری ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میری زندگی کا یہ سبق دیگر قارئین تک پہنچ جائے۔ امید ہے اسے جگہ ضرور دیں گی۔
فیصل اختر
(کراچی)



یہ ان کی شادی کی تیسری سالگرہ تھی۔
رمیز چونکہ ایک معروف اور مقبول کاروباری شخصیت ہے اس لیے اس سالگرہ میں اس کے گھر اور خاندان والوں میں دوستوں کی ایک بڑی تعداد بھی شریک ہوئی تھی۔
رمیز اور نائمہ نے اپنے خوبصورت گھر کے خوبصورت میں شاندار پارٹی ارنج کی تھی۔
دلوں میاں بیوی بہت خوبصورت تھے اور سفید لباس اس کے کسی خوبصورت جوڑے کی طرح تیرتے پھر رہے تھے۔
دھڑانے رشک کی کتنی نگاہوں نے ان دونوں کو اپنے میں لے رکھا ہوگا۔
لان کے پودوں، درختوں پر برقی بلبوں کی بلیں لپٹ

اور ہم راتوں رات وہاں سے فرار ہو کر یہاں آ گئے۔“
نے کہا۔ ”پورا گاؤں یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم دونوں پر اسرارہ غائب ہو گئے۔ دیدار شاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم دونوں کو مار کر دیا گیا ہے جس کے اصل کہانی صرف نواز شاہ کو معلوم ہے۔“
”شہر میں کمال کے لیے کاروبار کا بندوبست بھی نے کیا ہے۔“ صاحبہ نے بتایا۔ ”وہ تو ایسا آدمی ہے ام کہ ہم ساری زندگی بھی اس کے احسان کا بدلہ نہیں چکا کے۔“
”وہ شاید انسان ہی نہیں ہے صاحبہ۔“ میں دیر سے بولا۔ اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
”شاید وہ کوئی فرشتہ ہے۔“
”یا فرشتے سے بھی بلند کسی مخلوق کا تصور ہو سکتا ہے۔“
نواز شاہ ایسا ہے جناب۔“ کمال شاہ نے کہا۔

”اور ہمیں اس وقت تک پوشیدہ رہنا ہے جب کہ اس کا باپ زندہ ہے۔“ صاحبہ نے بتایا۔ ”ہم بہت لڑا ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں بابا سے نہیں مل سکتا کیونکہ نواز شاہ نے بہت سختی سے منع کر رکھا ہے۔“
”کیا نواز شاہ بھی یہاں آیا؟“ میں نے پوچھا۔
”کبھی نہیں۔“ صاحبہ نے جواب دیا۔
”بلکہ ہماری خواہش ہے کہ وہ کبھی بھی یہاں آئیں ہمہ کی راہوں میں آنکھیں بچھانے کے لیے بے تاب ہیں کمال شاہ نے کہا۔

میں نہ جانے کیا کیا سوچ کر وہاں آیا تھا۔ نواز شاہ خلاف میرے دل میں کیا کیا بھرا ہوا تھا اور اب میں داستان لے کر واپس جا رہا ہوں۔
میں نے نواز شاہ سے کہا تھا کہ میں اب کبھی اس پاس نہیں آؤں گا لیکن اس نے بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ میں اس کے پاس نہ آؤں۔
اور میں ایک ہفتے بعد ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ مگر اس سے لپٹ کر دیر تک روتا رہا تھا۔ ”میری جان، میرا دست تم نے انسان ہونے کا ثبوت دے دیا ہے۔“
”چھوڑا یار۔“ وہ منہ پٹا کر بولا۔ ”کیا خاک ثبوت ہے۔ وہ تو ابھی بھی مجھے یاد آتی ہے۔“
”نواز شاہ تم اس سے ملنے کیوں نہیں جاتے؟“
”نہیں یار۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”میں اس کے ساتھ نہیں جاسکتا۔ انسان ہوں نا۔ نہ جانے کس وقت پرانی مہم زندہ ہو جائے اس لیے وہ جہاں ہیں انہیں خوش رہنے دو۔“
میں ایک بار پھر نواز شاہ سے لپٹ پڑا تھا۔

230

خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسی بے غرض اور بے لوث محبت اور توجہ حاصل ہے۔“

”کیسی محبت کی بات کر رہی ہیں۔ کس کی محبت ہے؟“
”نواز شاہ کی۔“ اس نے ایک اور انکشاف کیا۔
”نواز شاہ کی محبت۔ میرے خدا میں یہ سب کیا سن رہا ہوں۔“
”جی جناب۔ یہ بہت عجیب کہانی ہے۔“ صاحبہ نے بتایا۔ ”اس شخص نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک شریف النفس انسان ہے۔ اس میں ایسا خلوص، ایسی محبت اور ایسا پیار ہے کہ اس زمانے میں اس کی مثال ہی نہیں مل سکتی۔ اس نے مجھ سے سچا پیار کیا اور اس پیار کی لاج رکھ لی۔ اس نے ثابت کر دیا کہ اس دور میں بھی انسانیت زندہ ہے۔“
”خدا کے لیے مجھے صاف صاف بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“ صاحبہ نے بتایا۔ ”میرے انکار پر نواز شاہ کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ جب کہ اس کے باپ نے اپنے سینے میں انتقام کی آگ جلا لی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے بابا کے اسکول میں آگ لگوا دی۔“
”اوہ۔ تو یہ حرکت دیدار شاہ کی تھی۔“

”جی جناب۔“ اب صاحبہ کے شوہر نے کہا۔ ”جب یہ بات نواز شاہ کو معلوم ہوئی تو وہ معافی مانگنے صاحبہ کے گھر آیا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا باپ غصے میں اس حد تک آگے چلا جائے گا۔“
اور اس وقت اس نے یہ بھی بتایا کہ دیدار شاہ مجھے اور کمال کا خون کروانا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے باپ کے سامنے مجبور ہے۔ اس کی مخالفت نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور کروں گا کہ میں خفیہ طور پر بچانے کی کوشش کروں۔“

”اور جناب۔ اس خدا کے بندے نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا۔“ کمال نے بتایا۔ ”ہماری شادی کو ایک سال ہو گیا تھا جب اس نے آ کر بتایا کہ اس نے غنڈے کو توڑ لیا ہے۔ وہ یہی ظاہر کرے گا کہ اس نے ہم دونوں کو ٹھکانے لگا کر ایک پرانی قبر میں دفن کر دیا ہے۔“
”اور یہی ہوا۔“ اب صاحبہ بتا رہی تھی۔ ”نواز شاہ نے انتہائی سختی کے ساتھ منع کیا تھا کہ ہم اس سازش کی ہوا اپنے بابا کو بھی نہیں لگتے دس۔ ان کو بھی اندھیرے میں رکھا جائے۔ ورنہ قیامت آ جائے گی۔“

”اس اللہ کے بندے نے ہمارے لیے یہ مکان خریدا

سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”یہ جھوٹ نامہ کی طرف سے نہیں
میری جانب سے ہے۔ کیونکہ میں شاید اس کو اتنی محبت
دے سکوں گا جتنی محبت کی وہ حق دار ہے۔ لہذا جھوٹ بول
رہے سے کیا فائدہ؟“

”تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔“
”فیصل۔ میں کسی اور سے محبت کرنے لگا ہوں۔
ریز نے بتایا۔“

یہ میرے لیے ایک اور انکشاف تھا۔ ریز کسی اور
چاہتا ہو یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے تو نامہ کو اپنی جان پر کھم
کر حاصل کیا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنے کیریئر کی
پروا نہیں کی تھی اور اب وہ ایک اور محبت کی خبر سن رہا تھا۔
”پلیز تم مجھے آرام اور تفصیل سے بتاؤ۔“ میں
کہا۔ ”تا کہ مجھے پتا چلے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”فیصل میرے اور نامہ کے درمیان اختلاف جس
کا ہے میں تمہیں اس کے بارے میں بتا نہیں سکتا لیکن
ضرور کہوں گا کہ اب ہم شاید ایک دوسرے کے ساتھ نہیں
سکیں۔ ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہو چکے ہیں۔ اسی
مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”میں تو ہر وقت تم دونوں کے لیے کوشش کرنے کو
ہوں۔“

”نہیں، ہم دونوں کے لیے نہیں صرف نامہ
لیے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“

”وہ اس وقت ٹوٹی ہوئی ہے، یہ اود بات ہے کہ اس
نے ظاہر نہیں کیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس فیصلے نے اس
کو کمزور کر دیا ہے۔ تم ہمارے مشترکہ دوست ہو۔ کانج
زمانے سے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ لہذا
اس کا ساتھ دو۔“

”میں اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”بہت آسان ہے۔ تم اس کے قریب ہو جاؤ۔ ایک
اچھا اور ہمدرد دوست بن کر اس کے ساتھ رہو۔ اسے سہ
دو۔ تفریح کراؤ تا کہ وہ اس دکھ کو برداشت کر سکے۔“

”خدا کے بندے۔ جب تمہیں اس کا اتنا ہی خیال
ہے تو پھر اس سے الگ کیوں ہو رہے ہو؟“

”یہ ایک دوسرا معاملہ ہے۔“ اس نے کہا ”میں نہیں
چاہتا کہ اس علیحدگی کے بعد وہ بکھر کر رہ جائے۔“

عجیب بات تھی لیکن ریز کی اس بات نے مجھے
دوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی سمجھیں کہ میرے ہر قدم کے
ماہنامہ سرگزشت

اور ٹھیک دس مہینوں کے بعد۔
ریز میرے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا، خاموش۔ اس
نے آ کر ایک ایسی خبر سنا دی تھی کہ میرے ہوش اڑ گئے تھے۔
میں اس وقت دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ریز مجھ سے
ملنے چلا آیا تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ میرا عزیز دوست تھا۔ اس کے آنے کی
خوشی ہوئی تھی لیکن اس طرح صبح صبح آنا کچھ حیرت کی بات
تھی۔ ”فیصل تم آج دفتر نہیں جا رہے ہو۔“ اس نے کہا۔
”اوکے۔“ میں مسکرا دیا۔ ”جو حکم میں ابھی دفتر فون کر
کے بتا دیتا ہوں کہ میں نہیں آ رہا۔“

”ہاں بتا دو۔“ اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا
کر آنکھیں بند کر لیں۔

”یقیناً کوئی خاص بات تھی ورنہ وہ اس موڈ میں کبھی
دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنے دفتر فون کر کے بتا دیا کہ
میں نہیں آ سکوں گا اور خود کپڑے تبدیل کرنے اور چائے
پانے چلا گیا۔

میں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اپنے خوبصورت اور
بڑے اپارٹمنٹ میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ ملازمہ ہفتے میں صرف
دو دنوں کے لیے آتی تھی۔

چائے بنا کر لایا تو ریز اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا
تھا۔ میری آہٹ سن کر وہ چونک گیا تھا۔ میں نے چائے کی
پیالی اس کے سامنے رکھ دی۔ ”ہاں میری جان اب بتاؤ
خیریت تو ہے؟“

”نہیں۔ خیریت نہیں ہے۔“ اس نے دھیرے سے
کہا۔ ”میں اور نامہ ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں۔“

”کیا.....!“ میں جیسے اچھل پڑا تھا۔ ”کیا بکواس کر
رہے ہو۔“

”سچ کہہ رہا ہوں۔ ہم دونوں نے ہمیشہ کے لیے
علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم دونوں کے دماغ تو نہیں خراب ہو گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے ابھی بھی تم دونوں کی شادی کی تیسری
سالگرہ یاد ہے جب تم نے ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کیا
تھا۔ صرف دس ہی مہینے تو گزرے ہیں اور اب علیحدگی کی خبر
سنانے چلے آئے ہو۔“

”ہاں بھی زندگی کبھی کبھی ایسے تماشے بھی دکھا دیتی
ہے۔“

”لیکن کیوں۔ اس پاگل پن کی کیا وجہ ہے؟“

اس لیے کہ اب جھوٹ کے سہارے زندگی میں گزر رہا تھا۔ یہی سمجھیں کہ میرے ہر قدم کے

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or send message at 0336-5557121

تھے۔ میں نے بھی کسی زمانے میں نامہ سے محبت کی تھی لیکن اس کا اظہار نہیں ہو پایا تھا۔ دل ہی دل میں اس کی پرستش کرتا رہا تھا۔ رمیز نے پیش قدمی کی اور وہ نامہ کو لے اڑا۔ اس نے محبت کا اظہار بھی کیا اور شادی کی پیش کش بھی۔

ان دونوں کی شادی ہو گئی اور میں اپنی تمناؤں اور اپنے خوابوں کے ساتھ تیار ہو گیا۔

اور اب وہ مجھ سے یہ کہے جا رہا تھا کہ میں اس کے قریب ہو جاؤں۔ اس کا دل بہلاؤں۔ اس کا ساتھ دوں۔ نہ جانے ان دونوں کے درمیان ایسی کون سی بات ہو گئی تھی؟

رمیز مجھے گھر پر بلا کر چلا گیا تھا۔ اس نے تاکید کی تھی کہ میں شام کو اس کے پاس پہنچ جاؤں۔

میں شام کو اس کے گھر گیا تو رمیز نہیں تھا صرف نامہ تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک پھلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ ”آؤ فیصل رمیز تو اس وقت نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیا ضروری ہے کہ میں رمیز ہی سے ملنے آؤں۔ میں تمہارا ہی تو دوست ہوں۔“

”کیوں نہیں۔ بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“

میں آرام سے بیٹھ گیا۔ اس گھر میں کسی قسم کا کوئی تکلف نہیں تھا، اپنا ہی جیسا تھا۔

نامہ کچھ دیر بعد چائے لے آئی تھی۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بھیجی سی ہے۔

”نامہ۔“ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”میں یہ کس قسم کی حماقت سن رہا ہوں۔“

”اوہ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”رمیز نے تمہیں بتا دیا ہے۔“

”ظاہر ہے کہ وہ سب سے پہلے میرے پاس آیا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن مجھے اس کی بکواس پر یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”یہ بکواس نہیں سچائی ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”ہم دونوں نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ تم یہ سوال کرو گے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے تو میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گی۔ یہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔“

”آخر معاملہ کیا ہے؟“ میں زچ ہو چکا تھا۔ ”نہ تو رمیز تیار ہے اور نہ تم تیار ہی ہو۔“

”میں نے کہا نا کہ میں نہیں بتا سکتی۔“ نامہ کی آواز

بھرائی ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ اس کی آنکھوں میں آنے وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

میں اس کی حالت دیکھ کر کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس خوبصورت چہرے کی اداس دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں دیر اس کا انتظار کر کے واپس آ گیا تھا۔

دوسرے دن رمیز کا فون آیا، وہ میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم اس سے ملنے چلے گئے آج بھی ملے جانا پلیز۔“

میں نے رمیز کو ایک بار اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے میری بات یہ کہہ کر ختم کر دی۔ ”فیصل جو فیصلہ ہو وہ ہو چکا اب اس کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ پلیز اس موضوع پر اب کچھ مت کہنا۔“

”شام کے وقت میں پھر رمیز کے گھر چلا گیا۔ نامہ کا گھر ہی تھی۔ اس نے کہا۔“ فیصل اب اس گھر میں شاید رمیز تمہاری ملاقات نہ ہو اس نے کہیں اور رہنا شروع کر دیا ہے۔“

”ظاہر ہے میں اس پاگل پن کے بارے میں اور کہہ سکتا ہوں۔“

”میں تم سے ایک بات کہوں میری بات مانو گے۔ مجھ سے اب اس موضوع پر بات مت کرو۔“ اس نے کہا۔

”اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔“

”تو پھر کس موضوع پر بات کروں؟“

”زمانے کی باتیں، اپنی باتیں۔ تم نے کیا سوچا۔ زندگی کس طرح گزارنا چاہتے ہو۔ ابھی تک شادی کیوں نہ کی وغیرہ وغیرہ۔“

اور ہم باتیں کرتے رہے زمانے بھر کی ان باتوں درمیان ہم نے رمیز اور نامہ کی شادی شدہ زندگی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی پھر نامہ ہی کی تجویز پر ہم آؤنگ گئے

لیے نکل گئے تھے۔ اس وقت میرے دل کی حالت بہت غلط ہو رہی تھی۔ نامہ کے ساتھ وقت گزارنے کا خواب تو وہ زمانے کا تھا لیکن اس خواب کی تکمیل کس انداز سے ہو رہی تھی

نامہ کے ساتھ گھومتے اور باتیں کرتے ہوئے میرے دل کے چور نے آواز دی۔ ”فیصل تم یہ اچھا نہیں کر رہے

نامہ تمہارے دوست کی بیوی ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ ریز رو رہنا چاہیے۔“

پھر اندر ہی سے جواب آیا میں جو کچھ کر رہا ہوں اس میں میری مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے یہ میں اپنے دوست کی مرضی سے کر رہا ہوں وہ جانتا ہے سب کچھ۔

نامہ نے ایک بار چلے چلے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

ہم اس وقت ایک ہوٹل کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اس ہوٹل میں کھانے کا مشورہ اسی نے دیا تھا اور جب ہانے لگے تو اس نے کہا۔ ”نہیں فیصل ہم اس طرح ہانے کے۔“

”تو پھر۔“

”تم میرا ہاتھ تھام لو۔“ اس نے کہا۔

”نامہ۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہم اس طرح ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے ہٹ گئے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں اس کی کیفیت کے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میری کیفیت بہت بُری ہو گئی۔ دل کا یہ حال تھا جیسے سینہ سے باہر آ جائے گا ایسا

شاید پہلے بھی نہیں ہوا ہوگا۔“

ہم اسی طرح ہوٹل میں داخل ہوئے۔ اور ایک عجیب بات ہوئی رمیز اسی ہوٹل میں موجود

ہم دونوں کو اس طرح آتا۔ دیکھ کر وہ چونک اٹھا تھا۔ نے گھبرا کر نامہ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا لیکن نامہ نے فوراً ہی

اٹھ دو بارہ تھام لیا تھا۔ مجھے شرم سی آر رہی تھی لیکن نامہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”نامہ یہ اچھا نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔

”کیوں اس میں کون سی بُرائی ہو گئی؟“ نامہ نے کہا۔

”اب وہ خود مجھ سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتا تو اس سے انے یا شرممانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”اس کا بھی کہنا اپنی جگہ درست تھا لیکن مجھے رمیز سے محسوس ہو رہی تھی لیکن اب شاید نامہ اس سے اکڑ چکی

اسی لیے اس نے رمیز کی پروا نہیں کی تھی۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ بہاروں اور خوابوں کے

مہمان۔ میں اور نامہ بہت تیزی سے ایک دوسرے کے ہب آتے جا رہے تھے۔ ویسے نہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ

الہام کیا ہوگا؟ رمیز نے ابھی تک نامہ کو مکمل طور پر نہیں چھوڑا تھا اس

چھوڑ دینے کے بعد ہی میں اور نامہ ایک ہو جانے کے سے میں کچھ سوچ سکتے تھے اس سے پہلے تو ظاہر ہے یہ

سی بات تھی۔ ایک بار اور ایسا ہوا۔ ہم دونوں ساحل پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے تھے

میز نے دیکھ لیا۔ اس بار بھی نامہ نے اس کی کوئی پروا

نہیں کی تھی۔ وہ بدستور مجھ سے ہاتھیں کرتی رہی تھی۔

اور اب میں بھی کسی حد تک اسے اور خود کو حق بہا اب سمجھنے لگا تھا۔ ظاہر ہے جب ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق

ہی نہیں رہا تھا تو پھر ڈرنے اور شرممانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک چل سکتا تھا۔ اسی لیے ایک دن

میں نے نامہ سے کہا۔ ”نامہ بہتر یہی ہے کہ تم اب رمیز سے صاف صاف بات کر لو۔“

”کیا بات کر لوں؟“

”یہی کہ وہ اب تمہیں چھوڑ دے۔“ میں نے کہا۔

”کیونکہ نہ تو تم مطلق ہو کر زندگی گزار سکتی ہو اور نہ میرے بس کا روگ ہے، ہم دونوں کو کسی ایک نتیجے پر پہنچ جانا چاہیے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ نامہ نے میری تائید کی۔ ”میں اس سے بات کر رہی ہوں۔“

اس گفتگو کے دوسرے دن نامہ نے فون کر کے بتایا۔ ”فیصل رمیز سے میری بات ہو گئی ہے، وہ اگلی لہجہ کرنے آ رہا ہے۔ تم بھی آ جانا۔“

”نامہ۔ میرا آنا شاید مناسب نہیں ہوگا۔“

”کیوں نہیں ہوگا؟“ اس نے کہا۔ ”تم رہو گے تو مجھے تمہاری وجہ سے حوصلہ ملتا رہے گا۔“

”اوکے میں پہنچ جاؤں گا۔“

وہ رات میرے لیے بہت بے چینی کی تھی۔ طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا کل آنے والا کل میرے اور نامہ کے لیے کتنا عجیب ہونے والا تھا۔

اگر کوئی اور ہوتا تو مجھے اتنی پروا بھی نہیں ہوتی لیکن یہ معاملہ رمیز کا تھا جو میرا دوست تھا لیکن اس میں میرا بھی کیا قصور رمیز نے تو خود ہی نامہ کو چھوڑ دیا تھا اب وہ اپنے منہ سے کیا کہہ سکتا تھا۔

دوسری شام میں نامہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس شام نامہ نے میک اپ اور لباس میں خاصا

اہتمام کر رکھا تھا اور بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی اور اس کی

آنکھوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے۔ ”رمیز بس آنے ہی والا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور

اس کے آتے ہی ایک نئی زندگی شروع ہو جائے گی۔“

رمیز ٹھیک سا زے پانچ بجے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت بو کے تھا۔ اس نے آتے ہی وہ پھول نامہ کو

دے دیا تھا اور نامہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میرے لیے یہ منظر بالکل ہی غیر متوقع اور حیرت انگیز

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم!

آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی اور چھاپی ہوں گی، آج میں آپ کو اپنا ہی ایک واقعہ سنارہا ہوں جو یقیناً دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ چور پر مور کی صحیح تشریح یہ یہ کہانی۔
(فیصل آباد)

آخری شرط

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہوگا۔
مجھے بات بے بات شرط لگانے کی عادت تھی اور اپنی ہوشیاری سے میں اکثر شرط جیت بھی لیتا تھا۔ مثال کے طور پر کئی واقعات ہیں۔ ایک بار میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔

سامنے والی میز پر ایک خونخوار شکل کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ایک دوست نے کہا۔ ”یار بدرو یہ آدمی کتنا خطرناک دکھائی دیتا ہے۔“

یاد رہے کہ میرا پورا نام بدرالدین ہے لیکن یار لوگ پیار سے بدرد کہتے ہیں اور زیادہ پیار ہو تو بدروح بھی کہتے تھے ہیں۔

”ہاں ہے تو خطرناک۔“ میں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔

کرے تم دونوں کا تو یہ کھیل ہو گا لیکن کسی اور کے لیے شام، کھیل نہ ہو۔“

”ہاں یار یہ شاید ہماری حماقت تھی۔“ رمیز نے کہا۔
”بہر حال آج ہم دونوں کو ایک نئی زندگی شروع کرنی پڑی۔ ایک انتہائی پیار بھری زندگی۔“

یہی نامہ نے بھی کہا تھا کہ آج سے اس کی ایک زندگی شروع ہو جائے گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ رکھا تھا اور خود میں بھی اس وقت ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ اس وقت میرے وجود میں کیسی توڑ پھوڑ ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کس طرح میرا دل رو رہا تھا۔ میرے سارے خواب ذرا سی دیر میں بکھر کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ یہ کوئی اچھا مذاق نہیں کیا تھا۔

”فیصل۔“ اس بار نامہ نے مجھے مخاطب کیا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں کہ اس وقت تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہو گی مجھے احساس ہے کہ تم مجھ سے واقعی محبت کرنے لگے تھے لیکن ایک بات بتاؤ کیا ہم اب بھی ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے۔ ایک اچھے دوست کی طرح ایک مہربان ہمدرد کی طرح۔“ اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”بتاؤ تم ہمارے درمیان ایسی محبت نہیں ہو سکتی۔“

”کیوں نہیں؟“ میں نے اپنے آنسو اپنے سینے ہی میں چھپا لیے تھے۔ ”کیوں نہیں ہو سکتی؟ میں تو تم سے ہر قسم کی محبت کرنے کو تیار ہوں۔“

وہ ہنس پڑی۔ رمیز بھی ہنس دیا تھا۔ میں بھی مسکرا رہا تھا اور اس کمرے میں محبت اپنی پوری توانائی کے ساتھ ڈرائی تھی اور احساس دلارہی تھی کہ محبت کے ہزار پہلو ہوا کرتے ہیں۔

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں۔ میں یہ کہانی ان دونوں کی شادی کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر لکھ رہا ہوں۔ آج بھی سب کچھ اسی تیسری سالگرہ کی طرح ہے۔ روشنائی مغل کردی گئی ہیں۔ چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور دونوں ہلکی ہلکی موسیقی میں ایک دوسرے کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔

اور خود میں بھی اب تنہا نہیں ہوں میرے ساتھ میری بیوی افروز ہے۔ بہت خوبصورت اور خیال رکھنے والی بالکل نامہ کی طرح اس کی صورت نامہ ہی جیسی ہے کیونکہ وہ نامہ کی چھوٹی بہن ہے۔ یہ شادی نامہ ہی نے کرائی ہے ہمارے درمیان پیار کے رشتے اور گہرے ہو گئے ہیں۔

شما

تھا۔
”فیصل تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ رمیز نے کہا۔ ”تم نے میری محبت مجھے واپس دلا دی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ نامہ بھی تمہاری شکر گزار ہے۔ کیوں نامہ۔“

”ہاں۔“ نامہ نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایک دوسرے سے بہت دور چلے جاتے۔“
”میں نہیں سمجھا کہ یہ سب کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ایک ڈراما۔“ رمیز نے کہا۔ ”ہم ایک دوسرے کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کی ہے۔“

”تو پھر ایسے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

”ضرورت اس لیے تھی کہ ہمارے درمیان بے زار کن لمحے آنے لگے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ ہماری محبت میں کمی ہوئی تھی، نہیں وہ اسی طرح تھی صرف یکسانیت سے اکتا ہٹ سی ہونے لگی تھی پھر میں نے ایک مشہور سماجی مفکر کا ایک قول پڑھا۔ اس نے کہا ہے کہ اگر محبت کا احساس شدید کرنا چاہتے ہو تو ایک رقیب پیدا کر لو۔“
”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تو تم نے اس طرح ایک رقیب پیدا کر لیا۔“

”ہاں یار۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ اس کے لیے تم سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں تھا۔ اور تم یقین کر دو کہ تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میں واقعی رقابت کی آگ میں جلنے لگا تھا اور نامہ کی محبت میرے دل میں شدید ہوتی جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے تاکہ ہے۔ اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے نامہ کو تم مجھ سے چھین کر لے جا رہے ہو بس یہ ہوا کہ میں نے اور نامہ نے فون کر کے یہ طے کر لیا کہ اب بہت ہو گئی اس کہانی کو اب ختم ہو جانا چاہیے اور ہمیں احساس ہوا کہ ہماری محبت پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ اسی لیے اب ہم دونوں تمہارے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑے ہیں۔“

”بہت بہت مبارک ہو یار۔“ میں نے کہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت میرے دل کی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ ”مبارک ہو کہ تم دونوں نے بہت زبردست اداکاری کا مظاہرہ کیا اور اس بات کی بھی مبارک کہ تمہارے درمیان پیار کا رشتہ کہیں زیادہ مضبوط ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بتا دوں کہ آئندہ اس قسم کا تجربہ مت کرنا ہو سکتا ہے کہ جس انداز سے آج میں نامہ کو واپس کر رہا ہوں کوئی اور نہ

”کیا تو اس کو تھپڑ مار سکتا ہے؟“ دوست نے پوچھا۔
”مجھے اپنی زندگی عزیز ہے بھائی۔“ میں نے کہا۔
”میں خواہتا ہوں کیوں تھپڑ ماروں، ہاں اگر شرط لگاؤ تو پھر سوچا جاسکتا ہے۔“

”چل دو سو روپے کی شرط۔“
”اس خطرناک آدمی کے لیے دو سو روپے بہت کم ہیں۔“ میں نے احتجاج کیا۔
”اچھا تو پھر تین سو روپے۔“
”ہاں اب سوچا جاسکتا ہے۔“ میں نے ہنکاری لی۔
”بس بھائی تو میری مرہم پٹی کا سامان تیار رکھ میں اسے مار کر آتا ہوں۔“

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس آدمی کے پاس پہنچ گیا۔
”جناب عالی مجھے آپ سے ایک درخواست کرنی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔ میری پوری بات سن لیں گے۔“
”کیا بات ہے؟“ وہ غرایا۔

”پہلے وعدہ کریں کہ آپ میری پوری بات سنیں گے۔“
”اچھا بولو تو سہی۔“
”میں آپ کو ایک تھپڑ مارنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”کیا!.....؟“ غصے سے اس کے گال لرزنے لگے۔
”کیا بکواس کر رہا ہے۔“

”جناب۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ آپ میری پوری بات سنیں گے۔“ میں نے کہا۔
”اچھا چل بتا کیا بات ہے؟“

”میں آپ کو ڈیڑھ سو روپے دوں گا۔“ میں نے کہا۔
”خود سوچ لیں ابھی اسی وقت آپ کو ڈیڑھ سو روپے مل جائیں گے اور آپ کون سا روز روز اس ہونٹ میں آتے ہیں کہ لوگ آپ کو پادری نہیں گے، ایک ہلکے سے تھپڑ کے بدلے ڈیڑھ سو روپے کوئی اتنا مہنگا سودا نہیں ہے، اگر کوئی مجھے صرف پچاس روپے بھی دے تو میں تھپڑ کھالوں۔“

اتنا کہہ کر میں بھاگنے کی پوزیشن میں آ گیا یعنی وہ ذرا سا بھی غرائے تو میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ لوں لیکن اس کو بھی شاید پیسوں کی ضرورت تھی اس لیے اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چل ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن تجھے پیسے بڑھانے ہوں گے۔“

”چلیں دو سو اس سے زیادہ میں نہیں دے سکوں گا۔“
”تو نکال دو سو۔“
میں نے اپنی جیب سے دو سو نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔

دے۔ اس نے اپنا گال آگے کر دیا۔ چونکہ پچاس روپے سے چلے گئے تھے اسی لیے میں نے خاصا زور وار تھپڑ مار دیا تھا۔

تو یہ تھی میری شرط جیتنے کی تکنیک۔
اور اسی تکنیک کے بھروسے پر میں کلن بھائی سے 4 گنا تھا۔ کلن بھائی ایک زبردست آدمی تھے پینتالیس روپے پچاس کے درمیان، بہت زبردست صحت تھی ان کی۔ مگر زمانے میں شکاری بھی رہ چکے تھے۔ ان کی سب سے 4 خوبی یہ تھی کہ وہ گپ ہانکنے کے ماہر تھے۔ ہمارے نکاح کا ایک بڑا سا چوترا تھا، بالکل روایتی چوتروں کی طرح جن درختوں کے سائے ہوتے ہیں۔

وہ چوترا کلن بھائی کا اڈا تھا۔ وہ شام کے وقت اپنے دوستوں کو لے کر بیٹھ جاتے اور گپ شپ چلتی رہتی تھی۔ کلن بھائی کی شخصیت کی ایک اور خاص بات ان کی موٹھیں تھیں۔ واقعی بہت ہی شاندار موٹھیں تھیں کلن بھائی کی۔ وہ جانے ان پر کتنی محنت کی ہوگی، وہ خود کہا کرتے تھے کہ دروازے کا ایک پاؤ مکھن ان موٹھوں کو پلایا جاتا ہے۔

کھاتے پیتے آدمی تھے اسی لیے ایک پاؤ مکھن موٹھوں کو پلا سکتے تھے اور خود بھی پی سکتے تھے۔ اس اڈے ان ہی کے دم سے چائے کا دور چلتا رہتا تھا۔

سامنے ہی ایک ہوٹل تھا جہاں تو کلن بھائی کسی بندے کو بھیج دیتے کہ جاتنی چائے کا آرڈر دے کر آجایا بھی وہیں سے آواز لگا دیتے۔ ”استاد جلدی سے بارہ چائے بھیج دے۔“ اور استاد فوری طور پر چائے تیار کرنے لگتا۔

ایک دن کلن بھائی نے فرمایا۔ وہ اس وقت اپنے محل کے شکار کا واقعہ سن رہے تھے۔ ”بھائیو ہوا یہ کہ میں نے انداز لگا لیا کہ کوئی بہت ہی وزنی مچھلی کاٹنے میں پھنس چکی ہے کیونکہ اس میں اتنا زور تھا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ لے رہی تھی۔ بہر حال میں نے بھی جان لڑا دی اور کھینچنا شروع کر دیا۔ دس منٹ کے بعد وہ چار من کی مچھلی اوپر آئی تھی۔“

”چار من کی۔“ سننے والوں نے اپنی سانسیں روک لی تھیں۔

”ہاں بھائی۔“ انہوں نے بڑی بے نیازی سے چاروں طرف دیکھا۔ ”وہ تو میں نے تم لوگوں کے تکلف میں وزن کم بتایا ہے ورنہ اس کا وزن اور بھی زیادہ تھا۔“

سب واہ واہ کرنے لگے۔ اس وقت نہ جانے مجھے کما مومجھی کہ میں بول پڑا۔ ”کلن بھائی ایک بار میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔“

”اچھا وہ کیا؟“ اب وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔
”میں نے جب کاٹنا باہر نکالا تو ایک جلتی ہوئی لائین مل آئی۔“ میں نے کہا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو پانی سے جلتی ہوئی لائین کیسے نکلتی ہے؟“
”کلن بھائی آپ مچھلی کا وزن کم کر دیں میں لائین بتا ہوں۔“

اس پر جو قہقہے پڑے ہیں تو کلن بھائی کی موٹھیں بھی ہلانے لگی تھیں۔ اس واقعے کے کئی دنوں بعد تک کلن بھائی مجھ سے ناراض ناراض رہے تھے بعد میں سیٹ ہوتے چلے گئے۔

ایک دن میرے ایک دوست نے کہا۔ ”یار تو بڑا یار بنتا ہے، تو کلن بھائی کی موٹھیں صاف کر دے۔“
”موٹھیں۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
”بے کیوں میری جان کا دشمن ہوا ہے، کلن بھائی جتنا شریف پاتا ہی خطرناک بھی ہے۔ ہاتھ چلانے میں اس کا کوئی بے نہیں ہے۔ دو منٹ میں آنتیں باہر نکال دے گا۔“

”اے جا..... پھر تیری استاد کی کہاں گئی؟“
”استادی کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں شیر کے منہ میں دے دوں۔“ میں نے کہا۔

”یہی تو دیکھنا ہے۔ تو بڑا شرط لگا تا پھر تا ہے، چل میں ارکی شرط ٹھہری۔ اگر تو نے ان کی موٹھیں صاف کر داور میں میں ہزار تیرے ہو گئے۔“

”میں ہزار تو بہت بڑی رقم ہے اس کے لیے میں کچھ ہی کر سکتا ہوں۔“

”لیکن یاد رکھ اس کی بھی ایک کنڈیشن ہے۔“
”اب اس کی کیا کنڈیشن ہے؟“

”ان کی موٹھیں ان کے ہونٹوں میں صاف ہوں گی۔ ہاتھتے ہوئے صاف ہوں گی ایسا نہیں ہوگا کہ تو نے انہیں بے ٹی کی دوا دے دی اور وہ جب بے ہوش ہو گئے تو استرا لے ان کی موٹھیں صاف کر دیں یہ نہیں ہوگا۔“

”یار یہ تو بہت کڑی شرط ہے۔“
”یہی تو ہے۔ اب تجھے حلوہ تو نہیں مل سکتا۔“

معاملہ میں ہزار کا تھا۔ میرے سیریس ہونے کی وجہ یہ تھی آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں نے کوئی شرط جیتی ہو اور رقم نہ ملی ہو۔ اس معاملے میں یہ لوگ بہت کمرے تھے۔
”کیا سوچ رہا ہے بد رو؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اپنی گردن ہلائی۔ ”میں تیار ہوں۔“

”واہ میرے شہر اب دیکھتا ہوں تیری کارگر مری۔“
اس شام جب کلن بھائی کی بیٹھک جی تو میں وہاں موجود تھا۔ میری نگاہیں ان کی شاندار موٹھوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

”کلن بھائی۔“ میں نے انہیں مخاطب کیا۔ ”میں نے پورے شہر میں آپ جیسی خوبصورت موٹھیں نہیں دیکھیں۔“
”یہ تو ہے۔“ کلن بھائی اپنی موٹھوں پر تاؤ دینے لگے۔ ”بڑی محنت ہوئی ہے اس پر۔“
”اور خرچ بھی تو بہت ہوا ہوگا۔“

”بہت۔ اب تک کم از کم پچیس ہزار صرف ان موٹھوں پر خرچ کر چکا ہوں۔“

”کلن بھائی۔ آپ یہ موٹھیں میرے ہاتھ لے دیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا!.....؟“ کلن بھائی حیران رہ گئے۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو۔ موٹھیں بیچ دوں؟“

”جی ہاں کلن بھائی۔ یہ موٹھیں مجھے دے دیں۔ میں اس کے بدلے آپ کو تیس ہزار روپے دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور پورا محلہ اس بات کا گواہ ہے کہ میں پیسوں کے معاملے میں ہیرا پھیری نہیں کرتا۔ جو کہہ دیا کرویتا ہوں۔“

”یہ بات تو ہے۔“ محلے والوں نے بھی میری تائید کی۔ ”اس معاملے میں تو یہ کھرا آدمی ہے۔“

”اے تو موٹھیں کیسے بیچ دوں اور میری موٹھیں لے کر کیا کرے گا؟ میرے چہرے سے نکلنے کے بعد یہ تیرے کس کام آئیں گی؟“

”یہ میرا در دوسرے کلن بھائی۔“ میں نے کہا۔ ”تم تو سودا ملے کر لو اور ہاں ایک بات اور کوئی ضروری نہیں ہے کہ میں یہ موٹھیں لے لی لوں۔ سودا ہونے کے بعد بھی یہ تمہارے ہی چہرے پر رہیں گی۔“

”تو پھر کس بات کے پیسے دو گے؟“

”اس بات کے کہ جب میں چاہوں گا یا مجھے ضرورت ہوگی تم بغیر کسی پس و پیش کے اپنی یہ موٹھیں میرے حوالے کر دو گے۔“

”بھائیو اس کا شاید دماغ خراب ہو گیا ہے۔“
”اب یہ سب رہنے دو کلن بھائی۔“ میں نے کہا۔ ”تم تو معاملے کی بات کرو۔ ایڈوائس کے پانچ ہزار میں ابھی دینے کو تیار ہوں۔“

کلن بھائی سوچ میں پڑ گئے تھے ظاہر ہے کہ ایسا پہلی بار ہوا ہوگا کہ کوئی ان کی موچھوں کا سودا کر رہا ہوگا۔ محلے والے بھی اس انوکھے سودے میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ ان سبھوں کی یہ خواہش تھی کہ میرے اور کلن بھائی کے درمیان یہ سودا ہو جائے۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ کلن بھائی نے محلے والوں کے اکسائے پر ہاں کر دی۔ ”میں اپنی موچھیں تمہارے ہاتھ چچ رہا ہوں۔“

”تو پھر کاغذ پر لکھوا لو اور گواہوں کے دستخط بھی ہو جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔“

اُسی وقت ایک انگریز منٹ تیار کر لیا گیا جس کے مطابق پارٹی نمبر ایک یعنی کلن بھائی کی موچھیں پارٹی نمبر دو یعنی بدرالدین نے دس ہزار روپوں کے عوض خرید لی تھیں اور ایڈوانس کے طور پر پانچ ہزار روپے دے دیے تھے اور شرط کے مطابق جب بھی پارٹی نمبر دو یعنی بدرالدین کو موچھوں کی ضرورت ہو سکتی تھی وہ پارٹی نمبر ایک سے موچھیں لے سکتا تھا چاہے وہ موچھیں آدمی ہوں یا پوری ہوں۔ پارٹی نمبر ایک یعنی کلن بھائی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔

دوسری شق یہ تھی کہ اگر پارٹی نمبر ایک یعنی کلن بھائی نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے موچھیں دینے سے انکار کر دیا تو پھر پارٹی نمبر دو یعنی بدرالدین کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ وہ کلن بھائی سے پچاس ہزار روپے وصول کر لے۔“

معاہدے پر گواہوں کے دستخط بھی ہو گئے اور میں نے ایڈوانس کے طور پر پانچ ہزار روپے کلن بھائی کو دے دیے۔ کلن بھائی اس وقت تک اُجھنوں میں تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

ویسے میں نے دیکھا کہ ایک دو بار عادت کے مطابق موچھوں پر تاؤ دینے کے لیے ان کا ہاتھ ہونٹوں تک گیا تھا پھر جلدی سے واپس آ گیا شاید انہیں یہ احساس ہو رہا ہوگا کہ اب یہ موچھیں کسی اور کی ہو چکی ہیں۔

میرے دوستوں کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ حیران رہ گئے تھے۔ ”ابے یہ کیسی شرط لگالی۔“

”یہی تو اصل کارِ گیری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب تم لوگ تماشا دیکھتے رہنا۔“

”یہ تو نقصان کا سودا ہے۔ کلن بھائی کی موچھیں لے کر کیا کرے گا۔ وہ بھی تیس ہزار روپے میں۔“

”تم لوگ دیکھ لیتا میں نے تیس کی جگہ ساٹھ وصول نہیں کیے تو میرا بھی نام نہیں۔“

اب میں اس انتظار میں تھا کہ ایسا کوئی موقع مل جائے کہ میں کلن بھائی سے اپنے پیسے مع منافع کے وصول کر لوں اور ایک دن قدرت نے یہ موقع فراہم کر ہی دیا۔

کلن بھائی تہا زندگی گزارا کرتے تھے یعنی ان کی وغیرہ نہیں تھی۔ بہت پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا کے بعد سے اب تک صرف موچھوں پر گزارا تھا۔

کلن بھائی ایک ہوٹل میں ایک عورت کے ساتھ دکھائی دیے تھے۔

اس زمانے میں بہت سے ہوٹلز میں کیمین بنے ہوئے تھے۔ میں جائے پینے کے ارادے سے ہوٹل میں داخل ہوا اتفاق سے کیمین کا پردہ اپنی جگہ سے مل گیا تھا اور مجھے کلن بھائی اس عورت کے ساتھ دکھائی دے گئے۔

وہ ایک جوان اور قبولِ صورت عورت تھی۔ کلن بھائی دل و جان سے اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکے تھے۔ میں ان کے برابر والے کیمین میں جا کر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کی شخصیت اعلیٰ شاندار ہوگی۔“ وہ عورت کہہ رہی تھی۔

”کیا خاص بات لگی میری شخصیت میں۔“

”آپ کی موچھیں۔“ اس عورت نے کہا۔

”تسلیم میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ تم اتنی اچھی ہوگی۔“ کلن بھائی کی آواز آئی ”ورنہ عام طور پر قلمی دوستی کے نام پر ایک دوسرے کو دھوکے ہی دیے جاتے ہیں۔“

پھر مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کے درمیان قلمی دوستی کا سلسلہ تھا اس زمانے میں اس قسم کی دوستیاں بہت عام تھیں اور شاید یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔

لیکن کلن بھائی کی قسمت کہ میں نے پہلی ہی ملاقات میں انہیں دیکھ لیا تھا۔

میں ان کی باتیں سنتا رہا۔ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کلن بھائی بہت خوش ہیں کیونکہ انہیں کسی کی محبت حاصل ہو گئی تھی۔ بہر حال مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ ان دونوں نے اگلی ملاقات کہاں رکھی ہے۔

اب یہ ایسا موقع تھا جس سے مجھے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں نے ایک شام کلن بھائی سے کہا۔ ”کلن بھائی میں آپ کو ایک مشورہ دوں۔“

”ضرور۔“

اس وقت جینٹل حسبِ معمول آباد تھی۔ کلن بھائی بہت ترنگ میں تھے اور سب کو دو دو بار چائے پلوا چکے تھے۔

”میرا مشورہ یہ ہے کلن بھائی کہ اب آپ کی طرف محلے والوں کی دعوت ہو جائے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ شادی کر لیں۔ خدا نے سب کچھ رکھا ہے، کیا نہیں ہے آپ کے پاس پھر یہ اکیلی زندگی گوا چھی نہیں لگتی۔ کیوں بھائیو۔“ میں نے دوسروں کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں بدر وٹھیک کہہ رہے ہیں، کلن بھائی آپ کی کر لیں محلے میں رونق ہو جائے گی۔“

”خود سوچیں کلن بھائی کوئی مرنے والے کے ساتھ تو جس مر جاتا۔ آپ کی بیوی کے انتقال کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ تو آپ کی شرافت ہے کہ آپ ابھی تک ان کی یادوں میں سے لگائے بیٹھے ہیں لیکن کب تک؟“

کلن بھائی کی موچھیں تھر تھرانے لگی تھیں۔ وہ بار بار ہل بدل رہے تھے۔ انہیں میرا مشورہ یقیناً بہت پسند آیا تھا۔ وہ تو ٹھیک ہے۔“ کلن بھائی نے کہا۔ ”لیکن میرے لیے ملنے کہاں سے آئے گا؟“

”ارے کلن بھائی۔ آپ خود بھی اپنے لیے کوئی تلاش کر سکتے ہیں۔ بس کسی شریف گھرانے کی شریف خاتون کی طرف اشارہ کر دیں۔ ہم خود آپ کا رشتہ لے کر پہنچ جائیں گے کیونکہ آپ تو اکیلے آدمی ہیں آپ کی طرف سے بات دن کرے گا؟“

”ہاں یہ تو ہے۔“ کلن بھائی جلدی سے بولے۔ ”یہ تم لوگوں کو ہی کرنا پڑے گا۔ میرا تم لوگوں کے علاوہ اور کون ہے؟“

میں نے جال پھینک دیا تھا میں جانتا تھا کہ کلن بھائی اس عورت کی بات کریں گے جو ان کی موچھوں پر عاشق ہو گئی تھی۔ کئی دنوں کے بعد کلن بھائی نے مجھے بتایا۔ ”میاں میں نے لڑکی تلاش کر لی ہے بہت شریف خاندان کی ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے حیرت ظاہر کی جبکہ میں جانتا تھا کہ یہ لڑکی وہی ہو سکتی ہے جس کو میں کلن بھائی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ ”مبارک ہو کلن بھائی اب آپ یہ بتا دیں کہ آپ کا رشتہ کب لے جانا ہے؟“

”پہلے اس کے گھر والوں سے تو بات کر لوں۔ وہ لوگ رضی تو ہوں۔“

پورے محلے میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ کلن بھائی ہادی کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور انہوں نے ایک فیہ بھی دیکھ لیا ہے اور محلے والے بہت جلد شادی کی تاریخ طے کرنے جا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب محلے والے ایک ہی خاندان جیسے ہوا کرتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں پوری طرح شریک۔ آج کی صورت حال نہیں تھی کہ برابر والے کو برابر کی خبر نہ ہو۔

بہر حال وہ وقت بھی آ گیا جب ہم چار پانچ آدمی کلن بھائی کا رشتہ لے کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ ایک چھوٹا سا گھر لیکن گھر والوں سے مل کر احساس ہوا کہ وہ واقعی مہذب اور شریف لوگ تھے۔

اس دن پتا چلا کہ اس لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ شادی کے دو سال بعد ہی شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد اس نے بہت دکھ بھرے دن گزارے تھے۔ کسی اسکول میں ٹیچر تھی۔ کلن بھائی سے قلمی دوستی ہوئی تھی۔ کلن بھائی اس کو پسند آ گئے تھے جسکے اس کے گھر والوں نے بھی کلن بھائی کو پسند کر لیا تھا۔

بہر حال شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔

پورا محلہ اس شادی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ کلن بھائی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور جس وقت کلن بھائی جج دج کر تیار ہوئے اس وقت میں اپنے منصوبے کے مطابق ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”بس کلن بھائی اب معاہدے پر عمل ہو جانا چاہیے۔“

”کیسا معاہدہ!“ کلن بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

”دبی موچھوں والا۔“ میں نے کہا۔

”میاں یہ کون سا موقع ہے۔“ کلن بھائی نے کہا۔

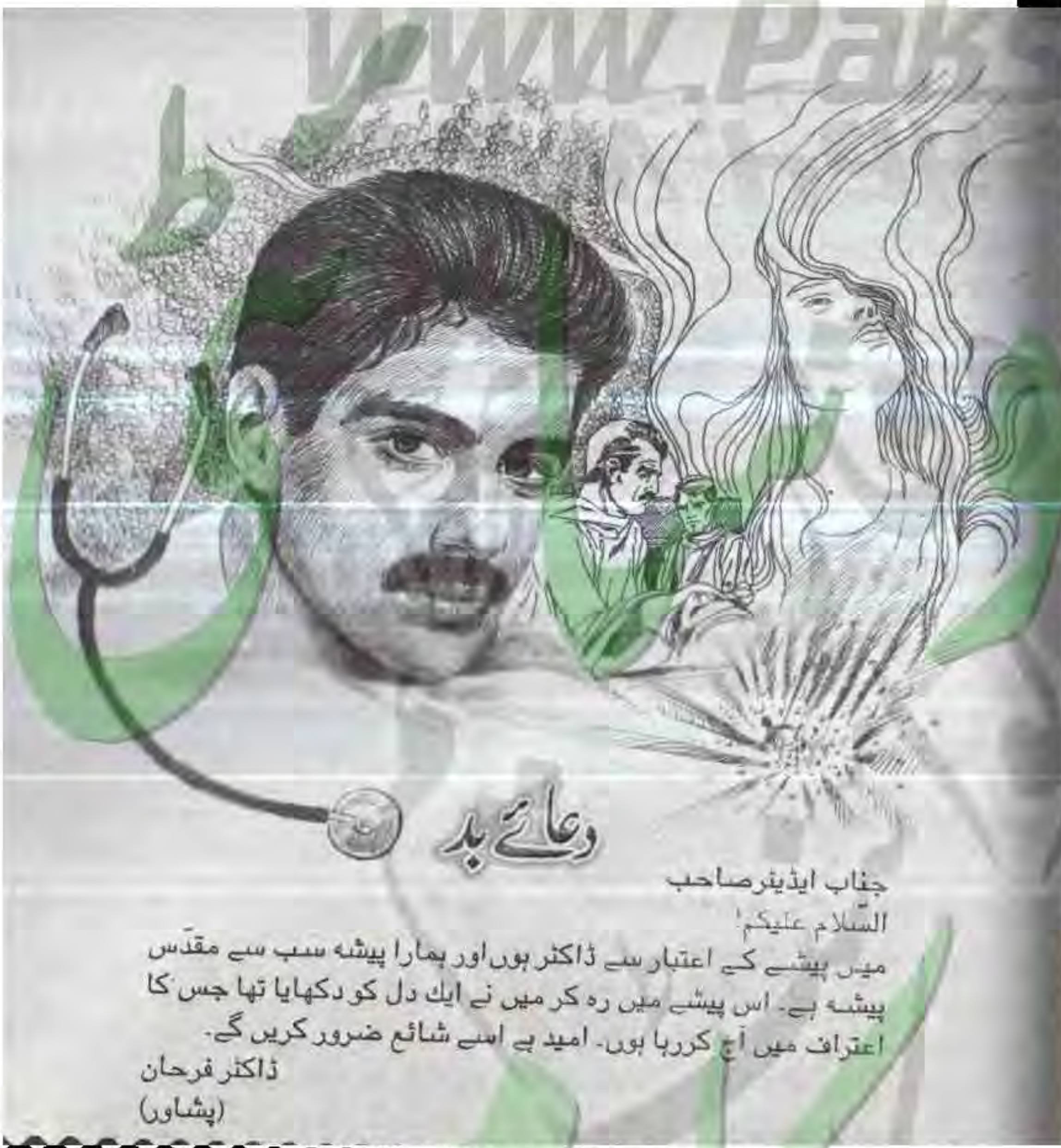
”دیکھتے نہیں میری بات کی روانگی ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتا معاہدے میں صاف صاف لکھا ہے کہ میں جب چاہوں اور جس طرح چاہوں آپ کی موچھیں لے سکتا ہوں۔ میں نے ایسا اس کے بطور ہر آپ کو پانچ ہزار بھی دے دیے تھے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی شرافت نہیں ہے کہ تم اس وقت میری موچھیں مانگنے لگو۔“

محلے والے بہت دلچسپی سے یہ بحث سن رہے تھے۔ ان سبھوں کو اس معاہدے کا علم تھا۔ میں نے اپنی جیب سے وہ معاہدہ نکال کر لوگوں کو دکھایا۔ ”بھائیو یہ ہے وہ معاہدہ جس پر آپ لوگوں کے سامنے کلن بھائی نے دستخط کیے ہیں۔ میں انہیں بتایا کچھ ہزار ابھی دینے کو تیار ہوں لیکن مجھے ان کی موچھیں چاہئیں۔“

محلے والوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ ”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ میں نے کہا۔



وہاں سے بد

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم

میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں اور بیمار پیشہ سب سے مقدس
پیشہ ہے۔ اس پیشے میں رہ کر میں نے ایک دل کو دکھایا تھا جس کا
اعتراف میں آج کر رہا ہوں۔ امید ہے اسے شائع ضرور کریں گے۔

ڈاکٹر فرحان
(پشاور)

جب مجھے ایم بی بی ایس کی ڈگری ملی تھی تو ہر ڈاکٹر کی
طرح میں نے بھی حلف اٹھایا تھا کہ میں انسانیت کے مفاد کو
اپنے مفاد پر ترجیح دوں گا۔ انسانیت کی خدمت کو اپنا شعار
بناؤں گا، وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت دل میں جذبہ بھی یہی تھا لیکن ہاؤس جاب
کمل کرنے کے بعد جب میں نے اپنی وہ ایم بی بی ایس کی
ڈگری ہاتھ میں لے کر سال بھر تک بڑے بڑے سرکاری
ہسپتالوں کے دھکے کھائے تو مجھے اپنی ڈگری بھی بے وقعت
لگنے لگی اور خدمت انسانیت کا جذبہ بھی نہ جانے کب دم
توڑ گیا۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھ سے چھوٹی تین
بہنیں تھیں۔ وہ سب زیر تعلیم تھیں اور پورے گھر کو مجھ سے

پوری طرح ایماندار ہونا چاہیے۔ کیوں کلن بھائی۔“
”ٹھیک ہے۔“ کلن بھائی نے اپنی گردن اگڑا لی
”تمہاری یہی ضد ہے تو یہی سبھی۔ لاؤ بقایا بچیس ہزار روپے
ابھی اپنی آدمی موچیس کٹوا رہا ہوں۔“
اب میری آزمائش شروع ہو گئی تھی۔ بچیس ہزار
روپے جارہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ کلن بھائی عین وقت
پر انکار کر دیں گے۔ ایسا کون دہکا جو جو کر بن کر ٹال دے
گے لے جائے گا۔ اسی اطمینان کے ساتھ میں نے بچیس ہزار
روپے کلن بھائی کے حوالے کر دیے۔
محلے والوں کی دلچسپی دگنی ہو گئی تھی۔ ایسا تماشا پہلا
کہاں دیکھنے کو ملا ہوگا۔
اور کلن بھائی نے واقعی اپنی آدمی موچیس کٹوالی تھیں
ان کی شاندار موچیس آدمی ہو گئی تھیں اور وہ بہت مشکل
دکھائی دے رہے تھے۔
”تمہاری تسلی ہو گئی۔“ کلن بھائی نے پوچھا۔
”جی کلن بھائی آپ معاہدے کے کچے انسان ہیں۔“
میں نے کہا۔

کلن بھائی نے ایک آدمی کو اشارہ کیا جس کو میں نہیں
جانتا تھا وہ محلے کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کلن بھائی اسے لے کر
اپنے گھر میں چلے گئے۔ پندرہ منٹ کے بعد ان کی واپسی
ہوئی تھی اور ہم سب حیرت سے اچھل پڑے تھے کلن بھائی کی
موچیس ان کے چہرے پر موجود تھیں۔ بالکل وہی شاندار
موچیس۔ جوان کی شخصیت کا حصہ تھیں۔

”یہ۔ یہ۔ یہ۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
”کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ کلن بھائی مسک
دیے۔“ میں نے ان کے پاس جا کر بیٹھا۔
”میاں تم نے جس وقت یہ تماشا شروع کیا تھا میں کچھ
گیا تھا کہ تم نے بھی وہ مشہور کہانی پڑھی ہوگی ہے جس میں اہل
ہی واقعہ تھا لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ کسی زمانے میں میرا
تعلق تھیر سے رہ چکا ہے اور یہ رشید چاچا ہیں میک اپ کے
ماہر۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تم عین وقت پر ایسی حرکت کرو گے اسی
لیے میں نے ان کو بلا لیا تھا اور انہوں نے میرے چہرے پر
آدمی موچہ لگا دی ہے اب اس معاہدے میں یہ تو کہیں
نہیں تھا کہ میں نکلے گا۔“

محلے والے تالیاں بجانے لگے۔ میرا یہ حال تھا کہ
میرے تیس ہزار روپے چلے گئے تھے، اس دور میں یہ ایک
بہت ہی بڑی رقم تھی۔ کس وہ دن ہے اور آج کا دن میں لے
آج تک کسی سے شرط نہیں لگائی۔



”کلن بھائی سے موچیس وصول کرنے کا یہی موقع ہے۔“
”اچھا بھائی تو ایسا کر مجھ سے دس ہزار لے لے اور
میری جان چھوڑ۔“
”نہیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اسی
وقت آپ کی موچیس چاہئیں۔“
ایک عجیب صورت حال ہو گئی تھی۔ کلن بھائی کی
موچیس غصے سے پھڑکنے لگی تھیں۔ میں نے ان کو بہت بڑے
موقع پر گھیر لیا تھا۔
”دیکھو تم جو کچھ کر رہے ہو یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔“
”یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔
”پانچ ہزار کی رقم میں نے پونہ نہیں دی تھی۔“
”چلو ٹھیک ہے۔“ کلن بھائی نے اپنی گردن جھکالی۔
کلن نے کبھی اپنے وعدے سے انحراف نہیں کیا ہے۔ آج
بھی میں اسی وعدے کے لیے اپنی موچیس کی قربانی دے رہا
ہوں۔ بلاؤ کسی حجام کو۔“

محلے کے ایک حجام کو بلا لیا گیا۔ اس وقت لوگ مجھے
سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھائی آج اس بے چارے
کی شادی ہے جانے دو یہ موقع پھر آ جائے گا۔ وہ کہیں بھاگے
تو نہیں جا رہے۔“

”دیکھیں آپ لوگ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔“
میں نے کہا۔ ”یہ معاملہ میرا اور کلن بھائی کا ہے۔ معاہدہ کی
اپنی اہمیت ہوتی ہے۔“
حجام جب استرا لے کر کلن بھائی کی طرف بڑھا تو میں
نے اسے روک دیا۔ ”اب کیا ہے؟“ کلن بھائی جھٹکا کر بولے۔
”پوری نہیں صرف آدمی موچہ۔“ میں نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

”کیا!“ سب کو جیسے سانپ سوگھ گیا تھا۔
”جی ہاں۔“ میں نے معاہدہ پھر سامنے لہرا دیا۔ ”یہ
دیکھیں اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ میں جب چاہوں اور
جس طرح چاہوں کلن بھائی سے موچیس وصول کر سکتا ہوں۔
لہذا اس وقت مجھے آدمی موچیس کی ضرورت ہے۔ اسی لیے
آدمی موچیس لوں گا۔“

”ارے بھائی۔ اس طرح تو یہ بے چارے کارٹون
بن کر رہ جائیں گے۔“
”اور آج شادی کا دن ہے۔ دولہا بن کر جا رہے ہیں
ایسا ظلم تو نہ کرو۔“
”نہیں جناب۔ یہ کوئی ظلم نہیں۔ یہ تو ایک معاہدہ
ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ایک کھیل ہے اور کھیل میں انسان کو

بہت امیدیں وابستہ تھیں۔

ملازمت کے لیے یا تو کئی لاکھ روپے کی ضرورت پڑتی تھی یا پھر کسی "بگزی" سی سفارش کی۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں، جب ایک ایل ڈی سی (لوئر ڈویژن کلرک) کی اسامی کے لیے وزیروں اور سیکریٹریز کی سفارشات آتی ہوں تو ڈاکٹر کی جانب کے لیے کسی سفارش کی ضرورت ہوگی۔

میرے ایک دوست دانیال نے امریکا کی ایک میڈیکل یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ پھر وہیں کے ایک اسپتال میں اسے جاب بھی مل گئی۔ وہ ان دنوں چھٹی پر پاکستان آیا ہوا تھا۔

دانیال پر امریکی لے کر اے لیوٹننٹ میرے ساتھ ہی پڑھا تھا۔ ہم دونوں میں بہت اچھی دوستی تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ گھریلو تعلقات تھے۔ وہ ایک معروف بزنس مین کا بیٹا تھا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں ابھی تک بے روزگار ہوں تو وہ حیران ہو کر بولا "فرحان! تو اتنا گیا گزرا اسٹوڈنٹ تو نہیں تھا۔ پھر ابھی تک بے روزگار کیوں ہے؟"

"میرے پاس نہ کوئی سفارش ہے نہ اندرون سندھ کے کسی پس ماندہ علاقے کا ڈومیسائل۔" میں نے سچ لہجے میں کہا۔

"ارے یار، لعنت بھیج ملازمت پر، تو اپنا کلیٹک کیوں شروع نہیں کرتا؟"

"اپنا بزنس!" میں نے مزید تلخ لہجے میں کہا "اپنا بزنس شروع کرنے کا سرمایہ ہوتا تو میں اس سے آدھے سے بھی کم خرچ کر کے سرکاری اسپتال کی جاب حاصل کر لیتا۔" میں نے کہا۔

"تو نے کب کہا تھا، تجھے سفارش چاہیے۔" دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بس تو پھر سمجھ لے، تیرا کام بن گیا۔" "او بھائی!" میں نے غمی سے کہا "ہواؤں میں باتیں مت کر۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ چنگی بجاتے ہیں یہ کام کرانے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔"

"کئی لوگ میں اور مجھ میں فرق ہے فرحان۔" دانیال نے اُردمان کر بولا "تو اپنے ڈاکومنٹس مجھے دے۔ تین دن کے اندر اندر اپنا کنٹنٹ لیٹر تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ بھی شہر کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال کا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "یار فرحان! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی، یہ تمام گریجویٹ سرکاری ملازمت کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟"

"تو نے امریکا سے تعلیم ضرور حاصل کی ہے لیکن مجھے خیال ہے کہ تیری پوری زندگی پاکستان میں گزری ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا تو نہیں جانتا کہ کسی بھی ڈاکٹر کی قدر و قیمت اس وقت بنتی ہے جب وہ کسی بڑے سرکاری اسپتال کا ملازم ہو، چاہے وہ مریضوں کو کچھ کے نام پر پالی میں رنگ گھول کر دیتا ہو اور گلوکوز کے انجکشن لگاتا ہو۔ پھر ان اسپتالوں میں نہ صرف سیکھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ اسی بنیاد پر انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ پرائیویٹ اسپتال والوں کو کون پوچھتا ہے۔"

"او بھائی، تو نے تو باقاعدہ تقریر شروع کر دی۔" دانیال نے کہا "پرسوں اپنا کنٹنٹ لیٹر تیرے ہاتھ میں ہوگا۔" پھر وہ ہنس کر بولا "افشاں! مجھے ذرا اچھی سی کافی پلاؤ۔ تمہارے بھائی نے تو میرا دماغ خراب کر دیا۔"

افشاں مجھ سے چھوٹی اور انتہائی شوخ تھی، وہ مسکرا کر بولی "دانیال بھائی، کسی چیز کے خراب ہونے کے لیے پہلے اس کا ہونا ضروری ہے۔"

"یعنی..... اب..... تم بھی..... خیر کافی تو میں پیوں گا۔" دانیال نے ہنس کر کہا۔

پھر وہ رات کا کھانا کھائے بغیر نہیں ملا۔ اسے امی کے ہاتھ کے شامی کباب بہت پسند تھے۔ اس نے نہ صرف کباب کھائے بلکہ اپنے ساتھ بھی لے گیا۔

میں ایک دفعہ پھر ملازمت کی تلاش میں سرگرواں ہو گیا۔ مجھے دانیال پر اعتبار تو تھا لیکن وہ بے چارہ بھی کیا کر سکتا تھا؟ زیادہ سے زیادہ اپنے ڈیڈی سے سفارش کر سکتا تھا یا پھر دوسری صورت یہ تھی کہ وہ رشوت میں مانگی جانے والی رقم مجھے اُدھار دے دے۔ یہ بات مجھے گوارہ نہیں تھی۔

تین دن بعد دانیال ہمارے گھر آیا تو بہت سنجیدہ تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ اسے بھی ناکامی ہوئی ہے۔ اسے شاید اس بات کی شرمندگی تھی کہ اس نے امی اور میری بہنوں کے سامنے بیٹھ کر بڑے بڑے دعوے کیے تھے۔

"یار فرحان!" دانیال نے آہستہ سے کہا "یار، میں نے کوشش تو بہت کی لیکن....."

"ارے یار!" میں مسکرا کر بولا "تو تو میری ہی ہو گیا۔"

"اچھا چل، آج ہم آؤنگ پر چلتے ہیں، کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔"

"نہیں یار!" میں نے کہا "اس وقت میرا بالکل بھی موڈ

نہ ہے۔" "اوہو، اب ہمارے ساتھ بھی موڈ؟" دانیال ہنس کر "میدھی طرح چل ورنہ میں زبردستی لے جاؤں گا اور اس سے تو اچھی طرح واقف ہے۔"

"یار، یہ اچھی زبردستی ہے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

میں لباس تبدیل کر کے آیا تو دانیال نے پھر ایک مرتبہ "یار فرحان، میں نے کہا تھا کہ میں نے بہت کوشش کی لیکن تیری کوشش سے کیا ہوتا ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ہو ہی گیا ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"کیا کسی مضائقہ ڈھنری میں جاب ملی ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"لی الحال تو یہی ہے۔" دانیال نے کہا اور اپنی بیب خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکال کر مجھے دے دیا۔

میں نے بے دلی سے لفافہ کھول کر اس میں رکھا ہوا خط نکال لیا۔ پھر جیسے جیسے میں خط پڑھتا گیا، میرا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ خط پڑھ کر میں نے دانیال کو مارنے کے لیے تکیہ اٹھالیا لیکن وہ پہلے ہی میری پہنچ سے دور امی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

میں اس کی طرف مارنے کو بڑھا تو امی نے کہا "یہ کیا بے ہودگی ہے فرحان! اس نے تو کوشش کی تھی، اس سے زیادہ اور وہ کیا کر سکتا ہے؟ تجھے اعتراض ہے تو مت کر یہ ملازمت۔"

امی کی ہر بات پر دانیال سر ہلاتا رہا۔ "ارے امی، اس خبیث نے فضول میں مجھے اتنی دیر تک پریشان کیا۔ کراچی کے ایک بڑے سرکاری اسپتال میں میرا اپائنٹمنٹ ہو گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امی نے تو اسی وقت مصلیٰ سنبھال لیا۔ وہ شکرانے کے لعل پڑھنا چاہتی تھیں۔

"او بھائی، یہ سب ہوا کیسے؟" میں نے پوچھا۔ "تیرا حافظہ اب واقعی کمزور ہو گیا ہے لیکن پریشان مت ہو، یہ عمر کا تقاضا ہے۔" فرحان مسکرایا "ابے کھامڑا! کیا تو بھول گیا کہ میرے بڑے ماموں فشری آف ہیلتھ میں چیف سیکریٹری ہیں۔"

"ہاں یار، مجھے ضیا ماموں کا تو خیال ہی نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

"ما فوق الفطرت" سے مراد ایسی قوت ہے جو فطرت (Nature) سے ماورا ہو، جسے قوانین سے بالاتر ہو یا وہ چیزیں جو انسان کی عقل و ادراک سے بالاتر ہوں ما فوق الفطرت کہلاتی ہیں، انگریزی میں انہیں سپرنچرل (Supernatural) کہتے ہیں۔

لغت میں شیطان کے معنی ہیں سرکش، شریر۔ قرآن حکیم میں شیطان کے لیے "ابلیس" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ شیطان شطی سے بنا ہے، جس کے معنی دور ہونے کے ہیں اس لیے اسے شیطان کہتے ہیں یہ لفظ شیطان شط سے بنا ہے جس کے معنی چلنے کے ہیں چونکہ وہ آگ سے بنا ہے اور آگ میں ہی داخل ہوگا اس لیے اسے شیطان کہا گیا۔ آگ چونکہ اس کا مادہ تخلیق ہے اس لیے اس میں قوت غصہ اور غرور موم زیادہ ہے۔ یہی اوصاف حضرت آدم علیہ السلام کو جبہ کرنے سے روکنے والے تھے۔ سرکش، جس میں انسان اور حیوان بھی شامل ہیں کو شیطان کہتے ہیں۔ شریر جن کو شیطان کہتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں ہے (اور ایسے ہی ہم نے شریر جنوں اور "انسانوں" کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "حسد شیطان ہے اور غصہ شیطان ہے۔"

انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

"بس میں کل ان کے آفس گیا اور ان سے کہا کہ ماموں جان، اس درخواست پر سائن کر دیں۔"

"یہ کیا ہے بھئی؟" ماموں جان نے پوچھا۔ "یہ فرحان کی ملازمت کی درخواست ہے۔" میں نے کہا "آپ کے ہوتے ہوئے وہ گزشتہ ایک سال سے بے روزگار ہے۔"

ماموں جان نے اسی وقت اپنے پی اے سے اپنا کنٹنٹ لیٹر مانگ کر لے کر کہا پھر جب تک میں نے چائے پی ایا، کنٹنٹ لیٹر کا پرنٹ آ گیا۔ پھر وہ افشاں سے بولا "اب مجھے اچھی سی کافی پلاؤ۔"

"ارے، میں تو آپ کو کھانا کھلاؤں گی دانیال بھائی! افشاں نے ہنس کر کہا۔

"کھانے میں تو ابھی دیر ہوگی۔" دانیال ہنس کر بولا "وہ تو خیر میں کھاؤں گا ہی، ابھی صرف کافی۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "اور تو جا کر مٹائی ہی لے آ۔"

یوں سال بھر تک ٹھوکریں کھانے کے بعد مجھے شہر۔

اس بڑے سرکاری اسپتال میں ملازمت مل گئی۔

وہاں کا باوا آدم ہی نہ لایا تھا۔ ہمارے وہ بڑے بڑے پروفیسرز جو ہمیں رات دن انسانیت کا درس دیتے تھے، خود وہ باتیں بھول گئے تھے۔ وہ لوگ اوپی ڈی میں بیٹھے تو تھے لیکن اوپی ڈی کے زیادہ تر مریض ان کے ذاتی اسپتالوں اور کلینک پر منتقل ہو جاتے تھے۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، اگر میں اس کی تفصیل بتا دوں تو آپ کا اعتماد اسپتال اور ڈاکٹروں دونوں سے ہمیشہ کے لیے اٹھ جائے گا۔

چند ہی مہینوں بعد میں بھی سب کچھ بھول گیا۔ وہاں ہر شخص کا مقصد صرف اور صرف پیسا کمانا تھا۔ لوگ اس کا جواز یہ دیتے تھے کہ ہمارے والدین نے پانچ سال تک ہم پر جو رقم خرچ کی ہے، اسے بھی تو واپس لینا ہے۔ میں بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔

اوپی ڈی کے موقع پر تو ہر ڈاکٹر گویا فرعون ہوتا تھا۔ ہم میں سے بہت کم ایسے تھے جن کو واقعی اپنے پیشہ ورانہ فرائض کا احساس تھا۔ ڈاکٹر توڑے ایک طرف، وہاں تو وارڈ بوائز، نرسیں اور دوسرا اسٹاف بھی مریضوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔

اس دن میں حسب معمول اوپی ڈی میں مصروف تھا۔ میرے کمرے کے باہر مریضوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ میں جلدی جلدی سب کو بھٹکا رہا تھا۔ مریضوں کو تو ہر حال میں دیکھنا ہی پڑتا تھا۔

اچانک ایک بوڑھا مریض میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ نہیں ہوگی لیکن غربت، نامساعد حالات اور بیماری نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

”کیا تکلیف ہے باباجی؟“ میں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں جو کچھ کھاتا ہوں، ہضم نہیں ہوتا۔ پیٹ میں بھی ہر وقت تکلیف رہتی ہے اور اب تو بخار بھی رہنے لگا ہے۔“

میں نے اس کا بلڈ پریشر چیک کیا، اسٹیتھو سکوپ سے اس کا سینہ دیکھا، آنکھوں کی پتلیوں کا جائزہ لیا۔ اسے معدے کا السر تھا اور ذرا سی توجہ سے ٹھیک ہو سکتا تھا۔ مجھے بھلا توجہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اگر توجہ دیتا بھی تو اسے دینے کے لیے دوائیں کہاں سے لاتا؟ اسپتال کی ساری دوائیں تو میڈیکل اسٹور پر بیچ دی جاتی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب!“ اس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا

”ایک ہفتے سے میں علاج کر رہا ہوں لیکن کوئی فائدہ ہی ہوتا۔ میں اکیلا کمانے والا ہوں۔ میرے چھوٹے بھوتے بچے ہیں ڈاکٹر صاحب! اگر میں نے اب اور دو چار دن نہ کیا تو میرے گھر میں قاتلے شروع ہو جائیں گے۔“

”میں دوا لکھ کر دے رہا ہوں۔“ میں نے کہا ”یہ دوا باہر سے لے لینا۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ پھر میں نے اسے الم کی ایک پیکی دوا لکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے اسپتال کا رنگین پانی اور میٹیم کی بے ضرر گولیاں بھی لکھ دیں۔ وہ مجھے دعا میں دیتا ہوا چلا گیا۔

میں جانتا تھا کہ اسپتال کی دوا سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ باہر کی دوا سے البتہ اسے آفاقہ ہو سکتا تھا۔ باہر کے پتے سننے ہوتے تھے، ان میں میرا کمیشن بھی ہوتا تھا۔

وہ مریض دو دن بعد پھر آیا۔ اس کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس نے میڈیکل اسٹور کی مہلکی دوا میں نہیں خریدی ہیں۔ اگر مزید دو تین ہفتے اس حال میں گزرے تو وہ بچ نہیں سکے گا۔

پھر وہی ہوا، دو ہفتے بعد وہ مریض مجھے نظر نہیں آیا۔ بے چارہ کب تک اسپتال کے رنگین پانی اور میٹیم کی بے فیض گولیوں پر زندہ رہتا؟

یہ واقعہ تو میں نے اس لیے تحریر کر دیا کہ آپ کو میری بے حسی کا اندازہ ہو جائے۔ ان دنوں تو انسانی جان کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

ہاں، ایمر جنسی میں واقعی کام کرنا پڑتا تھا۔ وہاں ڈاکٹروں کو شدید محنت کرنا پڑتی تھی۔ بروقت ڈیوٹی پر موجود اور مستعد رہنا ہوتا تھا اس لیے ہر ڈاکٹر ایمر جنسی کی ڈیوٹی سے گھبراتا تھا۔

میرے کچھ ساتھی ڈاکٹر نائٹ ڈیوٹی کے موقع پر کسی ایک خالی کمرے میں بیٹھ کر خوب ہلاک کرتے تھے۔ ٹی وی پر فلمیں دیکھتے تھے، ڈیک پر گانے سنتے تھے یا پھر فلیش کھیل کر وقت گزارتے تھے۔ اسپتال کی نرسیں بھی ہم سے پیچھے نہیں تھیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ خوب انجوائے کرتی تھیں۔

گنتی کے چند ڈاکٹر زاور نرسیں، جن میں ایمانداری اور فرض شناسی کا ہیضہ لاحق تھا۔ وہ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوتے تھے بلکہ وارڈوں میں رہتے تھے۔ اس دن اس طرح کی ایک ”نائٹ“ تھی۔ ہم لوگ بہت ترنگ میں تھے اور نرسوں کی لائی ہوئی مختلف ڈشوں پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ایک گوشے میں بیٹھے فلیش کھیل رہے تھے، کچھ ڈاکٹر ڈیگزین پڑھ رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو بخوبی بصورت

ن کو پڑھ رہے تھے۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان داخل ہوا۔

”جی فرمائیے؟“ ڈاکٹر ذیشان نے کچھ ناگواری سے کہا ”کیا پرابلم ہے؟“

”میرا بھائی یہاں ایڈمٹ ہے۔ وہ شدید بیمار ہے اور پ لوگ مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے یہاں ہل مہل کر رہے ہیں؟“ نوجوان نے سخت لہجے میں کہا۔

”تمہارا بھائی بیمار ہے تو ہم کیا کریں؟“ ڈاکٹر جاوید ناگواری سے کہا ”اس کا علاج ہو رہا ہے لیکن تم یہاں بیٹھے آئے؟“

”مجھے یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے؟“ وہ بھٹا کر ”لا“ میں ملک کے ایک بڑے اخبار کا کرائم رپورٹر ہوں اور اس لیے خبر ملک کے تمام اخبارات میں ہوگی کہ اسپتال کے ڈاکٹر زاور نرسیں ڈیوٹی کے اوقات میں پکنک مناتے ہیں۔ ان کی اس بجرمانہ غفلت کا خمیازہ بے چارے مریض بھگتتے ہیں۔“

”او بھائی!“ ڈاکٹر فیضان نے نخوت سے کہا ”تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرو، ہمیں پھانسی پر چڑھوا دو لیکن فوری طور پر یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ۔۔۔۔۔۔“

فیضان ہیلتھ منسٹر کا بھانجا تھا اور اسے بہت زعم تھا کہ اسپتال کا ایم ایس بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ تو معمولی سا رپورٹر تھا۔

رپورٹر خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے کہا ”اب یہاں سے ساری چیزیں سمیٹو، اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا دو ورنہ اس مرتبہ وہ کمرے کے ساتھ آئے گا۔ فیضان کو اندازہ نہیں ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا آج کل کیسا مثر ہے مہار ہے۔“

فیضان تو اس رپورٹر کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا، لیکن دوسرے ڈاکٹروں اور نرسوں نے غلٹ میں اس کمرے کی صفائی کر دی اور ہم لوگ اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے۔

وہ رپورٹر خود تو نہیں آیا لیکن دوسرے دن کے ہر اہلکار میں وہی خبر چھپی تھی کہ اسپتال کے ڈاکٹر ڈیوٹی کے اوقات میں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ وہ بجرمانہ غفلت کا شکار ہو رہے ہیں۔ دو تین اخبارات نے تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ڈاکٹروں اور نرسوں کے تعلقات پر بھی تجسّز اچھالی تھی کہ ڈاکٹروں نے اسپتال کے اس کمرے کو عیاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔

انگریز ہندوستان کے مال و بوج کر اس کی اندرونی سیاست کو مفلوج کر دینے کے لیے تمام آئینی اور غیر آئینی چھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ مسلم لیگ جس نے 1906ء میں جنم لیا تھا نوابوں، جاگیرداروں اور حاشیہ برداروں کی مفلوج سی جماعت بنتی جا رہی تھی۔ خلافت کا الگ دم گھٹ گیا تھا۔

1934ء میں مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی صدارت قبول کر کے اس جماعت کو بے موت مرنے سے بچالیا۔ آپ نے کئی مسائل پر مجھ سے مشورے لیے، کئی باتوں میں ہمارا اختلاف ہوا اور اس طرح ہم نے مسلمانوں کے لیے ایک پلیٹ فارم تیار کر لیا۔

ایکشن کا وقت آیا تو محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کمرے کیے۔ رفیع احمد قدوائی نے اپنے دو امیدوار مسلم لیگ کے مقابلے میں اور ایک انواب چھتاری کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ راہ پر نہ آیا۔

خلافت کے ہیرو مولانا شوکت علی زندہ تھے، آپ نے امو بے بھر میں سپاہیوں کی طرح کام کیا۔ میں نے بیس ہزار روپے کے بینک پروٹوٹ کا بندوبست کر لیا اور شانہ راز بھاگ دوڑ سے چھتیس میں سے اسیس سیشن پر قبضہ کر لیا۔

یوپی کے گورنر سر ہیک نے نواب چھتاری کی زبانی مجھے پیکش کی کہ میں یوپی کی عبوری حکومت کی کینٹ میں شامل ہو جاؤں لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی پارٹی کے مفاد کے پیش نظر یہ پیش کش قبول کرنے کو تیار نہیں۔

مجھے جمعیت علمائے ہند کے ایک اجلاس میں بلایا گیا لیکن وہ لوگ میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے انہیں صاف بتا دیا کہ ہم ابھی ہندوستان کی آزادی سے زیادہ مسلمانوں کے الگ حق رائے دہندگی اور الگ انتخاب کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جنگ آزادی بعد میں لڑی جائے گی۔ یہ جمعیت بیکار سی جماعت تھی جو چند ہی روز بعد مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے کانگریس سے جا ملی۔

اقتباس: چوہدری خلیق الزماں، بقلم خود
مرسلہ: نعمان فیض پوری، جہلم

جون 2012ء

ماہنامہ سرگزشت

جون 2012ء

ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ سرگزشت

اس سے پہلے کہ ایم ایس صاحب یا کوئی اور سینئر ڈاکٹر ہم لوگوں سے باز پرس کرتا، ہم نے ڈاکٹر شاہد کے کہنے پر ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ڈاکٹر شاہد زمانہ طالب علمی میں اسٹوڈنٹ لیڈر رہ چکا تھا اور اس قسم کے چمکنڈوں سے خوب واقف تھا۔

پھر اس نے تمام جھوٹے اور اخبارات کے نمائندوں کو بلا کر پریس کانفرنس کی اور کہا کہ اس رپورٹر نے ذاتی عناد کی وجہ سے یہ خبر لگائی ہے۔ اخبار اس رپورٹر کو ملازمت سے نکالے اور جن جن اخبارات میں خبر شائع ہوئی ہے، وہ ڈاکٹروں اور نرسوں سے معافی مانگیں۔ انہوں نے ہمارے مقدس پیشے کی توہین کی ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ہم ڈیوٹی پر نہیں جائیں گے۔

یوں اسپتال کے تمام ڈاکٹر ز اسرائیک پر چلے گئے۔ ہم اسپتال جاتے ضرور تھے لیکن ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ پہلے ایک آدھ دن تو اوپی ڈی مریضوں سے کچھ بھری رہی لیکن پھر ڈاکٹر شاہد نے چھریوں کو حکم دے دیا کہ کل سے اوپی ڈی کے دروازے بھی بند رکھو۔ کوئی مریض اندر داخل ہونے نہ پائے۔ اوپی ڈی میں مریضوں کی کراہوں سے اس کا موڈ خراب ہوتا تھا۔

البتہ ایمر جنسی میں اسرائیک نہیں تھی جہاں بہ دستور کام مہیا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹر ان دنوں بہت مصروف تھے۔

ایمر جنسی کے ایک ڈاکٹر آفتاب نے مجھ سے شکوہ کیا کہ آپ لوگ تو سارا وقت چائے اور خوش گپیوں میں گزار دیتے ہیں۔ مریضوں کا سارا پریشہ ایمر جنسی پر پڑ گیا ہے۔ آپ اسرائیک ضرور کریں لیکن اگر آپ میں سے کچھ ڈاکٹر رضا کارانہ طور پر ایمر جنسی میں چند گھنٹے بھی کام کر لیں تو ہمارے لیے بھی آسانی ہوگی اور اس سے اسپتال کی انتظامیہ اور میڈیا پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔

”ڈاکٹر آفتاب!“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”ہماری اس اسرائیک کو ڈاکٹر شاہد لیڈ کر رہے ہیں۔ آپ پلیز ان سے بات کریں۔ ہمیں ایمر جنسی وارڈ میں چند گھنٹے ڈیوٹی دینے پر کوئی اعتراض نہیں۔“

ڈاکٹر آفتاب چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر شاہد صاف انکار کر دے گا، یہی ہوا۔ ڈاکٹر شاہد نے صاف انکار کر دیا اور ڈاکٹر آفتاب اپنا سامان لے کر واپس آ گئے۔

اسپتال کا پورا انتظام درہم برہم تھا۔ ہمارے ساتھ ساتھ نرسوں نے بھی اسرائیک کر دی تھی کیونکہ ان کی ”نیک نائی“ پر بھی حرف آرہا تھا۔ ہم لوگ سارا دن خوش گپیاں کرتے،

مکانے کا تے، فلیش کھیلتے اور کچھ مچھلے نرسوں سے قہرٹ بھی کر لیتے۔ گویا راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ایک دفعہ ہم حسب معمول ہلے گلے میں مصروف تھے کہ چہرہ اسی نے آکر بتایا ”ایم ایس صاحب اور ہیلتھ سیکریٹری صاحب اسی طرف آرہے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ جھٹلو کے نمائندے بھی ہیں۔“

شاہد نے مجھے، فیضان کو اور ڈاکٹر جاوید کو ساتھ لیا اور ان سے مذاکرات کرنے روانہ ہو گیا۔

ایم ایس صاحب نے بہت نرم لہجے میں کہا ”دیکھیے، آپ لوگوں کا غصہ بجا ہے لیکن آپ جس مقدس پیشے سے وابستہ ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ لوگ محل سے کام لیں۔ آپ کے چکر میں مریض بے چارے پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ اخبارات میں ہماری پوری کیوٹی کی بدنامی ہو رہی ہے۔ نیوز چینلز۔۔۔ ہمارے بارے میں عجیب عجیب خبریں نمک مرچ لگا کر نشر کر رہے ہیں۔ وہ لوگ روزانہ دو چار مریضوں اور ان کے لواحقین کے انٹرویوز دیتے ہیں جو ڈاکٹروں کی سنگ دلی کا شکار بنے ہیں۔ عوام کا غم و غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔“

”سر، تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ ہم ان کے الزامات کو حلیم کر لیں؟“ شاہد نے رخ لہجے میں کہا۔ ”جب تک میڈیا والے ہم سے معافی نہیں مانگیں گے، اس وقت تک ہم اسرائیک ختم نہیں کریں گے۔“ شاہد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”دیکھیے ڈاکٹر صاحب!“ سیکریٹری ہیلتھ نے پہلی دفعہ زبان کھولی ”اس سے قبل شاید میڈیا سے آپ کا واسطہ نہیں پڑا ہے۔ ان کی طاقت سے بڑی بڑی حکومتیں خوف زدہ رہتی ہیں۔“

”سر، اسٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے کئی دفعہ میڈیا والوں سے میرا واسطہ پڑ چکا ہے۔“ شاہد نے کہا۔

”حکومتیں ان سے خوف زدہ ہوتی ہوں گی، ہم بلیک میل ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔“ میں نے رخ لہجے میں کہا۔

”ایک بات اور بتا دوں۔“ شاہد نے بے خوفی سے ہیلتھ سیکریٹری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”نرسوں کراچی کے دوسرے بڑے سرکاری اسپتالوں کے ڈاکٹر بھی اسرائیک پر چلے جائیں گے۔“

”بات کو اتمامت بڑھا میں ڈاکٹر صاحب!“ ایم ایس نے کہا ”ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کے مطالبات تسلیم

کر لیے جائیں۔“

”تو پھر جب آپ کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نکلے تو ہمیں می آگاہ کر دیجئے گا۔ ہم اسی وقت ڈیوٹی پر حاضر ہو جائیں گے۔“

ایم ایس اور ہیلتھ سیکریٹری مایوس ہو کر چلے گئے۔ میڈیا نے ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ایک دفعہ تو میں نے ہی سوچا کہ انتظامیہ سے مذاکرات کر کے اسرائیک ختم کر دینا چاہیے لیکن شاہد اس پر راضی نہ ہوا۔

یہ اسرائیک کے پانچویں دن کی بات ہے، میں ڈاکٹر فیضان اور ڈاکٹر جاوید کے ساتھ اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ بہا پ اڑاتی کافی کی پیالیاں ہمارے سامنے تھیں اور ہم صورت حال پر گفتگو کر رہے تھے۔

اچانک باہر سے میرے چہرے کی تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی کو اندر آنے سے روک رہا تھا۔ پھر دھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی عمر یہ مشکل پچیس چھیس سال رہی ہوگی، جسم پر بہت سستا سا ملگجلا لباس تھا، اس کے بال کھمرے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر چڑیاں جھی ہوئی تھیں۔ اس کی گود میں دو ڈھانکی سال کا ایک بچہ بھی تھا۔

اس نے رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھا، پھر بولی ”ڈاکٹر صاحب، میرے بچے کو دیکھ لیں، صبح سے اس کی حالت بہت خراب ہے۔“

”بی بی! آپ کو معلوم نہیں کہ ہم لوگ اس وقت اسرائیک پر ہیں۔“ میں نے محل سے کہا ”ہم اس وقت کسی پیشہ کو نہیں دیکھ سکتے۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ عورت نے خوشامدانہ انداز میں کہا ”ڈاکٹروں کی ہڑتال کسی انسانی جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہو سکتی۔“

”زیادہ بیکچر مت دو بی بی!“ میں نے درشت لہجے میں کہا ”ہماری عزتیں داؤ پر لگی ہیں اور تم مجھے انسانیت کا سبق پڑھا رہی ہو۔“

اچانک بچے کا سانس اکڑ گیا۔ وہ جھکے لینے لگا۔ بچہ کی حالت دیکھ کر عورت چیختی ہوئی آواز میں بولی ”ڈاکٹر صاحب! آپ کو اللہ کا واسطہ، میرے گڈو کو دیکھ لیں، دیکھیں۔۔۔ اسے کیا ہو رہا ہے؟“

ڈاکٹر فیضان نے کہا ”یار فرحان! بچے کو ایک نظر دیکھ لو۔ شاید کو کون سا معلوم ہوگا یا تم نہ دیکھنا چاہو تو مجھے دیکھنے دو۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔ اس دو نکلے کے رپورٹر نے ہماری عزت اُچھالی ہے اور تم ابھی سے میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔ تم دیکھنا چاہو تو شوق سے دیکھو، میں ابھی ڈاکٹر شاہد کو کال کرتا ہوں۔“

ڈاکٹر فیضان خاموش ہو گیا۔

عورت نے پھر دل ہلا دینے والے انداز میں روتے ہوئے کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ کو اپنے پیاروں کا واسطہ، آپ کو اللہ کا واسطہ۔ میرے گڈو کو دیکھ لیں۔ یہ مجھے بہت منتوں اور میرادوں کے بعد ملا ہے۔“ اس پر ہڈ پانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے اچانک میرے پیچھے پڑنے ”میرے گڈو کو بچا لیں ڈاکٹر صاحب!۔۔۔ میرے گڈو کو بچا لیں۔“ میں نے جھٹکا دے کر اپنے پیچھے چھڑائے اور چیخ کر چہرہ اسی سے کہا ”کریم، یہ عورت اندر کیسے آئی، اسے باہر نکال۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ کریم نے افسردگی سے کہا ”اس کا بچہ واقعی بہت سیریس ہے۔ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔“

”بکومت!“ میں چیخ کر بولا ”اس عورت کو دھکے دے کر باہر نکالو ورنہ ابھی کھڑے کھڑے میں تمہیں نوکری سے نکلا دوں گا۔“

”چل زبیدہ۔۔۔!“ عورت سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے میلے کچیلے جواں عمر مرد نے کہا ”ان ڈاکٹروں کے سینے میں دل نہیں پتھر ہیں۔ اس وقت یہ اختیارات کے نشے میں چور ہیں۔ یہ تیری کوئی بات نہیں سنیں گے۔“

”ڈاکٹر صاحب! اللہ کے واسطے آپ۔۔۔“ عورت نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی اور چیخ کر بولا ”کریم، میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟“

کریم نے اس عورت کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر کی طرف لے کر نکالا۔ کریم کی آنکھوں میں بھی نمی تھی اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ عورت کو اپنی مرضی کے خلاف باہر نکال رہا ہے۔

زبیدہ کے ساتھ آیا ہوا مرد آگے بڑھا اور اس سے بولا ”جے گزرا نا ہے، رحم کی بھیک مانگتا ہے تو اس قادر مطلق سے مانگ۔ یہ بھک مٹے تجھے کیا دے سکتے ہیں؟“

”گیت لاسٹ!“ میں نے چیخ کر کہا۔

”پوشٹ اپ ڈرنی سوائن!“ مرد نے اسی لہجے میں چیخ کر کہا۔ ”کون کہتا ہے کہ تم ڈاکٹر ہو، یو آر مرڈرر!“ اس نے کہا اور زبیدہ کو سہارا دے کر باہر لے گیا۔

مرد کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے، ان کے جانے کے بعد کریم نے دروازہ اندر سے بند

کر دیا۔

ایک ہی منٹ بعد پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں بُری طرح بھٹا گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ وہی ڈھیٹ عورت ہوگی۔

کریم نے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں؟ میں تملاکر آگے بڑھا اور دروازے کا لاک کھول دیا اور چیخ کر بولا ”تم لوگ آخر کس مٹی.....“ میرا جملہ حلق ہی میں رہ گیا کیونکہ آنے والا ڈاکٹر شاہد تھا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں شور کر رہے ہو ڈاکٹر؟“

”ارے ڈاکٹر صاحب، ان چشمنے تو زندگی اجیرن کر دی ہے۔“

”چھوڑو اس بات کو، اب تم جلدی سے مٹائی منگوا لو۔“

”مٹائی کس لیے ڈاکٹر؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”ارے بھئی، ہمارے مطالبات پورے ہو گئے ہیں۔ اخبار کی انتظامیہ نے اس بد زبان رپورٹر کو ملازمت سے نکال دیا ہے۔“

”ویری گڈ!“ میں خوش ہو کر بولا ”اب کم از کم کسی اخبار کا کوئی رپورٹر ایسی حرکت نہیں کرے گا۔“

”میرے خیال میں اب ہمیں اپنی ڈی شروع کر دینا چاہیے۔“ ڈاکٹر شاہد نے کہا۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ”ابھی صرف ساڑھے نو بجے ہیں۔ ہم اپنی ڈی کے مریضوں کو دیکھ سکتے ہیں۔“

اچانک باہر سے چیخ پکار اور بین کرنے کی آوازیں آئیں۔ ان آوازوں میں اس عورت زبیدہ کی جگر خراش چیخیں نمایاں تھیں۔ میں جھنجھلا کر کرسی سے اٹھا ”کیا مصیبت ہے؟“ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے ہی برآمدے میں مجھے زبیدہ دکھائی دی۔ وہ برآمدے کے پختہ فرش پر اپنا سر پھوڑ رہی تھی اور بہت دردناک انداز میں بین کر رہی تھی۔ اس کی گود میں وہی بیمار چچہ تھا۔ وہ اب بالکل بے حس و حرکت تھا۔

زبیدہ نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ان میں سے آنسوؤں کے بجائے خون چھلک پڑے گا۔ وہ ہڈیانی انداز میں بولی ”میرا بچہ مر گیا ڈاکٹر!..... مر گیا میرا بچہ..... تو اس کا قاتل ہے.....“ تو نے میرے بچے کو قتل کیا ہے..... دنیا کی کوئی عدالت تجھے سزا نہ دے لیکن تو بھول گیا

کہ ایک سب سے بڑی عدالت اور بھی ہے۔ وہاں صرف اور صرف انصاف ہوتا ہے..... میں نے اپنا معاملہ اسی عدالت کے سپرد کر دیا ہے..... جیسے تو نے میری خوشی جھیننی ہے، اللہ اسی طرح تجھے بھی خوشیاں دے گا اور جھین لے گا..... تو کبھی سکون سے نہ رہ سکے گا میرے بچے کے قاتل..... تو خوشیوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر نڈھال ہو جائے گا..... دولت کے انبار بھی تجھے ایک ذرا سی خوشی نہ دے سکیں گے..... تو قاتل ہے، تو میرے بچے کا قاتل ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

ڈاکٹر شاہد نے پوچھا ”ڈاکٹر فرحان! یہ کیا معاملہ ہے؟“

”ارے یہ جاہل لوگ ایک تو مریض کو اس وقت اسپتال لے کر آتے ہیں جب وہ بالکل لب دم ہوتا ہے۔“ میں نے منہ بنا کر کہا ”اور اگر بد قسمتی سے مریض ایکسپائر ہو جائے تو اس کا سارا الزام ڈاکٹر پر دھر دیتے ہیں۔“

”ارے تو مرے گا تو کوئی حلق میں پانی ڈالنے والا بھی نہیں ملے گا۔“ زبیدہ جنونی انداز میں چیخی ”کیڑے پڑیں گے تیری قبر میں۔ تو میرے بچے کا قاتل ہے، تو ڈاکٹر نہیں درندہ ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے بچے کو فرش پر رکھا اور جنونی انداز میں میری طرف بڑھی۔

اس سے پہلے ہی اس کے شوہر نے اسے پکڑ لیا اور بولا ”گھر چل زبیدہ! ابھی ہمیں گڈو کو دوا دے بھی تو کرنا ہے۔ بہت کام ہے۔ ان پتھروں سے سرمہ پھوڑ۔“

وہ بچے کی لاش کو اٹھا کر زبیدہ کو باہر کی طرف کھینچنے لگا۔ زبیدہ مسلسل چیخ رہی تھی ”تو خوشیوں کو ترے گا ڈاکٹر..... تو خوشیوں کو ترے گا..... تو قرار کو ترے گا..... تو.....“

آہستہ آہستہ اس کی آواز معدوم ہو گئی۔

نہ جانے اس کی آواز میں کیا بات تھی کہ میں اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس کی جگر خراش چیخیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں ”میرا گڈو..... میرا لال..... تو خوشیوں کو ترے گا ڈاکٹر..... تو خوشیوں کو ترے گا۔“

”کب تک یہاں کھڑے رہو گے ڈاکٹر فرحان!“ ڈاکٹر جاوید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں بُری طرح چونک اٹھا۔

”اسٹرائیک ختم ہو چکی ہے۔ چلو، اپنی ڈی میں چلو۔“ میں بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وقت سبک رفتاری سے گزرتا رہا۔ میں نے اب شہر کے ایک پس ماندہ علاقے میں اپنا کلینک بھی شروع کر دیا تھا۔

ہاں نہیں اگرچہ کم تھی لیکن مریضوں کی تعداد بے تحاشا تھی۔ بے علاقوں میں چونک ملتی سہولتوں کا فقدان ہوتا ہے، اس لیے ڈاکٹرز کے علاوہ جعلی ڈاکٹر جنہیں ہماری اصطلاح میں ”کوئیک“ کہا جاتا ہے، وہ بھی خوب کماتے ہیں۔ کوئی کیس بگڑ جاتا ہے تو وہاں کے آن پڑھ اور معصوم لوگ ڈاکٹر کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے اسے مشیت ایزدی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے اس آبادی سے اتنا کمایا تھا کہ دو ہی سال میں شہر کے ایک پوش علاقے میں کلینک کھول لیا۔ اللہ مجھ پر مہربان تھا اور مجھ پر بہن برس رہا تھا۔ جدید ماڈل کی قیمتی گاڑی، اپورٹینڈ اور ہنگ سٹیل فون، بیش قیمت لباس..... میری تو پوری شخصیت کی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔

افشاں تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی۔ اسی اس کے لیے رشتے کی تلاش میں تھیں۔

بالآخر انہیں ایک لڑکا پسند آئی گیا۔ خاندان بھی اچھا تھا اور لڑکا بھی بہت سلجھا ہوا اور پڑھا لکھا تھا۔ وہ کیمیکل انجینئر تھا اور ایک ملٹی نیشنل فرم میں بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔

رکسی چھان بین کے بعد ای نے وہ رشتہ قبول کر لیا اور افشاں کی شادی ہو گئی۔

نامصر واقعی بہت اچھا لڑکا تھا۔ افشاں اس کی تعریفیں کرتے نہ چھوڑتی تھی۔

شادی کے دو ہی مہینے بعد نامصر کی تقرری امریکا کی ایک کمپنی میں ہو گئی۔ وہ افشاں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

وہاں سے افشاں تقریباً روزانہ ہی ای کو ٹیلی فون کرتی تھی۔ وہاں وہ بہت خوش تھی۔

پھر نامصر نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ مبارک ہو، فرحان بھائی! آپ ماموں بن گئے ہیں۔“

میں خوشی سے بالکل ہو گیا۔ میری نظروں میں وہ چھوٹی سی افشاں گھوم گئی جو فراک بنے، دو چشماں باندھے سارے گھر میں ایک پاؤں سے اچھلتی پھرتی تھی اور میں اس کی چونچیاں پکڑ کر اس بُری طرح کھینچتا تھا کہ وہ رونے لگتی تھی۔ آج وہی افشاں ایک بچی کی ماں بن گئی تھی۔

امی نے اپنی نواسی کا نام شمرہ رکھا۔ افشاں نے بتایا تھا کہ میں دو مہینے بعد پاکستان آؤں گی۔

اس دن اتوار تھا۔ میں نے رات کو ایک پیچیدہ آپریشن کیا تھا اس لیے رات گئے آیا تھا اور ابھی رات ہی کی ٹھکن اُتار رہا تھا۔

اچانک ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجی تو میں جھنجھلا گیا۔ ان اسپتال والوں کو بھی بالکل احساس نہیں ہے کہ ابھی ڈسٹرب نہ

کریں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور ریسیور اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہیلو!“

”بھیا!“ دوسری طرف سے افشاں کی وحشت زدہ آواز سنائی دی۔

میری نیند اچانک اُڑ گئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور بولا ”کیا بات ہے افشاں! تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

”میں جاہ ہو گئی بھیا!..... برباد ہو گئی..... میں..... کیا کروں؟“ وہ بُری طرح روتے ہوئے بولی۔

”افشاں! مجھے بتاؤ، کیا بات ہے؟ شمرہ تو ٹھیک ہے..... نامصر کہاں ہے؟“ میں نے ایک ہی سانس میں اس سے دو سوال کر دیے۔

”نامصر مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے بھیا!“ افشاں ہانپتی ہوئی بولی ”وہ آج اپنے ایک گودام کے وارنٹ پر گئے تھے۔ وہاں..... کیمیکل کا ایک ارم پست گیا اور

اور ”وہ بھر پوری طرح رولنے لگی“ اس آہنی ملک میں..... مجھے تو کوئی دلاسا دینے والا بھی نہیں ہے بھیا!..... میں کیا کروں..... میں کیا کروں بھیا!“

”ہمت سے کام لو افشاں! اگر تم نے حوصلہ ہار دیا تو شمرہ کا کیا بنے گا؟ تم گھبراؤ مت، میں پہلی دستیاب پرواز سے وہاں پہنچتا ہوں۔“

”اس کی..... ضرورت نہیں ہے بھیا!“ افشاں سسکتے ہوئے بولی ”نامصر کی کمپنی والوں..... نے ہماری داپھی کا انتظام کر دیا ہے..... میں آج رات دو بجے کی فلائٹ سے شمرہ..... اور نا..... مر کو..... لے کر آ رہی ہوں۔“ وہ ایک مرتبہ پھر رونے لگی۔

”رو مت گڑیا!“ اس کی آہ وزاری سن کر میرے آنسو بھی بہنے لگے ”ہمت کر..... اور تجھ پہ شمرہ کی بھی ذمہ داری ہے۔ تو..... مجھ سے اتنی دور ہے گڑیا کہ..... میں تیرے سر پر ہاتھ بھی نہیں رکھ سکتا..... تو پاکستان آ جا..... پھر.....“

”میں آ رہی ہوں بھیا!“ افشاں نے کہا ”اب میں یہاں کس کے سہارے رہوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ای شاید میری بلند آواز سن کر کمرے میں آ گئی تھیں۔ میرے آنسو دیکھ کر وہ تڑپ کر بولیں ”کس کا فون تھا فرحان؟“

میں امی سے یہ بات چھپا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں میرے بہتے بہتے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔

مجھے ایسا لگا جیسے ان آوازوں میں ایک آواز سب سے

نمایاں ہو" تجھ سے بھی تیری خوشیاں یوں ہی چھن جائیں گی ڈاکٹر! تو میرے گڈو کا قاتل ہے..... قاتل ہے۔"

میں نے سر جھٹک کر اس عورت کے خیال سے پیچھا چھڑایا پھر ای اور دوسرے لوگوں کی دل جوئی میں مصروف ہو گیا۔

یوں میری شوخ دکھنڈری بہن بیوگی کا داغ ماتھے پر سجائے میرے گھر لوٹ آئی۔

وقت پھر اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ میں نے شرہ کی معصوم شرارتوں اور باتوں میں خود کو بہلا لیا۔ افشاں بھی اس کی وجہ سے زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی اس لیے اس نے ایک انگلش میڈیم اسکول میں جاب کر لی۔ میں نے بھی اس لیے اعتراض نہ کیا کہ باہر رہ کر اس کا دل بہل جائے گا۔

زندگی پھر اسی ڈگر پر چلنے لگی۔ میں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتا رہا۔

میری دوسری بہن نورین نے ابھی انٹری کیا تھا کہ اس کے لیے قومی انٹرنل کے ایک پائلٹ کا رشتہ آ گیا۔ کلید میرا دیکھا بھالا تھا۔ ابو کے ایک دوست رزاق انکل کا بیٹا تھا۔ خاصا کھانا پیتا گھرانہ تھا۔ رزاق انکل کا انتقال ہو چکا تھا۔ کلید، ایک چھوٹی بہن اور والدہ کے علاوہ اس گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔

میں چاہتا تھا کہ فی الحال منگنی ہو جائے اور نورین بی اے کر لے لیکن کلید کی والدہ کو بہت جلدی تھی۔ یوں اس کی شادی ایک مہینے کے اندر اندر ہو گئی۔

میں نے اس کی شادی میں دل کھول کر اپنے ارمان نکالے۔ پھر وہ رخصت ہو کر اپنے سسرال چلی گئی۔

نورین کے جانے کے بعد گھر ایک دم خالی خالی سا لگنے لگا۔ افشاں نے تو گویا ہنستا بولنا چھوڑ دی دیا تھا۔ نورین ہی چپکتی رہتی تھی یا پھر اس کی اور نوشین کی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سے نوشین بھی بالکل چپ چاپ ہو گئی تھی۔

ایک دن میں تمکا ہارا اسپتال سے آیا تو معلوم ہوا گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ نوکر نے بتایا کہ بڑی بیگم صاحبہ کی کوئی رشتہ دار ہیں۔

میں نے انہیں زیادہ اہمیت نہ دی۔ ہمارے نزدیک کے چند ہی تو رشتے دار تھے۔

میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نہاد ہو کر، فریٹ ہو کر اپنے کمرے سے نکلا تو افشاں ہنستی ہوئی میرے

پاس آئی۔ اسے یوں مہینوں بعد ہنستا دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔

اس نے کہا "بھیا! گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ آپ آکر سیدھے کمرے میں ٹھہر گئے۔ وہ لوگ کیا کھانے کے کہ ان کا بیٹا کتنا بداخلاق ہے۔"

"ارے تو مہمان ہیں کون؟" میں نے پوچھا "ا، مہمانوں کے چکر میں آج تم نے شام کی چائے بھی کھل کر دی۔"

"امی کی سکھر والی کزن ہیں۔" افشاں ہنس کر بولی "آئیے، وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی ہیں۔ چائے بھی وہیں ملے گی آپ کو۔" افشاں نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

امی کی سکھر والی کزن سے بھلا مجھے کیا لینا دینا۔ میں جھنجھلایا ہوا سا ڈرائنگ روم میں پہنچا تو امی کے ساتھ ایک حسین چہرے کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ لڑکی تھی یا حسن کی صورت! اب تک بے شمار لڑکیاں میری نظروں سے گزری تھیں لیکن اتنا مکمل حسن تو میں نے بھی دیکھا ہی نہ تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر پڑیں تو ہنسا بھول گئیں۔

"آؤ بیٹا فرحان!" امی کی آواز پر میری محویت ٹوٹی "یہ تمہاری عابدہ خالہ ہیں۔" انہوں نے ادھیڑ عمر خاتون کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بہت نفیس خاتون تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں ادب سے سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹے!" انہوں نے کہا۔

"اور یہ عابدہ خالہ کی بیٹی صائمہ ہیں۔" افشاں نے اس نازنین کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے بہت ادا سے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر مجھے آداب کیا۔

"جتنی رہو۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔" میں نے کسی بڑی بوڑھی کی طرح اسے دعا دی۔

میرے اس انداز سے کمرے میں قہقہہ گونج اٹھے اور صائمہ کچھ جھپٹی جھپٹی نظر آنے لگی۔

"بیٹا فرحان!" عابدہ خالہ نے کہا "میں نے تمہیں اب سے سولہ سترہ سال پہلے دیکھا تھا۔ جب تمہارے خالو زندہ تھے تو میں کراچی آئی تھی۔ تمہیں تو شاید یاد بھی نہ ہوگا۔ اس وقت صائمہ میری گود میں تھی۔ ایک دن تم نے زبردستی اسے چادر لٹا دیے تھے۔"

"زبردستی کیوں خالہ!" میں نے ہنس کر پوچھا "کیا صائمہ چادر لٹا کر نہیں کھاتی ہیں؟"

"ارے بیٹا! یہ اس وقت صرف چھ مہینے کی تھی۔" خالہ نے ہنس کر کہا۔

"اچھا، یہ کبھی چھ مہینے کی بھی تھیں؟" میں نے حیرت کا ٹھہار کیا۔

"شاید کراچی میں لوگ پیدا ہوتے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔" صائمہ نے کہا۔ اس کی طرح اس کی آواز بھی دلکش تھی۔

انہی خوش گپیوں کے دوران۔۔۔ چائے پی گئی۔ مجھے ات کو کلینک جانا تھا لیکن میں نے اپنے اسٹنٹ ڈاکٹرز سے کہہ دیا کہ میں آج کلینک نہ آسکوں گا۔

رات کو امی اور افشاں میرے کمرے میں آئیں تو میں انہیں دیکھ کر چونک اٹھا۔

"آئیے امی!" میں نے بیڈ پر ان کے لیے جگہ بتائی۔

افشاں پہلے ہی بیڈ پر چکی تھی۔

"فرحان! تمہیں صائمہ کیسی لگی؟"

میں ان کا سوال سن کر چونک اٹھا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا کہ امی مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟

"صائمہ!" میں نے منہ بنا کر کہا "بس آدمی کا بچہ ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اچھی نہیں ہے؟" افشاں نے کہا پھر وہ امی سے بولی "امی، آپ عابدہ خالہ سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بد صورت بیٹی کی شادی سکھر میں ہی کہیں کر دیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "ارے، میں نے یہ کب کہا ہے کہ وہ بد صورت ہے۔ بھئی، آدمی کا بچہ تو میں بھی ہوں، تم بھی ہو۔ اس کا مطلب یہ کب ہوا کہ آدمی کے بچے بد صورت ہوتے ہیں؟"

"تو تمہیں یہ رشتہ پسند ہے؟" امی نے پوچھا۔

"ارے امی! آپ کو پسند ہے تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں لیکن پہلے میں نوشین کی شادی کروں گا۔" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"ابھی نوشین کی عمر شادی کی ہے؟" امی نے آٹھویں نکالیں "وہ ابھی میٹرک میں پڑھ رہی ہے۔ کیا تم بڑھاپے میں شادی کرو گے؟ پھر عابدہ اتنی دیر نہیں رکے گی۔ اس کی سسرال سے بھی دو تین رشتے آئے ہوئے ہیں، اسے مجبوراً صائمہ کی شادی انہی جاہلوں میں کرنا پڑے گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی امی!" میں نے سر جھکا کر کہا۔

پھر چٹ منگنی اور پٹ بیابا کے مصداق دو مہینے کے اندر

اندر صائمہ میری دلہن بن کر میرے آگن میں اتر آئی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ کبھی بھی تو مجھے یہ خوف ہوتا تھا کہ کہیں یہ میرے چھوٹے سے بھائی نہ ہو جائے۔

امی نے اس شادی کے موقع پر دل کھول کر اپنے ارمان نکالے، ویسے کی تقریب شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی۔

اب میں نے اپنی مصروفیت کچھ کم کر لی تھی۔ میں تو صائمہ کو دیکھ کر جیتا تھا۔

پھر وقت دے پاؤں یوں گزرا کہ مجھے احساس ہی نہ ہوسکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال گزر گئے۔ بس میرے دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ صائمہ کی گودا بھی تک خالی تھی۔

میں نے اپنا اور صائمہ کا میڈیکل چیک اپ بھی کرا لیا تھا۔ دونوں کی رپورٹس نارمل تھیں۔ بس قدرت ہی کی طرف سے دیر تھی۔ امی پہلے تو اشاروں کنایوں میں مجھے اس عہدی کا احساس دلاتی رہیں، پھر انہوں نے مکمل عام کہنا شروع کر دیا کہ مجھے ایک پوتا چاہیے۔ کیا میں امی یہ خواہش قبر میں ساتھ لے جاؤں گی؟ انہوں نے دے لفظوں میں مجھے دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا۔ میں نے ان کے اس مشورے کو مسترد کر دیا کہ جب ہم دونوں کی میڈیکل رپورٹس نارمل ہیں تو دوسری شادی کا کیا جواز ہے؟

اسی خواہش میں تین سال گزر گئے۔

نورین بھی ابھی تک ماں نہیں بنی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نوشین اب بھی جیسی رہتی ہے۔ اس کا چہرہ بھی پہلے کی طرح تروتازہ اور نکھرا ہوا نہیں تھا۔ یہ ظاہر اسے کوئی پریشانی بھی نہیں تھی۔ محبت کرنے والا شوہر تھا۔ شفیق ساس بھی۔ گھر میں ہر طرح کا آرام تھا۔

ایک دن افشاں کے بہت زیادہ اصرار پر وہ رونے لگی اور اس نے بتایا کہ اس کی ساس نے اس کا جینا حرام کر دیا ہے۔ کلید تو کئی کئی دن بلکہ ہفتوں کے لیے فلائٹ پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے ساس اور نند صنفیہ اس کی زندگی اجہرن کر دیتی ہیں۔ ہم دونوں کی میڈیکل رپورٹس بالکل ٹھیک ہیں لیکن ساس صاحبہ مجھے ہی قصور وار سمجھتی ہیں۔ وہ کلید کی دوسری شادی کرانا چاہتی ہیں۔

افشاں نے اسے سمجھایا کہ فکر مت کرو، اللہ کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔

میں اس دن کلینک میں تھا اور بہت زیادہ مصروف تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجی۔ شرہ کی کال تھی۔ میں نے کال نہ کی کیونکہ تو وہ بہت زیادہ گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولی "ماموں

جان! آپ فوراً گھر پہنچیں۔“
 ”خیریت تو ہے بیٹا!“ میں گھبرا گیا۔
 ”بس آپ فوراً گھر پہنچیں۔“ اس نے روتے ہوئے
 کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔
 میں نے سارے اپائنٹمنٹ منسوخ کیے اور آندھی
 طوفان کی طرح ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر پہنچا۔
 اسی سکتے کی حالت میں بیٹھی تھیں۔ افشاں اور نوشین
 بڑی طرح رورہی تھیں اور شرہ کی تو ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔
 افشاں نے روتے ہوئے بتایا کہ نورین نے مٹی کا تیل
 چھڑک کر خود کو آگ لگائی۔ وہ اس وقت سول اسپتال میں
 ہے اور اس کی حالت بہت خراب ہے۔
 میں نے شرہ اور نوشین کو ای کے پاس چھوڑا اور افشاں
 کو ساتھ لے کر اسپتال کی طرف دوڑا۔
 وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ نورین نے مٹی کے تیل کی بوتل
 اپنے جسم کے بالائی حصے پر انڈیلی تھی، پھر اس نے خود کو آگ
 لگائی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ بڑی طرح جھلس گیا تھا، صرف
 ٹانگیں محفوظ تھیں۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا اور اس کی حالت
 دیکھی نہیں جاتی تھی۔
 وہ اس وقت اپنی قوت ارادی کی بدولت ہوش میں تھی۔
 اسپتال کے ڈاکٹرز نے پولیس کو بھی طلب کر لیا تھا۔
 نورین نے بیان دیا کہ میں نے ساس اور تند کے طعنوں سے
 تنگ آ کر خود سوزی کی ہے۔ اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں
 ہے، میں خود ہوں۔
 ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں جانتا تھا کہ نورین
 جاں برب نہ ہو سکے گی۔ اس بڑی طرح جھلسے ہوئے مریض کو بھی
 نہیں بچتے تھے۔ اگر وہ بچ بھی جاتی تو اس کی بقیہ زندگی مزید
 اذیت میں گزرتی۔
 شام تک ٹھیک نہیں آ گیا۔ وہ نورین کو دیکھ کر ہاڑیں
 مار مار کر رونے لگا۔
 ایسا لگ رہا تھا جیسے نورین کو ٹھیک ہی کا انتظار ہو۔ رات
 تک اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ بھیانک
 انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔
 مجھے زور کا چکر آیا اور میں کھڑے قدموں فرش پر
 گر پڑا۔ میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ ارد گرد کی آوازیں
 میرے کانوں میں آرہی تھیں۔
 اچانک ایک جانی پہچانی آواز آئی۔
 ”ڈاکٹر! تو میرے گڈو کا قاتل ہے، خوشیاں یوں ہی
 تجھ سے دور دور بھاگتی رہیں گی۔“

”اب تو میرا بیچھا چھوڑ دو۔ میں نے بہت سزا بھگتی
 ہے، اب تو مجھے معاف کر دو۔“ میں چیخ کر بولا۔
 جواب میں مجھے زبیدہ کی ہڈی نی لی آواز سنائی
 دی۔
 اس وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور کوئی
 نرم لہجے میں بولا ”آرام سے لیٹے رہیں ڈاکٹر صاحب!“
 میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ سول اسپتال ہی کا
 ایک کمرہ تھا۔ فرش پر گرے سے میرے سر اور بازو پر چوٹ
 آئی تھی۔
 نورین کی موت کے بعد تو مجھے خوشیوں سے خوف آنے
 لگا تھا میں نے سوچا کہ میں زبیدہ کو تلاش کر کے اپنے طور پر
 معافی مانگ لوں لیکن میں اسے تلاش کہاں کرتا؟
 میرا چہرہ اسی کریم اس دن اسے اندر لایا تھا، شاید وہی
 اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو؟
 میں نے کریم کو بلایا اور پوچھا ”کریم! تمہیں وہ عورت
 یاد ہے جو ہڑتال کے دنوں میں یہاں آئی تھی؟“
 ”اچھی طرح یاد ہے ڈاکٹر صاحب!“ کریم نے کہا
 ”اس کا بچہ مر گیا تھا۔“
 ”ہاں ہاں!“ میں نے جلدی سے کہا ”تم جانتے ہو کہ
 وہ کہاں رہتی ہے؟“
 ”میں جانتا ہوں صاحب!“ کریم نے افسردگی سے
 کہا۔
 ”تو پھر مجھے اس کے پاس لے چلو۔“ میں نے بے تابا
 سے کہا۔
 ”وہ میرے ہی محلے میں رہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب!“
 کریم نے افسردگی سے کہا ”لیکن آپ نے بہت دیر کر دی۔
 اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔“
 ”اف میرے خدا!“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر
 تھام لیا۔
 ”بیٹے کی موت کے بعد وہ پاگل ہو گئی تھی ڈا
 صاحب!“ کریم بولے جا رہا تھا ”وہ پچھلے حال، بڑے احوال
 گلیوں میں ماری ماری پھرتی تھی، بچے اسے پتھر مارتے تھے
 لیکن اس نے کبھی کسی بچے کو کچھ نہیں کہا، پھر ایک دن دیوانگی
 میں سڑک پار کرتے ہوئے وہ ایک ٹرک کی لپیٹ میں
 آ گئی۔“
 ”اور اس کا شوہر.....؟“ میں نے پوچھا۔
 ”وہ تو اس کے مرنے کے فوراً بعد وہ محلہ چھوڑ گیا تھا۔“
 کریم کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک ساکھ

ماہ بیٹھا رہا۔ زبیدہ سے معافی مانگنے کی آخری امید بھی دم
 لگتی تھی۔
 نورین کی موت اور افشاں کی بیوگی سے گھر پر عجیب سی
 امت چھا گئی تھی۔ امی ٹوٹ کر رہ گئی تھیں اور مجھے اب ان کی
 ل سے بھی فکر رہنے لگی تھی۔
 صائمہ اولاد کے لیے اب دوا علاج چھوڑ کر بیروں
 لایروں اور مزاروں کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ وہ مجھے عبداللہ
 شاہ غازی کے مزار پر لے گئی، ٹھنڈے مزاروں پر حاضری
 لے، شاہ عقیق کے مزار پر جا کر منت مانی، سیون شریف گئی،
 حنا دربار گئی، بڑی امام گئی۔ غرض وہ ہر اس مزار پر گئی جہاں
 اسے امید کی ہلکی سی کرن بھی نظر آئی۔
 ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے لیکن صائمہ کی گود
 اب تک خالی تھی۔ امی کافی ضعیف ہو گئی تھیں۔ اب تو انہوں
 نے بھی پوتے کی تمنا چھوڑ دی تھی۔ بس وہ ہر دم اداس رہتیں
 اور نلا میں نکلتی رہتیں۔ شرہ اب ماشاء اللہ دس سال کی ہو گئی
 تھی۔ وہی امی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔
 میں ایک مرتبہ پھر دولت سینے میں مصروف ہو گیا تھا۔
 تے کلنٹن میں ایک کلینک اور کھول لیا تھا۔
 خیرے کلاس فیلو میری قسمت پر رشک کرتے تھے کہ محض
 نام بی بی ایس کر کے میں لاکھوں روپے ماہانہ کما رہا تھا۔
 سے پاس تو کوئی اعلیٰ ڈگری بھی نہیں تھی ورنہ ڈگریوں کی
 قضا رکے بغیر کوئی بھی ڈاکٹر کامیاب نہیں ہو سکتا۔
 صائمہ نہ صرف مزاروں پر حاضری دے رہی تھی بلکہ وہ
 ہڈ علاج پر بھی لاکھوں روپے خرچ کر رہی تھی۔
 شادی کا ساتواں سال تھا کہ امریکا سے ایک ماہر ڈاکٹر
 تات آیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کے علاج سے شرطیہ طور پر
 و پیدا ہو سکتی ہے۔ صائمہ کی ضد پر میں اس ڈاکٹر سے بھی
 ڈاکٹر ہونے کے ناتے اس نے میرا بہت خیال کیا اور
 مکہ ڈاکٹر صاحب! آپ دونوں کی رپورٹس نارمل ہیں۔
 آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھوں گا۔ میرے علاج سے
 ل اتنا فائدہ ہوگا کہ ہارمونز متحرک ہو جائیں گے۔ اولاد
 سوتا یا نہ ہوتا درست قدرت میں ہے۔ میں تو کوشش ہی
 سکتا ہوں۔
 اس نے جو دوائیں دیں وہ بھی ان دواؤں سے مختلف
 جو صائمہ اب تک استعمال کرتی رہی تھی۔ اس نے مجھے
 سپر سولز کا ایک کورس کرایا۔
 آخر اللہ نے ہماری سن ہی لی۔ صائمہ کی طبیعت خراب

ہو گئی تو میں نے پہلے تو خود ہی اس کا چیک اپ کیا، پھر مزید
 تصدیق کے لیے شہر کے ایک معروف گائناکولوجسٹ کے
 پاس لے گیا۔ الٹراساؤنڈ کے بعد اس نے بھی تصدیق کر دی
 کہ صائمہ ماں بننے والی ہے۔
 وہ دن میری زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ امی بھی اس خبر
 سے گویا دوبارہ جی اٹھی تھیں اور انہوں نے اپنی عمر کے دس
 سال گویا جھٹک دیے تھے۔
 افشاں اور امی نے صائمہ کو بالکل بیڈ پر بٹھادیا۔ ان
 دونوں نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنالیا تھا۔ آخر آٹھ سال کے طویل
 انتظار کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے خوشی کا یہ دن دکھایا تھا۔
 پھر صائمہ نے چاند سے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ امی نے
 اس کا نام ارسلان رکھا۔ صائمہ پیار میں اسے مون کہتی تھی کہ
 وہ تھا بھی چاند کا کلڑا۔
 میرے گھر میں خوشیاں ایک مرتبہ پھر لوٹ آئیں۔
 افشاں اور نوشین تو مون کی دیوانی تھی، شرہ بھی اسکول سے
 آنے کے بعد سارا وقت مون ہی کو لیے رہتی تھی۔ وہ بھی اب
 چودہ سال کی ہو رہی تھی۔
 وقت سبک رفتاری سے گزرتا رہا۔ مون ایک سال کا
 ہونے والا تھا۔ صائمہ اس کی پہلی سالگرہ بہت دھوم دھام
 سے کرنا چاہتی تھی۔ اس کی سالگرہ میں ابھی پندرہ دن باقی
 تھے۔ صائمہ کی شائنگ ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ افشاں، نوشین
 اور شرہ بھی بہت خوش تھیں۔
 شرہ کئی دن سے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ مجھے کچھ ضروری
 چیزیں خریدنا ہیں۔ بس یہ آخری شاپنگ ہے۔ آپ بھی
 میرے ساتھ چلیں۔“
 مجھے غم نہیں مل پارہا تھا۔ اصل میں صائمہ میرے ہی
 لیے کچھ شاپنگ کرنا چاہتی تھی۔
 میں نے اس سے کہا کہ تم امی، افشاں اور نوشین کو لے
 جاؤ۔ امی نے شاپنگ بھی نہیں کی ہے، انہیں بھی شاپنگ
 کرا دینا اور شرہ کو بھی میری طرف سے ایک نیا سوٹ
 دلوانا۔
 میں حسب معمول اسپتال آ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا
 کہ کسی ڈاکٹر نے ایک نرس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش
 کی تھی اس لیے تمام نرسیں اسٹرائیک پر چلی گئیں۔ انہوں نے
 میڈیا کو بھی یہ بیان دیا تھا کہ جب تک ہماری عزت و آبرو کی
 حفاظت کی کوئی ضمانت حکومتی سطح پر نہیں دی جاتی، ہم
 اسٹرائیک پر رہیں گے۔
 جواب میں ڈاکٹر نے بھی اسٹرائیک کر دی۔ یہ ہم پر

اور جب میں نے دکاندار کو اپنی پسند بتائی تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں بے پناہ حیرت بھی تھی اور تسخیر بھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک اچھی عمر کا آدمی ہوں۔ میرے سارے بال سفید ہو چکے ہیں اسی لیے اسے حیرت ہو رہی ہوگی کہ یہ بڑے میاں کس قسم کی ماڈرن پسند رکھتے ہیں۔

اس نے جب مجھے دیکھا تو ذرا سی دیر کے لیے میں ان خوبصورت آنکھوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ پورے بدن میں ایک سناٹا سلجھوس ہونے لگا۔

وہ آنکھیں اپنے آپ میں سمو لینے کی قدرت رکھتی تھیں۔ وہ لڑکی اپنی پسند کے کیسٹ لے کر چلی گئی لیکن میں اس دکان میں کھڑا رہ گیا تھا۔ مجھے اس وقت اپنی بڑی ہوئی عمر کا احساس ہونے لگا تھا۔ کاش میں اپنے وقت سے بچیں

لاکھ بھگت

محترم مدیر اعلیٰ
سلام مسنون!
میں جب بھی لکھتا ہوں، حقیقت لکھتا ہوں۔ یہ واقعہ جو چشم کشا ہے، اس کا ہر لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ میرے ایک واقف کار کا واقعہ ہے۔ وہ ایک بڑا نام ہے اس لیے میں نے اس کا نام حذف کر دیا ہے۔ امید ہے قارئین کے لیے یہ واقعہ ایک سبق ہوگا۔
منظر امام
(کراچی)



میں ایک سائے کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ سائے سے مراد ہے آنکھیں۔ گہری نیلی اور دلوں میں اتر جانے والی خوبصورت آنکھیں!

یہ آنکھیں مجھے ایک آڈیو شاپ پر ملی تھیں۔ میں وہاں اپنے پروفیشنل کام کے سلسلے میں انگریزی کی چند کمپوزیشن لپٹے گیا تھا۔ بیک گراؤنڈ میوزک کے لیے۔

اس دکان میں وہ لڑکی بھی موجود تھی۔ نیلے رنگ کے رقع میں صرف اس کی خوبصورت آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں، اس کے علاوہ اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ سامنے نہیں تھا۔

لیکن چہرے کا جتنا حصہ بھی کھلا ہوا تھا اس نے یہ بتا دیا تھا کہ لڑکی کتنی خوبصورت ہے۔ وہ بھی اپنی پسند کے کیسٹ لے رہی تھی، آج کی جدید پسند۔

ہسپتال کے دروازے پر بڑی طرح گھومنے لگے۔ ڈاکٹر شوکت اگر آگے بڑھ کر مجھے سہارا نہ دیتے تو شاید میں پکرا کر گر جاتا۔

میں نے ہمت مجتمع کی اور کانپتے ہاتھوں سے ایک لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ میں چیخ پڑا۔ وہ شہرہ کی لاش تھی۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت اور شوخی تھی۔ دوسری لاش صائمہ کی تھی۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہو کر رہ گئے تھے۔ افشاں، امی اور نوشین کی لاشیں اس قابل نہیں تھیں کہ انہیں دیکھا جاتا۔ ان کے چہرے مسخ ہو گئے تھے لیکن قابل شناخت تھے۔

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سب سے چھوٹی لاش پر سے چادر ہٹائی۔ میرے من کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے باوجود کہ اس کے جسم کا دایاں حصہ دھماکے میں اڑ گیا تھا۔

مجھے بہت زور کا پکڑ آیا اور میں دھڑام سے فرش پر گر گیا۔

ڈاکٹروں اور نرسوں کی ملی جلی آوازوں میں ایک آواز پھر نمایاں تھی۔ وہ زبیدہ کی آواز تھی ”دیکھا ڈاکٹر..... جب اپنی اولاد مرے تو دل پر کیا گزرتی ہے اور تو، تو اب سب کچھ کھو بیٹھا ہے..... تجھے بہت غرور ہے نا اپنی ڈاکٹری کا..... تو پھر انہیں زندہ کر لے..... زندہ کر لے انہیں۔“

میں نے نظریں سمٹھا کر دیکھا، ایک بچنے والی، اُجڑی ہوئی عورت میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ دیوانہ وار تہمتیں لگا رہی تھی۔

”اس عورت کو ہٹاؤ۔“ میں نے ہڈیانی انداز میں کہا۔

”یہاں تو کوئی عورت نہیں ہے ڈاکٹر فرحان!“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

ڈاکٹر یہ سمجھے کہ اس حادثے کی وجہ سے میں اعصابی تار کا شکار ہو گیا ہوں۔

زبیدہ کے قہقہے اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اس پاگل پن کے باعث میری ملازمت ختم ہو گئی، میری پریکٹس ختم ہو گئی اور میں مجبور بن کر اپنے گھر کے ایک کمرے میں پڑا ہوا ہوں۔ اب تو میں اللہ سے گڑگڑا کر یہی دعا کرتا ہوں کہ اے مالک دو جہاں، میں نے اپنے کیے کی بہت سزا بھگت لی، اپنا پورا خاندان گنوا دیا۔ اب تو مجھے معاف کر دے۔ اب تو مجھے زبیدہ کی بددعا سے نجات دے دے۔“

سراسر الزام ہے۔ وہ نرس ڈاکٹر سے ذاتی عناد کی بنا پر ایسا کہہ رہی ہے۔

ہسپتال میں امیڑائیک تھی اس لیے میں نے سوچا کہ میں صائمہ اور دوسرے گھروالوں کے ساتھ شاپنگ ہی کر لوں۔ میں نے گھر ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ شاپنگ کے لیے نکل چکے ہیں۔

ایک دفعہ پھر وہی منظر تھا۔ اوپلی ڈی کے باہر بے شمار مریض جمع تھے لیکن کوئی پرسن حال نہیں تھا۔

میں نے کریم سے ایک مرتبہ پھر اوپلی ڈی کا مین گیٹ بند کرا دیا تھا۔

اس وقت ایمرجنسی سے کال آئی کہ یہاں بم دھماکے کے کئی مریض بہت تشویش ناک حالت میں لائے گئے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر زکی تعداد کم ہے اس لیے آپ پلیز ایمرجنسی میں آ جائیں۔

اسٹرائیک کے دوران میں عموماً ہوتا یہ ہے کہ ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر حسب معمول کام کرتے رہتے ہیں۔

میں ایمرجنسی کی طرف جانے کے لیے نکلا تو اس وقت ملک کی ایک اہم شخصیت کو زخمی حالت میں لایا گیا۔ ان کی فوری نگہداشت بہت ضروری تھی۔ میں نے انہیں آپریشن میٹر میں منتقل کرا دیا۔

دو گھنٹے بعد جب میں آپریشن سے فارغ ہو کر نکلا تو ڈاکٹر فیضان میرے پاس آئے اور افسردہ لہجے میں بولنے لگے ڈاکٹر فرحان! آپ میرے ساتھ آئیے۔“

”کیا کوئی اور مریض آ گیا ہے؟“ میں نے پوچھا

”میں اس وقت بہت تھک گیا ہوں، آپ ڈاکٹر شاید کو.....“

میرے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے۔ ایمرجنسی کے برآمدے میں قطار سے چھ لاشیں رکھی تھیں۔ یہ لوگ خودکش بم دھماکے میں جاں بہ حق ہوئے تھے۔ ان کے چہرے چادروں میں چپے ہوئے تھے۔

”ہمیں افسوس ہے ڈاکٹر فرحان!“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”وہ ایمرجنسی وارڈ کے انچارج تھے ہم نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن ہم آپ کی سزگوندہ بچا سکے۔“

”میری سز.....!“ میں نے حیرت سے کہا ”کہاں ہے صائمہ! وہ تو شاپنگ کے لیے گئی تھی۔“

”جی ہاں، وہیں تو بم دھماکا ہوا ہے۔ اس حادثے میں آپ کا ڈرائیور بھی ایکسپائر ہو گیا ہے۔ آپ کی سز کے پرس سے یہ شناختی کارڈ نکلا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں علم ہوا کہ میڈم صائمہ فرحان، آپ کی سز ہیں۔“

سال پیچھے ہوتا، کاش!

میں ایک فلم ڈائریکٹر ہوں۔

میں نے ابتدا قلموں سے کی تھی پھر قلموں کا بڑا حال دیکھ کر چھوٹی اسکرین یعنی ٹی وی کی طرف آ گیا تھا اور ڈرامے وغیرہ بنایا کرتا۔

اس شاپ میں جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایک ڈرامے کے بیک گراؤنڈ میوزک کے لیے نئے آئیڈیاز لیے جائیں۔ میں جس لائن سے وابستہ تھا اس میں لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ایک سے ایک خوبصورت طرح دار لیکن اب تک کسی نے اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا ہوگا جتنا اتریہ لڑکی دے گئی تھی، صرف اپنی آنکھوں کے ذریعے۔

وہ لڑکی محلے ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ شاپ ایسی تھی جس میں عام طور پر اہل محلہ ہی آیا کرتے تھے۔ میں خود بھی اسی محلے میں رہتا تھا۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ میں اسے دوبارہ تلاش کر لوں گا۔ اس کے بارے میں دکاندار سے بھی معلوم کرنا مناسب نہیں تھا۔

گھر کے پاس ایک مارکیٹ بھی ہے۔ میں کئی دنوں تک ان آنکھوں کو مارکیٹ میں اور اس دکان میں تلاش کرتا رہا لیکن وہ دوبارہ دکھائی نہیں دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہیں پر کوئی سوئی انگ گئی ہو۔

پھر ایک شام وہ دکھائی دے گئی۔ علاقے ہی کے ایک خوبصورت فاسٹ فوڈ ریستورنٹ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوسری لڑکی بھی تھی۔ میں ان کے سامنے والی میز پر بیٹھا تھا اس لیے جب اس لڑکی نے میری طرف اپنی آنکھیں اٹھائیں تو میں نے فوراً پہچان لیا۔

یہ وہی تھی وہی آنکھیں، وہی انداز، آنکھوں میں وہی شرارت۔ وہ اپنی ساہمی لڑکی سے کچھ کہنے لگی تھی اس پر اس کی ساہمی نے بھی میری طرف دیکھا تھا۔ شاید اس لڑکی نے یہ بتایا ہوگا کہ بڑے میاں کو اس عمر میں بھی انگلش گانوں کا شوق ہے یا اسی قسم کی کوئی اور بات۔

ساتھی لڑکی ہنسنے لگی تھی اور میں..... میں تو ایک بار پھر ان آنکھوں کے سحر میں کھو گیا تھا۔ ایسی بولتی اور جادو جگاتی ہوئی آنکھیں بہت کم ہی ہوتی ہوں گی۔

جب وہ چلنے لگیں تو غیر ارادی طور پر میں بھی ان کے پیچھے چل پڑا بہت مناسب فاصلہ دے کر میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس تعاقب کا احساس ہو جائے۔

انہیں احساس بھی نہیں ہوا اور میں نے ان کا مکان

دیکھ لیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ وہ ایک خوبصورت مکان تھا۔ ایک منزلہ گھر بہت نفیس۔ چھوٹا سا لان جس میں بہت خوبصورت پارک لگے ہوئے تھے۔

اتنی خوبصورت آنکھوں والی لڑکی کا گھر ایسا ہی 11 چاہیے تھا۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں ایک بڑی عمر کا آدمی ہوں اسی لیے مجھے ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ میری بیوی نے دو بچے ہیں اس کے باوجود میں اس لڑکی کی قوت کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

دل چاہتا تھا کہ اس سے باتیں کروں۔ اس سے ملوں اور اس کی آنکھوں کے دریا میں ڈوب جاؤں، اسی لیے میں نے اس کے گھر کے آس پاس چکر لگانے شروع کر دیے اس توقع پر کہ شاید وہ کبھی دکھائی دے جائے۔ ایک دن پھر وہ دکھائی دے گئی۔

اس دن وہ اکیلی تھی اور ایک دکان سے باہر آ رہی تھی۔ میں جان بوجھ کر اس کے سامنے آ گیا کہ وہ مجھے دیکھ سکے اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹکی تھیں۔ اس نے یقیناً مجھے شناخت کر لیا تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے یہ احساس ہو کہ میں اس میں..... دلچسپی لینے لگا ہوں۔ کچھ آگے جا کر ایک بک اسٹال تھا۔ میں میگزین وغیرہ دیکھنے کے بہانے وہاں کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے کس توقع پر اور یہ توقع اس طرح پوری ہوئی کہ وہ بھی اسی اسٹال پر آ گئی تھی اور اس نے ایک میگزین میگزین طلب کیا تھا۔

میں نے ایک میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی جب کہ میرا دھیان اسی کی طرف تھا۔ میگزین کی قیمت ادا کرنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ "ماشاء اللہ ہر قسم کا شوق ہے آپ کو۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ بہت ہی شوخ قسم کا جملہ تھا جس سے اس کے مزاج کی شرارت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میں نے بھی ایک میگزین کی قیمت ادا کی اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ لیکن وہ مارکیٹ کی بھیڑ میں کہیں گم ہو چکی تھی۔

اس سے ایک اور ملاقات بھی اسی انداز سے ہوئی تھی۔ میں ایک دکان سے اپنی پسند کا پرفیوم لے رہا تھا اور مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ لڑکی بھی اسی دکان میں میرے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ جب میں پرفیوم لے کر باہر نکلنے لگا تو پھر اس پر نظر پڑی اور اس بار بھی اس نے ایک جملہ جست کر

"یہ مہر تو عطر گلاب خریدنے کی ہوتی ہے، ماڈرن" میں مسکرا دیا۔ اس بار میں خاموش نہیں رہا تھا۔ "محترمہ" ایسے ہوتے ہیں جن سے ملنے کے بعد گزرتی ہوئی عمر محسوس نہیں ہوتا وہ پھر سے جوان کر دیتے ہیں۔

"تو کس نے جوان کیا ہے آپ کو؟"

"ہے ایک لڑکی۔ جس کی اب تک صرف آنکھیں

اہوں۔" میں نے کہا۔ "بہت خوب۔" وہ مسکرا دی۔ اس کے مسکرانے کا وہ اس کی آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ "خدا آپ کے حال پر ہے۔"

"آنکھیں رحم کر جائیں تو خدا بھی رحم کر دے گا۔" وہ چند لمحوں تک دیکھتے رہنے کے بعد آگے بڑھ گئی۔ خود بھی اس طرح مارکیٹ میں کھڑے ہو کر اس سے باتیں کرنا بہانہ لگ رہا تھا۔

اب بے قراری میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اب سے باتیں بھی ہو گئی تھیں۔ شوخ لہجہ۔ خوبصورت آواز۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھ لیتا۔ وہ اس قابل تھی۔

ایک بار پھر ملاقات ہو گئی۔ میں یہ کہوں گا کہ یہ ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں میری کوششوں کا ثمر تھا۔ یعنی اس کے گھر کی نگرانی کے دوران میں اور جب وہ گھر سے نکل کر مارکیٹ کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی تو میں اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"خدا کی پناہ۔ کچھ لوگ ہمیشہ مارکیٹ ہی میں دکھائی دیتے ہیں۔" میں اس کے قریب سے ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"خدا کی پناہ۔ کچھ لوگ اس عمر میں بھی ایسے حرکتوں سے باز نہیں آتے۔" یہ اس کا جملہ تھا۔

اس دن بھی ان دو جملوں کے تبادلوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوا لیکن ایک دن میں نے دل کڑا کر اس کے اس سے دو چار باتیں کر لی ہیں۔ وہ راستے میں مل گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "آنکھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا انگلش گانے پسند کرنا اور ہلوم وغیرہ لینا میرے پروفیشن کی بھجوری ہے۔"

"اوہو۔ ایسا کون سا پروفیشن ہے کہ آپ ماضی کی طرف لوٹ گئے ہیں۔"

میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ "میوزک میں اپنے ڈرامے کے بیک گراؤنڈ کے لیے پسند کر رہا تھا۔"

لفظ مشاعرہ مروج و مستعمل ہوا تو اس کے دوش بدوش اسی وزن کے اور کئی الفاظ بنائے گئے اور معنوی اعتبار سے مشاعرے کے مترادفات قرار پائے۔ ان لفظوں میں مراختہ، مسالہ، منالہ اور مغالہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مراختہ کی اصل عربی نہیں ہے یہ ریختہ یعنی اردو سے بردوزن مشاعرہ گھڑ لیا گیا ہے۔ ریختہ کا لفظ اصلاً فارسی مصدر "ریختن" کا اسم مفعول ہے اور اس کے لغوی معنی گرا پڑا اور کم مایہ و کم رتبہ ہیں۔ اردو کو چونکہ شروع شروع میں فارسی کے مقابلے میں کم تر درجے کی عامیانہ زبان خیال کیا جاتا تھا اس لیے "ریختہ" کہا جانے لگا۔ فارسی میں "ریختن" کے دوسرے لغوی دجازی معنی کی رعایت سے ریختہ کے معنی پختہ اور مضبوط و مستحکم بھی ہیں۔ اردو چونکہ متعدد زبانوں کے آمیزے سے وجود میں آئی ہے اور اس کی تعمیر کے لیے کئی اجزا کو ملا کر مسالہ تیار کیا گیا ہے اس لیے اردو کو ریختہ کہا جانے لگا۔ وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو، اس میں شبہ نہیں کہ "ریختہ" اردو ہی کا دوسرا نام ہے اور اردو میں لفظ "مراختہ" اسی سے مشتق ہے۔ حتیٰ کہ "ریختہ" سے اردو میں ایک نئی اور بہت عجیب و غریب صنف سخن "ریختی" کے نام سے وجود میں آ گئی۔

"مراختہ" کا لفظ غالباً اردو مشاعرے کو فارسی مشاعرے سے تمیز کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ شعرائے قدیم کے تذکروں ہی میں یہ لفظ نظر آتا ہے۔ میر تقی میر نے میاں کترین کے بیان میں لکھا ہے کہ "گاہے گاہے در مجلس مراختہ کہیں لفظ بردوزن مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات ی شود" (نکات الشعراء، مرتبہ مولوی عبدالحق اور بیگ آباد 1935ء صفحہ 147) لیکن یہ قول مولوی عبدالحق "یہ اصطلاح صرف چند روز ہی رہی۔ خود ریختہ کا لفظ بھی کسی بھی غالب کے ابتدائی دور تک استعمال ہوا مگر جب ہر زبان عام ہو گئی تو خود بخود مٹ کر ہو گیا۔" (المہلات مہدائے، دہلی 1938ء صفحہ 79) مسالہ اپنی سادگی اور اصل میں عربی ہے، باہم سلام علیک کے معنی رکھتا ہے اور قدما میں اسی طود پر مستعمل رہ چکا ہے لیکن سرچے کی مقبولیت کا دور آیا تو اس کے لوازم کے حوالے سے اس لفظ نے ایک الگ صنف سخن کی صورت اختیار کر لی۔ اس طرح جب صرف سلام پڑھنے یا سنانے کی غرض سے شعرا کیجا ہوئے تو اس مجلس کو مسالہ کہا جانے لگا۔ اقتباس: مشاعرہ از فرمان فتح پوری

مرسلہ: تنہیم کوثر، حاصل پور



جھانسا

مکرم ومحترم معراج رسول صاحب
السلام علیکم!

میں پیشے کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہوں اور یہ میری اپنی روداد ہے۔
میرے ساتھ ایک عورت نے کتنا عجیب مذاق کیا ہے، اسی کی روداد
سنارہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ میری طرح کوئی اور یہ وقوف نہ بنے،
کسی اور کی شہرت داؤ پر نہ لگے، کوئی اور معصوم اپنی
ڈاکٹر ذیشان سولنکی
معصومیت کا شکار نہ بن جائے۔
(جیکب آباد)

عرے میں میری پریکٹس خاصی جم گئی۔ ساتھ ہی میں گورنمنٹ
جانب کے لیے بھی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھا۔
بات کہاں سے کہاں نکل گئی..... پہلے اپنا تھوڑا تعارف
تو کرادوں ورنہ آپ کو میری یہ جیگر حیرت انگیز کھا پڑنے کا
دوہڑہ نہیں آئے گا۔

بہر حال میں کہہ رہا تھا کہ آج مجھے کلینک سے واپسی پر
کوئی دزٹ نہیں کرنا تھا مگر جب میں آخری مریض کو فارغ
کرنے کے بعد اسے اپنے ڈسپنسر کے حوالے کر کے جانے کی
تیاری کرنے لگا تو دو افراد کلینک میں داخل ہوئے، میں نے
اُن کی طرف دیکھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی مریض نظر نہیں
آ رہا تھا۔ میں نے اُن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مریضوں کا رش
کم ہو گیا تھا۔ دس بجے تک میں آخر کے دو "وزٹس" نہ بنا کر
گھر روانہ ہو جاتا تھا۔ چونکہ آج کوئی دزٹ نہیں تھا اس لیے
جیگر نصف گھنٹا پہلے پہنچنے کی امید تھی۔ دس بجے بھی جلدی گھر
آ کر کیا کرنا تھا، سونا ہی تھا۔ میں والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھ
بڑی دہائیں تھیں، سب سے بڑی کی شادی ہو چکی تھی اور
دوسری چچا زاد سے منسوب تھی۔ میری بھی شادی نہیں ہوئی
تھی۔

میں نے بھی حال ہی میں ایم بی بی ایس کیا تھا، ہاؤس
جواب کرنے کے فوراً بعد جیکب آباد میں ہی کلینک کھول لیا تھا
کیونکہ یہی میرا آبائی شہر تھا۔ اللہ کا شکر تھا کہ تھوڑے ہی

آپ کو کس طرح روکا جائے کیونکہ آپ تو مجھے
خوبصورت سمجھ کر میرے پیچھے بڑ گئے تھے۔ پھر میں نے
مناسب سمجھا کہ میں آپ کے گھر جا کر آپ کی ہا
ساتھ خود کو ظاہر کر دوں اور میں نے خود کو ظاہر کر دیا۔
نتیجہ یہ دیکھ رہی ہوں کہ آپ کے سر کا بھوت اُتر چکا
آپ مجھ سے کترانے لگے ہیں۔"

"نہیں۔" میرے ہونٹوں پر ایک پھینکی سی مسکرا
نمودار ہو گئی۔ "میں ابھی بھی تم سے دوستی کرنے کو تیار ہوں"
"لیکن یہ دوستی صرف مہربان اور ہمدرد دوست
ہوگی۔ ایسا دوست جو دوست بھی ہو اور بزرگ بن کر سارا
دے سکے۔ بتائیں۔ کیا آپ ایسی دوستی کے لیے تیار ہیں؟"
"ہاں۔" میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ "کیونکہ تم
میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"چاہے میں جیسی بھی ہوں۔"
"ہاں۔ چاہے تم جیسی بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "لہ
تمہاری ذہانت، تمہاری باتوں اور تمہاری شرارتی آنکھوں
سے دلچسپی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

"بدل تو نہیں جائیں گے۔"
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"
"تو پھر آپ بھی مجھے دیکھ لیں۔" اس نے اپنا ہاتھ
اُتار دیا۔

خدا کی پناہ۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ا
خوبصورت آنکھوں کی طرح وہ مجسم خوبصورت تھی۔ سال
شفاف چہرہ۔ کہاں کے دانے۔ کہاں کے داغ دھبے۔ ہر
بھی نہیں تھا۔

"تو پھر۔ میری بیوی نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔" میں
نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے اس بے چاری کے پاس اپنی ایک دوست
بھیجا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اس بے چاری کا چہرہ ایسا ہی ہے
جیسا آپ نے سنا ہوگا۔ اب بتائیں۔ اب کیا کہتے ہیں۔"
"کیا کہوں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "ایک ہا
پھر تمہاری ذہانت اور شرارت کا قائل ہو گیا ہوں۔"
"تو پھر ہم دوست تو ہو گئے نا۔"

"ہاں۔"
"کیسے دوست؟"

"جیسے دوست کی جہیں خواہش ہے۔" میں نے کہا۔
اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ہے۔"
"ہاں۔ پچھلے دنوں کچھ مصروف رہا تھا۔" میں نے کہا۔
"کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے گھر بھی گئی
تھی۔" اس نے بتایا۔ "آپ کی بیوی سے ملاقات ہوئی تھی۔
بہت اچھی خاتون ہیں۔"

"ہاں۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔"
"اور یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں کیسی ہوں۔" اس نے
کہا۔ "شاید اس لیے میری طرف سے آپ کا سارا جوش ٹھنڈا
ہو چکا ہے۔"

"نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"
"ڈائریکٹر صاحب۔ میں بھی چہرے پڑھنا جانتی
ہوں۔ خیر چھوڑیں۔ چلیں۔ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ آپ سے
بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

ہم ایک ہول میں آ گئے۔ یہاں کین کا بھی انتظام
تھا۔ وہ مجھے ایک کین میں لے آئی۔
"جی اب بتائیں۔" اس نے پوچھا۔
"کیا بتاؤں؟"

"ڈائریکٹر صاحب۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ انسان کی
فطرت ہے کہ وہ حسرت پرست ہوتا ہے لیکن اس کے لیے
ضروری ہے کہ وہ خود کو کنٹرول میں رکھے۔ اسے اپنے آپ پر
جبر کرنا پڑتا ہے کیونکہ حسن پرست اور رومانویت کا وقت نکل
چکا ہوتا ہے۔ وہ اب عصر کا کافی حصہ ملے کر چکا ہوتا ہے۔ کیا
میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

"نہیں۔ تم ٹھیکس ہی کہہ رہی ہو۔"
"اسے اپنے آپ کو مارنا ہوتا ہے۔ اپنی ساکھ کے
لیے۔ اپنی عمر کے لیے۔ اپنے گھر کے لیے۔ اپنی بیوی بچوں
کے لیے۔ یہ عمر عشق کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ اپنا تجزیہ کرنے کی
ہوتی ہے۔"

"تم شاید مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"
"نہیں۔ احساس دلانا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔
"جس وقت ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ اسی وقت میں نے
محسوس کر لیا تھا کہ آپ۔ میری آنکھوں کے سحر میں مبتلا ہو چکے
ہیں۔ آپ کو میں پسند آتی ہوں۔ یہ جھوٹ تو نہیں ہے۔"
"نہیں۔ تم ٹھیکس ہی کہہ رہی ہو۔"

اس کے بعد بھی۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں اور احساس ہو گیا
کہ آپ نوجوانوں جیسا کہتے تھے گئے ہیں۔ یعنی میرا
انتظار کرنا۔ مگر کے چکر کھانا اور یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی۔
کم از کم آپ کو بالکل ز۔ یہ نہیں دیتا تھا۔ میں سوچتی رہی کہ

وہ مجھے لینے آئے تھے، ان کا کوئی مریض تھا جس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے اپنے کپاؤنڈر سے میڈیکل ایمرجنسی بیک تیار کرنے کو کہا، ان میں سے ایک نے میرا باکس سنبالا، دوسرے نے تانگا پکڑا اور ہم چل پڑے۔ دونوں آدمی میرے لیے اجنبی تھے۔ یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ میرے کلینک میں تقریباً روزانہ ہی دوسرے علاقے سے مریض آتے تھے۔ اجنبی سے مراد آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ لوگ جو میرے مستقل مریض نہ تھے۔ جبکہ آباد شہر تھا ہی کتنا بڑا، سب ایک دوسرے کے دیکھے بھالے تھے۔ میرا کلینک سکھر، شکار پور جانے والی مین شاہراہ پر واقع تھا۔ یہ علاقہ جعفر آباد کہلاتا تھا۔ مغرب میں شہر تھا، شرق میں لمبی سڑک..... ہمارا تانگا شرق ہی کی سمت چل رہا تھا۔

ریلوے بھانگ پار کرنے کے بعد کوئی پندرہ بیس منٹ بعد تانگے والے کو دائیں جانب کے قدرے نیچے راستے پر اترنے کو کہا گیا۔ آگے چھوٹے چھوٹے گھروں کے خاکے نظر آ رہے تھے، کہیں کہیں ٹھناتی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ مضافاتی علاقے کا کوئی گوشہ تھا، مجھے نہ جانے کیوں بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ ہمارے علاقے میں یہ بد امنی بھی تو تھی؟ لوٹ مار، اغوا، بے تابان۔

بہر طور کسی بھی آبادی کے چھوٹے سے گوشہ میں ہم داخل ہوئے، پھر ایک گارے مٹی کی دیواروں والے گھر کے سامنے تانگا رک گیا۔ ہم نیچے اترے، ایک نے لکڑی کا اکلوتے پٹ والا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا، اندر... بلب کی روشنی میں مجھے چار افراد نظر آئے۔ وسط میں ایک چار پائی پر کوئی رلی اوڑھے بیٹھا تھا۔ میں اندر داخل ہوا، ایک نے مریض پر سے رلی ہٹائی۔ میں مریض کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ ایک جوان اور خوبصورت عورت تھی۔ اس نے سر پر کپڑے کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی، یہ جوان عورت اور وہ بھی کسی ایسے گھر میں جہد صرف دو جوان مرد رہتے تھے، میرے لیے یہ بات باعث حیرت تھی۔ یہی نہیں بعد میں تین مزید جوان اور بٹے کئے مرد بھی وہاں پہلے سے موجود تھے، گویا ان پانچ مردوں کے بیچ یہ جوان عورت تھیں، کیوں؟..... خیر، میں اپنا کام نمٹانے لگا۔

عورت کو تیز بخار تھا اور شدید کمزوری بھی لاحق تھی۔ میں نے تفصیلی طبی معائنے کے بعد ایک شخص سے کہا۔

”اس عورت کی حالت زیادہ خراب ہے..... اسے میرے کلینک پر ہینچانا ہوگا۔ وہاں اسے ڈرپ لگے گی اور اس کے اندر کچھ مزید انجکشن شامل کرنا پڑیں گے۔“

وہ پانچوں افراد ایک دوسرے کا منہ نکلنے لگے۔ انہوں نے ایک کونے میں جا کر آپس میں کھسک پھسکی۔ اس کے بعد ایک شخص مریضہ کو میرے کلینک تک لے چلنے پر راضی ہو گیا۔ مریضہ کو تانگے میں سوار کرایا گیا۔ ایک شخص اسے سنبھالے ہوئے بیٹھ گیا اور تانگا واپس چل پڑا۔ کلینک میں کوئی مریض نہ تھا، عورت کو کوچ پر لٹا کر ڈرپ لگا دی گئی اور اس کے اندر چند ضروری انجکشن ڈال دیے گئے۔ ڈرپ ڈیڑھ گھنٹے بعد ختم ہونا تھی، کلینک سے دیر ہونا معمول کی بات تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ میرے گھروالے پریشان نہیں ہو رہے ہوں گے۔ البتہ میرا ایک کپاؤنڈر چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ دوسرا موجود تھا۔ میں اپنی کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور اس شخص کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مجھے خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا اور بار بار میرے قریب کھڑے کپاؤنڈر کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے مگر کپاؤنڈر کی موجودگی میں کترا رہا ہے۔ میں نے کپاؤنڈر کو بھانے سے چائے لانے کے لیے بھیج دیا۔ مریضہ ہنوز نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

”ڈاکٹر سائیں! آپ کی فیس کتنی ہوئی؟“ اس آدمی نے مجھ سے پوچھا۔

”دزٹ کے پانچ سو روپے اور ڈرپ وغیرہ کے ہزار، کل ملا کے پندرہ سو۔“ میں نے اپنی فیس ٹوٹل کر کے بتا دی۔ اس نے جھٹ ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال لیے۔ میں نے پانچ سو واپس کیے۔

”سائیں! میں ابھی ذرا تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ باقی کے پیسے لے کر وہ بولا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

اتنے میں کپاؤنڈر چائے لے آیا۔ ہم نے اس آدمی کا انتظار کیا مگر وہ تو گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ چائے ہم نے ہی پی۔ حتیٰ کہ ڈرپ بھی ختم ہو گئی اور مریضہ کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ بالکل بھلی چٹنی ہو گئی۔ اس کی عمر پچیس برس کے لگ بھگ تھی۔ گہرائی لیے ہوئے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، دراز گیسو اور سرخ و سپید رنگت۔ اس نے علاقائی طرز کا لباس پہن رکھا تھا جو خاصا بوسیدہ ہو رہا تھا۔ میرے اندر عجیب عجیب خیالات ابھر رہے تھے، کچھ کچھ اندازہ بھی ہو رہا تھا۔

بالآخر میں نے اس سے پوچھا ”اب کیسی ہے تو؟“

اس نے میری طرف دیکھا اور ہولے سے بولی ”ٹھیک ہوں۔“

”یہ مرد کون تھا تیرے ساتھ؟ ابھی تک واپس نہیں

”میں نے اس سے کہا۔“ وہ نہیں آئے گا..... اور نہ ہی میں اس کو جانتی ہوں۔“

لب سے لہجے میں بولی۔

”اس.....!“ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا ”یہ کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے ابھمن سے کہا۔

اس کے حسین چہرے کی معصومیت پر جیسے غموں کی بارش لگ پڑی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی، میں شپٹا گیا۔

”رہتی کیوں ہے چھو کر؟ کچھ بتا تو سہی، تو کون ہے وہ کون تھے؟“

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے آنسو پونچھے پھر ہنس سکیوں پر قابو پاتے ہوئے بتانے لگی۔

”میں..... حالات کی سستی ہوئی لڑکی ہوں، میرا نام

ہیرا ہے۔ میں شکار پور کی رہنے والی ہوں۔ میرا بوڑھا

پ چند روپوں کے عوض ایک بڑھے سے میری شادی کرنا

چاہتا تھا۔ میں بہت روٹی چلائی مگر اس پر جوں تک نہ رینکی

بلکہ الٹا مجھے یہ دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو

وہ مجھے ”کاری“ قرار دے کر مار ڈالے گا۔ میں خوف زدہ

ہو گئی۔ پھر مجھے جوانی اس بڑھے کھوسٹ سے بیاہ دیا گیا۔

مجھے اس کے وجود سے ہی کراہیت آتی تھی۔ میں اس سے

شدید نفرت کرتی تھی۔ یوں تو میں نے بھی اپنے دل میں یہ

تہیہ کر رکھا تھا کہ اسے اپنے قریب بھی نہ بٹھکنے دوں گی مگر مجھے

بعد میں سخت حیرت ہوئی کہ اس نے بھی کبھی میرے ساتھ

دیر دیتی کرنے یا میرے قریب آنے اور مجھے چھونے کی

کوشش نہ کی۔ میں نے سوچا، شاید اس عمر میں وہ ناکارہ

ہو گیا ہوگا..... کچھ عرصہ گزرا، اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔

”تو اگر کسی جوان چھو کرے سے شادی کرنا چاہتی ہے تو

میں کروادیتا ہوں۔“

مجھے اس کی بات پر خوشگوار سی حیرت آمیز خوشی ہوئی

بالآخر میری اس کے ساتھ مسلسل نفرت آمیز سلوک نے اسے

میں سے الگ کر دیا تھا۔

”تو مجھے چھوڑ دے، یہی کافی ہے۔“ میں نے بڑی

رکھائی سے کہا تھا۔

”نہیں، میں نے تیرے پیو (باپ) کو پورے پچاس

ہزار روپیے دیے ہیں، میں بھی آخر تیرے نکلے کچھ بے کربوں گا۔“ وہ

جینا نہ لہجے میں بولا۔

میں نے سوچا چلو کچھ بھی ہو اس بڑے سے تو جان چھوٹے۔ جوان آدمی کے ساتھ پھر بھی گزارا ہو جاتا ہے۔ قہقہہ مختصر، یوں ایک تیس بیستیس سالہ شخص سے بیاہ دی گئی۔ وہ رنڈا تھا، اس کی بیوی چار سببے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ مجھے معقول لگا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جوان شخص اس پہلے والے بڑے سے بھی گھرا تھا کیونکہ وہ نشہ کرتا تھا، چرس سے لے کر ہیروئن تک۔ چرس تو وہ دن میں کئی کئی بار پیتا تھا۔ اس کے بچوں کو رحم کھا کر اس کا کوئی بے اولاد رشتے دار اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس بد بخت نے ان کے بھی نکلے کمرے کیے تھے۔ پھر اس مردود نے نشے کے پیسے پورے کرنے کے لیے مجھے بدکاری پر مائل کرنا چاہا اور ایک روز رات کو وہ کسی ”گاہک“ کو بھی لے آیا۔ میں کسی طرح اپنی عزت بچا کر وہاں سے بھاگی۔ مجھے سخت بخار نے آلیا۔ میں جبک آباد آنے والی ایک لاری میں سوار ہو گئی اور راستے میں ان بھینٹوں کے چنگل میں پھنس گئی۔ وہ مجھے اپنی اوطاق میں لے آئے مگر میری نازک حالت کے پیش نظر پریشان ہو گئے۔ میں نے انہیں ڈرانے کے لیے کہا کہ میں جس ہیروئن کی بیوی ہوں، اس کم بخت کو ایڈز کی بیماری تھی اور اب مجھے بھی ہو گئی ہے۔ ایڈز کی بیماری کی شہرت تو یہاں ہر خاص و عام میں پھیلی ہوئی ہے، تب انہوں نے مجھے ہاتھ تک لگانا گوارا نہ کیا اور مجھ سے خوف زدہ ہو گئے اور مجھے علاج کروانے کے بہانے یہاں چھوڑ گئے۔

☆☆☆

اپنی عبرت ناک کہانی بیان کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ میں خود اس کی درد بھری پیتاسن کرتے ہوئے رہا اور پھر کسی خیال سے پریشان ہو کر بولا۔

”اب تو کہاں جائے گی؟ تیرا تو کوئی گھر کھاٹ بھی نہ رہا؟“

”ہاں ڈاکٹر سائیں! میرا تو اللہ سائیں کے سوا اب اس دنیا میں کوئی نہ رہا۔ میرا بیو (باپ) بھی کب کا مر چکا ہے۔“ وہ پھر رو ہانسی ہونے لگی۔

میں پریشان ہو گیا مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ لڑکی میرے دل کو بھا گئی تھی۔ اب بتائیں اس میں میری ہمدردی کا دخل تھا یا اس کے معصوم حسن کا مگر میں اس کی مدد کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا تھا کیونکہ وہ شادی شدہ ہونے کے بعد بھی کنواری تھی۔

انسان کی سوچ کی کیا پلٹے کب دیر لگتی ہے۔ میرے سنجیدہ سوچ کے گھوڑے پھر دور تک دوڑتے چلے گئے۔ وہ بڑی بہن دوسرے شہر بیاہی تھی، دوسری کی شادی ہوئی تھی۔ وہ سکھر بیاہی جاتی تھی۔ میرے ماں باپ بہت فخر سے تھے۔ باپ کو بھی دل کا مرض لاحق تھا۔ میں نے سوچا چلو! بٹھائے ایک حسین اور شریف دو تیز کار شہر مل رہا ہے نہ! میں نے بلاتال اس کا عندیہ لیا۔

”خیراں! تو میرے ساتھ رہے گی؟“

اس نے ایک دم چونک کر میری طرف اپنی موٹی موٹی کالی آنکھوں سے دیکھا پھر اداس سے لہجے میں بولی۔

”نہیں سائیں! میرا مقدر تو خراب ہے ہی.....“

کیوں خراب ہو۔ تو مجھے کسی طرح لاڑکانہ کے دارالامان تک پہنچا دے، تیری وڈی مہربانی ہوگی۔“

”نہیں..... میں تیرے سے شادی کروں گا۔“ میں نے حتی لہجے میں کہا۔ ”اگر تو مجھے پسند نہیں کرتی تو اور بات ہے۔“

”نہیں، نہیں..... سائیں! میں تو ساری عمر تیرے پاؤں بھی دھو کر پیوں تو بھی تیرا احسان نہیں بھولوں گی۔“ وہ بولی۔

قہقہہ مختصر میں نے اس سے شادی کر لی۔ خیراں سے شادی کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے خیراں سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میں اسے پا کر بہت خوش تھا اور وہ بھی۔ میں اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا اور اکثر شاپنگ کے لیے اسے سکھر لے جایا کرتا تھا۔ باقی رہا جبک آباد سے سکھر کا فاصلہ بہ مشکل ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔

خیراں کو کپڑوں سے زیادہ جیولری کا شوق تھا۔ میں نے بھی اس کی کوئی خواہش نہیں مانی۔ چونکہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اس لیے شادی پر بھی میں نے ہی اسے سونے کے سیٹ ڈالے تھے۔ اس کے بعد بھی ہم اکثر زیورات خریدنے رہے، کبھی سونے کا نیپلس تو کبھی جڑاؤ کڑے اور کبھی بریسلیٹ، اسے جیولری کا بہت شوق تھا، میرے عطا کردہ اندازے کے مطابق صرف جیولری کی مد میں، میں نے لگ بھگ دو ڈھائی لاکھ کی خریداری کی تھی۔

تھوڑا وقت گزرا..... اتوار کے روز میں صبح کلینک نہیں کھولا تھا۔ صرف شام میں جاتا۔ دوپہر میں تین افراد مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ مجھے وہ تینوں کچھ شناسا سے معلوم ہو رہے تھے۔ مگر اس وقت باوجود ہن پر زور دینے کے میں انہیں نہیں پہچان سکا۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے ضروری بات کرنے کو کہا۔

میں نے ازراہ اخلاق و مہمان نوازی گھر کا ساتھ والی

لی (بیٹھک) کھول کر انہیں بٹھایا۔

”سائیں! میرا نام امیر خان ہے..... یہ دو میرے چچا بھائی ہیں۔ رحیم خان اور خدا بخش!“

نبیٹا ایک لمبے ترنگے شخص نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ل کرواتے ہوئے کہا۔ ”سائیں معاف کرنا! بات ہی ایسی ہے کہ..... آپ کو ناگوار گزرے گی لیکن..... مجبوری ہے۔“

”آپ بات کریں، میں سن رہا ہوں۔“ میں نے اس کے ہنرے پر نظر سنا گاڑتے ہوئے گہری متانت سے کہا۔

وہ بولا ”سائیں! آپ کی بیوی کا نام خیراں ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے مختصر آ کہا۔ میرے اس جواب پر اس نے اپنے سامنے بیٹھے رحیم خان نامی شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک بڑا سا کاغذ نکال کر امیر خان کو دکھایا۔ امیر خان نے کاغذ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے ابھی ہوئی طرفوں سے ان کے بشروں کی طرف دیکھا پھر کاغذ پر مندرجہ بات پڑھنے لگا۔ پھر جیسے جیسے..... میں اسے پڑھتا گیا، ہرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی اور میری کنپٹیاں اپنی انتشار کے باعث سلگ اٹھیں۔

”یہ..... یہ کیا بکواس ہے؟“ میں نے امیر خان کی طرف گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

”یہ بکواس نہیں ہے سائیں! حقیقت ہے یہ۔“ وہ میری ف بہ غور گھورتے ہوئے بولا۔

”میں اسے ہرگز نہیں مانتا، خیراں میری بیوی ہے۔“ میں نے اپنے اندرونی غبار پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ کاغذ حقیقت خیراں کا نکاح نامہ تھا جس کی رو سے وہاں موجود رحیم خان اس کا شوہر تھا۔

”آپ لوگ تشریف لے جاسکتے ہیں..... ایسا نہ ہو، میں مہمان نوازی بھلا کر جھکڑا کرنے پر تیار جاؤں۔“ یہ کہہ کر میں غصے سے کھڑے ہوتے ہوئے مزید بولا ”یہ نکاح نامہ جلی ہے۔“

”سائیں! یہ نکاح نامہ جلی ہے یا اصلی، ہماری خواہش ہے کہ آپ اسے اس وقت اپنی بیوی کو دکھائیں، ہمیں یقین ہے کہ وہ اسے جھٹلانے کی ہمت نہیں کرے گی۔“ امیر خان نے معتدل لہجے میں کہا۔ مجھے اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔

”دیکھو ڈاکٹر سائیں! آپ بھی عزت والے ہو، ہم بھی..... لڑکی نے ہم دونوں کے ساتھ دھوکا کیا ہے، ہم معاملہ سلجھانے آئے ہیں..... پہلے آپ اپنی بیوی سے ذرا جا کر پوچھ تو لو پھر یہ نکاح نامہ بھی دکھاؤ، اس میں اس کے انگوٹھے کا

میں ایک روز دربار کر رہا تھا کہ امیر اعظم خاں کی لڑکی کا ایک خط مجھے ملا۔ یہ کابل میں تھی اور میرے ساتھ منسوب تھی۔ اس نے قاصد کو ہدایت کی تھی کہ خود میرے ہاتھ میں خط دے۔ خط بند کر کے لے آئے جیسا کہ میں نے پیشتر ذکر کیا ہے۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا کبھی شوق نہ تھا اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ خط پا کر مجھے کس قدر رندامت ہوئی۔ میں نے اپنے آپ کو سخت ملامت کی کہ مجھے فخر ہے کہ میں ایسا اچھا شخص ہوں، لیکن درحقیقت مردانگی سے بعید ہے کہ جاہل رہوں۔ اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بہت رویا اور اپنے خدا کی درگاہ میں نہایت عاجزی اور انکسار سے دعا مانگی اور ارواح اولیاء اللہ سے سفارش کی درخواست کی۔ آخر روتے روتے صبح کے قریب میری آنکھ لگ گئی اور میں نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ میانہ قامت لیکن بالکل راست، آنکھیں بادام اور ابرو نہایت باریک۔ ریش دراز چہرہ بیضوی اور انگلیاں پتلی اور لالہ تھیں، بھورے رنگ کا عمامہ زیب سر تھا۔ ایک دھاری دار کپڑا کمر سے بندھا تھا اور ایک لمبا عصا ہاتھ میں تھا جس کے سرے پر لوہے کی شام تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بزرگ میرے سر ہانے کھڑے ہو کر آہستہ سے فرماتے ہیں ”عبدالرحمن اٹھ اور لکھ“ میں چونک پڑا اور کسی کو نہ پا کر پھر سو گیا۔ وہی بزرگ پھر تشریف لائے اور فرمایا ”اگر اس مرتبہ تو سویا تو اس عصا سے تیرا سینہ چھلنی کر دوں گا۔“ یہ سن کر میں خوف کے مارے اٹھ بیٹھا اور پھر نہ سویا۔ خادم کو بلا کر کاغذ قلم منگوایا اور مکتب میں جو حروف لکھا کرتا تھا، انہیں سوچنے لگا۔ خدا کی قدرت کہ تمام حروف کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ میرے حافظے نے مدد کی اور جو کچھ میں نے پڑھا تھا، یاد آئے لگا۔ ایک ایک لفظ کر کے کاغذ پر لکھا۔ اس طرح طلوع آفتاب تک میں نے ساٹھ سطریں لکھ لیں۔ بعض حروف اچھی طرح نہ ملا سکا تھا اور بعض درست بھی نہ تھے لیکن جب میں نے ان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب پڑھ سکتا ہوں اور غلطیاں بھی معلوم کر لیں جو کہ بہت تھیں۔

امیر عبدالرحمن خان کی سرگزشت
مرسلہ: نواز خاں، راولپنڈی



اگر آپ صبح سوکر اٹھیں اور اپنی بیوی کو نومولود بچے کے ہمراہ گھر سے غائب پائیں تب آپ کے محسوسات کیا ہوں گے؟ اس وقت کچھ ایسے ہی احساسات سے میں دوچار تھا۔ گزشتہ روز ماں بننے والی میری بیوی اس وقت گھر میں موجود نہیں تھی۔ صبح میں نے کروٹ بدلنے کے بعد جب اپنی بیوی کے بستر پر نظر ڈالی تو اسے غیر حاضر پایا۔ وہ اتنی صبح اٹھنے کی عادی نہیں تھی۔ میں نے سوچا شاید کچن میں دودھ گرم کر رہی ہوگی لیکن بیڈ کے ساتھ موجود لکڑی کے پالنے پر نظر ڈالی تو نومولود بچے کو بھی اپنی جگہ موجود نہیں پایا۔ تب میں ہڑبڑا کر بستر سے نیچے اتر آیا اور ماں بچے کو فلیٹ میں تلاش کرنے لگا۔ وہ دونوں فلیٹ میں موجود نہیں تھے۔ میرے ماتھے پر فکر انگیز لکیروں کا جال پھلنے لگا۔ وہ ہو چکا تھا جس کا گزشتہ چھ مہینوں سے فطرت تھا۔ میں نے جیب سے سستے برانڈ کا سگریٹ باہر نکالا اور لائٹر کے ذریعے اسے سلگانے کے بعد آرام کر سی پر

جنس

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!

یہ روداد میرے بڑے قریبی دوست کی ہے۔ اسی کے الفاظ میں پوری کہانی لکھی ہے باپ اور ماں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اس سے آپ کو بخوبی پتا چل جائے گا۔
عمران قریشی
(کوئٹہ)

اطمینان ہوا۔
”آپ چار لاکھ روپے نقد دے دیں۔ ہم یہ نکاح اور طلاق نامہ آپ کے حوالے کر دیں گے۔“
”چار لاکھ؟“ میں اتنی بڑی رقم کان کر پریشان ہو گیا لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ میرے پاس چار لاکھ روپے نہیں تھے بلکہ اس مسئلے کے حل کے عوض اتنی بڑی رقم نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ امیر خان بولا۔
”سائیں! اپنی جوان، خوبصورت بیوی کو چھوڑنا مذاق نہیں۔“

”شٹ آپ!.....! میں نے غصے سے کہا۔“ تم کل یہ رقم میرے کلینک پر آ کر لے جانا اور طلاق نامہ بھی ساتھ لے آنا۔“

مجھے اس کی یادہ کوئی زہر لگی تھی اس لیے میں نے بھی معاملہ ادھر ہی ختم کرنا چاہا۔ خیراں سے اب میں جی جان سے محبت کرنے لگا تھا۔ چار لاکھ اس کے سامنے معمولی رقم تھی۔ میں نے اگلے روز چار لاکھ کی رقم چیک کٹوا کر بینک سے نکلائی اور ان تینوں کے حوالے کر دی اور انہوں نے نکاح نامہ مع طلاق نامہ میرے حوالے کر دیا۔

میری ہنسی بستی زندگی میں جو خزاں آنے والی تھی وہ اب بادِ بہار میں بدل گئی۔ انہی دنوں چھوٹی بہن کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس کا جہیز تیار تھا۔

اگلی صبح ماں اور بہنوں نے سینہ کو بی کرتے ہوئے مجھے جگایا۔ گھر میں چوری ہو گئی تھی۔ راتوں رات چوروں نے گھر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ جہیز، نقد رقم اور زیورات سب چور سمیٹ کر لے گئے تھے اور..... خیراں بھی غائب تھی۔ میں دہری پریشانی کا شکار ہو گیا جبکہ مجھے اپنی بیوی خیراں کا پراسرار غیب زیادہ بے چین اور پریشان کیے ہوئے تھا۔

اچانک میری نگاہ بیڈ سائڈ پر کالج کے گلاس کے نیچے دبے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ میں اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔

”ڈاکٹر سائیں! آپ جیسے سیدھے سادے اور شریف لوگوں کی وجہ سے ہی تو ہماری دال روٹی چل رہی ہے۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش بیکار ہوگی۔ وہ نکاح نامہ اور طلاق نامہ دونوں ہی جعلی تھے بلکہ میں اور میری محبت بھی جعلی تھی۔ بلاوجہ آپ کی بدنامی ہوگی۔ معاملے کو خاموشی سے دبا لیں..... خیراں!“

کاغذ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا..... اور میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔

نشان ہے۔“
میں اس کی بات کو سر بہ سر ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر اس کی بات پر مجبور ہونا پڑا۔ چونکہ یہ معاملہ ہی اتنا نازک تھا۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں نے وہ نکاح نامہ اس سے لے لیا اور اپنے کمرے میں آیا۔ وہ خیراں کو دکھایا اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ یہ نکاح نامہ دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ سن ہو کر رہ گئی، میرا دل ڈوب گیا۔ خیراں نے ننھا آکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر یکدم میرے پاؤں پکڑ لیے۔

”سائیں! میرا اس میں کوئی قصور نہیں..... یہ میرا ہی نامراد شوہر ہے جس نے میری زندگی تباہ کر دی اور اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے مجھے بدکاری کی طرف مجبور کرتا تھا۔“

میں پریشان ہو گیا۔ بات بہ ظاہر درست ثابت ہوئی تھی مگر اس میں خیراں کا بھی بہر حال کوئی قصور نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس کا تو ذکر پہلے ہی کر چکی تھی۔ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ یوں اچانک ایک دن بھیانک عفریت کی طرح آن کھڑا ہوگا۔ اگر میں عدالت سے رجوع کرتا تو بدنامی میری ہی ہوتی۔ جبکہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے معاشرے میں عزت تھی، میں نے خیراں کو سنبھالا اور پوچھا۔

”خیراں! اب تم ہی بتاؤ، کیا کرنا چاہیے ہمیں؟“
”سائیں! یہ کمین آپ کو شریف اور عزت دار آدمی سمجھ کر بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے منہ پر دوچار روپے دے مارو اور یہ نکاح نامہ رکھ لو۔ بعد میں بھاڑ دیتا۔ وہ مجھے طلاق دے دے گا۔“ مجھے اس کی بات معقول لگی اور میں اوطاق میں آیا تو تب تک میرا سارا پیش اور غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا اور اس کی جگہ اب معاملہ نہیں لے لی تھی۔

میں ایک گہری سانس لے کر امیر خان سے بولا۔
”امیر خان! اب خیراں میری بیوی ہے..... اپنے پہلے شوہر رحیم خان سے طلاق لینا چاہتی ہے.....“ میری بات سن کر ان تینوں کو جیسے یکدم سانپ سونگھ گیا۔ میں اندر سے بہت پریشان تھا اور یہی دعا مانگ رہا تھا کہ معاملہ دے دلا کر رفع دفع ہو جائے، ایک عورت کے دودھ وے وار تھے، بڑی الجھن آمیز اور پریشان کن صورت حال تھی۔

”ٹھیک ہے سائیں! ہم بھی یہی چاہتے ہیں اب..... کہ یہ نازک معاملہ ادھر ہی اوطاق میں طے پا جائے۔“
خاصی دیر کی پُرسوج خاموشی کے بعد امیر خان بولا تو مجھے کچھ

بیٹھ کر کش لگانے لگا۔ میرے ساتھ پڑی میز کی دراز میں ایسے تین عطر موجود تھے جنہوں نے مجھے چھ ماہ سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے خط باہر نکالے، ان میں سے ایک خط کے ساتھ ایسی تصویر موجود تھی جس میں ایک مرد اور جوان عورت کرسی پر بیٹھے چائے پینے میں مصروف تھے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ عورت میری بیوی طاہرہ تھی۔ لیکن مرد کو میں نہیں جانتا تھا۔ یہ تصویر مع خط مجھے چھ ماہ قبل موصول ہوئی تھی۔ خط کی تحریر تقریباً پانچ سطروں پر مشتمل تھی اور خلاصہ کچھ یوں تھا۔

”میرے دوست! تمہیں حیرانی محسوس ہو رہی ہوگی کہ خط کے ساتھ موجود تصویر میں تمہاری بیوی کے ساتھ میں کیوں موجود ہوں تو یقیناً جانو..... اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی باتوں کے متعلق آگاہی رکھتا ہوں جن کے متعلق تمہارے اور میرے علاوہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔ مثلاً تمہاری بیوی کے سینے پر موجود سرخ تل..... ایک پوشیدہ نشان ہے اور تم ایک جہاندیدہ انسان ہو اور یقیناً یہ جان سکتے ہو کہ میری ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟ پھر بھی بتائے دیتا ہوں کہ تمہاری بیوی ایک چال باز اور آوارہ عورت ہے۔ میرے علاوہ اس کے تین چار اور مردوں کے ساتھ بھی ناجائز تعلقات ہیں۔ تمہیں سب کچھ بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ فوراً سے بیشتر اسے طلاق دے دو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔

تمہارا خیر خواہ۔“

باقی ماندہ دونوں خطوں کی تحریر موجودہ تحریر سے مختلف نہیں تھی۔ کم و بیش یکساں مضمون تھا۔ میں نے ان دونوں خطوں کی جانب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کوئی بھی ڈاکٹر کسی بھی عورت کے پوشیدہ رازوں سے واقف ہو سکتا تھا۔ یہی تصویر کی بات تو کسی بھی خصوصی موقع پر بھیجی جاسکتی تھی۔ لیکن ایک بات جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا وہ یہ تھی کہ شادی کے تقریباً دو ماہ بعد تک طاہرہ کا رویہ میرے ساتھ خلصانہ رہا تھا لیکن خط ملنے کے بعد رویے میں تبدیلی پیدا ہوتی چلی گئی۔ وہ بات بات پر میرے ساتھ لڑنے جھگڑنے لگی۔ گھر بیلو ڈتے دار یوں کی جانب سے اس نے غفلت برتنی شروع کر دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہر روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر میں نے فلیٹ کے نیچے موجود ہوٹل کے مالک کو کچھ رقم ایڈوانس دے کر اسے دوپہر اور رات کا کھانا فلیٹ میں بھجوانے کی ہدایت کر دی تھی۔ اس وقت میری بیوی حاملہ تھی۔ ایسے موقع پر اکثر

خواتین چڑچڑی ہو جایا کرتی ہیں۔ میں نے ایسا سوچ کر اہل آپ کو مطمئن کیا لیکن اس نے اپنی روشن نہیں بدلی۔ میں اہل سفری سیلز میں تھا۔ ہماری شادی میرے پیشے کی مرہون ملے تھی۔ کاروبار کی نیت سے شہر سے کچھ دور ایک پہاڑی قصبے میں جانا ہوا تھا۔ وہیں طاہرہ سے ملاقات ہوئی اور میں طاہرہ کی آنکھوں پر مرنا تھا پھر لوٹ کر آفس کے کچھ ساتھیوں کی مدد ساجت کی اور انہیں طاہرہ کے گھر بھجوایا۔ میری طرح اس کے آگے پیچھے بھی دادی کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ دادی نے فوراً ہاں کر کے اپنے سر کا بوجھ میرے سر پر منتقل کر دیا۔ شادی کے بعد ایک اور بات جو مجھے غفلت دیتی رہی وہ یہ تھی کہ اس کی دادی شادی کے بعد کبھی بھی اس سے ملنے شہر نہیں آئی تھی۔ میں اکثر طاہرہ کو دادی کے پاس جانے کی تجویز پر متفق کرنے کی کوشش کرتا۔ تب وہ بڑا سامنے بنا کر انکار کر دیتی تھی۔

میں نے ہاتھوں میں موجود ختم ہوتی سگریٹ کو الٹی ٹرے میں سلا اور خط اور تصویر کو جیب میں ڈال کر فلیٹ سے باہر نکل کر مین دروازے کی جانب چل دیا۔ وہاں گیٹ کی چوکیداری پر متحین گارڈ موجود تھا۔ میں نے اس سے اپنی بیوی کے متعلق پوچھا۔ تب اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا کہ رات کے تین بجے وہ بچے کے ہمراہ فلیٹ سے باہر نکلی تھی۔ پھر فلیٹ کے سامنے موجود ٹیکسی میں بیٹھ کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا ٹیکسی کے اندر ڈرائیور کے علاوہ کوئی اور شخص بھی موجود تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔“

”یقیناً پچھلی سیٹ پر کوئی شخص موجود تھا لیکن میں اس کی شکل نہیں دیکھ پایا تھا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ فلیٹ میں جا کر ناشتا کیا۔ پھر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ٹی بی اسٹینڈ کی جانب چل دیا۔ طاہرہ کی دادی کا قصبہ کچھ فاصلے پر واقع تھا، قصبے کا نام دیال پور تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ نوکر نے فوراً مجھے طاہرہ کی دادی کے سامنے پہنچا دیا۔ انہوں نے حیرانی کے ساتھ میری جانب دیکھا پھر بولیں۔

”نفسب دشمنان..... آج خلاف معمول تمہارا یہاں آنا کیسے ہوا؟ طاہرہ تو خیریت سے ہے نا.....؟“ میں نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

”میزے یہاں آنے کی وجہ طاہرہ ہی ہے۔ وہ گھر میں موجود نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق شاید اسے آپ کے پاس ہونا چاہیے کیونکہ اس کے علاوہ اور اس کا کہیں بھی

ہا نہیں ہے۔“

”کیسی بات کر رہے ہو بچے!“ دادی نے بات درمیان کاٹ کر کہا۔ ”بھلا اس کا یہاں کیا کام..... تم اچھی طرح ملے ہو۔ شادی کے بعد سے وہ کتنی دفعہ مجھ سے ملنے یہاں ہے اور اگر تمہارے کہنے کے مطابق آئی بھی ہوتی تب لڑداسے چلیا سے پکڑ کر تمہارے گھر چھوڑ آتی۔“

میں نے جیب سے طاہرہ اور خط لکھنے والے آدی کی ہر باہر نکالی پھر دادی کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

”طاہرہ کے ساتھ موجود اس مرد کا طاہرہ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟“ دادی کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات نمایاں آئے۔ پھر وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”یہ مواکون ہے..... اور ہماری بیٹی کے ساتھ تصویر میں لگا رہا ہے؟“

”ہی..... تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے اہل بھرے لہجے میں کہا ”کہ یہ مواکون ہے؟ اور طاہرہ کے ساتھ بھلا کیوں دکھائی دے رہا ہے؟“

”تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“ دادی نے پوچھا۔

”یہ طاہرہ کے سامان میں موجود تھی۔“ میں نے جھوٹا ملاخانی لہجے پر دست بیاں ہوئی۔“

”بہر حال میں اسے نہیں جانتی، شاید طاہرہ کے کالج کا ولی دوست ہو۔ لیکن طاہرہ کو ایسی تصویر اپنے سامان میں نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔“

”طاہرہ اس شخص کے ہمراہ فرار ہو چکی ہے۔“ میں نے ہر لیے لہجے میں دادی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”اور مجھے اس بات سے کسی بھی قسم کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ مہری بلا سے وہ جس کے ساتھ مرضی بھاگ جائے۔ مجھے اگر دیکھی ہے تو صرف اپنے نومولود بچے سے ہے، وہ مجھے واپس چاہیے۔“

”طاہرہ بچے کے ہمراہ بھاگی ہے۔“ دادی نے غرور بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں..... ایک دن پہلے پیدا ہوا بچہ میرے فلیٹ میں موجود نہیں ہے۔ یقیناً وہ اپنی ماں کے ہمراہ ہوگا۔“

”بہر کیف، اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ دادی نے اہل سانس کھینچتے ہوئے پوچھا ”مجھے معلوم نہیں ہے کہ طاہرہ اس وقت کہاں ہے؟“

”تصویر میں موجود اس شخص کا نام اور پتا مجھے چاہیے۔“

طاہرہ یقیناً اس کے گھر میں موجود ہوگی۔“

”میں اسے نہیں جانتی۔“ دادی نے حتی لہجے میں انکار کر دیا۔ ”اگر جانتی ہوتی تب ضرور بتا دیتی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کرسی سے اٹھنے لگا۔

”اب میں اس شخص کے متعلق کچھ والوں سے معلوم کروں گا۔ یقیناً آپ کو اعتراض نہیں آگا۔“

”اپنی جگہ بیٹھے رہو۔“ دادی نے لہجے میں بولیں ”قصبے والوں سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”طاہرہ تمہیں اس کے متعلق شادی سے پہلے بتا دینا چاہتی تھی لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ شاید یہ میری غلطی تھی لیکن میں بھی کیا کرتی..... اگر ایسا نہ کرتی تب تم طاہرہ کے ساتھ شادی نہ کرتے اور تمہارے علاوہ کسی کو بھی نہیں ایسا نہیں تھا جو طاہرہ کے ساتھ شادی کی ہائی بھرتا۔ اس آدی کا نام حامد علی خان ہے اور یہ طاہرہ کا پہلا شوہر ہے۔“

مجھے اپنے سر پر پہاڑ گرنے کا دھماکا محسوس ہوا۔ دادی بولتی جا رہی تھیں۔

”دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے لیکن حامد میاں غصے کے بہت تیز تھے۔ اس لیے غصے کی حالت میں طاہرہ کو طلاق دے بیٹھے..... بعد میں پچھتاوے کے ہاتھوں مجبور ہو کر طاہرہ سے معافیاں مانگتے رہے لیکن لا حاصل..... ایک بار طلاق کے بعد حلالہ کے بغیر وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔ پھر طاہرہ، حامد میاں سے بدظن بھی ہو چکی تھی اور ایسا چاہتی بھی نہیں تھی اس لیے چپ ہو کر بیٹھی رہی۔“

”حامد میاں کی رہائش کہاں ہے؟“ میں نے بات درمیان میں کاٹ کر جو شیلے لہجے میں پوچھا۔

شمارہ مئی 2012ء کی منتخب بج بیانات

ہماری پیش کش: آپ کا انتخاب

☆ اول: انتقام..... طلعت (لاہور)

☆ دوم: دھول بھرا سناٹا..... انور علی (کراچی)

☆ سوم: ٹوٹے رشتے..... کوثر زید حسن (کراچی)

☆ چوتھ: اترے اتنا کے لیے آپ ہی منتخب کیجئے

☆ آپ کی رائے کا احترام کریں گے

”طاہرہ کی شادی کے بعد حامد میاں قصبہ چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن شادی کے بعد جو آخری خط مجھے موصول ہوا، اس پر لاہور کی مہر تھی۔ شاید وہ لاہور میں رہائش اختیار کیے ہو۔ بس وہ آخری خط تھا جو ہمیں موصول ہوا۔ اس کے بعد ہمارے اس کے ساتھ تعلقات منقطع ہو گئے۔“

”اس کا ذریعہ معاش کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”میوہل کارپوریشن میں کلرک تھا۔ شاید نوکری چھوڑ کر لاہور چلا گیا ہو، مجھے معلوم نہیں۔“

”ٹھیک ہے..... میں معلوم کر لوں گا۔“ میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو اپنا کارڈ دیے دیتا ہوں، اس پر میرا موبائل نمبر درج ہے۔ اگر طاہرہ یا حامد علی خان کے متعلق کچھ معلوم ہو تو موبائل پر مجھے اطلاع کر دیجئے گا۔“ انہوں نے کارڈ تمام لیا اور میں تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

میرے دماغ میں آکے کا کچھ لائحہ عمل ترتیب پا چکا تھا۔ طاہرہ یقیناً اپنے پہلے شوہر حامد علی خان کے پاس تھی۔ حامد علی خان میوہل کارپوریشن میں کلرک کرتا تھا۔ نوکری یقیناً پکی تھی اور وہ گورنمنٹ کی نوکری کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ طاہرہ کی دادی کو اس کا آخری خط، لاہور سے موصول ہوا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ اس وقت لاہور میں تھا۔ طاہرہ ہے کہ اس نے اپنا ٹرانسفر وہاں کر دیا ہوگا۔ اور اب وہ میوہل کارپوریشن کے لاہور دفتر میں کام کر رہا ہوگا۔ مجھے اس کی تلاش میں مزید سرگرداں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مجھے بد آسانی وہاں دستیاب ہو سکتا تھا۔ میں نے اسٹیشن سے لاہور کی بس پکڑی اور روانہ ہو گیا۔

مجھے شہر تک پہنچنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ بس نے مجھے میوہل کارپوریشن کی عمارت کے بالکل سامنے اتار دیا۔ میں اپنا مختصر بیگ سنبھالنے عمارت کی جانب چل دیا۔ چہرہ اسی نے مجھے روک کر دفتر میں آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب میں نے اس سے حامد علی خان کے متعلق پوچھا۔

اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ”وہ تو ایک مبینہ کی چٹھی پر شہر سے باہر جا چکے ہیں۔“ میں نے اس کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے بتایا ”میں نہیں جانتا، آپ ہیڈ کلرک سے معلوم کر لیں۔ ان کا کرا سامنے گیلری میں تیسرے نمبر پر ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گیلری میں موجود تیسرے کمرے کی جانب چل دیا۔ کمرے کا دروازہ چو پٹ

کھلا ہوا تھا اور سامنے ایک لمبی میز کے دو اطراف تین افراد بیٹھے بات چیت میں مصروف تھے۔ میں نے سلام دعا کے بعد ہیڈ کلرک سے حامد کے متعلق دریافت کیا۔ ان تینوں میں ایک شخص نے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، ”میں ہیڈ کلرک ہوں، کہیے آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“ میز کے سامنے رکھی کرسی کو اپنی جانب تھکیٹ کر میں اتر بیٹھ گیا۔ پھر جیب سے طاہرہ اور حامد علی خان کی تصویر نکال کر میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے تصویر میں موجود اس شخص سے متعلق کچھ معلومات درکار ہیں۔ کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

دادی کی نسبت ہیڈ کلرک نے اپنے چہرے پر ۸۰ گھبراہٹ کے تاثرات کو چھپانے میں کمال چاہکدنی ا ثبوت دیا پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”حامد علی خان شہر سے باہر جا چکے ہیں۔ ایک مہینے سے پہلے ان کی داہم متوجہ نہیں ہے۔ اگر آپ کو کچھ ضروری کام درپیش ہو تو ملے بتا دیجئے، میں ان تک پیغام پہنچا دوں گا۔“

”کام کی بات میں ان سے خود ہی کروں گا۔“ میں نے جیب سے اپنا کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ”آپ میرا کارڈ اٹھ کے حوالے کر دیجئے گا اور اگر ہو سکے تو موبائل پر مجھ سے باہر چیت کر دیجئے گا۔ اب میں چلتا ہوں۔“ میں نے کمرے سے ہوتے ہوئے کہا اور کارڈ اس کے ہاتھوں میں تھا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

میوہل کارپوریشن کے دفتر کے سامنے ایک چھوٹا سا صاف ستھرا ہوٹل موجود تھا۔ دوپہر کے ڈیڑھ بجنے والے تھے۔ میں نے موٹل میں داخل ہو کر کھانے کا آرڈر دے دیا اور خود ہیڈ کلرک کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ یقیناً حامد علی خان کی قریبی رشتے دار تھا یا پھر ہو سکتا تھا کہ اس کا بڑا بھائی ہو۔ مجھے اس کے چہرے کی کیفیت دیکھنے کے بعد میں یہ غریبی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ بھی اس تمام کھیل میں برابر شریک تھا اور یقیناً وہ اس بات سے بھی واقفیت رکھتا تھا کہ اس وقت حامد علی خان کہاں چھپا ہوا ہے؟ میں تھوڑی دیر میں طاہرہ تک پہنچنے والا تھا۔ یہ سوچ کر میرے ہاتھوں کی مٹھیاں غصے سے بھینچ گئیں۔ ویٹر نے کھانا لا کر میرے سامنے رکھ دیا اور میں اسے زہر مار کرنے لگا۔ کھانے کی میز سے میوہل کارپوریشن کے دفتر کا گیٹ صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں نے میز کا انتخاب اسی وجہ سے کیا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے چائے منگوائی پھر سگریٹ سگایا کر چائے پینے لگا۔ میرا دماغ مختلف سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ میں بلاہم

پریش کر رہا ہوں۔ میرے فلیٹ سے نکلنے کے بعد وہ آگئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا ویش آیا ہو جس کی وجہ سے اسے مجھے بتائے بغیر فلیٹ کو نا پڑا ہو۔ میں نے جیب میں سے موبائل باہر نکالا اور ہمسائی کا نمبر ملانے لگا لیکن اچانک ہی ہیڈ کلرک میوہل پریشن کے گیٹ سے باہر نمودار ہوا۔ میں نے موبائل کو لپیٹا اور جیب میں رکھ لیا۔ وہ عمارت کے قریب واقع بس ہڈ کی جانب جا رہا تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ویٹر کے مٹل میں بل کی رقم تھما کی اور ہوٹل سے باہر نکل کر معقول ملے رکھتے ہوئے ہیڈ کلرک کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ شہر کے باغات میں جانے والی بس کا منتظر تھا۔ بس اسٹاپ پر لوگوں کی کافی بھیڑ جمع تھی۔ اس لیے اسے میرے متعلق معلوم نہ جانے کا خدشہ معدوم تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ کو شہر سے دیکھنے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک کھنے درخت کے انتخاب کیا اور پیچھے کھڑے ہو کر ہیڈ کلرک کی جانب دیکھنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد بس آتی دکھائی دی۔ ہیڈ کلرک نے ہاتھوں میں موجود فائیکوں والا بیگ سنبھالا اور بس کی بیل چل دیا۔ اس کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی بس پر چڑھنے لگے۔ ان لوگوں کے پیچھے میں بھی موجود تھا۔ بس مسافروں کے کچھ بچ بھری ہوئی تھی۔ بیٹھنے کی جگہ مفقود تھی۔ اس لیے ا کے ڈیڑے کو تمام کر میں ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے تقریباً دس بارہ قدم آگے کھڑا تھا اور ہمارے درمیان فریبا پانچ چھ مرد حائل تھے۔ ہیڈ کلرک شکل سے یہ ظاہر ملن دکھائی دیتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میری طرح اس کا داغ بھی اس وقت مختلف سوچوں کے گرداب بگولے کی طرح اٹھ رہے ہوں گے۔ وہ بس میں کھڑے تقریباً ڈیڑھ گریٹ پی چکا تھا۔ بس اب مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ میں دروازے کے پاس سے ہٹ کر ایک کونے میں کئی مسافروں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ بس رکی تو ہیڈ کلرک نیچے کر تیز قدموں کے ساتھ قریبی کالونی کی جانب چل دیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ تب بالکل اچانک ہی ایک موٹر سائیکل وار بڑی سڑک سے نمودار ہو کر تیزی کے ساتھ میرے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ موٹر سائیکل پر ایک مرد اور عورت بیٹھے تھے۔ عورت کی گود میں نو مولود بچہ موجود تھا۔ موٹر سائیکل سوار نے ہیڈ کلرک کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک ہی بڑیک مارے اور گرم جوشی کے ساتھ ہیڈ کلرک کے ساتھ بات چیت کرنے لگا۔ پیچھے بیٹھی عورت نے بچے کو ایک ہاتھ سے سنبھالا اپنے جسم پر موجود چادر کو درست کرنے لگی۔ ایک لمحے

اس زمانے میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آواز باگشت بن گئی۔

”منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے“ جب میں بولتی تو سب چراتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں اور عظیم بھائی نے بھی میری نا سمجھی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے، بڑی ہوشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خود سر اور ضدی تھی ان کی شہ پاکر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی کھنے پڑھایا کرتے۔ کبھی انہیں حرارت ہو جاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ ہیرا بن جاتے۔ ان کی بیوی بیٹی ان کی چھائی بیٹکا کرتیں اور وہ مجھے پڑھایا کرتے، انہوں نے بھی مجھ سے سریا بھر دہانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کر کے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو کھنے ہو گئے اور چند صفوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

”ہم نہیں پڑھتے آپ سے۔ آپ اتنا تو کھانتے ہیں۔“ میں نے جل کر کہا۔

”بے وقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانسی رہے ہیں۔“ انہوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب کھانسی نہیں کھائیں گے۔ پتا نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے، چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا، چونکہ اب وہ جو وہ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسماعیل، مجنوں گورکھ پوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے، اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کر دیے۔

اقتباس: عصمت چغتائی
مرسلہ: راحیلہ امجد، گجرات

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

**or
send message at
0336-5557121**

کے لیے مجھے اس کے چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ وہ یقیناً طاہرہ تھی۔ میں نے موٹر سائیکل پر بیٹھے مرد کی جانب دیکھا۔ وہ تصویر میں موجود حامد علی خان تھا۔ ہیڈ کلرک یقیناً اسے میری آمد کے متعلق بتا رہا تھا۔ حامد علی خان کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں نمودار ہوتی دکھائی دیتی تھیں۔ پھر اس نے موٹر سائیکل کو اشارت کیا اور مکمل رفتار کے ساتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے ہڑبڑا کر ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ لیکن وہاں کوئی ٹیکسی یا پھر رکشا وغیرہ موجود نہیں تھا۔ ہیڈ کلرک تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا قریبی گلی کی جانب مڑ گیا۔ گلی میں لوگ کم تھے۔ میں نے اندھا دھند دور دور جاتی ہوئی موٹر سائیکل کی جانب بھاگنا شروع کر دیا۔

میں بھاگتا ہوا گلی کے سامنے پہنچا۔ گلی سنسان دکھائی دی۔ اب یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ وہ دونوں اس گلی کے کس مکان میں موجود تھے یا پھر گلی میں داخل ہونے کے بعد دوسری جانب سے نکل کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ گلی کے کٹڑ کے پاس آیا، چھوٹی سی کریانے کی دکان کی کھڑکی موجود تھی۔ کریانے کی دکان کو ارد گرد نگاہ میں بنی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دکان کی کھڑکی میں جھانکا۔ وہاں پندرہ سولہ سالہ ایک لڑکا کرسی پر بیٹھا۔ ہیڈ فون کانوں سے لگائے میوزک سننے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہیڈ فون کانوں سے اتارا اور استفہامیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے جیب میں سے پیسے نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے اپنے برائڈ کے سگریٹ کی فرمائش کی۔ پھر لہجہ میں پریشانی کا عنصر شامل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

مجھے اپنے بچپن کے دوست کا پتا درکار ہے۔ اس کا نام حامد علی خان ہے اور وہ میوزیکل کارپوریشن میں کلرک ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے موٹر سائیکل پر گزرا ہے لیکن میرے آواز دینے کے باوجود توجہ نہیں دے پایا۔

لڑکے نے سگریٹ کا ڈبا میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بتایا پیسے میرے حوالے کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہ تم رکھ لو، مجھے صرف ایڈریس بتادو۔“ اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکالا پھر دکان کی لائن میں پانچویں گھر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ اس کا گھر ہے۔ وہ ابھی اپنی بیوی کے ہمراہ یہاں سے گزرا ہے اور یقیناً گھر میں ہی ہوگا۔ میں نے لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور تیز قدموں کے ساتھ حامد علی خان کے گھر کی جانب چل دیا۔ کھڑکی کے دروازے کے آگے ناٹ کا پردہ

موجود تھا۔ دروازے کے پاس کھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ میں نے کھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے کسی بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے.....؟“ میں نے جواب میں اپنا نام بتایا۔

حامد علی خان کے متعلق دریافت کیا۔

عورت بولی ”وہ موٹر سائیکل اپنے دوست کو واپس دے گا۔“

”تم کچھ دیر بعد آ جانا۔“ اچانک بوڑھی عورت کے پیچھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ باہر کون ہے؟ میں اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ

طاہرہ کی آواز تھی۔ غصے کی شدت سے مجھے اپنے جسم کا دوران خون بدھتا ہوا محسوس ہوا اور میں نے دھکا دے کر دروازے کو کھول دیا۔ بوڑھی عورت ہڑبڑا کر ایک جانب کھڑی ہو گئی۔

طاہرہ سامنے برآمدے میں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے اور نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

بوڑھی عورت پریشان لہجے میں بولی۔

”میں نے بتایا نا..... حامد گھر میں موجود نہیں ہے۔ تم تھوڑی دیر بعد آ جانا۔“ بوڑھی عورت کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے طاہرہ سے پوچھا۔

”میرا بچہ کہاں ہے؟ میں اسے لینے آیا ہوں۔“

”تم اندر آ جاؤ..... ہم بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔“

طاہرہ نے اپنے لہجے میں موجود کپکپاہٹ پر قابو پا رہے ہوئے کہا۔ بوڑھی عورت حیران و پریشان نگاہوں سے کبھی میری جانب اور کبھی طاہرہ کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔

”میں بات چیت کرنے نہیں آیا ہوں، صرف اپنے بچے کو واپس اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا ہوں۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ طاہرہ اس دفعہ ہڈیانی انداز میں چلا تے ہوئے بولی ”تم اسے واپس نہیں لے جا سکتے۔ اور میرے شوہر کے آنے سے پہلے گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرنا ورنہ میں پولیس کو فون کرنے میں دیر نہیں کروں گی۔“

میں نے حیرانی کے ساتھ طاہرہ کی جانب دیکھا۔ اس کا یہ روپ میں پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بھری ہوئی شیرنی کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی شیرنی جو اپنے دودھ پیتے بچوں کی حفاظت کے لیے آخری حدوں کو پار کر لینے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے بوڑھی عورت اور طاہرہ کی جانب دیکھا پھر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے ان حالات کے متعلق بتاؤ۔ جن کی بدولت تم اپنا فلیٹ چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہو۔ تجھ کس کے پاس رہے گا، اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔“

”قلیت چھوڑنے کی وجہ میں نہیں بتا سکتی۔ رہی بچے کی بات..... تو وہ میرے پاس رہے گا۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ میں نے اس دفعہ غصیلے لہجے میں کہا اور صحن میں داخل ہو کر سامنے موجود برآمدے میں نظر آتے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے بے دردی کے ساتھ دھکا دے کر ایک جانب ہٹایا اور کمرے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ بیڈ روم تھا۔ پتنگ کے ساتھ لوہے سے بنا ہوا پالنا رکھا ہوا تھا اور اس میں میرا نومولود بچہ سفید کپڑے میں لپٹا سویا ہوا تھا۔ میں نے پھرئی کے ساتھ آگے بڑھ کر بچے کو اٹھایا اور سینے کے ساتھ لگا کر کمرے سے باہر کی جانب چل دیا۔ وہ دروازے میں پریشان نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے لیکن شدتِ جوش کی بدولت وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

”میں اسے لے کر جا رہا ہوں۔“ میں نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”تہااری بے وفائی کے لیے یہ سزا کافی ہوگی۔ اگر تم مجھے وجہ بتانے کے لیے آمادہ ہو، تب میں اس سزا میں ترمیم کرنے کے متعلق سوچ سکتا ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے بچے کو چھیننے کی کوشش کی لیکن میں نے دوبارہ دھکا دے کر اسے دور ہٹا دیا اور تیزی کے ساتھ کمرے کا پردہ ہٹا کر باہر نکل آیا۔

بوڑھی عورت صحن میں موجود تھی۔ اس نے مجھے روکنے کی ذرہ برابر بھی کوشش نہیں کی۔ میں نے بھاگتے ہوئے صحن کو عبور کیا اور دروازے پر لگے پردے کو ہٹا کر باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن اچانک ہی مجھے اپنے پیچھے طاہرہ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہی تھی۔

”میں وجہ بتانے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے پردے کو چھوڑ دیا پھر طاہرہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم وجہ بتاؤ..... میں وجہ سننے کے بعد فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ مجھے اگلا قدم کیسے اٹھانا چاہیے۔“

”کیا تم برداشت کر پاؤ گے؟ وجہ کا تعلق تمہارے بچے سے ہے۔ ایک ماں ہونے کے ناتے میں ابھی تک اپنے دل میں اٹھتی درد کی ٹیس پر قابو نہیں کر پاکی ہوں اور ہر لمحے تڑپتی رہتی ہوں۔ نہ جانے باپ ہونے کی بدولت تمہارا راز کھل گیا ہوگا؟ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی لیکن تمہاری ضد کے آگے مجبور ہو کر بتائے دیتی ہوں۔ تمہادی گود میں موجود بچہ نہ مردوں میں ہے اور نہ ہی صنفِ نازک میں ہے۔ اسے تہذیب کے الفاظ میں خواجہ سرا کہا جاتا ہے۔“

مجھے اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹا محسوس ہوا۔ میں نے حیران نگاہوں کے ساتھ بچے کے چہرے کی جانب دیکھا لیکن وہاں ایسی کوئی بھی نشانی دکھائی نہیں دیتی تھی جس کی بدولت اس پر لگائے گئے گھناؤنے الزام کی نفی ہو پاتی۔ اس کی شکل مام بچوں کی مانند تھی۔ طاہرہ بولے جا رہی تھی۔

”ایک ماں ہونے کے ناتے میں اسے کسی بھی صورت میں کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم تھا کہ جب تمہیں اس کی صنف کے متعلق معلوم ہوگا، تب تم اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرو گے۔ اس لیے کہ تم نے لڑکی کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کیے تھے۔ جب تم لڑکی کے باپ کہلانا پسند نہیں کرتے تو پھر ایسے بچے کو کیسے قبول کر لیتے اس لیے میں نے گھر سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ دادی کے پاس جانے سے متعلق میں اس لیے مخرف رہی کہ وہاں بھی میرے بچے کو تحفظ ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میری پوشیدگی کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں کسی ایسے مقام کا انتخاب کرتی جہاں تمہارا پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ تب میں نے حامد کے پاس واپس چلے آنے کا فیصلہ کیا۔ حامد ہماری شادی کے بعد مجھے کئی دفعہ خط لکھ چکے تھے اور اپنے کیے کی معافی مانگتے رہتے تھے۔ میں نے اس شرط پر ان کے پاس آنے کی ہائی بھری کہ وہ میرے بچے کے متعلق زیادہ استفسار نہیں کریں گے اور میں جیسے چاہوں گی، بچے کی پرورش کروں گی۔ علاوہ ازیں آپ سے طلاق کے متعلق بھی میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ حامد نے ہائی بھری اور یوں میں یہاں چلی آئی۔“

میرے قدموں میں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں موجود بچہ کسمایا۔ پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ طاہرہ نے آگے بڑھ کر بچے کو میری گود سے واپس لیا پھر کپڑا اٹھا کر بولی ”لو..... دیکھ لو۔“

میں نے ٹھنڈی سانس بھری پھر پوچھا ”کیا حامد اس کی صنف کے متعلق معلومات رکھتا ہے؟“

”بالکل..... وہ سب جانتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اس کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں۔“ طاہرہ بولی اور میں مایوسی کے ساتھ دروازے کی جانب چل دیا۔ اتنی بڑی آزمائش کے لیے میں اپنے آپ کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔ بچہ ابھی کم عمر تھا، جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا، اس کی کمزوریاں نمایاں ہوتی جاتیں اور انہیں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا ناممکن ہوتا جاتا۔ میں لوگوں کی نگاہوں میں تماشا نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنی بیوی کی قربانی دے کر اپنے شہر کی جانب چل دیا۔ □

گاؤں سے اسٹیشن کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ چند ایک نئے مکانات بنے ہوئے تھے جنہیں مچی آبادی میں شمار کیا جاسکتا تھا لیکن دوسرے شہروں اور دیہاتوں کی طرح جدید طرز پر نہ کوئی ٹیکسٹری بنی تھی اور نہ ہی جدید قسم کی عمارتوں نے جگہ گھیر لی تھی۔

وہ مچی مچی سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا رہا اور گاؤں پہنچ گیا۔ اسی گاؤں میں وہ پلا بڑھا تھا۔ اس کی ایک ایک مچی سے وہ مانوس تھا۔ تھوڑا بہت فرق آیا اور نہ سب کچھ دیا ہی تھا، اسے یوں لگا جیسے وہ صبح ہی وہاں سے گیا ہے اور شام کو لوٹ آیا ہے۔



منزل

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

میرے دکھ درد آپ کے سامنے ہیں۔ یہ میری زندگی کی لفظی تصویر ہے۔ میں نے اپنے درد کو لفظوں کا پیر بن دیا ہے۔ اپنی ایک بہت بڑی غلطی کا اعتراف کر رہا ہوں جو میرے ضمیر پر بوجہ بن گئی ہے۔ امید ہے آپ کو میری یہ کاوش پسند آئے گی۔

عبد الرحیم
(رحیم یار خان)

گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ملنگ بابا کا کھیا اور بوڑھے برگد کا درخت جو اب بوڑھا ہو گیا تھا، ملنگ بابا جو کمر سیدھی کر کے چلا کرتا تھا، اب ضعیف ہونے کی وجہ سے جھک کر چلنے لگا تھا جیسے کوئی اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔

وہ وہیں برگد کے درخت کے نیچے ٹھہر گیا۔ سب کچھ یاد ہونے کے باوجود وہ بول کے دو درختوں والا گھر اور اس کی یادیں بھول چکا تھا۔

گاؤں کے کونے کا وہ آخری مکان تھا جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر لیکن اب اس مکان کی پچھلی طرف صاف زمین کی بجائے باغ نظر آ رہا تھا۔

باغ تو اس کے بچپن کے وقت بھی تھا اور تھوڑی دور پر سے نہر کے ساتھ اور نہر کہ جس میں وہ اور ساتھیوں کے ساتھ نہایا کرتا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے آہستہ آہستہ قدم بڑھانے شروع کر دیے جیسے اسے کچھ یاد آ رہا ہو۔ کوئی بھولی بھری کہانی یا پھر کوئی یادوں کا حادثہ۔ پھر ایک دم ہی سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ گلی کا موڑ، مکان کا نقشہ اور اندرونی پلاٹ۔

اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، ایک مدت گزر گئی۔ تیس سال جو ان کو کھیلوں کو بڑھا چکی تھیں جو اس وقت پیدا ہوئے تھے، ان کے سروں میں سفید بال آنا شروع ہو گئے تھے۔

پھر اچانک یادوں کے درپچوں میں ایک بجلی سی چمکی اور اسے ایسا لگا جیسے ایک دن ہی گزر رہا ہو۔ جیسے کل کی ہی بات ہو، ان ہی گلیوں میں زنب کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ گھوما کرتا تھا۔ دوسروں کے ساتھ مل کر شرارتیں کیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا تیس سال گزر گئے لیکن ایسے لگا جیسے آٹھ بج چکی ہو۔ دن میں کتنی ہی دفعہ زنب کے ساتھ مل کر برگد کی ٹہنیوں پر چڑھ کر جھولا جھولا کرتا تھا۔

زنب جو اس کی ہم عمر تھی اور معصوم بھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر کہتا، ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے زنب! تو زنب مسکرا دیا کرتی۔ پھر اسے یاد آیا کہ کتنی ہی دفعہ نہر کے کنارے اس نے زنب سے پیاری پیاری باتیں کی تھیں، پھر جب جوانی کا شعور آیا تو اس نے برگد کے پاس کھڑے ہو کر زنب سے کہا تھا، میں تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قد ہی بڑھ گئے تھے لیکن سوچیں بچکانہ نہیں، پھر اسے یاد آیا کہ برگد کے نیچے ہی آخری دفعہ زنب کو آخری بار کہا تھا،

آخری بار دیکھا تھا۔ وہ چلی گئی اور وہ خود ایسے ہی بے وحیالی میں برگد کے پتے کو انگلیوں میں مروڑتا رہا۔

اس وقت سطحی سوچیں تھیں، بچپنا تھا۔ اس سے آگے سوچنے کی صلاحیتیں ہی نہ تھیں۔ اس کے باوجود آج تک زنب یاد تھی۔ اس کی معصوم مسکراہٹ یاد تھی۔ اس کا آنکھیں مٹکا مٹکا کر اسے دیکھنا یاد تھا۔

زنب، وہ تصور کے پروے پر اس کی تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب اس عمر میں اس کی نشی آ نکھیں کیا غضب ڈھاتی ہوں گی۔ کتنوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہوں گی، رخساروں کے چاہ غب غب اب کس انداز سے دیکھنے والے کے دل پر بجلیاں گراتے ہوں گے۔ پھر اچانک وہ تصور کی دنیا سے نکل آیا۔ اس نے سوچا کہ اس کی سوچیں بھی شاید اپنے حواس کھو بیٹھی ہیں، ورنہ زنب تو اس کی ہم عمر تھی اور اب ادھیڑ عمر میں زنب کے بال بھی شاید سفید ہو چکے ہوں گے۔ اس کا حسن سفید بالوں میں بھلا کیا غضب ڈھاتا ہوگا۔

اس نے پہلے پہل زنب کو کپاس کے کھیت میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ زمیندار کی کپاس چنے گیا تھا کہ ماں کے حصے میں زیادہ کپاس آئے اور کا نڈار زیادہ پیسے دے۔

سردی کا موسم اپنی جوانی کی طرف قدم قدم بڑھ رہا تھا۔ سورج چوتھائی سفر طے کرنے کو تھا لیکن سردی کا احساس کم نہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنی ماں کے ساتھ کھیت میں پہنچا تھا تو گھٹکرے والے بالوں والی زنب اسے بہت اچھی لگی تھی۔ بچہ تھا وہ بھی لیکن محبت تو ہر رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کپاس نہ چنے بس زنب کو دیکھتا ہی رہے۔

گاؤں میں وہ اپنی نانی کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس کی نانی کا گھر گاؤں سے باہر کی جانب تھا اور وہ اپنی نانی کو بھی ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ شام کو وہ دکان سے مٹی کا تیل لینے چلا تو ساتھ والے گھر میں اسے زنب پھر دکھائی دی تب اسے پتا چلا کہ زنب گاؤں کے امام مسجد کی بیٹی ہے اور جب نانی نے اسے مسجد میں پڑھنے کے لیے امام صاحب کے حوالے کیا تو زنب بھی اسے مسجد میں پڑھتی نظر آئی۔ مولوی صاحب نے اسے بہت پیار کیا اور سبق سے فارغ ہو کر اسے اپنے اور زنب کے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ مولوی صاحب کی بیوی ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ اس نے بھی اس کے سر پر پیار کیا، اور پھر وہ زنب کے ساتھ ساتھ پھر تار ہا۔ کبھی باغ میں، کبھی نہر کے کنارے اور کبھی اسکول کے گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے۔

گاؤں میں اور بھی بہت سارے لوگ تھے لیکن اس وقت اسے کوئی یاد نہ تھا کیونکہ اس کی سوچوں کا محور صرف زنب تھی۔

ساری دنیا اس کے لیے زنب میں سمائی ہوئی تھی۔ بچتے کھیلتے دن گزر رہے تھے۔ بہت خوش تھا وہ، زنب سے اور وہ دونوں جوانی میں داخل ہو گئے۔

کیا نکھار تھا زنب کی جوانی میں اور کیا خار تھا اس کی آنکھوں میں، کیا لوج تھا اس کی چال میں اور کیا نزاکت تھی اس کی اداؤں میں۔

وہ زنب سے محبت کرنے لگا تھا۔ بچپن کی دوستی نے یہ رنگ اپنایا تھا۔ اسے زنب کے بغیر اپنا آپ ادھورا نظر آنے لگا تھا۔

پھر ایک دن شرماتے ہوئے زنب نے بھی اس سے محبت کا اقرار کر لیا کہ وہ بھی اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور نہیں کر سکتی۔

گاؤں ہی کیا معاشرتی طور پر ہر علاقے کی کچھ روایتیں ہوتی ہیں۔ ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنیں گے۔ شادی کریں گے۔ جس کے لیے اس نے اپنی نانی ماں سے رجوع بھی کر لیا لیکن نانی اماں نے ان کے خوابوں کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنی اور مولوی صاحب کی حیثیت سمجھانے بیٹھ گئی۔

جوانی کے منہ زور لیے کے آگے اگر بندھ باندھنے کی کوشش کی جائے تو وہ اور منہ زور ہو جاتا ہے اور پھر وہ نام نہاد عزت و ناموس کی ریت کو اپنے ساتھ بھا کر لے جاتا ہے۔

چوہے پر چڑھی ہوئی چٹیلی میں لاکھ چھپے ہلایا جائے لیکن ابال پھر بھی آ جاتا ہے۔ اسی طرح محبت بھی جب انتہائی راستے پر چلتی ہے تو عورت کی جوانی بھی چوہے پر چڑھی چٹیلی کی طرح ہوتی ہے۔ چوہے میں آگ جلتی ہے، پیش پہلے چٹیلی کو لگتی ہے، پھر چٹیلی میں جو چیز ہوتی ہے وہ گرم ہونے لگتی ہے اور جب گرمی ایک حد تک پہنچتی ہے تو چٹیلی میں ابال آ جاتا ہے۔

جب ابال آتا ہے تو چٹیلی میں پکنے والی چیز ابل ابل کر چٹیلی کے کناروں سے باہر گرتی ہے اور چٹیلی کے اطراف کو جلانی ہوئی نیچے چوہے میں جا گرتی ہے۔ اس کے بعد چوہے کی آگ ایک آواز کے ساتھ بجھ جاتی ہے۔ جب آگ بجھ جاتی ہے تو چٹیلی میں پکنے والی چیز کا جوش ماند پڑ جاتا ہے اور چٹیلی کے اندر سکون ہو جاتا ہے۔

نانی ماں نے کہا تھا کہ وہ بچہ ہے ابھی۔ جب تک وہ بڑا آدمی نہ بن جائے اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ زنب تو بھی یہی مذہب پرست گھرانے کی بیٹی۔ لیکن جوانی کے فیصلے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یہ حسن کی مرضی ہے کہ خیرات میں کسے اپنا

آپ سو پ دے۔ زنب نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا اور وہ دونوں ہر راستے سے گزر گئے۔ وہ دونوں تک نانی ماں سے بولا نہیں، بڑھاپا کیا کر سکتا تھا۔ تیسرے دن نانی ماں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر سمجھایا ”دیکھو عبدالرحیم! ابھی نوکری تلاش کرو۔ دنیا کو دکھانے کے لیے کچھ پونجی جمع کرو۔“

”نانی ماں! مجھے دنیا سے کیا لینا، زنب میرے ساتھ ہے۔“

”کیا.....!“ نانی ماں نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا ہو کہ اس نے عبدالرحیم کے منہ سے کیا سن لیا ہے۔ ”زینت تمہارے ساتھ ہے؟“

”ہاں۔“ عبدالرحیم نے غراتے ہوئے کہا۔ اسے اس وقت بڑھاپے کی فصاحت بڑی لگ رہی تھی۔

”لیکن بیٹا.....!“

”میں کچھ نہیں جانتا ماں!“ اس نے نانی ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”زنب کا بھی دل ٹوٹ جائے گا۔“

”کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ بالکل ہی۔“

Monthly Digest

سکینہ املا و سہلا

Sole Distributor

ویلکم بک شاپ

WELCOME BOOK SHOP

P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817

JD Group of Publications

بہرہ وہ ہوتی..... اپنی حیثیت تو دیکھو۔“

”کیا ہوا ہے میری حیثیت کو؟ کیا میں نے گاؤں کے اسکول میں نہیں پڑھا۔ کیا میں کبڑی نہیں کھیلا؟ کیا میں زمیندار کی نوکری نہیں کرتا؟“ وہ بولتا رہا اور نانی ماں سنتی رہی۔ وہ خاموش رہی، بولتی بھی کیا؟ اسے تو اپنی جوانی کا وقت یاد آ رہا تھا اور وہ عبدالرحیم کی باتیں سنتے ہوئے دونوں وقتوں کا موازنہ کر رہی تھی۔

وقت نے، بزرگوں نے، معاشرے نے، حالات نے جب عبدالرحیم اور ننب کا ساتھ نہ دیا تو انہوں نے بھی زبانی کوئی وعدہ نہ کیا، جو کرنا تھا ایسی زبان میں کر گئے جو صرف جوانی ہی سمجھتی ہے، جوانی ہی بولتی ہے۔ کوئی بس نہ چلا عبدالرحیم کا۔ اسے اپنے والدین کے پاس آنا ہی پڑا اور پابندی لگا دی گئی کہ وہ نانی ماں سے ملنے نہیں جائے گا۔ پُرانا وقت تھا جب تعلیم عام نہ تھی اور پھر ننب نے تو صرف اسلامی تعلیم حاصل کی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ خط ایک دوسرے کو لکھ نہ سکتے تھے، بس انجانے میں عہد تھا، جیسے ننب کہہ رہی ہو کہ زندگی کے کسی موڑ پر میرا پیار بھلا نہ پاؤ گے۔

عبدالرحیم کا دل ہٹانے کی خاطر اس سے کہہ دیا گیا کہ جب وہ بائیس سال کا ہوگا تو کوشش کی جائے گی کہ ننب سے اس کی شادی کر دی جائے۔ باقی مولوی صاحب کی مرضی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ عبدالرحیم سے کرنے پر راضی ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ اس طرح وقتی طور پر عبدالرحیم بہل گیا لیکن ننب سے بچھڑنے کا تصور جب بھی ذہن کے پردے پر آ جا کر ہوتا تو وہ بے چین ہو جاتا۔ کس بُری طرح بلبل کر رہی تھی وہ..... اس کا اپنا حال بھی بُرا تھا لیکن پھر بھی اس نے ننب کو دلاسا دیا تھا۔

”ننب! وقت گزر جائے گا۔“

”اکیلے میں کیسے.....؟“ ننب نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

”میں ہر دن، ہر لمحہ، ہر گھڑی تمہیں یاد رکھوں گا۔“

”ہماری شادی کیسے ہوگی عبدالرحیم!“

”کیوں..... لیکن ننب خاموش رہی، کیا کہتی وہ اس سے کہ وہ اپنے والدین کو اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ آتے وقت ننب نے اسے ایک رشتی رومال دیا تھا اور پھر جب بھی ننب کی یاد شدت سے آتی، وہ رومال کو آنکھوں سے لگا کر تسکین حاصل کر لیتا۔

یہ ایک زمانہ پہلے کی بات تھی۔ جب عبدالرحیم کو اس تھی

کہ ایک دو سال کی بات ہے، پھر زندگی بھر کا ساتھ ہے لیکن وہ سب کچھ خواب تھا۔ انسان خواب دیکھنے پر قادر ہے لیکن تعبیر حاصل کرنے پر قادر نہیں۔

وقت جب آہستہ آہستہ گزرتا ہے تو ساتھ ساتھ اسے لگائے ہوئے زخموں کو بھی مندل کرتا جاتا ہے۔ جس طرح کسی دیوار پر لگی ہوئی تصویر ہر گزرنے والے دن کے ساتھ گرد کی تہ میں چھتی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح دیوانگی میں کی آتی گلی اور پھر دو سال میں اسے ننب کا بھی خیال نہ آیا۔

اس کی زندگی میں نئے دوستوں نے شمولیت کر لی، پھر کچھ والدین نے ہمت دلائی اور کچھ اس نے اپنے شوق میں تعلیم حاصل کر لی، کورس کے لیے اسے بڑی عمر کا سہارا لینا پڑا۔ اب وہ ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ پھر بھی ننب جو ایک بھولا بسرا خواب بن چکی تھی، کبھی کبھی اس کی تنہائیوں کی یادوں میں چلی آتی۔ اس نے کام سیکھ کر اپنی ورکشاپ بنالی اور مکمل شہری انسان بننے کے ساتھ ساتھ معروف ہونا چلا گیا اور پھر ننب ایک خوشگوار خواب بن گئی۔

وقت نے ایک اور کروٹ لی تو اسے ننب کی شکل بھی بھول گئی، ذہن پر نقش شدہ تصویر کے نقوش مدہم پڑ گئے۔ بچپن کے فیصلے اسے عجیب سے نظر آنے لگے، پھر اس کی شادی ہو گئی۔

حمیداں سے شادی اس کی زندگی کا مفہوم تو نہ تھی لیکن زندگی سے منہ موڑتے ہوئے ماں اور باپ کی خواہش کا پاس تھا، اس سے آگے اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

حمیداں بڑی اچھی بیوی ثابت ہوئی، جس کی چاہت و خدمت نے اس کے ذہن اور یادوں کے سارے زخم مندل کر کے صاف کر دیے کہ سوائے نشان کے باقی کچھ نہ بچا۔ وہ بہت سکھڑ، سمجھ دار، تابعدار اور شوہر پرست قسم کی عورت تھی۔ گوکہ وہ حسین تو نہ تھی لیکن اس نے اپنے حسن سلوک سے عبدالرحیم جیسے انسان کو قابو میں کر لیا تھا۔ عبدالرحیم کے ذہن سے ننب کے نقوش مٹا ڈالے تھے۔ اس لیے عبدالرحیم حمیداں سے نہایت خوش اور مطمئن تھا۔

جس طرح زیادہ کھانے سے پیٹ میں گڑبڑ ہو جاتی ہے یا وقت بے وقت کھانے سے ہانسی میں خرابی ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح قبل از وقت ملاپ سے ننب کے پیٹ نے بھی نمایاں حیثیت اختیار کر لی تھی گوکہ وہ ایک شریف آدمی کی بیٹی ہونے کے ناتے بالکل ڈھیلا لباس پہنتی تھی، جس سے اس کی حرکت چھپی رہتی تھی لیکن کب تک؟ دنیا کی نظریں بالکل اکیس رے مشین ہوتی ہیں۔

ایک دن ایک عورت نے ننب کی چال دیکھ کر اس کی ماں سے ذکر کر دیا۔ اس کے بعد ننب کی ایسی شامت آئی کہ اسے سچ بتاتے ہی بن پڑی۔ یہ ایک علیحدہ بات کہ اسے اس حرکت کا کیا نذرانہ ادا کرنا پڑا، اسے ننب یا خدا جانتا ہے۔

ایک زمانہ بیت گیا۔ کتنے ہی ماہ و سال بیت گئے۔ کتنی مکوشیں بدل گئیں، عبدالرحیم نے پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا ہوتی بڑی حسین ہے لیکن جب آنکھ حقائق کو دیکھتی ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے، وہ بھی خوابوں کی دنیا سے نکل آیا۔

وہ شہر تو نہ تھا، نہ ہی قصبہ تھا۔ بس تھوڑی سی ترقی ضرور کی تھی جیسے آٹے میں نمک ڈال دیا جائے درنہ گاؤں کا گاؤں وہی تھا۔ جب وہ گیا تھا تو چڑھتے سورج کی جوانی تھی لیکن اب زندگی اور دھوپ کے سائے کافی لمبے ہو چکے تھے۔

اس نے قدم آگے بڑھائے تو دو ایک جگہ بیٹھ پڑے ہوئے دیکھے اور چوہے میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ گاؤں کا ہوٹل ہے، اس نے ایک جگہ بریف کیس سائڈ میں رکھا اور خود ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ گنچے اور موٹے ہوٹل والے نے اسے حیران کن نظروں سے دیکھا اور اپنے تہ بند سے ہاتھ صاف کرتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

”کیا چائے ملے گی؟“

”ہاں جی، باؤ جی! کیوں نہیں؟“ اور چائے بنا کر اس کے ہاتھ میں جو پیالی آئی تھی اس میں چائے کی جگہ شیرے، ہلکے دودھ اور کپاس کی پتیوں میں اُلی ہوئی کوئی چیز تھی۔

”یہاں پر بہت عرصہ پہلے ایک مولوی صاحب رہا کرتے تھے.....“

”کون سے مولوی صاحب؟“ دکاندار نے پوچھا۔

”نام تو ان کا تھا شاید ارشاد حسین.....“

”ارشاد حسین.....“ دکان دار نے آہستہ سے خود کھامی کے انداز میں کہا پھر ایک دم سر اُٹھا کر ایک طرف منہ کر کے بولا ”چاچا خیرو!“ دکان دار کے گلے کا الیوم کچھ اتنا اونچا تھا کہ بے خیالی میں عبدالرحیم کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھٹک گئی۔ اس نے گھبرا کر دکاندار کی طرف دیکھا لیکن دکاندار اس کی طرف متوجہ نہ تھا اور اس کے ہاتھوں میں پیالی چھٹکتے کسی نے نہ دیکھی تھی۔

”کیا کہے موٹے!“ ادھر سے آواز آئی، جس طرف منہ کر کے دکاندار نے آواز لگائی تھی۔

”یہ بابو جی آئے ہیں.....“

”کون سے بابو جی؟“

ماہنامہ سرگزشت

”پانچویں، مولوی صاحب کا پوچھتے ہیں۔“

”اچھا ٹھہرو، میں وہیں آتا ہوں۔“ چاچا خیرو کی طرف سے جواب ملا تو موٹا اپنی گدی پر جا بیٹھا۔ اتنے میں عبدالرحیم نے چائے ختم کر لی۔

”بابو جی! ادھر ہی رکھ دو پیالی۔“ موٹا بولا۔ عبدالرحیم نے بیچ پر پیالی رکھی ہی تھی کہ آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کیے ایک بوڑھے کو اپنی طرف گھورتے ہوئے پایا۔

”سلام چاچا!“ عبدالرحیم نے نہایت اخلاق سے ہاتھ اُٹھا کر اسے سلام کیا۔

”ولیم السلام، ولیم السلام! پر بابو جی! میں نے پہچانا نہیں۔“

”جی میں اجنبی ہوں۔“ عبدالرحیم لفظ اجنبی کہتے ہوئے ذرا جھجک سا گیا۔

”کس سے ملتا ہے؟“ چاچا خیرو نے اس سے دریافت کیا۔

”جی..... وہ ادھر..... ایک عرصہ پہلے مولوی صاحب رہتے تھے، جن کا نام شاید ارشاد حسین تھا۔“

”ارے تمہیں..... ہے۔ وہ بے چارہ ابھی مرا تو نہیں ہے، پر..... تو کیا لگے ہے اس کا؟“

”جی..... بس صرف واقفیت ہے۔“

”اچھا..... اچھا..... وہ ادھر کونے والا مکان ہے، وہ.....“ چاچا خیرو نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہ جس میں بول کا درخت کھڑا ہے، بس وہی مکان ہے۔“

عبدالرحیم نے چائے کے پیسے ادا کیے اور شکریہ ادا کر کے بریف کیس اُٹھا کر اپنی منزل کی جانب چل دیا۔

اس نے ابھی دروازہ کھٹکھٹانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کے پاس سے ایک عورت چھوٹے سے بچے کو اٹھائے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ عبدالرحیم جلدی سے بولا۔

”ننب!“ اس عورت نے گھور کر عبدالرحیم کی جانب دیکھا اور منہ سے کچھ بولے بغیر دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

عبدالرحیم شش و پنج میں پڑ گیا۔ کبھی ہاتھ اُٹھاتا کہ دروازے پر دستک دے، پھر رک کر ہاتھ گرا لیتا۔ اس کی سوچیں منتشر ہو گئی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ننب پر ماہ و سال نے اثر کیوں نہیں چھوڑا، وہ ویسی کی ویسی ہے اور پھر اس نے مجھے پہچانا بھی نہیں۔ پھر اس نے سوچا کہ ایک زمانہ زندگی کا گزرا دیا ہے اور زمانہ گزرنے کے نشانات اس کے چہرے اور بالوں پر عیاں تھے۔

”میں بدل گیا، ننب نہیں بدلی۔“ وہ خود کھامی کے

ماہنامہ سرگزشت

یہ ایک زمانہ پہلے کی بات تھی۔ جب عبدالرحیم کو اس تھی

ماہنامہ سرگزشت

ابھی اس کی سوچیں کسی منزل نہ پہنچ پائی تھیں کہ دروازہ پھر کھلا اور ایک دفعہ پھر اسے زینب کا چہرہ نظر آیا "اندر آ جاؤ۔" زینب نے عبدالرحیم سے کہا تو وہ جھپکتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ برآمدے میں پہنچ کر زینب نے اسے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری طرف چل دی۔ عبدالرحیم نے غور سے زینب کی جانب دیکھا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے وہیں کھڑا زینب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ زینب تو ایک کمرے میں کھس گئی، اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن وہ بے خیالی میں اسی طرف دیکھتا رہا۔

انسان کی سوچیں ذہن کی پیداوار ہیں لیکن جذبات دل کی لہروں پر چٹکولے کھاتے ہوئے وارد ہوتے ہیں۔ اصل میں یہی منہمی بھرگوشت کا لوتھڑا اپنی جگہ ایک سمندر ہے۔ جس میں جذبات کی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی جب کوئی لہر سرکشی پر آمادہ ہوتی ہے تو نہ وقت کو دیکھتی ہے نہ عمر کو۔ چاہے وہ نو عمر ہو، جوان ہو یا بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہو۔ یہ لہر انسان کو بے دست و پا کر دیتی ہے۔ اس وقت اس کے اختیار میں کچھ نہیں رہتا۔ وہ شعوری طور پر دل میں اُٹھنے والے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے تو لاشعوری طور پر اس کی زد میں آ جاتا ہے اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب شعور اور لاشعور میں جنگ ہوتی ہے تو بعض اوقات تحت الشعور جیت جاتا ہے۔

سوچوں کا ایسا چوراہا تھا جہاں پر عبدالرحیم رک چکا تھا اور فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ وہ کہاں تک پہنچتا کہ کسی کے کھانے کی آواز نے اسے خیالات کی دنیا سے نکال باہر کیا، اتنے میں اسے دروازے میں ایک بوڑھی عورت کا چہرہ نظر آیا جس کی طرف زہیب اشارہ کر گئی تھی۔

”آپ..... آپ برآمدے میں کھڑے ہو گئے ہیں۔“
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“
 ”کسا.....؟“

”بس ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔“
 ”آئیے، اندر آ جائیے۔“ اتنا کہہ کر وہ چہرہ اندر کرے
 میں غائب ہو گیا اور عبدالرحیم اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
 ”میں سمجھتی ہوں یہ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر آپ جیسے شان
 و شوکت والے انسان کے شایانِ شان تو نہیں، پھر بھی جو کچھ
 ہے، حاضر ہے۔“

”شکریہ!“ عبدالرحیم نے ایک سال خوردہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

282

”کس سے؟“
”زہنب سے.....“
”اوہ.....“ عورت کے منہ سے اتنا نکلا اور ایک لمبے
کے لیے اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔
”کیا ہوا.....؟“ عبدالرحیم نے بے چینی سے پوچھا۔
”مدت ہوئی اس کا انتقال ہو گیا.....“
”کب.....؟“ عبدالرحیم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
”یہی کوئی تیس بتیس سال پہلے کی بات ہے۔“
”لیکن میں نے اسے دیکھا ہے۔“
”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے عبدالرحیم!“
”آپ..... آپ مجھے جانتی ہیں؟“
”بہت اچھی طرح.....“ عورت نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

”افسوس.....“
”اب افسوس کرنے کا کیا فائدہ۔ تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ نا، یہ بے چینی اب فضول ہے۔“

”آپ..... میرا مطلب ہے کہ آپ.....“
 ”میں اس کی بڑی بہن ہوں۔“ عبد الرحیم بہت آہستگی سے بٹھ گیا اور جیب سے چھید شدہ بہت ہی پُرانے ریشمی رومال کو نکال کر اپنی پیشانی سے نہ آنے والا پسینا صاف کرنے لگا۔ عورت بڑے غور سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رومال کو دیکھنے لگی۔

”آپ جیسے..... خوش پوش انسان کے ہاتھ میں یہ
قیانوسی اور ستا سا رومال اچھا نہیں لگتا۔“ عورت نے بھی
ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے عبدالرحیم سے کہا۔

”یہ..... یہ دراصل.....“ اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

”کیا کہہ رہے تھے تم؟“ عورت نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

”میں کہہ رہا تھا کہ یہ رومال میرے..... پاس.....“

”اوہ..... اتنی محبت تھی تم کو اس سے کہ اس کے مرنے کے اتنے سال بعد بھی اس جنازہ کو سننا لے رہا ہو“

”محمد نے میرے رسول کا حوالہ نہیں دیا۔“

”آپ کمر باز نہ بنیں، کیا کوئی قصہ سنا گیا؟“

جون 2012ء

”ہاں..... ہے۔“ عورت نے بڑے محل سے جواب دیا۔
 ”آپ نے بتایا نہیں کہ میں نے ابھی ننب کو دیکھا ہے، اس کے پاس چھوٹا سا بچہ بھی تھا.....“
 ”میں نے کہا تھا کہ تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ عورت نے
 ہنسی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا ”لیکن تم نے پھر وہی سوال کر ڈالا تو
 سنو.....“ اتنے میں وہ عبدالرحیم کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس نے
 عبدالرحیم کی کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور جھک کر سرگوشی
 کے انداز میں عبدالرحیم کے کان کے قریب منہ کر کے بولی
 وہ..... وہ ننب کی روح ہے جو برسوں سے یہاں بھٹکتی
 پھر رہی ہے اور بچہ..... تم اسے کیا دے کر گئے تھے؟“
 ”وہ..... وہ ہماری غلطی تھی۔“ عبدالرحیم نے نروس
 ہوتے ہوئے کہا۔

”خیر..... چھوڑو اس ذکر کو۔“ عورت نے سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ”یہ بتاؤ تمہارے بیوی بچے تو خیریت سے ہیں ناں؟“

”میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور میرا کوئی بچہ بھی زعمہ پیدا نہیں ہوا۔“ عبدالرحیم نے ایک بار پھر چہرے پر رومال کو پھیرتے ہوئے کہا۔

عورت اس کے پاس سے ہٹ کر ایک بکس کے پاس لگی اور اس میں سے کچھ تلاش کرنے لگی اور پھر جو واپس مڑی تو اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی جس میں زیب نیچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ فوٹو رسوں کرانا ہونے کی وجہ سے مدھم مدھم چکا تھا۔

عبدالرحیم تصویر دیکھتے ہی پُر جوش انداز میں بولا "یہی ہے..... خدا کی قسم یہی ہے۔ یہی تو مجھے بلا کر اندر لائی ہے۔ اُف خدایا!....." اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو پکڑ لیا "کیا یہ واقعی روح ہے؟" عبدالرحیم نے سر اٹھا کر بے یقینی کے انداز میں عورت سے پوچھا۔

”ہاں۔“ عورت نے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں روح کے بجائے اسے بدروح کہہ جائے تو اچھا ہوگا۔“

"نہیں، نہیں..... آپ ایسا نہ کہیں۔"

"کون؟ بہت اذیت ہوئی ہے تمہیں..... اچھے"

عبدالرحیم: یہ تو بتاؤ کہ پھڑتے سے نسب نے تمہیں تو نشانہ

”بالکل۔“ عبد الرحیم نے رومال اس عورت کی طرف

۱۰۰ ماهنامه سرگزشت

بڑھاتے ہوئے کہا لیکن عورت اس طرف کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے بولی "اور تم نے اسے جو نشانی دی تھی، وہ تصویر میں اس کی گود میں ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ آدمی صدی گزرنے کے قریب ہے، تمہیں آج سے پہلے خیال کیوں نہیں آیا؟" عورت ایک دم جوش میں آگئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ پر قابو لیا۔

"میری شادی ہوئی تھی۔" عبدالرحیم نے مری سی آواز میں کہا۔

”شادی ہو جانا اور بات ہے، پیار کرنا اور بات۔
دونوں چیزیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ تم نے تو دوبارہ
پوچھا بھی نہیں کہ بے چاری نسب پر کیا گزری۔“ عورت نے
تھکے انداز میں عبدالرحیم سے کہا۔

عبدالرحیم نے سر جھکا لیا۔ وہ بولتا بھی تو کیا؟ قصور اس کا اپنا تھا۔ اسے واپس آنا چاہیے تھا لیکن وہ تو حمید ادا کے دام میں ایسا الجھا کہ تیس سال تک نکل نہ سکا۔ تاؤ فٹیکہ وہ اس

”مجھے بہت افسوس ہے عبدالرحیم! تم نے آنے میں

”ہاں۔“ عبدالرحیم نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا
”مجھ سے واقعی دیر ہوئی۔ اب اس غلطی کی سزا بھی میں ہی
زندگی بھر بھگتوں گا۔ اچھا مجھے اجازت دیجئے۔“ اس نے

اُٹھتے ہوئے کہا اور اپنا باریف تیس ہاتھ میں پکڑ کر ہڑا ہوا گیا۔
عورت بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور پوچھنا
”چارے ہو؟“

”ہاں۔“ اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عورت اسے دروازے تک چھوڑنے لگی اور جب عبدالرحیم اس پر الوداعی نظر ڈال کر دروازے سے باہر نکل گیا تو وہ عورت دروازہ بند کر کے بڑھائے میں بھی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اچانک اس کی نظر دائیں ہاتھ کی طرف الماری میں لگے ہوئے آئینے پر پڑی تو وہ ٹھنک گئی، غور سے دیکھا اور پھر قدم بہ قدم آئینے کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ اپنے سراپے کا جائزہ لینے میں اس طرح مصروف ہو گئی کہ وقتی طور پر ساری کائنات سے کٹ کر رہ گئی۔ زمانے کے ساتھ گزرنے والے طوفانوں نے اس کے ڈھانچے کو تو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اپنے سفید سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچے گئی کہ کچھ تو ہے آخر فرق اس میں اور نینب میں۔ پھر ایک طویل سالوں کا فاصلہ جس طرح اس نے طے کیا، اس سفر نے اس کی روح و جسم پر شکن طاری کر دی تھی، پھر تھکر



آس کے جگنو

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!

انسان کا ضمیر غلطیوں سے گندھا ہے۔ ایک غلطی میرے ابا کے دوست نے کی پھر اس دوست نے جس نے میری پرورش کی، مجھے پروان چڑھایا۔ ایک غلطی میں نے کی ان دونوں غلطیوں کو آپ کے سامنے تحریری طور پر لایا ہوں تاکہ لوگ سبق حاصل کر سکیں۔

فراز علی
(نیو یارک)

تھیں، مگر اات کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ابا جی کی تھوڑی سی زمینیں تھیں۔ ہم بہت زیادہ غریب نہ تھے تو بہت امیر بھی نہیں تھے۔ اچھی گزر بسر ہو جاتی تھی۔

ابا جی چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہر باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے کیونکہ ہمارے گاؤں میں بہت سے لڑکے ایسے تھے جن کے والدین نے انہیں محض پرائمری تک تعلیم دلا کر ہی کام پر لگا دیا تھا۔ ان میں سے کئی لڑکے تو ایسے تھے جن کی زمینیں ہم سے زیادہ تھیں

زندگی بھی انسان کے ساتھ عجیب قماشے کرتی ہے۔ کبھی خوشیوں کی اتنی بہتات ہوتی ہے کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور کبھی دکھوں کی ایسی آمدنی آتی ہے کہ انسان بگولے کی طرح گردش کرنے لگتا ہے۔ زندگی میں یہ قماشے کسی کے ساتھ کم ہوتے ہیں اور کسی کے ساتھ زیادہ لیکن نشیب و فراز تو ہر انسان کی زندگی میں آتے ہیں۔

میری زندگی بھی ان ہی تخیلوں اور شیرینی سے عبارت ہے جو میں اپنے والدین کا بکھوتا تھا، مجھ سے چھوٹی دو بہنیں

ہوئی آواز میں بولی ”تمہارا ابو بیٹی! اس وقت زندگی کے کسی راستے پر سر جھکائے مایوسی کو گلے لگا کر، بغیر منزل کا تعین کیے چلا جا رہا ہوگا۔“

اتنا کہتے ہوئے وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ شاید اپنی حالت بیٹی سے چھپانا چاہتی تھی اور پھر وہ بیٹی کو کیسے بتاتی کہ ابھی جس اجنبی نے ”نہیں“ ”نہیں!“ ”کہہ کر پکارا تھا اور پھر تو ہی اسے اندر بلا کر لائی تھی، وہی تیرا ابو تھا۔ کمرے میں وہ چارپائی کی پٹی سے پیشانی ٹیک کر بیٹھ گئی جیسے کہ اس وقت آنسوؤں کے ذریعے زندگی کو بھی بہا دینا چاہتی ہو۔

مگر زندگی اتنی آسان کہاں ہوتی ہے کہ اسے آنسوؤں میں بہا دے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو لوگ اس کی باتوں پر یقین کر لیتے۔ اسے عبدالرحیم کے جانے کے بعد ڈیڑھ سال تک پنڈی میں اپنی پھوپھی کے ہاں گزارنے کی سزا نہ ملتی، جب وہ واپس گاؤں آئی تھی اور ماں نے سب کو بتایا تھا کہ نہن کی شادی ہوئی اور شوہر سڑک حادثے میں مر گیا تو کتنے لوگوں نے یقین کیا تھا، آنکھیں طعنے دیتی تھیں۔ آنسو بھی کسی کام نہ بند نہیں کر پائے تھے۔

اس وقت بھی وہ آنسوؤں سے ان نشان قدم کو دھو رہی تھی جو اس کی زندگی پر ثبت تھے۔ وہ ان کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتی تھی کہ ایک آواز سنائی دی۔

”نہن!..... میں سزا پانے کے لیے لوٹ آیا..... میرے بال ہی سفید نہیں ہوئے ہیں، بیٹائی بھی کمزور ہو گئی ہے۔ بھی تو تمہیں پہچان نہیں پایا..... سڑک پر پہنچ کر ڈھن نے تمہاری باتوں کا تجربہ کیا تو آئینے سے گرد صاف ہوئی..... میں لوٹ آیا ہوں نہن!“

”بیٹائی ہی نہیں عقل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے..... اب آئی گئے تو اپنے ساتھ اپنی نشانی بھی لیتے جاؤ..... اس کا شوہر اسے چھوڑ گیا ہے، صرف اور صرف تمہاری وجہ سے کہ اسے بھی میری کہانی پر یقین نہیں آیا تھا اور طعنے دے دے کر اس کی زندگی جہنم بنائے ہوئے تھا۔“

”ٹھیک ہے..... میری غلطی میرے ساتھ جائے گی مگر تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔ اپنے ابا کو بھی تیار کر لو۔ میں تانگہ لانے جا رہا ہوں۔“

کچھ دیر بعد ایک تانگہ جس پر چار کہانیاں لدی پھندی کی سڑک کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ایک کہانی مولوی صاحب کی، دوسری نہن، تیسری بیٹی اور چوتھی عبدالرحیم کی۔ ان کہانیوں کو ایک نیا اور خوشگوار اختتام ملنے والا تھا۔

نے رنگ دکھایا کہ وہ ہستی جو کبھی رگ و جاں سے بھی قریب تھی دل کی ہر دھڑکن جس کا نام لیتی تھی، وہ ہستی بھی اسے پہچان نہ پائی۔ وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے غڑ حال سی ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ اب اسے آرام کرنا چاہیے، ابدی آرام۔ زندگی کی دوڑ میں اب وہ حصہ نہ لے سکے گی، ایک انتظار تھا سو وہ بھی ختم ہو گیا۔

وہ پتا نہیں کب تک محویت کے عالم میں کھڑی رہتی کہ ساتھ والے کمرے سے کھانسنے کی آواز آئی اور پھنسی پھنسی سی آواز اس کے کانوں میں پڑی ”نہن!“ اس کے ساتھ ہی وہ خیالوں کی دنیا سے نکل آئی اور زور سے بولی ”آئی ابا!“ اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے کمرے میں پہنچ گئی۔ اپنے باپ کو سنبھالا، دوائی کھلائی۔ ابھی وہ لحاف ٹھیک کر رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی ”ای!“ اس نے گھوم کر دیکھا تو اس کی بیٹی اپنے بچے کو گود میں لیے آنکھوں میں شکایت سجائے کھڑی تھی۔

”کیا بات ہے؟“

”آپ نے امی! آج پھر نانا میاں کو ”ابو“ کہا؟“

”نہیں بیٹی! میں نے ابا کہا.....“

”کیوں؟“

”تو کیا ہو گیا؟“

”آپ نے وعدہ کیا تھا مجھ سے.....“

”ادہ..... بھول ہو گئی۔“

”آپ تو ایک عمر سے بھولتی چلی آرہی ہیں۔“

”کیا چاہتی ہو؟“

”اب تو میں بھی بچوں والی ہو گئی ہوں۔“

”مجھے بھی معلوم ہے۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ بچپن سے اب تک آپ ہالتی چلی آرہی ہیں.....“

”مجھے پریشان نہ کرو۔“

”نہیں، آپ کو بتانا ہی پڑے گا۔“

”کیا.....؟“

”میرے ابو کہاں ہیں؟ وہ ہم سے کیوں نہیں ملتے؟“ اسے ایک جھٹکا سالگا۔ اگر وہ پلنگ کا سہارا نہ لیتی تو شاید گر ہی پڑتی۔ اس وقت ماں کی متنا بھی جاگی اور اپنا پیار بھی۔ اس کے اندر ایک طوفان برپا ہو گیا، اس کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن سامنے بیٹی تھی، وہ پوچھتی تو کیا جواب دیتی۔

جذبات بے قابو تھے، آنسوؤں کا ریلہ منہ زور ہو کر بند توڑنے کو تھا۔ اس نے بیٹی کی طرف سے منہ موڑ لیا اور زندگی

جب کھلاڑیوں نے قے کرنا شروع کر دی

1976-77ء میں ویسٹ انڈیز کے دورے میں ڈومینیکا کے ریٹورنٹ میں کھانے کے دوران ٹیم کے کھلاڑیوں نے ماؤنٹین چکن منگوالی اور بہت زیادہ شوق سے کھائی، میں نے وال منگوالی اور علیحدہ میز پر کھائی، کھانے کے بعد جب ساتھی کھلاڑیوں نے مجھے بتایا کہ ہم نے یہ ڈش کھائی ہے تو میں نے انہیں بتایا کہ یہ مینڈک کی بریانی ہوتی ہے۔ انہوں نے ریٹورنٹ کے مالک سے پوچھا جس نے میری بات کی تصدیق کر دی۔ اس کے بعد کھلاڑیوں نے قے کرنا شروع کر دی۔

یادداشت: آصف نواز (سابق کرکٹر)

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ ہیڈ ماسٹر صاحب جلدی سے بولے۔

”یارہ، جمالے! بات اصل میں یہ ہے کہ.....“
”او بس کر اوئے۔“ جمال چاچا نے اباجی کو جھڑک دیا
کیا فراز صرف تیرا ہی بیٹا ہے، میرا کوئی حق نہیں ہے؟“ پھر
انہوں نے مجھ سے کہا ”جا بیٹا! تو جا کر روائگی کی تیاری کر۔“
میں بھی خوش ہو گیا کہ یہ مسئلہ تو کسی طرح حل ہوا۔
”دیکھ جمالے!“ اباجی نے کہا ”میں نے فراز کو بساط
بمراجم سے اچھا کھلایا اور اچھے سے اچھا پہنایا ہے لیکن میں
نے بھی اسے کھلی چھوٹ نہیں دی ہے۔ میں تو اس بات کا
نکل نہیں کہ.....“

”کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نظر سے۔“ جمال
چاچا نے اباجی کا جملہ پورا کر دیا ”تو فکر مت کر۔ فراز اب میری
لے تے داری ہے۔ تجھے بھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

☆☆☆

یوں میں جمال چاچا کے ساتھ لاہور آ گیا۔ یہاں
انہوں نے مجھے شہر کے بہترین کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ اس
کے علاوہ میری تعلیم کے لیے دو ٹیوشن بھی لگا دیے۔
میں کالج سے آنے کے بعد کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا
تھا، پھر سر غارف آ جاتے تھے۔ وہ مجھے فزکس اور میٹھ
پڑھاتے تھے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد سر اکبر آ جاتے
تھے۔ وہ مجھے کیمسٹری کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اردو بھی
پڑھایا کرتے تھے۔ یوں میرا زیادہ وقت پڑھائی میں گزر جاتا
تھا۔

شام کو پانچ بجے میں اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ
کرکٹ کھیلنے جاتا تھا۔
اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ انٹر میڈیٹ میں بھی پورے
بورڈ میں میری پہلی پوزیشن آئی۔

جمال چاچا نے اس موقع پر ایک شاندار پارٹی کا اہتمام
کر ڈالا۔ اس پارٹی میں جمال چاچا کے تمام دوست تو شریک
تھے ہی، انہوں نے اباجی، اماں اور میری دونوں بہنوں کو سین
اور ٹرین کے علاوہ گاؤں کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی خاص
طور پر اس پارٹی میں مدعو کیا تھا۔

جمال چاچا کے دوستوں نے مجھے اتنے تحائف دیے
تھے کہ میرا کمر بھر گیا تھا۔

سب سے بڑا تحفہ تو جمال چاچا ہی کا تھا۔ میں جب بھی
گاؤں جاتا تھا، گاؤں کے لوگ مجھے حیرت اور رشک سے
دیکھتے تھے۔

تھے تو اپنے بھائیوں کے ساتھ رہنے کی بجائے ہمارے ہی گھر
ٹھہرتے تھے۔

وہ بہت خوش اخلاق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔
لاہور میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ دو ٹیکسٹائل ملیں تھیں،
اور گلبرگ میں گارمنٹ کے دو بڑے اسٹور تھے اور نہ جانے
ان کا کیا کچھ کاروبار تھا۔

وہ ہمیشہ چمکتی دھمتی گاڑی میں گاؤں آتے تھے۔ ان کی
چمکتی ہوئی گاڑی دھول مٹی میں اٹ جاتی تھی۔ اباجی فوراً
گاؤں کے کسی آدمی کو بلا کر جمال چاچا کی گاڑی کو دھلوا دیا
کرتے تھے۔

میں بھی دو چار بار اباجی کے ساتھ جمال چاچا کے گھر
چاچکا تھا۔

لاہور میں گلبرگ کے علاقے میں ان کا محل جیسا گھر
تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اتنے بڑے گھر میں وہ صرف چند
ملازموں کے ساتھ کیوں رہتے ہیں؟ اپنے بھائیوں یا ان کے
بچوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟ اکثر یہ سوال میرے
ذہن میں سر اٹھاتا تھا لیکن میں بھی یہ سوال جمال چاچا یا اباجی
سے نہ کر سکا۔

جمال چاچا دو تین مہینے میں دو چار دن کے لیے گاؤں
ضرور آتے تھے اور وہ صرف کھڑے کھڑے اپنے بھائیوں
کے گھر جاتے تھے۔ اپنے بھائیوں اور بھیبھوں کو تحفے وغیرہ
دیتے پھر سارا وقت ہمارے گھر گزارتے۔ ان کے بچپنے اور
بچتیاں بعد میں ہمارے گھر آ کر ان سے ملتے تھے۔

جمال چاچا اس مرتبہ آئے تو ہمارے اسکول کے ہیڈ
ماسٹر صاحب بھی موجود تھے۔ وہ اباجی کو سمجھا رہے تھے کہ
بھائی علی نواز! تم فراز کو ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دے دو
ورنہ اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس کی ذہانت خاک
میں مل جائے گی۔“

”بات کیا ہے نوازے؟“ جمال چاچا نے پوچھا۔ وہ
اباجی کو اسی بے تکلفی سے مخاطب کرتے تھے، جواب میں اباجی
بھی انہیں جمالے کے نام سے پکارتے تھے۔

”بھائی جمال!“ ہیڈ ماسٹر نے کہا ”اچھا ہوا تم آگے، تم
ہی میاں علی نواز کو سمجھاؤ۔ میری بات تو سمجھتا ہی نہیں۔“

جب جمال چاچا کو مسئلے کا علم ہوا تو وہ اباجی پر برس
پڑے ”واہ نوازے! تو نے خوب دوستی بھائی ہے۔ یار! لاہور
میں میرا اتنا بڑا گھر موجود ہے۔ تو اس کے باوجود پریشان
ہو رہا ہے۔ او عقل کے دشمن! فراز اگر گجرات کے بجائے
لاہور میں پڑھ لے تو کیا فرق پڑے گا؟“

لیکن اس صدی میں بھی وہ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ
پڑھ لکھ کر بھی ہمارے بیٹے کون سے گورنر بن جائیں گے، اس
لیے ان کی تعلیم میں وقت اور پیسا کیوں ضائع کیا جائے؟

اباجی ان کے مقابلے میں روشن خیال تھے۔ وہ مجھے زیادہ
سے زیادہ پڑھانا چاہتے تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے ”بیٹا جی! اگر تم
تعلیم کے لیے ولایت بھی جانا چاہو گے تو میں تمہیں بھیج دوں
گا۔ میں تمہاری تعلیم کی خاطر اپنی زمین بیچ دوں گا۔“

مجھے بھی بچپن ہی سے تعلیم کا شوق تھا، پھر اباجی کے الفاظ
میرے شوق پر ہمیز تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں انتہائی محنت
سے پڑھ رہا تھا۔

اس کا صلہ مجھے یوں ملا کہ میٹرک میں پورے ضلع میں
میری دوسری پوزیشن تھی، پہلی پوزیشن گجرات کے کسی اعلیٰ
اسکول کی لڑکی نے لی تھی۔

ہمارے گھرانے کے لیے تو میٹرک ہی اعزاز تھا۔ میں
اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے میٹرک پاس کیا تھا۔
گاؤں کا بھی پہلا لڑکا تھا جس نے میٹرک کے امتحان میں
دوسری پوزیشن لی تھی اور جس کی تصویر اخباروں میں چھپی تھی،
ٹی وی چینلوں پر دکھائی گئی تھی۔

پورا گاؤں مبارک باد دینے کے لیے ہمارے گھر آٹا آیا
تھا۔ مجھ سے زیادہ خوش اباجی تھے۔ وہ یوں فخر سے گردن
اکڑائے ہوئے تھے جیسے یہ کارنامہ انہوں نے ہی انجام دیا
ہو۔ اگر دیکھا جائے تو حقیقت بھی یہی تھی۔ یہ ان ہی کی
خواہش تو تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔ انہوں نے
کبھی مجھے کسی عروسی کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔

ہمارا اسکول تو وہاں سے پانچ ساڑھے پانچ میل دور
تھے میں تھا لیکن اب کالج میں پڑھنے کے لیے مجھے گجرات
جانا تھا۔ گجرات کا قافلہ وہاں سے پچاس کلومیٹر تو ہوگا۔ اباجی
کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں اتنا لمبا سفر طے کر کے گجرات
کیسے جاؤں گا؟

میرے تعلیمی اخراجات کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ مجھے
سرکار کی طرف سے وظیفہ ملا تھا۔ مسئلہ تھا میرے قیام کا، اباجی
نہیں چاہتے تھے کہ میں ہاسٹل میں رہوں۔ نہ جانے انہیں کن
لوگوں نے بہکا دیا تھا کہ ہاسٹل میں رہ کر لڑکے آوارہ
ہو جاتے ہیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بس اب میری تعلیم کا سلسلہ
منقطع ہو جائے گا۔ میں روزانہ اتنا طویل سفر طے نہیں کر سکتا
تھا اور اباجی مجھے ہاسٹل بھیجنے کے قائل نہیں تھے۔

انہی دنوں چاچا جمال خان ہمارے گھر آئے۔ وہ اباجی
کے بچپن کے دوست تھے۔ جمال چاچا جب بھی گاؤں آتے

میرا ایڈمیشن انجینئرنگ کالج میں ہو گیا۔
جمال چاچا محبت تو مجھ سے پہلے بھی کرتے تھے، اب تو
ان کی محبت بہت گہری ہو گئی تھی۔
میں انجینئرنگ کے پہلے سال میں کامیاب ہوا تو اباجی
اور اماں خاص طور پر لاہور آئے تھے۔ اس موقع پر جمال
چاچا نے اباجی سے کہا ”یار نوازے! اگر تو بڑا نہ مانے تو ایک
بات کہوں؟“

اباجی نے انہیں گھورتے ہوئے کہا ”تجھے بھی یہ پوچھنے
کی ضرورت ہے؟“

”یارہ، میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تو فراز کو میرا بیٹا
بنادے۔“

”او، فراز تیرا ہی بیٹا ہے۔“ اباجی نے کہا ”پچھلے تین
سال سے تو یہ تیرے ہی ساتھ رہ رہا ہے۔“
”وہ تو ٹھیک ہے۔“ جمال چاچا نے کہا ”میں فراز کو
باقاعدہ اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔ تجھے کوئی اعتراض ہے؟“
”ادے، مجھے کیا اعتراض ہوگا جمالے؟“ اباجی نے
ہنس کر کہا ”میں تو فراز کو تیرے حوالے کر ہی چکا ہوں۔“
”بس تو پھر میں کل ہی اعلان کر دوں گا کہ فراز اب میرا
بیٹا ہے۔“

پھر واقعی انہوں نے یہی کیا، میں ان کا بیٹا بن گیا۔
اباجی شاید اس لیے مطمئن تھے کہ میں لاہور میں رہوں یا
گاؤں میں، بیٹا تو انہی کا رہوں گا۔

میں ان دنوں انجینئرنگ کے تیسرے سال میں تھا جب میری ملاقات شین سے ہوئی۔ میں کبھی بھی پہلی نظر کی محبت کا قائل نہیں رہا اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتا تھا جو ایسی غیر منطقی بات کرتے تھے لیکن شین کو دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ پہلی نظر کی محبت کیا ہوتی ہے۔

وہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتی تھی اور میرے ایک دوست کی بہن کی کلاس فیلو تھی۔ میں نے اپنے اسی دوست اکبر کے گھر میں شین کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ پھر اکبر کی بہن مائرہ کے توسط سے شین سے اکثر ملاقات ہونے لگی۔

ایک دن میں نے ہمت کر کے اس سے کہا ”مس شین! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ اگر.....“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا تو میں کچھ گڑبڑا گیا۔ ”کیسی ضروری بات؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ بات یہاں اس شور شرابے میں تو نہیں ہو سکتی۔“ میں نے حوصلہ پا کر کہا ”اگر آپ میرے ساتھ ایک کپ چائے پینا پسند کریں تو.....“

”فراز صاحب!“ اس نے کہا ”میں کوئی ایسی دہی لڑکی نہیں ہوں کہ آپ کہیں گے اور میں چل دوں گی۔“ ”آپ بھی مجھے غلط مت سمجھیں۔“ میں نے کہا ”میں بھی کوئی گرا پڑا لڑکا نہیں ہوں۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں اکبر کے پاس تو اکثر جاتا رہتا تھا۔ وہ بھی ہمارے گھر آ جاتا تھا۔

دوسرے دن میں اکبر کے گھر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھا۔ میں نے..... فون پر بات کرنا چاہی لیکن وہ بھی بند تھا۔ میں واپس جانے کو مڑا تو مائرہ نے مجھے روک لیا ”فراز بھائی! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔

”اوہو، آپ کی بھی کوئی ضروری بات ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ میں ان لوگوں سے بہت بے تکلف تھا ”جی فرمائیے، میں سن رہا ہوں۔“

”آپ بیٹھیں تو سہی۔“ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور بولی ”شین سے آپ کی کیا بات ہوئی تھی؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا، گویا شین نے مائرہ کو بھی میرے بارے میں بتا دیا تھا۔

”شین سے؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا ”اس سے تو میری کوئی بات نہیں ہوئی۔“

”کل اس سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی؟“ مائرہ نے مجھے شوخ نظروں سے گھورا۔

”ہاں ملاقات ضرور ہوئی تھی لیکن وہ محترمہ تو میری کوئی بات سننے کی روادار ہی نہیں تھیں، پھر ان سے کیا بات ہو سکتی تھی؟“

”آپ نے اس کو چائے پلانے کی آفر کی تھی؟“ ”ہاں، کی تو تھی۔“ میں نے کہا ”لیکن تم یہ دکیلوں کی طرح جرح کیوں کر رہی ہو؟“

”وہ آج آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ فراز بھائی کوئی فلرٹ قسم کے لڑکے نہیں ہیں۔ وہ کروڑ پتی باپ کے بیٹے ہیں اس کے باوجود میں نے آج تک ان کا کوئی ایسا اسکینڈل نہیں سنا۔“

”مائرہ صاحبہ!“ میں نے ہنس کر کہا ”آپ کی بہت نوازش ہے کہ آپ نے میری تعریف کی۔“

”فراز بھائی! ایک بات بتائیں۔“ اس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا ”شین آپ کو کیسی لگتی ہے؟“ ”کیسی لگتی ہے کیا مطلب بھی؟“ میں نے کہا ”مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس لیے تو میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔“

”اچھا، تو یہ بات ہے۔“ مائرہ آنکھیں نیچا کر بولی ”گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ وہ بھی آپ کے بارے میں یہی کہہ رہی تھی۔“

”لیکن وہ تو.....“ ”فراز بھائی!“ مائرہ نے کہا ”وہ بے چاری ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی لڑکیاں ہر معاملے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہیں۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی ”آپ ایسا کریں، کل یونیورسٹی آجائیں۔“

اس وقت اکبر آ گیا اور میں مائرہ سے زیادہ بات نہ کر سکا۔ دوسرے دن میں یونیورسٹی پہنچا تو مائرہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ شین بھی تھی۔

”فراز بھائی!“ مائرہ نے کہا ”اب آپ لوگوں کو جو کچھ کہنا سنا ہے، براہ راست کہیں، میں لائبریری سے ہو کر آتی ہوں۔“ وہ فوراً وہاں سے چلی گئی۔

شین کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کی کھنی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولی ”فراز صاحب! میں اپنے اس دن کے رویے پر بہت شرمندہ ہوں۔“

”شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے، میں شین.....“

نے کہا ”میں سیدھا سادہ صاف گو آدمی ہوں۔ مجھے اس قسم کی باتوں کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“

شین کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”فراز صاحب! اس کا فیصلہ تو میرے والدین کریں گے۔ یہ بات آپ ان ہی سے کریں تو بہتر ہے۔“

”ظاہر ہے ان کی مرضی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آپ کو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟“

”جی نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ شین نے شرما کر کہا۔

”ٹھیک ہے، اب میں اپنے والدین ہی کو آپ کے گھر بھیجوں گا۔“ میں نے کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

شین چند ہی دنوں میں میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ مجھے اس کے علاوہ دنیا میں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔

میں نے دوسرے ہی دن جمال چاچا سے اس کے بارے میں بات کی تو وہ بولے ”ماشاء اللہ! ہمارا بیٹا اب واقعی جوان ہو گیا ہے۔“ پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولے ”فراز بیٹا! تمہارے باپ نے مجھ پر بہت بھاری ذمہ داری عائد کی ہے۔ میں پہلے اس لڑکی کے بارے میں خود چھان بین کروں گا، پھر کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔“

”آپ ضرور..... چھان بین کریں چاچا!“ میں نے کہا ”وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے والد کسی سرکاری محکمے میں گریڈ سترہ کے افسر ہیں۔ میں کل ان کے بارے میں سب کچھ آپ کو بتا دوں گا۔“

”کل کیوں بیٹا؟“ جمال چاچا نے کہا ”مائرہ اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہے۔ تم انہی اسے فون کر لو۔“

میں نے مائرہ سے فون پر بات کی اور شین کے بارے میں سب کچھ پوچھ لیا۔

میں نے جمال چاچا کو بھی وہی ساری باتیں بتا دیں۔ دو دن بعد چاچا نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور کہا ”فراز بیٹا! میں نے معلومات کروائی ہیں۔ شین کا خاندان انتہائی سنگھما ہوا اور شریف ہے۔ اس کے والد سمیع الدین صاحب بھی بہت نیک اور با اصول شخص ہیں۔ میں کل ہی لو الہ آباد سے بلواتا ہوں۔ ہم شین کا رشتہ چلنے جائے گا۔ اس معاملے میں دیر یوں بھی نہیں کرنا چاہیے کہ خوبصورت لڑکیوں کا رشتہ تو کوئی بھی لاسکتا ہے۔“

چاچا نے ٹیلی فون کر کے دوسرے ہی دن اہامی اور اماں

میرے بزرگ

میرے بزرگ دورۂ نادری میں ایران سے ہندوستان گئے تھے۔ میرے دادا (اخوند محمد اکبر) ایک مشہور قسیدے کا شعر جو حضرت امام رضا علیہ السلام کی شان میں ہے، اکثر لکھ کر اپنے بستوں میں رکھتے تھے تاکہ جس کسی کے ہاتھ پڑے، وہ پڑھے اور ثواب عام ہو۔ وہی فرمایا کرتے تھے کہ یہ قسیدہ حضرت کے روضہ میں ایک دروازے کی محراب پر سر بلند ہوا ہے۔ ان کا مطبوع شعر یہ تھا

یارب این ارض مقدس چہ مقام است و چہ جا است
کز زمیں تا بفلک منظر انوار خدا است
میاں عبدالرزاق (کالمی دروازے کے پاس) اسی محلے میں صاحب تدیس تھے۔ ان کے درس میں (ذوق) جاکر شریک ہونے لگے۔ وہیں والد مرحوم (محمد باقر) سے ملاقات ہوئی اور کئی برس تک دونوں کی تعلیم ایک استاد کے دامن شفقت میں ہوتی رہی۔ نیکی کی بنیاد استقلال پر ہوتی ہے۔ اول کار رابطہ آخر دم تک قائم رہا۔

والد مرحوم کا اور ان کا آغاز تحصیل میں ساتھ ہوا تھا۔ ساتھ بڑھے، ہر معرکے میں شریک حال رہے اور تھوڑے فاصلے میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔

والد مرحوم نے بہ نیت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن (ذوق) تشریف لائے۔ ان سے تاریخ کے لیے کہا۔ اسی وقت تامل کر کے کہا ”تعویث گاہ امام دارین“ پوری تاریخ ہے۔

1835ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفاتروں میں اردو زبان ہو گئی۔ اسی سن میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ 1836ء میں اردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان کا پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔ یہ 13 ستمبر 1857ء تک جاری رہا۔

اقتباس: سوانح محمد حسین آزاد
مرسلہ: دین محمد، مظفر آباد، کشمیر

کوگاؤں سے بلالیا۔

ان لوگوں کو بھی بہت خوشی ہوئی۔ اباجی نے ہنس کر کہا ”جمالے! پہلے اس نالائق کو انجینئر تو بن جانے دے۔“

”میرے بیٹے کو آئندہ نالائق مت کہنا۔“ جمال چاچا بڑا مان کر بولے ”اور جہاں تک انجینئرنگ کا سوال ہے تو ہم انجی کون سی اس کی شادی کر رہے ہیں، ہم تو ابھی صرف مفتی کریں گے۔ شادی تو اس وقت ہوگی جب یہ انجینئر بن جائے گا۔“

وہ لوگ دوسرے ہی دن نشین کے گھر جا پہنچے۔ حسب توقع ان لوگوں نے سوچنے کو کچھ وقت مانگا۔ ظاہر ہے لڑکی والے پہلی ہی ملاقات میں تو ہاں نہیں کر دیتے۔

دو دن بعد جب اباجی، چاچا اور اماں ان کے گھر گئے تو نشین کے والد مسیح الدین صاحب نے کہا ”جمال صاحب! ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ فراز بیٹا انتہائی ذہین اور شریف ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ جمال چاچا نے پوچھا۔

”لیکن ہمارے خاندان میں مفتی کا رواج نہیں ہے۔“ ”مفتی تو ایک دنیاوی رسم ہے بھائی صاحب!“ اباجی نے کہا ”اصل اہمیت تو زبان کی ہے۔ تو پھر ہم اس رشتے کو پکا سمجھیں؟“

”آپ نے ٹھیک کہا نواز صاحب!“ انہوں نے کہا۔ ”اصل فیصلے تو اس زبان ہی سے ہوتے ہیں۔ میں آپ سب کو زبان دے رہا ہوں کہ آج کے بعد نشین آپ کی امانت ہے۔“ اماں نے جھٹ مٹھائی کا ڈبا کھول کر سب کا منہ میٹھا کرایا۔

یہ ساری تفصیل مجھے اماں ہی سے معلوم ہوئی تھی کیونکہ میں خود تو وہاں موجود نہیں تھا۔

نشین کے ساتھ رشتہ پکا ہونے کے بعد میری بے تابی کچھ اور بڑھ گئی۔

میری تعلیم مکمل ہونے میں اب ایک ہی سال تو رہ گیا تھا اور یہ ایک سال بھی مجھے اک صدی کے برابر لگ رہا تھا۔ اس کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ نشین مجھ سے ٹیلی فون پر بات کرنے لگی۔

ہم لوگ رات کو گھنٹوں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔

محل نما گھر، بڑی بڑی شاندار گاڑیاں، بہترین ملبوسات اور بیش قیمت زیورات اس کا خواب تھے۔

نشین کی محبت میں اپنی پڑھائی سے غافل نہیں ہوا تھا۔ امتحان نزدیک آئے تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ اب

ہم اتنی دیر تک بات نہیں کر سکیں گے ورنہ میں قفل ہو جاؤں گا۔“

”ابھی تو امتحانات میں پورے چھ مہینے باقی ہیں فراز!“ نشین نے کہا۔

”اور یہی چھ مہینے میرے لیے بہت اہم ہیں۔“ میں نے کہا ”بس میں امتحان سے فارغ ہو جاؤں، پھر دن رات تم ہی سے باتیں کروں گا کیونکہ امتحان کے فوراً بعد میں تم سے شادی کرنے والا ہوں۔“

جمال چاچا نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ میں یونیورسٹی سے واپسی پر ہیڈ آفس کا ایک چکر لگالیا کروں تاکہ مجھ میں کاروبار کی سوجھ بوجھ بھی پیدا ہو جائے۔

میں ان کا حکم ٹال بھی نہیں سکتا تھا اس لیے یونیورسٹی کے بعد ہیڈ آفس جانے لگا۔

وہاں جا کر مجھے علم ہوا کہ جمال چاچا کے کتنے کاروبار ہیں اور کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں؟ دو ٹیکسٹائل ملز اور گارمنٹس اسٹورز کے علاوہ بہت سی کمپنیوں میں ان کے شیئرز تھے اور وہ ان دنوں ایک فائینانشل ہونٹ بنا رہے تھے جو کراچی میں تھا اور بمبئی کے آخری مراحل میں تھا۔

جمال چاچا میرے اندازوں سے کہیں زیادہ دولت مند تھے۔ میں بھی سوچتا تھا کہ جمال چاچا نے اپنی اربوں روپے کی جائیداد اور کاروبار مجھے دینے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ گاؤں میں ان کے سگے بھائی اور بھتیجے موجود تھے۔

ایک دن میں نے جمال چاچا سے پوچھ ہی لیا ”چاچا! گاؤں میں آپ کے بھائی اور بھتیجے موجود ہیں۔ ان کی مالی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ انہیں اپنے ساتھ بزنس میں کیوں نہیں لگاتے؟“

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے ”فراز بیٹا! جب بابا کا انتقال ہوا تو میری عمر صرف پندرہ سال تھی۔

ہماری اچھی خاصی زمین تھی۔ بابا کے مرتے ہی دونوں بھائیوں نے آنکھیں پھیر لیں اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے اپنے حصے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے مجھے بڑی طرح جھڑک دیا۔ میں نے اسی دن گھر چھوڑ دیا اور لاہور چلا آیا۔ یہاں

آ کر معمولی معمولی کام کرتا رہا۔ اس دور میں ایک نواز سے کی ذات تھی جو مجھے خط کے ذریعے حوصلہ دیتا تھا۔ میں نے لوگوں کی گاڑیاں صاف کیں، سامان ڈھویا، پھلوں کا ٹھیلہ لگایا، پھر کسی نہ کسی طرح میں نے چھوٹی سی ایک دکان خریدی۔ اس دور میں دکانوں اور مکانوں کی قیمت اتنی نہیں چڑھی تھی۔ میں نے اس دکان میں کپڑے کا کاروبار شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے

میں اس کام میں بہت برکت دی اور صرف دو سال کے عرصے میں وہ دکان بیچ کر میں نے اتارکلی میں ایک دکان کھولی۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا نوازاکہ میں نے اس ایک دکان سے تین مزید دکانیں خرید لیں۔ پھر میں نے ایک بڑی ٹیکسٹائل مل خریدی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بڑی مل بن گئی۔ کپڑے کے اس کاروبار میں اللہ تعالیٰ نے میرا ہاتھ مہیا کر دیا کہ میں دن دوئی۔۔۔ رات چوٹی ترقی کرنے لگا۔

گاؤں سے تہی دست نکلنے والا ایک بے آسرا لڑکا جس مال کے عرصے میں کروڑ پتی ہو گیا۔ میں اپنے بھائیوں کی حتی المقدور مدد کرتا رہتا ہوں لیکن انہوں نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے، وہ یاد آتا ہے تو میرے دل میں ان کی نفرت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ان لوگوں نے تو مجھے میرے حق سے بھی محروم کر دیا تھا، میں انہیں اپنی محنت کی کمائی میں شریک کیوں کروں؟“

”جمال چاچا! اب انہیں معاف کر دیں، وہ آپ کا خون ہیں۔“

”میں انہیں معاف کر چکا ہوں لیکن یہ کسی بھی طرح گوارہ نہیں کروں گا کہ وہ میری خون پسینی کی کمائی میں حصے دار بھی بن جائیں۔ پھر تمہیں تو ایسی بات کرنا بھی نہیں چاہیے۔“ جمال چاچا مسکرا کر بولے ”یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں اس میں دوسروں کو بھی شریک کر لوں؟“

میری سمجھ میں آ گیا کہ جمال چاچا اپنی تمام دولت اور جائیداد میرے نام کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میرے دل میں بھی لا لچ آ گیا تھا۔ مجھے یہ عیش و آرام پھر سے نصیب ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد تو میں واقعی خود کاروباروں کے اس کاروبار اور جائیداد کا وارث سمجھنے لگا۔

ایک دن میں گھر آیا تو چاچا بہت خوش تھے۔ میں سمجھا کہ ان کا ہونٹ والا پروجیکٹ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔

وہ ہنس کر بولے ”فراز بیٹا! تم پوچھو کہ میں آج اتنا خوش کیوں ہوں؟“

”میں اس لیے نہیں پوچھوں گا کہ آپ محروم بننا ہی گئے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

جمال چاچا نے بھی زور وار تہہ لگا دیا۔ ”لے! تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے تمہارے لیے ایک چابی لالے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”واقعی!“ میں خوشی سے چہنچا ”لیکن یہ تو راز دہی ہے۔ چاچا! آپ نے اتنا بڑا فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ اب آپ

کر ہی لیا ہے تو یہ بھی بتا دیں کہ ان خاتون کا نام کیا ہے اور کہاں پائی جاتی ہیں۔“

”وہ اتنی بڑی تو نہیں ہے کہ اسے خاتون کہا جائے۔“ چاچا ہنس کر بولے ”وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔“

”چاچا! چھوٹی ہوں یا بڑی میری تو وہ چاچا ہی ہوگی نا؟ میں تو اسے خاتون ہی کہوں گا۔“

”اچھا تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم ابھی لڑکی والوں کے گھر جا رہے ہیں۔“

”ہم!“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”اوئے گاؤں سے نواز امی آ گیا ہے اور بھابی بھی!“ اگلے مسکرائے۔

”اباجی آئے ہیں؟“ میں نے خوش ہو کر کہا ”کہاں ہیں وہ لوگ؟“

”وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو پہنچے ہیں۔“ چاچا نے کہا ”وہ بھی لڑکی کے گھر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔“

اباجی اور اماں واقعی تیار تھے، وہ دونوں ہی بہت خوش تھے۔

ہم لڑکی کے گھر پہنچے تو ان لوگوں نے بہت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ خامسے آزاد خیال لوگ تھے۔ انہوں نے اماں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اجازت دے دی کہ میں بھی ٹائل سے مل لوں۔

میں نے ٹائل کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت پرکشش بلکہ حسین لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ واقعی کم سن تھی اور عمر میں مجھ سے بھی دو چار سال چھوٹی ہی ہوگی۔ اسے خاتون کہنا واقعی.....

اس سب کے حسن کی تو ہن تھی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ٹائل جمال چاچا کی دلہن بن کر ہمارے گھر میں آ گئی۔

اپنے کے تیسرے ہی دن جمال چاچا، ٹائل کو لے کر دہلی من کے لیے پور پلے گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ فراز بیٹا، میں ذرا لمبی چھٹی پر جا رہا ہوں۔ یوں بھی میں نے برسوں سے آرام نہیں کیا ہے، میں چند ماہ ہر فکر سے بے نیاز ہو کر گزارنا چاہتا ہوں۔

میں فاضل ایئر کا امتحان دے چکا تھا اور اب رزلٹ کے اظہار میں تھا۔ ان دنوں میرے پاس بھی وقت تھا اس لیے میں چاچا کے کاروبار پر پور توجہ دینے لگا۔

اس دن میں آفس میں ہی تھا کہ نشین کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ فکاہی انداز میں بولی ”فراز! اب تو تمہارے امتحان بھی

ہو چکے ہیں، اب تمہیں کیا مصروفیت ہے کہ تم مجھے فون نہیں کر رہے ہو؟

”وہ اصل میں چاچا پورپ گئے ہوئے ہیں۔ کام کا سارا دباؤ مجھ پر ہے اس لیے.....“

”ارے بھئی، اب یہ کاروبار وغیرہ کا چکر چھوڑو اور کوئی اچھی سی جاب ڈھونڈو۔“

”کیوں بھئی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی، اب وہاں تمہاری وہ حیثیت تو رہی نہیں ہے، کل کو چاچا کے بچے ہوں گے تو وہی سارے کاروبار اور جائیداد وغیرہ کے مالک ہوں گے۔“

مجھے اس کی بات سن کر دھچکا سا لگا۔ میں نے اب تک اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا ”تم ٹھیک کہتی ہو ٹین! اب واقعی میری حیثیت وہ نہیں رہی ہے۔ میں تم سے رات کو بات کروں گا۔“ میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میرے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں اس وقت واقعی بہت خود غرضی سے سوچ رہا تھا کہ اب اس دولت، جائیداد، کاروبار اور محل نما بنگلے پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ مجھے اب اپنا راستہ خود بنانا ہوگا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ گزشتہ چھ سال سے میں جس شاہانہ انداز میں زندگی گزارنے کا عادی ہو گیا ہوں، کیا میں اس کے بغیر زندگی گزار پاؤں گا؟

”ہاں، مجھے اب یہ عیش و آرام ترک کرنا ہی پڑے گا۔ یہ مہنگے ملبوسات، عیش قیمت پر فہم، شاندار گاڑیاں، وسیع وعریض بنگلا اور ملازموں کی فوج۔ مجھے سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔

جمال چاچا کو بھلا اس بڑھاپے میں شادی کرنے کی کیا سوچیں گی؟ میں نے خود غرضی سے سوچا۔ اس لمحے میں یہ بھول گیا کہ میری معمولی سی خوشی پر چاچا کتنے خوش ہوتے تھے اور معمولی سی تکلیف پر کتنے بے چین ہو جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے بیٹوں سے بڑھ کر چاہا تھا اور میں ان کے لیے اس انداز میں سوچ رہا تھا۔

میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پڑھا لکھا ہوں، انجینئرنگ کی ڈگری میرے پاس ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے زور بازو سے بھی تو حاصل کر سکتا ہوں۔ جب جمال چاچا واجبی سی تعلیم ہونے کے باوجود بزنس ایمپائر قائم کر سکتے تھے تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟

میرا رزلٹ آیا تو میں حسب معمول بہترین نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔

میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پڑھا لکھا ہوں، انجینئرنگ کی ڈگری میرے پاس ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے زور بازو سے بھی تو حاصل کر سکتا ہوں۔ جب جمال چاچا واجبی سی تعلیم ہونے کے باوجود بزنس ایمپائر قائم کر سکتے تھے تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟

میرا رزلٹ آیا تو میں حسب معمول بہترین نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔

میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پڑھا لکھا ہوں، انجینئرنگ کی ڈگری میرے پاس ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے زور بازو سے بھی تو حاصل کر سکتا ہوں۔ جب جمال چاچا واجبی سی تعلیم ہونے کے باوجود بزنس ایمپائر قائم کر سکتے تھے تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟

میرا رزلٹ آیا تو میں حسب معمول بہترین نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔

میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پڑھا لکھا ہوں، انجینئرنگ کی ڈگری میرے پاس ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے زور بازو سے بھی تو حاصل کر سکتا ہوں۔ جب جمال چاچا واجبی سی تعلیم ہونے کے باوجود بزنس ایمپائر قائم کر سکتے تھے تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟

میرا رزلٹ آیا تو میں حسب معمول بہترین نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔

میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پڑھا لکھا ہوں، انجینئرنگ کی ڈگری میرے پاس ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے زور بازو سے بھی تو حاصل کر سکتا ہوں۔ جب جمال چاچا واجبی سی تعلیم ہونے کے باوجود بزنس ایمپائر قائم کر سکتے تھے تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟

رزلٹ آتے ہی مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرف مجھے ملازمت کی پیشکش کی گئی۔ میں نے دو بڑی کمپنیوں کے علاوہ سب سے معذرت کر لی۔ باقی دو کمپنیوں سے میں نے کہا کہ میں فی الحال اپنے ایک ضروری پروجیکٹ میں مصروف ہوں۔ میں چھ ماہ بعد آپ کی پیشکش قبول کر سکتا ہوں۔

میں جانتا تھا کہ چھ ماہ بعد بھی وہ کمپنیاں مجھے ملازمت دینے سے انکار نہیں کریں گی۔ انکار کریں بھی تو میں امریکا کی چھٹی ریاست کی طرف نکل جاؤں گا۔

اب مجھے چاچا کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ رات کو ٹین سے میری بات ہوئی تو میں نے اسے بتا دیا کہ مجھے کئی کمپنیز سے جاب کی بہت اچھی آفرز ہوئی ہیں۔ چاچا کے آنے کے بعد میں کوئی ملازمت کر لوں گا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ ٹین نے کہا۔

”تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو کسی قسم کا پچھتاوا تو نہیں ہوگا کہ ہم نے تو ایک کروڑ پتی لڑکے سے رشتہ طے کیا تھا، یہ چند ہزار روپے کا ملازم نکلا۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو فرازا!“ ٹین نے بردامان کر کہا ”میں نے ایک لمحے کے لیے بھی تمہاری دولت یا جائیداد کے بارے میں نہیں سوچا، رہی بات میرے گھر والوں کی تو ابوکل ہی کہہ رہے تھے کہ اب فراز کو کہیں ملازمت کر لینا چاہیے۔ وہ جمال صاحب کا حقیقی بیٹا تو ہے نہیں۔ اب صورت حال بدل چکی ہے۔“

مجھے یہ سن کر بہت سکون محسوس ہوا اور نہ مجھے یہ بھی خدشات تھے کہ کہیں ٹین کے گھر والے انکار نہ کر دیں۔ والدین کی تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی کو زیادہ سے زیادہ عیش و آرام میسر آئے۔ ممکن ہے ان لوگوں نے یہی سوچ کر رشتہ طے کیا ہو لیکن ٹین کی بات سن کر میرے تمام خدشات دور ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

جمال چاچا پورے چھ ماہ بعد یورپ اور امریکا کے دورے سے لوٹے۔ وہ پہلے سے کہیں تروتازہ اور جوان لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے اپنی عمر کے دس بارہ برس جھٹک دیے ہوں۔ شامکے بھی بہت کھلی کھلی نظر آرہی تھی۔ اس کے حسن میں ایک انوکھا نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ حسین تو وہ پہلے بھی تھی لیکن اب اس میں بڑے گھر کی عیامت والی تمکنت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ جدید فیشن کے میٹر اسٹائل اور لباس نے اس کا حسن دو آتشہ کر دیا تھا۔

پھر میں نے خود کو ملامت کی کہ شامکے کے بارے میں مجھے اس انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔

جمال چاچا مجھ سے یوں ملے جیسے برسوں بعد ملے۔ شامکے بھی بہت اپنائیت سی ملی۔ اس کی آنکھوں میں ہمارا سحر تھا۔ مجھے ان آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خوف سا ملتا ہوتا تھا۔

اس دن میں نے بھی آفس سے چھٹی کر لی تھی۔ جمال مجھے اپنے سفر کی روداد حیرے لے لے کر سنارہے تھے۔

دوران میں شامکے کی نظریں مجھ پر لگی رہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہیں پا رہی ہو۔

رات کو کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے میں نے جمال سے کہا ”چاچا! اب تو آپ کی سھکن اتر گئی ہوگی۔ اب آپ اپنا بزنس سنبھالیں۔“

”بیٹا جی! میں سب سمجھتا ہوں۔ اب تو بھی چاہتا ہوگا کہ نی بھی شادی ہو جائے اور تو بھی میری طرح طویل چھٹی پر مل جائے۔“ پھر وہ چونک کر بولے ”ہاں، تیرے امتحان کامیابی کی خبر مجھے ملی تھی۔ تو نے تو واقعی مجھے سرخ رو کر دیا لیکن صاحب! اب میں نوازے کے سامنے سر اٹھا کر کہہ لں گا کہ دیکھو، میرا بیٹا، انجینئر بن گیا ہے اور کس شان سے مل ہوا ہے۔“

”چاچا! میں.....“

”میں نے ماڈرن آئوٹرو والوں کو فون کر دیا تھا۔ تجھے اپنی کامیابی کا تحفہ پسند آیا؟“

”بہت پسند آیا چاچا جی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اس موقع پر مجھے ایک کار تحفے میں دی تھی۔

”چاچا جی! میں.....“

”میں نے ماڈرن آئوٹرو والوں کو فون کر دیا تھا۔ تجھے اپنی کامیابی کا تحفہ پسند آیا؟“

”بہت پسند آیا چاچا جی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اس موقع پر مجھے ایک کار تحفے میں دی تھی۔

”چاچا جی! میں.....“

”میں نے ماڈرن آئوٹرو والوں کو فون کر دیا تھا۔ تجھے اپنی کامیابی کا تحفہ پسند آیا؟“

”بہت پسند آیا چاچا جی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اس موقع پر مجھے ایک کار تحفے میں دی تھی۔

”چاچا جی! میں.....“

”میں نے ماڈرن آئوٹرو والوں کو فون کر دیا تھا۔ تجھے اپنی کامیابی کا تحفہ پسند آیا؟“

”بہت پسند آیا چاچا جی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اس موقع پر مجھے ایک کار تحفے میں دی تھی۔

”چاچا جی! میں.....“

”میں نے ماڈرن آئوٹرو والوں کو فون کر دیا تھا۔ تجھے اپنی کامیابی کا تحفہ پسند آیا؟“

”بہت پسند آیا چاچا جی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اس موقع پر مجھے ایک کار تحفے میں دی تھی۔

”چاچا جی! میں.....“

”میں نے ماڈرن آئوٹرو والوں کو فون کر دیا تھا۔ تجھے اپنی کامیابی کا تحفہ پسند آیا؟“

”بہت پسند آیا چاچا جی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اس موقع پر مجھے ایک کار تحفے میں دی تھی۔

”چاچا جی! میں.....“

”میں نے ماڈرن آئوٹرو والوں کو فون کر دیا تھا۔ تجھے اپنی کامیابی کا تحفہ پسند آیا؟“

”بہت پسند آیا چاچا جی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اس موقع پر مجھے ایک کار تحفے میں دی تھی۔

”گئے“ جتنی تجھ وہاں سے ملے گی، اس سے کئی گنا زیادہ تو تو خود اپنی کمپنی کے ملازمین کو دے دیتا ہے۔“

”چاچا! اب صورت حال وہ نہیں ہے۔ اب آپ کی.....“

”فرازا!“ جمال چاچا غصے کی شدت سے کاہنے لگے ”تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اب تیری حیثیت میں کوئی فرق آ گیا ہے۔ میرے دس بیٹے بھی پیدا ہو جائیں تو تیری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہ کاروبار اور جائیداد تیری ہے اور تیری ہی رہے گی۔ ہاں، مجھے تجھ سے یہ امید ضرور ہے کہ تو اپنے بھائیوں کو ہر طرح سے سہارا دے گا اور ایک دن وہ خود بھی اتنے ہی بڑے کاروبار اور جائیداد کے مالک ہوں گے۔

لیکن تو نے تو میرا دل ہی توڑ دیا ہے نواز بیٹا!“ چاچا شدت جذبات سے رورہے تھے۔ ”میں نے تو ہمیشہ تجھے اپنا بیٹا سمجھا لیکن تو نے میرے بارے میں اس انداز میں سوچا..... مجھے..... تجھ سے یہ امید نہیں تھی بیٹا جی!“ جمال چاچا پھر رونے لگے۔

میں آگے بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گیا اور گلو گلو لہجے میں بولا ”مجھے معاف کر دیں چاچا! میں نے اُن جانے میں اپنی باتوں سے آپ کا دل دکھایا ہے، مجھے معاف کر دیں پلیز!“

”اوئے تو مرد ہو کر رورہا ہے، چھٹ دوا لے کا آ دی بچوں کی طرح آنسو بہا رہا ہے۔“

ان کی بات پر مجھے ہنسی آگئی ”چاچا! آپ بھی تو رورہے ہیں۔“

”اوئے، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“ جمال چاچا نے میری پیٹھ پر دھب رسید کرتے ہوئے کہا ”بیٹا جی! آئندہ بھولے سے بھی ایسی بات مت کرنا ورنہ مجھ سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہوگا۔“

”تم بہت الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگے ہو فرازا!“ شامکے نے ہلکی دھمکانی کھولی ”جمال تو سارا وقت تمہارا ہی ذکر کرتے رہتے ہیں اور تم.....“

”ہاں بیٹے کے بچ میں تم مت بولو شامکے!“ چاچا نے سر دھچکے میں کہا۔

شامکے کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اسے اپنی توہین کا احساس ہوا ہوگا۔

اسی رات میں نے ٹین کو فون کیا اور اسے بھی سب کچھ بتا دیا۔

”فرازا! میں جانتی ہوں کہ چاچا تمہیں بہت چاہتے ہیں لیکن بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ ویسے تو تم بھی بہت ذہین

جون 2012

ماہنامہ سرگزشت

2012

ماہنامہ سرگزشت

2012

شہین بہت دور اندیش لڑکی تھی۔

”میں نے ہر طرح سے غور کر لیا ہے۔“ میں نے کہا ”تم تو اب شادی کی تیاریاں شروع کر دو۔ چاچا کل اباجی اور اماں کو یہاں بلا رہے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ اسی ہفتے کے اندر اندر ہماری شادی ہو جائے۔“

میں جانتا تھا کہ یہ بات سن کر شہین شرم سے گلنا رہو گی۔ اس لیے وہ چند لمحے تک کچھ بھی نہ بولی۔

”ہیلو! میں نے کہا ”تم سو تو نہیں سکتیں؟“

”میں جاگ رہی ہوں۔“ شہین نے کہا ”لیکن اب واقعی مجھے شدید خیند آ رہی ہے، باقی باتیں کل۔“

شادی کی بات پر وہ ہمیشہ یہی کہتی تھی۔ میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

دوسرے دن جمال چاچا نے شہین کے گھر والوں کو خصوصی دعوت دی۔ اس دعوت میں شہین بھی آئی تھی۔ مجھے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ شائلہ کا رویہ شہین کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ یہ بات یقیناً شہین نے بھی محسوس کی ہوگی لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد شائلہ میرے کمرے میں آ گئی۔ وہ اکثر میرے کمرے میں آ جاتی تھی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”فراز! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ شائلہ ادھر ادھر کی چند باتیں کرنے کے بعد بولی ”آخر تمہیں اس لڑکی شہین میں ایسا کیا نظر آ گیا تھا؟ تم ذہین ہو، ڈشنگ پرسناٹی کے مالک ہو۔ تمہیں تو ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی مل سکتی تھی۔“

میں نے چاہا کہ میں اسے کوئی سخت جواب دے دوں لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ وہ میرے خلاف چاچا کے کان بھرنا شروع کر دے گی۔ وہ تو یوں بھی آج کل شائلہ کے حسن کے امیر تھے۔

”دیکھو فراز! اب بھی وقت ہے، تم اس شہین سے اپنا پیچھا چھڑالو۔“

”میرے والدین اور چاچا شہین کے گھر والوں کو زبان دے چکے ہیں۔ اگر میں نے ایسی کوئی کوشش بھی کی تو والدین بھی مجھے دھتکار دیں گے اور چاچا بھی مجھے گھر سے نکال دیں گے۔“

”یہ تمہاری بھول ہے فراز! شائلہ نے کہا ”جمال تو تمہارے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔“

”میں انہیں آپ سے زیادہ جانتا ہوں شائلہ صاحبہ! میں نے تلخ لہجے میں کہا ”وہ مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہیں لیکن اپنی زبان سے کسی بھی قیمت پر نہیں پھریں گے۔“

شائلہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ مجھے اب اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ آخر کیوں شہین کی مخالف ہو رہی تھی؟

پھر کئی دن تک شائلہ نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ان ہی دنوں مجھے اطلاع ملی کہ اماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں فوراً گاؤں چلا گیا۔ اماں واقعی بہت بیمار تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے ساتھ لاہور چلیں، وہاں ان کا علاج بہت اچھی طرح ہو جائے گا لیکن وہ راضی نہ ہوئیں۔

اباجی نے بتایا کہ تمہاری ماں کا علاج تو چل رہا ہے اور وہ ٹھیک بھی ہو رہی ہیں۔ انہیں کوئی ایسی بیماری نہیں ہے، بس بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور بیٹا! آج کل یہ کوئی بیماری نہیں ہے۔“

اس موقع پر میری ہمت نہ پڑی کہ میں اباجی سے اپنی شادی کی بات کرتا۔ یوں بھی اب میری دونوں بہنیں جوان ہو چکی تھیں۔ اصولی طور پر تو پہلے ان کی شادیاں ہونا چاہیے تھیں۔

میں نے لاہور واپس آ کر چاچا سے بھی کہہ دیا کہ جب تک میری بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی، میں شادی نہیں کر سکتا۔

یوں میری شادی کا معاملہ کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ اب شائلہ کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے۔ وہ ہر ہفتے ہزاروں روپے کی شاپنگ کرتی تھی۔ بہترین ملبوسات اور جیولری کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے دوستوں اور محلے والوں کی دعوتیں بھی کرتی رہتی تھی۔ گویا چاچا کی شدید محنت کی کمائی کو بہت بے دردی سے لٹا رہی تھی۔

وہ چاچا کے دفتر میں معمولی ملازمت کے لیے آئی تھی اور اپنی خوبصورتی کے نل بوتے پر اس کمپنی کی مالک بن چکی تھی۔

اب وہ جمال چاچا کو بالکل نظر انداز کرنے لگی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا جھکاؤ میری طرف ہے۔ وہ مجھ سے ہنس ہنس کر بہت اپنائیت سے باتیں کرتی تھی لیکن جمال چاچا سے بہت سرد مہری سے پیش آتی تھی۔

جمال چاچا نے تو عملاً اب سب کچھ میرے حوالے کر دیا تھا اور خود بھی گھبراہٹ میں دفتر آتے تھے۔

ایک دن میں ایک طویل میٹنگ منہا کر اپنے آفس پہنچا شائلہ کو اپنی کرسی پر بیٹھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”شائلہ! آپ یہاں.....؟“

”ارے پریشان کیوں ہو گئے فراز!“ وہ ہنس کر بولی ”یہ کرسی تمہاری ہے اور تمہاری ہی رہے گی۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسی ہوئی اُٹھ گئی لیکن اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے لہرا رہے تھے۔

”خیریت تو ہے شائلہ! آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں؟“

”آج تمہارے چاچا سے زبردست جھڑپ ہوئی ہے۔ نہ وہ مجھے کہیں گھمانے لے جاتے ہیں، نہ میری کسی بات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں تو ان سے شادی کر کے پچھتا رہی ہوں۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”اور کیسی باتیں کروں؟ میری اور ان کی عمر میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اگر.....“

”شائلہ!“ میں نے سرد لہجے میں کہا ”یہ باتیں آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھیں، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”ہاں، اب کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ گویا خود کھائی کے انداز میں بولی ”اس بڑھے گھوسٹ نے تو زندگی اجیرن کر دی ہے۔“

”شائلہ!“ میں نے چیخ کر کہا ”آپ کو شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے؟ آپ پلیز..... یہاں سے چلی جائیں ورنہ.....“

شائلہ کو بھی شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ جلدی سے بولی ”فراز! ان باتوں کا ذکر جمال کے سامنے مت کرنا پلیز! میں غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔“

”آئندہ اگر آپ نے ایسی کوئی بھی بات کی تو میں چاچا کو سب کچھ بتا دوں گا۔ وہ میری بات پر یقین نہیں کریں گے گویا بونگا“

وہ زیادہ سے زیادہ مجھے اپنے گھر سے نکال دیں گے نا؟“

”فراز! پلیز ایسی بات بھی مت کرنا۔ اس گھر میں تم ہی تو ہو جس سے میں اپنا دکھ درد کہہ رہی ہوں۔ سوری، مجھے معاف کر دو۔“ یہ کہہ کر شائلہ وہاں سے چلی گئی۔

میں دیر تک سوچتا رہا کہ چاچا نے ہمارے لیے شائلہ سے شادی کر کے بہت گھمانے کا سودا کیا ہے۔ ۱۱ ہمارا کی دولت ہے درلغ لٹا رہی تھی۔ اس کے دنوں ہماری اب بہت اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ اس کے پاس پہلے پڑانی سائیکل تک نہیں تھی، اب وہ بڑے مال کی کڑا لائن کھوستا تھا۔ وہ ریکرونگ کا کام کرتا تھا اور میں نے سنا تھا کہ لوگوں کو باہر

بھولنے کے بہانے ان سے ہماری رقمیں انٹھ چکا تھا۔ اب ریکرونگ کے ساتھ ساتھ اس نے ٹریول ایجنسی بھی بنائی تھی اور اپنا دفتر بھی لاہور کے بہترین کاروباری علاقے میں منتقل کر لیا تھا۔ یہ سب کچھ چاچا کی دولت ہی سے ہو رہا تھا۔

چاچا نے اپنے اکاؤنٹ آفیسر سے کہہ رکھا تھا کہ شائلہ کو جتنے بھی کیش کی ضرورت ہو، اسے دے دیا جائے۔

پہلے تو تھوڑے سے کیش سے شائلہ کا کام چل جاتا تھا لیکن بعد میں جب بڑی بڑی رقموں کے چیک میرے پاس آنے لگے تو میں نے اکاؤنٹ آفیسر سے ان کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہر رقم مسز جمال کو چاہیے۔

”آپ ایسے تمام چیکس کا اندراج ایک علیحدہ رجسٹر میں بھی کریں اور مسز جمال کے نام سے کریں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے ایسا ہی کیا ہے سر!“ اس نے جواب دیا۔

شائلہ کے جانے کے بعد میں نے اکاؤنٹ آفیسر کو بلایا اور اس سے کہا ”مجھے ان تمام رقموں کی تفصیلات چاہئیں جواب تک جمال چاچا نے اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کرائی تھیں، جمال چاچا اسے اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے بھی چیک دیتے رہتے تھے۔“

اگر یہی صورت حال مزید سال بھر تک برقرار رہی تو ہماری کمپنی دیوالیہ ہو سکتی تھی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس سلسلے میں تو چاچا سے بات ضرور کروں گا۔

اس سے پہلے کہ میں گھر پہنچتا، چاچا کا فون آ گیا۔ ”السلام علیکم!“ میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”وعلیکم السلام!“ چاچا نے کہا پھر پوچھا ”فراز بیٹا! کیا شائلہ وہاں آئی تھی؟“

”جی ہاں، وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی گئی ہیں۔“

”آج اس نے کتنی رقم آفس سے لی ہے؟“ چاچا نے پوچھا۔

”میں ابھی اکاؤنٹ سیکشن سے معلوم کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”فراز بیٹا! آج کے بعد شائلہ کو وہاں سے کچھ مت دینا۔“

”جی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”میں بھلا کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“

”کیوں؟“ چاچا نے درشت لہجے میں کہا ”تمہاری مرضی کے بغیر تو کوئی وہاں سے ایک پیسا بھی نہیں لے سکتا۔ تم کہہ دینا کہ آپ کو جو کچھ بھی لینا ہے، چاچا سے لیں۔“ پھر وہ بولے ”تم گھر آؤ، پھر تفصیل سے بات کروں گا۔“ یہ کہہ کر

انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں گھر پہنچا تو چاچا، شائلہ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔
”فراز بیٹا! تم بھی ہمارے ساتھ چلو، ہم آؤنگ کے لیے جا رہے ہیں۔“

”چاچا! آپ جائے۔“ میں نے کہا ”میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں۔“

”چلو فراز!“ شائلہ نے کہا۔

”میں واقعی بہت تھکا ہوا ہوں، ورنہ آپ کو کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”بھئی، ناراض کیوں ہوتے ہو؟“ شائلہ نے چپک کر کہا ”تم آرام کرو۔“

وہ دونوں واپس آئے تو چاچا کچھ چپ چپ سے تھے لیکن مجھے دیکھ کر جبراً مسکرا دیے تھے۔

کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے پھر وہ لوگ سونے چلے گئے۔ میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر نہ جانے کب میری آنکھ شائلہ کی چیخوں سے کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیوار گیر گھڑی اس وقت پانچ بج رہی تھی۔ میں ننگے پاؤں اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔

شائلہ کی دل خراش چیخوں سے گھر کے ملازم بھی حواس باختہ ہو کر دوڑ پڑے تھے۔

”کیا بات ہے..... کیا ہوا؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”یہ..... یہ..... کچھ..... بول ہی نہیں رہے ہیں..... فراز..... یہ.....“

میں نے آگے بڑھ کر چاچا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ان کی پیشانی برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ میں نے نبض دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے بوکھلاہٹ میں نبض ہی نہیں مل رہی تھی۔

”غلام رسول!“ میں نے چیخ کر ملازم کو آواز دی ”جلدی ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔“

”جی صاحب!“ غلام رسول دوڑتا ہوا چلا گیا۔

شائلہ مستقل رو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ چاچا کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب آ کر انہیں ایک انجکشن دیں گے اور وہ مسکراتے ہوئے اُٹھ جائیں گے۔

اس سے زیادہ شاید میں خود کو تسلیاں دے رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ نزدیک ہی تھا۔ وہ دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے۔

انہوں نے چاچا کا معائنہ کیا، ان کی نبض دیکھی،

اسٹیتھسکوپ لگا کر دل کی دھڑکن سنی، پھر افسردگی سے سر ہلا کر بولے ”سوری فراز بیٹا! جمال صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انہیں بہت شدید ہارٹ ایٹک ہوا ہے اور.....“ وہ کچھ اور بھی کہہ رہے تھے لیکن مجھے کمرے کی چھت تیزی سے اٹھنے کی طرف آتی محسوس ہوئی، پھر میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں اپنے کمرے کے بجائے کہیں اور تھا۔ میری ایک جانب ایک کرسی پر شائلہ بیٹھی تھی، دایم جانب سفید کپڑوں میں ایک نرس کھڑی تھی۔

اس نے مجھے آنکھیں کھولنے دیکھ کر کہا ”تھینکس گاڈا آپ کو ہوش تو آیا۔“

مجھے معلوم ہوا کہ مجھے دو دن بعد ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اگر مزید چند گھنٹے مریض کو ہوش نہ آیا تو اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔

چاچا کا خیال آیا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے مجھے اپنوں سے بڑھ کر چاہا تھا لیکن میں کیسا بد نصیب بیٹا تھا کہ آخری وقت میں نہ ان کا چہرہ دیکھ سکا، نہ ان کے جنازے کو کندھا دے سکا۔

شائلہ نے کہا ”فراز! تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو، ورنہ تمہاری حالت پھر بگڑ جائے گی۔“

”میں بہت ڈھیٹ ہوں شائلہ صاحبہ!“ میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”اتنی آسانی سے نہیں مروں گا۔“

چاچا کا سوئم بھی ہو چکا تھا۔ اباجی اور اماں بھی گاؤں سے آگئے تھے اور چاچا کے بھائی اور بھتیجے بھی۔

وہ سب لوگ چاچا کے چالیسویں تک زکے، پھر گاؤں واپس چلے گئے۔

شائلہ ان دنوں عدت میں تھی۔ ایک رات وہ میرے کمرے میں آگئی، میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو گئے؟“ اس نے ہنس کر کہا۔

”آپ عدت میں ہیں۔“ میں نے کہا ”آپ کو یوں میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے۔“

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں فراز!“ شائلہ نے کہا۔

”تمہارے چاچا نے کوئی وصیت نامہ تو چھوڑا نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی پوری جائیداد کی وارث میں ہوں۔ ان کے بھائی بھی جائیداد پر نظر میں جھانپے بیٹھے ہوں

میں نے کہا ”میں نے سنا ہے جو تم نے سنا ہے۔“

”میں نے سنا ہے کہ..... میں..... یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے یہ دولت اور جائیداد نہیں چاہیے۔“

”اچھی طرح سوچ لو۔“ شائلہ نے کہا ”بعد میں مجھے

میں لیکن میں اتنی آسانی سے جائیداد نہیں دوں گی نہیں۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اب یہ آپ جناب کا چکر چھوڑو۔“ شائلہ نے کہا ”میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔“

”کیا..... کیا کہا آپ نے؟“

”ہاں، میں نے وہی کہا ہے جو تم نے سنا ہے۔ تم اس ت پر اچھی طرح غور کر لو۔ انکار کی صورت میں تمہیں یہ بگلا گاڑی، دولت، کاروبار سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ دوسری صورت میں سب کچھ تمہارا ہوگا۔ تم اچھی طرح فیصلہ کر لو۔“ یہ کروہ چلی گئی۔

میں ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ گزشتہ کئی برس سے میں جو شاہانہ زندگی گزار رہا تھا، اسے ترک کرنا بہت مشکل تھا۔ ایک دفعہ تو میرے دل میں آیا کہ میں شائلہ کی بات مان لوں لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی کہ شائلہ اس شخص کی بیوہ ہے جسے تم اپنا باپ کہتے تھے۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟ کیا دنیا والے تم پر تعویض گے نہیں؟ کیا تمہیں کی نظروں سے تم ہمیشہ کے لیے گریں جاؤ گے؟

دوسرے دن میں آنس میں بیٹھا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف شائلہ تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جمال کے بریف کیس میں جو کاغذات تھے، اس میں سے اس کا وصیت نامہ بھی نکلا ہے۔ تم فوراً گھر پہنچو۔

میرے دل میں امید کی ایک کرن جاگی کہ یقیناً چاچا نے اپنا ادارت مجھے بنایا ہوگا۔ وہ ہر آدمی سے یہی کہتے تھے کہ میری جائیداد کا وارث فراز ہے۔

میں گھر پہنچا تو شائلہ نے مجھے اپنے بیڈروم ہی میں بلوالیا اور چاچا کا وصیت نامہ میرے حوالے کر دیا۔ وصیت نامہ کیا، وہ چاچا کے ذاتی لیٹر ہیڈ پر ٹائپ کی ہوئی ایک تحریر تھی جس کی رو سے ان کی پوری جائیداد اور کاروبار کی وارث شائلہ تھی۔ اگر اس تحریر کے آخر میں چاچا کے دستخط نہ ہوتے تو میں اسے کبھی تسلیم نہیں کرتا لیکن میں چاچا کے دستخط اچھی طرح پہچانتا تھا۔

”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟“ شائلہ نے پوچھا۔

اس لمحے وہ مجھے ایسی چیل لگ رہی تھی جو انسانی خون جتنی ہو اور خوبصورت لڑکی کے روپ میں رہتی ہو۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ..... میں..... یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے یہ دولت اور جائیداد نہیں چاہیے۔“

”اچھی طرح سوچ لو۔“ شائلہ نے کہا ”بعد میں مجھے

سے شکایت مت کرنا۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”میں سب کچھ سوچ چکا ہوں شائلہ! اس دولت اور جائیداد کی میں اتنی بڑی قیمت نہیں چکا سکتا۔“

”قیمت تو تم اب چکاؤ گے۔“ شائلہ نے کہا اور جھپٹ کر اندر سے پولٹ کر لیا۔

”کیا..... کیا..... کر رہی ہیں آپ؟“

شائلہ نے اچانک اپنی قمیص کا گریبان پھاڑ ڈالا بلکہ قمیص کو جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا پھر اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اسے بھی پھاڑ دیا۔

اچانک مجھے بیڈ پر دھکا دیا اور پھر پوری قوت سے چیخنے لگی ”بھاؤ..... بھاؤ.....“

میں بڑی طرح گھبرا گیا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن اس نے منہج کر مجھے پھر بیڈ پر گر لیا اور جونک کی طرح مجھے لپٹ گئی۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی ”بھاؤ..... بھاؤ۔“

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی پھر کسی نے کمرے کی گھڑی کا شیشہ توڑ دیا اور کنڈی کھول کر اندر آ گیا۔ وہ ہمارا ملازم غلام رسول تھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں سے دوسرے ملازم بھی اندر آ گئے۔

ہم دونوں کے حلیے، میرے چہرے اور بازوؤں پر پڑے ہوئے شائلہ کے ناخنوں کے نشان اور پھینا ہوا لباس دیکھ کر وہ وہی سمجھے جو شائلہ انہیں سمجھانا چاہتی تھی۔

شائلہ نے چیخ کر کہا ”غلام رسول! پولیس کو فون کرو۔“

اس نے ایک چادر اپنے جسم پر لپیٹتے ہوئے کہا ”اور خیال رکھنا، یہ یہاں سے بھاگنے نہ پائے۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وہاں رکوں یا بھاگ جاؤں؟ بھاگنے میں زیادہ بدنامی تھی اس لیے میں نے وہاں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔

آدھے گھنٹے بعد پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی وہاں آ گئے۔ انہوں نے کمرے کا منظر اور میرا حلیہ دیکھ کر فوراً ہی مجھے حراست میں لے لیا۔

شائلہ سب انسپکٹر کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر نے مجھے بھی وہاں بلالیا اور مجھے باقاعدہ فرد جرم سنا دی۔ پھر وہ لوگ مجھے گرفتار کر کے لے گئے اور حوالات میں بند کر دیا۔

شائلہ نے مجھ پر الزام لگایا تھا کہ فراز نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی ہے۔

شائلہ نے یقیناً پولیس کے سب انسپکٹر کو رشوت میں

297

ماہنامہ سرگزشت

جون 2012

296

ماہنامہ سرگزشت

جون 2012

297

ماہنامہ سرگزشت

جون 2012

وسال سبک رفتار پنچھی کی طرح اڑ گئے۔ گزرے ہر
کی راکھ میرے بالوں میں پھیل گئی۔ میں نے دن و
مخت کی، کام، کام اور بس کام!
تاریخ کو کیا اپنے آپ کو پھر دہرائی تھی۔ میں
گزر گئے۔ اب میں ڈالرز میں لکھ پتی تھا۔ میں نے ا
آ کر اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا جو میری محنت اور لگن کا
سے خوب پھل پھول گیا۔
چاچا نے بھی شاید اسی طرح محنت کی ہوگی، میں
سوچتا تھا۔

میں برس میں اباجی اور اماں جی اس دنیا سے
ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی دونوں بہنوں کی شادی
تھیں اور دونوں اپنے گھروں میں خوش تھیں لیکن میں نے
نیک خود شادی نہیں کی تھی۔

☆☆☆

اپنی بہن کی بیٹی حرا کی شادی کے موقع پر مجھے
آنا پڑا۔ میری بہن نوشین کراچی میں..... کمان
علاقے میں رہتی تھی۔ وہاں سے عبداللہ شاہ غازی کا
زیادہ دور نہیں تھا۔

ایک دن میں یوں ہی ٹھٹھا ہوا مزار کی طرف نکل گیا
میں مزار پر فاتحہ پڑھ کر واپس آیا تو ایک فقیرنی کو،
ٹھٹھک گیا۔ میں شاید اسے کبھی نہ پہچان پاتا لیکن اس
آنکھیں اب بھی ویسی ہی تھیں۔ وہ شامکے تھے۔
شامکے نے بھی مجھے پہچان لیا۔ وہ دوڑ کر میرے قدم
سے لپٹ گئی اور رو کر معافی مانگنے لگی۔

میں اسے لے کر نسبتاً ایک پرسکون گوشے میں ہاگما
وہاں میں لوگوں کی نظروں میں تماشابن رہا تھا۔ اس نے
کہ سارا پلان میرے باپ کا تھا۔ وہ وصیت نامہ بھی جعلی تھا
میرے باپ نے تیار کیا تھا۔ پھر اس نے جمال کی بیوی
جائداد جوئے اور شراب میں اڑادی، پھر بنگلہ بھی بیچ کھا لیا
مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

”مجھے معاف کرو فرما!..... معاف کرو۔ میں
تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔“

اس نے واقعی میرا بہت دل دکھایا تھا۔ اس نے میری
محبت کو مجھ سے جھین لیا تھا لیکن شامکے کے اس عبرت
انجام پر میں لرز کر رہ گیا تھا۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔
دوسرے دن شامکے کی اکڑی ہوئی لاش مزار کے
سے ملی۔ وہ شاید مجھ سے معافی مانگنے کے لیے ہی زندہ تھی

خاصی بھاری رقم بھی دی ہوگی اس لیے وہ میری کوئی بات
سننے ہی کو تیار نہیں تھا۔

میری گرفتاری کی خبر سن کر اباجی اور اماں بھی لاہور
آ گئے۔ ایک دفعہ مٹین بھی آئی تھی لیکن مجھے اس کی آنکھوں
میں اجنبیت نظر آئی۔

میں نے رو رو کر اباجی کو بتایا کہ میں بے قصور ہوں۔
شامکے نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔

”ہمیں تجھ پر اعتماد ہے بیٹا!“ اباجی نے کہا ”وہ لڑکی
مجھے شروع ہی سے پسند نہیں تھی۔ تو فکر مت کر۔ میں تیرے
لیے شہر کے بہت قابل وکیل کی خدمات حاصل کروں گا۔“

پوکیس نے جوڈیشل ریمائنڈر پر مجھے جیل بھیج دیا۔

اباجی نے بہت قابل وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں۔

اس وکیل نے پہلی ہی پیشی میں میری ضمانت کرا دی۔

پھر اس نے میری طرف سے بھی شامکے پر ہتک عزت
اور جائداد کو غیر قانونی طور پر ہتھیانے کا الزام لگا دیا۔

میرے حق میں گھر کے دو تین ملازمین نے گواہی دی کہ

شامکے بی بی نے فراز صاحب کو خود اپنے بیڈروم میں بلایا تھا۔

ٹیلی فون: پہنچ میں بھی شامکے کی اس کال کا ریکارڈ تھا جس کے

ذریعے اس نے مجھے گھر بلایا تھا۔

کیس چل ہی رہا تھا کہ میں ایک دن مٹین کے گھر

چلا گیا۔

اس کے والد نے کہا ”فراز! اب تم یہاں مت آیا

کرو۔ تمہاری وجہ سے محلے میں ہماری پہلے ہی بہت بدنامی

ہو چکی ہے۔“

”انکل! کیا آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں؟“ میں نے

کہا۔

”ارے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔“

انہوں نے کہا ”دنیا تو یہی سمجھتی ہے۔“

”اور مٹین.....!“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو اب تمہارا نام سننے کی بھی روادار نہیں ہے۔“

میں بوجھل قدموں سے واپس آ گیا۔

میں ان دنوں اپنے ایک دوست کے گھر میں مقیم تھا۔

چونگی پیشی میں عدالت نے مجھے بری کر دیا۔

میں لاہور سے بد دل ہو کر کراچی چلا گیا۔ کچھ عرصہ

وہاں ایک ملٹی پٹیل کمپنی میں ملازمت کی پھر اس کمپنی کے ہیڈ

آفس میں میرا ٹرانسفر ہو گیا اور میں امریکا چلا گیا۔

☆☆☆

پھر وقت کا پھیا اتنی تیزی سے گھوما کہ نہ جانے کتنے ماہ

ماہنامہ سرگزشت

We at Paksociety.com giving you the
facility to download urdu novels,Imran
series,Monthly digests with direct links
and resumeable direct link along with
the facility to read online on different
fast servers

If site is not opening .or you find any
issue in using site send your complaint
at admin@paksociety.com

or

send message at
0336-5557121